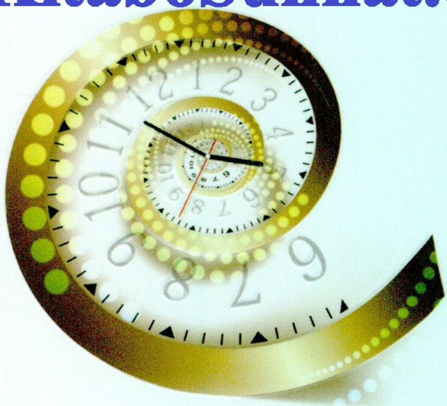
نوجوان نسل کی رہنمائی کے لیے

سنہری یادیں





دار السلام
DARUSSALAM

عبدالمالک مجاہد

سنہری یادیں

عبد المالک مجاہد

دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 00966 1 4043432-4033962 فیکس: 4021659
info@darussalamksa.com   riyadh@darussalamksa.com
www.darussalamksa.com

- الریاض العلیا فون: 01 4614483 فیکس: 4644945
- الملز فون: 01 4735220
- سویلم فون: 01 2860422
- مندوب الریاض موبائل: 0503459695
- القصیم (بریدہ) فون/فیکس: 06 3696124 موبائل: 0503417156
- مکہ مکرمہ موبائل: 0502839948
- مدینہ منورہ فون: 04 8234446 فیکس: 8151121 موبائل: 0504296740
- جدہ فون: 02 6879254 فیکس: 6336270
- الخبر فون: 03 8692900 فیکس: 8691551
- ینبع البحر فون/فیکس: 04 3908027
- خمیس مشیط فون/فیکس: 07 2207055

شارجہ فون: 00971 6 5632623   امریکہ ہیوسٹن: 001 713 7220419 * نیویارک: 001 718 6255925

لندن فون: 0044 208 539 4885   آسٹریلیا فون: 0061 2 9758 4040

پاکستان ہیڈ آفس ومرکزی شوروم

36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون: 0092 42 37324034-37240024-37232400 فیکس: 37354072 موبائل: 0322-8484569

Website: www.darussalampk.com   E-mail: info@darussalampk.com

- غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 37120054 فیکس: 37320703 موبائل: 0321-4439150
- Y-260 بلاک کمرشل ایریا، فیز III ڈیفنس، لاہور فون: 35692610 موبائل: 0321-4212174

کراچی مین طارق روڈ (D.C.HS / 110,111-Z) ڈولمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی، کراچی
فون: 34393936 فیکس: 34393937 موبائل: 0321-2441843

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 2281513 موبائل: 0321-5370378

سنہری یادیں

عبدالمالک مجاہد

DARUSSALAM
دارالسلام

کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور • کراچی
اسلام آباد • لندن • ہیوسٹن • نیو یارک

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر

مجاهد، عبدالمالك

ذكريات ذهبية - اردو. / عبدالمالك مجاهد. الرياض، ١٤٣٥هـ

ص: ٥٦٤، مقاس ١٤ x ٢١ سم

ردمك: ١-٣٣٩-٠٠٠-٥٠٣-٦٠٣-٩٧٨

١- التراجم الذاتية أ. العنوان

ديوي ٩٢٠ ١٤٣٥ / ٨٤٠٤

رقم الإيداع: ١٤٣٥ / ٨٤٠٤

ردمك: ١-٣٣٩-٠٠٠-٥٠٣-٦٠٣-٩٧٨

فہرست

موضوع	صفحہ نمبر

موضوع	صفحہ نمبر

موضوع | صفحہ نمبر

عرض مؤلف و ناشر

سنہری یادوں کو میں نے آج سے کم وبیش پانچ سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ میری پرانی خواہش تھی کہ میں اپنی نوجوان نسل کے لیے ایک رہنما تحریر چھوڑ جاؤں جس میں اپنے بچپن کے حالات، عملی زندگی کے بعض اہم واقعات، سعودی عرب آمد، دارالسلام کی تأسیس کیسے ہوئی اور اس کے مقاصد کیا تھے؟ ان تمام امور کے بارے میں کچھ تحریر کروں۔ ایک تو دارالسلام کی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔ دوسرا یہ کہ آئندہ آنے والی نسلوں اور بطور خاص میری اپنی آل اولاد کو معلوم ہو سکے گا کہ ان کے دادا پردادا نے دارالسلام کو کیوں، کیسے اور کن حالات میں شروع کیا۔ اس کے لیے کتنی محنت کی اور اس کی کامیابی کے لیے کون کون سے مراحل طے کیے۔ اپنی ذاتی یادداشتوں کے حوالے سے لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں نے کتنی ہی بار بعض واقعات کو لکھا پھر انہیں حذف کر دیا یا ان میں اختصار کیا۔ پھر مسودہ پڑھا تو اس میں کئی ایک سقم نظر آئے، پھر تبدیل کیا۔ دارالسلام کی ریسرچ ٹیم کے احباب نے بھی سنہری یادوں کا جائزہ لیا ہے۔ کوئی خامی اور کمزوری نظر آئی تو اسے تبدیل کرنے بیٹھ گیا۔ اس کے لیے میں بطور خاص دارالسلام ریاض کے سینئر ریسرچ سکالر قاری محمد اقبال عبدالعزیز صاحب، اور دارالسلام لاہور کی ریسرچ ٹیم کا شکر گزار ہوں۔ ان سب ساتھیوں نے اس کتاب کو آخری شکل دینے میں خاصی دقت نظر اور محنت سے کام لیا۔ میں اس کتاب کو خودنوشت کا نام اس لیے نہیں دینا چاہتا کہ عموماً سوانح

عمری یا خودنوشت بڑے آدمی لکھتے ہیں اور بڑے لوگوں کی ہی ہوتی ہے۔ میں نہ تو بڑا آدمی ہوں' نہ ہی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہوں اور نہ ہی ان شاءاللہ کبھی سمجھوں گا۔ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں' جس نے ایک چھوٹے سے ایسے گاؤں میں جنم لیا جو بنیادی سہولتوں سے محروم تھا۔ ہمارے گھر کچے تھے۔ بجلی تو بڑی دیر کے بعد ہمارے ہاں آئی۔ رہنمائی کرنے والی کوئی خاص شخصیت بھی نہ تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں سیلف میڈ انسان ہوں۔

عموماً جب کسی منصوبے میں لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ میں تو بچپن سے یہ اور یہ عزائم رکھتا تھا۔ اور میں نے اتنے سالوں کی جدوجہد کے بعد اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا خاص کرم ہوا' حالات ایسے بنتے چلے گئے اور کارواں بنتا چلا گیا؛ تاہم نیت جو پہلے دن تھی وہ الحمدللہ! آج بھی ہے کہ ہمیں اللہ کے دین کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں لوگوں تک پہنچانا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں بچپن میں اپنے ذاتی پرنٹنگ پریس کا خواب ضرور دیکھا کرتا تھا۔ لاہور میں ایبک روڈ پر شیخ محمد اشرف صاحب کا پرنٹنگ پریس ہوتا تھا۔ جب لاہور جاتا تو میں اس پریس کو گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔ میں دیکھتا رہتا کہ پریس کیسے کام کرتا ہے۔ مجھے متعدد بار فیروزسنز کے پریس کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ دل میں آرزو انگڑائی لیتی: کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا بھی پرنٹنگ پریس ہو۔

بچپن میں بعض اشاعتی اداروں کے پاس اپنے والد صاحب کے کتابت شدہ صفحات لے کر جایا کرتا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے ناشر بننے کا کبھی سوچا ہی نہ تھا' مگر میں جس ماحول میں پیدا ہوا۔ جس طرح کے میرے گھر کے حالات تھے' ان حالات میں

میرے لیے ناشر بننا بظاہر ناممکنات میں سے تھا۔

مجھے بچپن میں صحافی بننے کا بڑا شوق تھا۔ میں صحافی حضرات کو بڑی قدر اور رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی میں بھی کالم نگار یا ایڈیٹر بن جاؤں گا۔ دارالسلام بننے کے بعد میری زندگی کی بڑی خواہشات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ دارالسلام کی کتب بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی شریف کے باہر مکتبات پر میسر ہوں۔ میری خواہش تھی کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا اپنا سیٹلائٹ چینل ہو۔ ان ساری چیزوں کا جواب دینے سے پہلے میں کہوں گا کہ میری تمام تر کمزوریوں' خامیوں اور گناہوں کے باوجود مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے رب نے مجھ ناچیز کو اپنے دین کی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔ جب میں اپنے اندر کے عبدالمالک کو ٹٹولتا ہوں تو خود کو بالکل تہی دامن پاتا ہوں۔ مجھے تو اپنے اندر کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ مجھے اپنے اللہ سے' اپنے مشن سے اور اپنے دین سے خوب محبت ہے اور یہی میرا سرمایہ ہے۔ ہاں جب اپنے اللہ کی رحمتوں اور اس کی شفقتوں کو دیکھتا ہوں تو پھر میں پکار اٹھتا ہوں: واقعی وہ میرا رب ہے' جو نہایت کرم کرنے والا اور فضل و احسان کرنے والا ہے۔ جمعیت احیاء التراث الاسلامی کویت کے رئیس جناب طارق العیسی نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا: عبدالمالک! تم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہو جن کی خواہشات کو اللہ تعالی نے تمہاری زندگی ہی میں پورا کر دیا ہے۔

اللہ کا بے پناہ شکر ہے کہ لاہور میں اسلام آباد جانے والی موٹر وے پر پانچ ایکڑ جگہ پر دارالسلام قرآن پرنٹنگ کمپلکس نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ وقف منصوبہ ہے اس پریس سے جو آمدنی ہوگی ان شاء اللہ اس سے قرآن مجید' اس کے تراجم' قاعدے پارے'

احادیث اور سیرت رسول ﷺ پر مشتمل کتب چھاپ کر مفت تقسیم کی جائیں گی۔

نشر و اشاعت کے میدان میں دارالسلام نے نئے نئے آئیڈیاز متعارف کروائے ہیں۔ مجھے ایک لبنانی اشاعتی ادارے کے مالک نے کم و بیش یہ الفاظ کہے تھے: لوگ انتظار کرتے ہیں کہ دارالسلام اب کونسا نیا منصوبہ یا آئیڈیا لے کر آ رہا ہے تاکہ وہ اس کی نقل کریں۔ مجھے خوشی ہوتی ہے کہ کتنے ہی اداروں نے دارالسلام سے رہنمائی لے کر اپنی کتب کا معیار بہتر بنایا ہے۔ میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ الحمدللہ! دارالسلام اس وقت انگلش زبان میں اسلامی لٹریچر شائع کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ ہم تادم تحریر 28 زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم شائع کر چکے ہیں۔ مزید تراجم پر کام جاری ہے۔ اس وقت ہماری 1400 سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں مارکیٹ میں ہیں۔ دنیا کے بیس سے زائد ملکوں میں ہماری کتب فروخت ہوتی ہیں۔ مکہ مکرمہ میں حرم مکی اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے باہر درجنوں چھوٹے بڑے مکتبات ہیں۔ الحمدللہ! ہر مکتبہ پر ہماری کتب میسر ہیں۔

میرے صحافتی کام بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ جدہ سے شائع ہونے والے اردو نیوز میں ہفتہ وار کالم لکھتے ہوئے مجھے کم و بیش سات سال ہو رہے ہیں۔ اس کالم میں بہت کم انقطاع واقع ہوا ہے۔ میں لاہور سے ماہنامہ "ضیائے حدیث" بھی نکالتا ہوں۔ میرا منہج بڑا معتدل ہے۔ میں قطعاً متشدد نہیں۔ میں تمام مکتبات فکر کا احترام کرتا ہوں؛ تاہم عقیدے، منہج، اتباع سنت اور رد بدعت پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ بڑے پڑھے لکھے اور اونچے عہدوں پر فائز احباب نے مجھے بتایا: مجاہد صاحب! ہم آپ کا کالم بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ میں نے جدہ سے شائع ہونے

والے ہفت روزہ میگزین میں ''سیرت کے اوراق'' کے عنوان سے 159 کالم لکھے۔اس کے بعد یہ میگزین بند ہوگیا یہ کالم جو دو صفحات پر مشتمل تھا اس میں اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کو بڑے ہی آسان پیرائے میں قارئین کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ الحمدللہ! اس وقت تک میری تالیف کردہ بیس سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کو عوام وخواص میں یکساں پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث نے ''پیغام'' کے نام سے جو چینل بنایا ہے میرے لیے اعزاز ہے کہ میں بھی اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز کا ممبر ہوں۔ عالم اسلام کی سب سے مشہور شخصیت امام حرم مکی ڈاکٹر شیخ عبدالرحمٰن السدیس اس بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ مرکزی قیادت کا یہ بڑا پن ہے کہ انہوں نے مجھے اس کے ممبران میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کتنی ہی کامیابیاں ہیں جو میرے رب نے مجھے عطا فرمائی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں میں نے انہی کامیابیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب لکھنے کے دوران میں نے پوری کوشش کی ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ سچے اور درست واقعات ہی لکھوں۔ میں ہمیشہ سے ''پرامید'' رہتا ہوں۔ مایوسی کو گناہ سمجھتا ہوں۔ میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میرا سب سے بڑا سرمایہ بارگاہ الٰہی میں دعا ہے۔ اپنے رب کے ساتھ آہ وزاریاں ہیں۔ اگر مجھے کچھ مل گیا تو بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اگر نہ ملے تو بھی میں اللہ کا شکر ہی ادا کرتا ہوں۔

میری ان لاتعداد کامیابیوں کا حقیقی سبب ہمیشہ سے میرے رب کا خاص فضل وکرم رہا ہے اور اس کے بعد میرے والدین کی دعائیں ہیں۔ مجھے یہ بات لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میں اپنے والدین کا فرماں بردار بیٹا تھا اور ان کی عزت واحترام میری زندگی کا مشن تھا۔ تنخواہ لاتا تو آدھی آدھی دونوں میں تقسیم کر دیتا' وہ ڈھیروں دعائیں دیتے۔ وہ مجھ سے

بہت خوش تھے۔ ان کی دعاؤں ہی کا نتیجہ ہے کہ میں کسی کام کے قابل ہوا۔ والد محترم بلاشبہ مجھے بہت بڑے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ نجانے وہ میرے لیے کتنی دعائیں کرتے ہوں گے۔ آج مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہے کہ اللہ کے فضل وکرم سے دنیا کے بیشتر ممالک میں دارالسلام کے چاہنے والے' اس کی شائع شدہ کتب پڑھنے والے موجود ہیں۔ میں کسی بھی ملک میں جاؤں تو مجھے امید ہے کہ بیشتر ممالک میں مجھے ائرپورٹ پر خوش آمدید کہنے والے لوگ موجود ہوں گے۔ یہ سب کچھ میرے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ میں جب گھر آتا تو والدین کو میں ہر وقت ہنساتا رہتا۔ ان کے ساتھ کھیلتا' میں ان کا دوست بن جاتا۔ والدین کی ضروریات کو پورا کرنا میری زندگی کا نصب العین تھا۔ پھر اس کے جواب میں جو دعائیں ملتیں ان کا مت پوچھیں۔ میں اپنے قارئین سے کہوں گا کہ اگر آپ دنیا میں سعادت مند بننا چاہتے ہیں تو اپنے والدین کو ہمیشہ راضی رکھیں۔

میں نے یہ کتاب بطور خاص اپنی نوجوان نسل کے لیے لکھی ہے کہ ان کے لیے مشعل راہ ہو۔ میری خواہش ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے والے' اس میں بیان کردہ میرے تجربات اور بعض رہنما اصولوں کو اپنا لیں تو وہ بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ میری یہی خواہش ہے کہ ہمارے نوجوان مایوسی کا شکار نہ ہوں۔ میں مؤمن کو بارش کے پانی کی طرح سمجھتا ہوں کہ بارش کی صورت میں پانی اپنا راستہ خود بنالیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے نوجوانوں کو بھی مایوس ہونے' غلط باتیں سوچنے اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے بارش کی طرح اپنی راہیں خود نکالنی چاہییں۔

آخر میں ایک ضروری وضاحت کرنا چاہوں گا' میں نے اس کتاب میں بعض شخصیات کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ کتنے ہی مزید ایسے احباب ہیں جن کے بارے

میں مجھے لکھنا چاہیے تھا' مگر میں کتاب کے صفحات کو ایک حد سے زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا' اس لیے اسے مختصر کرتا چلا گیا۔ کتنے ہی صفحات لکھ کر ان کا اختصار کرنا پڑا۔ اس لیے جن احباب کا میں تذکرہ نہیں کر سکا' یا جن کے نام کتاب میں نہیں لکھ سکا اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میرے دل میں ان کے لیے محبت و احترام میں کوئی کمی ہے یا میں ان کو اہمیت نہیں دیتا۔ میں ہر اس شخص کا احسان مند ہوں' جس نے میرے ساتھ کبھی کوئی نیکی یا احسان کیا ہے۔ میں اپنے محسنوں کو عموماً بھولتا نہیں ہوں' مگر پھر بھی ہر شخص کے بارے میں لکھنا ناممکنات میں سے تھا۔ اس لیے جن کا ذکر نہیں کر سکا ان سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر میں سارے احباب کا تذکرہ شروع کر دیتا تو پھر یہ کتاب کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچتی۔

''سنہری یادیں'' آپ کو کیسی لگی؟ اس بارے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اگر کوئی شخص اس کتاب کو پڑھ کر اپنی زندگی سنوار لیتا ہے یا اس میں کچھ تبدیلی پیدا کر لیتا ہے' تو میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوش قسمتی نہیں ہو گی۔

محبکم

عبدالمالک مجاہد

الریاض' سعودی عرب

رمضان 1435

جولائی 2014ء

میرا سنہرا گاؤں

میرا بچپن...... ماضی کی سنہری یادیں

میں نومبر 1955ء میں کیلیا نوالہ میں پیدا ہوا۔ تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں واقع یہ گاؤں آبادی کے لحاظ سے کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا۔ کیلیا نوالہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہاں قدیم زمانے سے کیلو قوم آباد تھی جو ہندو مذہب کی پیروکار تھی۔ کیلو سے ماخوذ ہو کر لفظ کیلیا نوالہ بنا جو اس گاؤں کا نام ٹھہرا۔ اس دور میں ہمارے گاؤں میں بجلی تھی نہ ہسپتال، زندگی کی دیگر ضروری سہولیات بھی کم ہی میسر تھیں۔ میرا تعلق سپرا جٹ خاندان سے ہے۔ ہمارے خاندان کے جد امجد حاجی محمد عارف رحمہ اللہ تین صدیاں قبل یعنی 1711ء میں اس گاؤں میں سرکاری مال گزار کے طور پر تعینات ہو کر آئے، جبکہ ہمارے بزرگوں کے مطابق اس خاندان کے اکثر لوگ لالیاں، چنیوٹ کے قرب وجوار میں آباد ہیں۔ اسی لیے میرے تایا جان جناب محمد یوسف صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہم لالی سپرا ہیں۔ ہمارے خاندان کے اکثر لوگ خطاطی کے پیشہ سے منسلک تھے۔ خاندان کے متعدد لوگ طبیب بھی تھے، بعض امامت بھی کراتے تھے، ان حضرات کا کہنا تھا: ہم لوگ امامت اللہ کو

راضی کرنے کے لیے، طبابت خدمت خلق کے لیے اور کتابت گھریلو اخراجات کے لیے کرتے ہیں۔

وہ دور ہی ایسا تھا کہ پیسہ بہت کم لوگوں کے پاس تھا۔ کسی نے کچھ دے دیا تو الحمدللہ! ورنہ اگر کسی گھر میں سال بھر کے لیے گندم موجود ہوتی تو پھر فکر کی کوئی بات نہ ہوتی تھی۔

ہم اللہ کے فضل سے تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے جناب محمد ایوب سپرا صاحب ہیں جو مجھ سے ساڑھے تین سال بڑے ہیں۔ ان کے بعد میرا نمبر ہے اور مجھ سے چھوٹے محمد طارق شاہد ہیں جو مجھ سے آٹھ سال چھوٹے ہیں۔ مجھ سے چھوٹے ایک اور بھائی بھی تھے جن کا نام طیب رکھا گیا، مگر یہ اپنی ولادت کے چند روز بعد ہی وفات پا گئے۔ ہماری کوئی ہمشیرہ نہیں ہے۔ جس طرح میری کوئی ہمشیرہ نہیں اسی طرح والد صاحب کی اکلوتی ہمشیرہ بھی چھوٹی عمر ہی میں وفات پا گئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میری سگی پھوپھی کوئی نہیں۔ اس طرح میرے بچوں کی بھی سگی پھوپھی کوئی نہیں۔ میرے والد کے ایک ہی بھائی تھے جن کا نام محمد یوسف کیلانی تھا۔ بڑی خوبصورت شکل وصورت کے مالک تھے۔ ہمارے تایا جان جن کو ہم بڑے ابا جان کہتے تھے بڑے وضع دار انسان تھے۔ ساری زندگی انھوں نے اپنی وضع داری پر آنچ نہیں آنے دی۔ بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنتے، سر پر موسم کے مطابق ٹوپی رکھتے۔ میں نے انھیں بچپن میں سر پر کلے والی پگڑی باندھے بھی دیکھا ہے۔ بڑے اعلیٰ درجے کے خطاط تھے۔ میرے والد محترم سے کم وبیش بارہ تیرہ سال بڑے تھے۔ دادا جان بڑی مدت پہلے وفات پا چکے تھے۔ اس لیے والد صاحب کی پرورش اللہ تعالیٰ کے بعد انھوں نے ہی کی۔

کسی زمانے تایا جان مولانا ظفر علی خان کے زمیندار اخبار میں بھی کام کرتے رہے۔

میرے والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ بچپن میں یہ مجھے اور تمھاری دادی جان کو اپنے ساتھ لاہور بھی لے گئے تھے۔ ہم نے بہت تھوڑا وقت لاہور میں گزارا۔ تایا جان اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے، نستعلیق لکھتے تو اتنی خوبصورت کہ انسان دیکھتا رہ جائے۔ اسی طرح عربی رسم الخط میں بھی کتابت نہایت اعلیٰ کرتے تھے۔

ہمارا گاؤں کاتبوں کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ یہ حضرات اپنے نام کے ساتھ کیلانی لکھا کرتے تھے۔ میرے والد صاحب بھی اپنے نام کے ساتھ کیلانی لکھا کرتے تھے۔ کیلانی ہمارے گاؤں کیلیانوالہ کی نسبت سے ہے۔ محترم تایا جان اور ان کے بیٹے برادرم محمد داود کیلانی رحمہ اللہ کو یہ سعادت ملی کہ انھوں نے مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کی شروع سے آخر تک کتابت کی۔ یہ برسوں مولانا مودودی کے پاس کام کرتے رہے۔ اس وقت طریقہ یہی تھا کہ کاتب صاحب چند دن مؤلف کے پاس اس کے دفتر یا گھر میں بیٹھ کر کتابت کرتے۔ جب مؤلف کی ہدایات ازبر کر لیتے یا مؤلف کو اندازہ ہو جاتا کہ اب کاتب صاحب میرا انداز اور میری تحریر اچھی طرح سمجھ گئے ہیں تو وہ کاتب صاحب کو اجازت دے دیتے کہ اب وہ ان کی کتاب گھر میں لے جا کر کتابت کر سکتے ہیں۔ اس طرح کاتب صاحب وہ کام لے کر واپس گاؤں آ جاتے۔ پندرہ، بیس دن یا ایک ماہ کے بعد کتابت شدہ صفحات لے کر ناشر کتب کے پاس جاتے، وہ مزید مسودہ دے دیتا، کیے ہوئے کام کا معاوضہ مل جاتا اور بعض اوقات معاوضہ دینے میں کچھ انتظار بھی کرواتا۔ یہ زمانہ ہی ایسا تھا، بہت کم لوگوں کے پاس نقد رقم ہوتی۔ بہر حال کتابت اس دور میں ایک معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا، لوگ اسے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔

میں تایا جان کا ذکر کر رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ خصوصی محبت کرتے تھے۔ جب میں حافظ آباد سے گاؤں جاتا تو وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر میری طرف متوجہ ہو جاتے، میرے ساتھ گفتگو کرتے اور برادری کی تاریخ بیان کرتے۔ انھیں برادری کا شجرہ نسب بڑی حد تک یاد تھا، اسے بیان کرتے۔ یاد آیا کہ ہماری برادری کا جو شجرہ نسب چھپا ہوا ہے وہ انھی کی محنت کا شاہکار ہے۔ میں ان کے ساتھ بعض موضوعات پر بحث مباحثہ بھی کرتا، مگر ان کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ ہی ہوتا۔ میری ذاتی معلومات کی حد تک انھوں نے متعدد بار اپنے ہاتھ سے قرآن کریم کی کتابت کی۔ وہ ہمیشہ خوش باش ہی رہتے تھے، مگر زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے انھیں اس موقع پر روتے ہوئے دیکھا جب میرے والد اور ان کے بھائی نے وفات پائی۔ جب میں ریاض سے پاکستان گیا تو فوراً مجھے ملنے کے لیے آئے اور گلے لگا کر خوب روئے۔

ہماری تائی جان شریفاں بی بی صاحبہ ابا جان کی سگی خالہ زاد بہن تھیں۔ ہم انھیں پھوپھی جان ہی کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے! وہ زیادہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں، مگر اپنے گھر میں لڑکیوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتی تھیں۔

میری والدہ صاحبہ کا نام رضیہ بیگم تھا۔ یہ راجپوت برادری سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس وقت کے عام رواج کے مطابق ''احوال الآخرت'' اور ''زینت الاسلام'' پڑھ لیتی تھیں۔ حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی کی تالیف کردہ یہ دونوں کتابیں پنجابی اشعار کی شکل میں قرآن وسنت کے حوالوں سے مزین تھیں اور مقبول عام تھیں۔ امی جان قرآن کریم پڑھ لیتی تھیں بلکہ میں نے تو قرآن کریم والدہ صاحبہ ہی سے پڑھا ہے۔

میرے نانا جان رانا محمد شفیع ایک گاؤں جوئیانوالہ میں رہتے تھے، جو مرید کے کے

قرب وجوار میں واقع تھا۔ وہ بھی کتابت کے پیشے سے منسلک تھے اور گاؤں کی مسجد میں امامت کراتے تھے۔ بچپن میں مجھے ننھیال جانے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ دادا جان محترم جناب غلام مصطفیٰ اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے۔ عین جوانی میں طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے اور دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ ان کی رحلت کے وقت والد محترم کی عمر بمشکل ایک دو ہفتے ہی ہوگی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ انھوں نے شدید بیماری میں گھر والوں سے کہا: مجھے یونس بیٹا دکھا تو دو، میں نے تو اسے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں۔ دادا جان کو یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی سیرت نبوی پر شہرہ آفاق کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کی کتابت انھوں نے کی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ ان کا کتابت شدہ نسخہ دیکھا تھا، نہایت خوبصورت لکھائی تھی۔

والد صاحب نے اپنا بچپن حالت یتیمی میں گزارا۔ اس وقت کیلیانوالہ کا سب سے قریبی ہائی سکول رسول نگر میں تھا۔ ہمارے گاؤں میں اس وقت اسکول نہیں تھا۔ ابا جان بتایا کرتے تھے کہ وہ پڑھنے کے لیے کیلیانوالہ کے جنوب مغرب میں واقع گاؤں ہراکوٹ جایا کرتے تھے۔ انھوں نے پرائمری تعلیم وہاں سے حاصل کی اور اگلی کلاسوں کے لیے گاؤں کے شمال مشرق میں واقع رسول نگر کے سکول میں جایا کرتے تھے۔ اس وقت رسول نگر کا نام رام نگر تھا۔ یہ تاریخی قصبہ دریائے چناب کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ پنجاب کا راجہ رنجیت سنگھ گرمیوں کی چھٹیاں یہیں گزارا کرتا تھا۔ گرمیوں میں یہاں کا موسم دریا کی وجہ سے ٹھنڈا رہتا تھا۔

میں نے بچپن میں رنجیت سنگھ کی بارہ دری رسول نگر میں دیکھی تھی۔ سکھوں اور انگریزوں کی آخری لڑائی 1849ء میں اسی جگہ لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں مرنے والے

سپاہیوں کی قبریں میرے بچپن کے دور میں وہاں دیکھی جا سکتی تھیں۔

رسول نگر اس دور میں خاصی بڑی تجارتی منڈی تھی۔ خصوصاً نمک کے کاروبار کے لیے مشہور تھی، مگر آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی اور اس کی یہ حیثیت بتدریج علی پور چٹھہ کی طرف منتقل ہو گئی، جس کا نام کسی زمانے میں ''اکال گڑھ'' ہوتا تھا۔

ہمارا گاؤں کوئی بہت بڑا نہ تھا، مگر اتنا چھوٹا بھی نہ تھا۔ زیادہ تر لوگ کاشت کاری کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ ہمارے خاندان کے گھر کیلیانوالہ کے جنوبی حصے میں واقع تھے۔ گھروں کے پیچھے مغرب کی طرف قبرستان ہے، جو گھر کی چھت سے نظر آتا ہے۔ ہماری گلی سے مغرب کی طرف جائیں تو پانچ چھ سو میٹر کی دوری پر گاؤں ختم ہو جاتا تھا۔ گاؤں کے آخر میں ''ڈالانوالہ'' کا کھوہ تھا۔ اس کے بعد کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ گاؤں کے جنوب مشرق میں نالہ ''وگھ'' بہتا تھا۔ بچپن میں ہم اس میں نہایا کرتے تھے۔ میں نے تیراکی اسی نالے میں سیکھی۔ برسات کے موسم میں اس میں طغیانی آجاتی تھی۔

ہمارے گھر کے سامنے مشرق کی طرف کھیت تھا اور اس کے اختتام پر نمبرداروں کا ڈیرا تھا۔ ڈیرے کے بالمقابل کنواں تھا۔ اس کے بعد جنوب مشرق میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اس کے بعد عیسائیوں کے گھر تھے۔ گاؤں کے مشرق میں پانی کا ایک تالاب بھی تھا جس کے دوسرے کنارے پر چماروں کے گھر تھے۔

گاؤں کے مغرب میں ''وریا'' برادری کا ایک اور ڈیرا تھا جس کے وسط میں برگد کا بہت بڑا درخت تھا۔ لوگ دوپہر کے وقت اس درخت کے نیچے چارپائیاں ڈال لیتے اور وہیں قیلولہ کرتے تھے۔ ڈیرے کے مشرق میں چند کمرے تھے جن میں بعض اوقات محکمہ زراعت کا دفتر بھی میں نے دیکھا ہے۔ کبھی کبھار اس کے چند کمرے اسکول کی کلاسوں

میں تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔ خود میں نے بھی وہاں چند ماہ تک تعلیم حاصل کی تھی۔

ہمارے گاؤں کے شمال میں مشہور گدی نشین سید نور الحسن شاہ بخاری کا مزار تھا جس پر ہر سال ان کا بڑا زبردست عرس لگتا تھا۔ دور دور سے ان کے مرید آتے اور جلسہ ہوتا۔ میں اس وقت دوسری جماعت میں پڑھتا تھا جب میں نے اس موقع پر صاحبزادہ فیض الحسن شاہ بخاری کی تقریر سنی تھی۔ یہ بڑی زبردست تقریر تھی۔ میں نے گھر آ کر والدہ صاحبہ کو بتایا تھا کہ ان مولوی صاحب کی زبان بہت تیز چلتی ہے۔ مزار کے ساتھ بڑی خوبصورت اور وسیع جامع مسجد تھی۔ مزار کی دوسری جانب سید باقر علی شاہ اور ان کے بھائی سید جعفر علی شاہ کا محل نما مکان تھا۔ یہ خوبصورت کوٹھی سفید رنگ کی تھی اور دور سے نظر آتی تھی۔ ان کے اس محل کے پیچھے اہل تشیع کے کچھ گھر تھے۔ گاؤں کے وسط میں مہاجروں کے گھر تھے جو ٹیلے پر واقع تھے۔ یہاں بسنے والے ہندو جب یہ گھر چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تو ان کے پختہ گھر مہاجروں کو الاٹ کر دیے گئے۔

میرا گھر میری جنت

ہمارا گھر کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ گلی قدرے وسیع تھی۔ مکان میں داخل ہوتے ہی ڈیوڑھی تھی جس میں ایک چارپائی ڈالنے کے بعد بھی ایک شخص کے گزرنے کی جگہ بچ رہتی تھی۔ گھر کا دروازہ بالعموم کھلا ہی رہتا تھا۔ جب اس میں سے ہوا گزر کر آتی تو بڑا مزا آتا۔ گھر کے صحن میں دھریک کا بڑا سا درخت تھا۔ پہلے تایا جان محمد یوسف کیلانی رحمہ اللہ کا گھر آتا اور اس کے بعد ہمارا گھر تھا۔ صحن مشترک تھا، پھر کسی وقت اس میں دیوار بھی بنا دی گئی۔ ہمارے گھر کے چار کمرے تھے۔ ایک بڑا کمرہ اس کے بعد ایک درمیانہ سا کمرہ جس میں اناج کے لیے بھڑولہ اور بھڑولی رکھی ہوتی تھی۔ چھوٹی بھڑولی میں چاول اور

بڑے بھڑولے میں گندم ہوتی تھی۔

اس کے ساتھ ملحق کمرے کو باورچی خانہ بنایا گیا تھا اور اس کے ساتھ کافی بڑا کمرہ تھا جس میں عموماً ہماری رہائش ہوتی تھی۔ گھر کا صحن کوئی زیادہ بڑا نہ تھا تاہم چھ سات چارپائیوں کی گنجائش ضرور تھی۔

اس زمانے میں گرمیوں کے موسم میں ہم لوگ رات کو گھروں کی چھتوں پر سوتے تھے۔ سرِ شام ہی چھت پر ساتھ ساتھ چارپائیاں بچھ جاتیں۔ چارپائیاں مونجھ کی رسیوں سے بُنی ہوئی تھیں۔ روشنی کے لیے لالٹین جلائی جاتی۔ اکثر اوقات رات کا کھانا چھت پر ہی کھاتے۔ کھانا بڑا سادہ ہوتا۔ رات کو عشاء کی نماز کے فوراً بعد سو جاتے۔ والد صاحب سونے سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی کہانیاں سناتے۔ ہمیں نماز، دعائیں اور دعائے قنوت سبقاً پڑھائی جاتیں۔ سونے سے پہلے والدین سبق سنتے۔ ایک خوف طاری ہوتا تھا کہ ابا جان نے سبق سننا ہے۔ اس لیے دن کے وقت اسے یاد کر لیتے۔ بچپن میں کہانیاں سننے کا بڑا شوق تھا۔ ہر روز کہانی سنتے اور کہانی سنتے سنتے ہی سو جاتے۔ آسمان بڑا صاف ہوتا اس پر تارے صاف نظر آتے، میں ہر رات نمایاں اور موٹے قطب تارے کو دیکھتا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ آسمان کے بالکل درمیان میں واقع ہے۔ لوگ قبلے کا رخ اس کی سمت سے درست کیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کھتیاں جو چھ یا سات ستاروں کا مجموعہ اور ترنگڑ تین ستاروں کا مجموعہ نظر آتا۔ میں ہر رات ان ستاروں کو دیکھا کرتا، اس زمانے میں تاروں بھرا آسمان بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ میں ابا جان سے ان ستاروں کے بارے میں سوالات کرتا، کبھی کبھار اپنے سوالات سے خود ہی گھبرا کر ابا جان یا اماں جان کی گود میں سر چھپا لیتا۔ وہ گلے سے لگاتے، پیار کرتے اور میں ان کی گود میں سو جاتا۔

اب تو یہ مناظر شہروں کی روشنیوں کی وجہ سے مفقود ہو چکے ہیں۔ ہاں البتہ جب کبھی مجھے صحراء میں جانے کا اتفاق ہو تو رات کے وقت اب بھی ستاروں بھری رات بہت خوبصورت لگتی ہے۔

والد گرامی کے بارے میں

میرے والد صاحب محمد یونس کیلانی رحمہ اللہ درمیانے درجے کے کاتب تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں والد صاحب کو رات کے وقت کم ہی سوتے دیکھا ہے۔ عشاء کے بعد جب ہم سونے کے لیے جا رہے ہوتے تو وہ اس وقت لیمپ کی روشنی میں کتابت کر رہے ہوتے اور جب ہم اٹھتے تو اس وقت بھی وہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد لیمپ کی روشنی میں کتابت کر رہے ہوتے تھے۔ لاہور کے کشمیری بازار میں تاجران کتب کی دوکانیں تھیں۔ خاندان کے اکثر لوگ وہیں سے کتابت کا کام لیتے اور گھر آ کر اسے انجام دیتے تھے۔ اس دور میں ملک سراج الدین سب سے بڑا تاجر کتب تھا، گو کہ وہ معاملات کا زیادہ اچھا نہ تھا اور خوب چکر لگوانے کے بعد ہی پیسے دیا کرتا تھا تاہم ان کی ایک خوبی تھی کہ ان کے پاس کتابت کا کام وافر ہوتا تھا، جسے کہیں سے کام نہ ملتا اسے ملک سراج الدین، جسے عرف عام میں سراجی کہا جاتا تھا، سے تو کام مل ہی جاتا۔ خود میں نے سب سے پہلے جس کتاب کی کتابت کا کام کیا وہ ملک سراج الدین کے صاحبزادے ملک عبدالرؤف صاحب نے ہی کتابت کے لیے دی تھی۔ یہ پشتو کی ایک کتاب تھی جسے عربی رسم الخط میں لکھنے کی ذمہ داری مجھے تفویض کی گئی۔ معمولی سا معاوضہ بھی چند ایک چکر لگانے کے بعد مل گیا۔

والد محترم دو اداروں میں کام کرتے تھے۔ ایک اندرون موچی دروازہ میں حکیم فصیح الدین چغتائی تھے جو ''الحکیم'' کے نام سے ماہانہ پرچہ نکالتے تھے۔ والد محترم اس کی کتابت

کرتے تھے۔ اس زمانے میں انھیں اسّی روپے ماہوار آمدنی اس ماہنامہ سے ہو جاتی تھی۔ دوسرا ادارہ ڈاکٹر اختر حسین اعوان کا تھا۔ جس کا نام ''کتب خانہ لطف زندگی'' تھا۔ یہ ادارہ ان کے والد حکیم مظفر حسین اعوان نے بنایا تھا۔ دفتر 22 لارنس روڈ پر تھا۔ اس دفتر کے مینیجر رضوی صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب بہت سی طبی کتابوں کے مؤلف تھے۔ ان کی تمام کتب کی کتابت والد محترم ہی کیا کرتے تھے۔

تایازاد بھائی بہنوں کے بارے میں

جیسا کہ پہلے میں بیان کر چکا ہوں، ہماری کوئی حقیقی بہن نہیں ہے۔ ہمارے تایا جان محمد یوسف کے پانچ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑے برادرم محمد داود صاحب تھے۔ بڑے خوبرو اور قد کاٹھ والے نوجوان تھے۔ بڑے طرح دار اور رعب داب والے تھے۔ میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا وہ بندوق گلے میں ڈالے شکار کرنے جایا کرتے تھے۔ گفتگو کرتے تو مخاطب ان کی وجاہت سے خوب متاثر ہوتا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ داود صاحب کے ہوتے ہوئے بات کرے۔ گھر کے سامنے دارہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے، کچھ ریاضت بھی کرتے، غالبًا کبڈی بھی کھیلتے تھے۔ ہم ان سے ڈرتے بھی تھے اور ہم جولیوں کو ان کا نام لے کر ڈراتے بھی تھے کہ دیکھو! ہم ان کے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے! عین عالم جوانی ہی میں شوگر کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے رب کے پاس چلے گئے۔

ان کے چھوٹے بھائی برادرم محمود الحسن الحمدللہ بقید حیات ہیں۔ گوجرانوالہ میں مقیم ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔ ان کی اولاد بڑی ذہین اور لائق ہے۔ خصوصاً عمر ماشاء اللہ بہت اعلیٰ مقرر اور خطیب ہے۔ اہل حدیث یوتھ فورس کا ذمہ دار بھی ہے۔ تیسرے بھائی

مسعود احمد کیلانی اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔ بڑے سمجھدار اور معاملہ فہم تھے۔ برادری کے معاملات ہوں یا عام لوگوں کے مسائل ......وہ حقیقی معنوں میں سوشل ورکر تھے۔ کتابت کا کام تو ہماری برادری کے سبھی لوگ کرتے ہیں۔

ان کے بعد برادرم محمد یعقوب صاحب ہیں جو عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال بڑے ہوں گے۔ اعلیٰ درجے کے خوشنویس ہیں۔ ایک زمانے میں کتابت کے میدان میں ان کا طوطی بولتا تھا، ان کے کتنے ہی شاگرد تھے۔ ان کی ''بیٹھک کاتیاں'' بڑی مشہور تھی۔ چونکہ اب کتابت کا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے انھوں نے دارالسلام فری ڈسپنسری کا نظام سنبھال لیا ہے۔ یہ ڈسپنسری میں نے کئی سال پہلے بنائی تھی، اس کا ذکر آگے آئے گا۔ بڑے اچھے منتظم ہیں۔

ان کے چھوٹے بھائی فاروق احمد ہیں۔ یہ مجھ سے کوئی سال بھر چھوٹے ہوں گے۔ نوعمری میں ہی کراچی چلے گئے تھے۔ وہاں ساری زندگی ایک اخبار میں کام کرتے ہوئے گزار دی۔

ہمارے تایا جان کی چھ بیٹیاں، آپا جی کلثوم، آپا جی تسنیم، آپا جی بلقیس، آپا جی عزیز، آپا جی امۃ الحفیظ اور عذرا بہن ہیں۔ ان میں سوائے آپا جی عزیز اور عذرا بہن کے چار بہنیں اللہ کے پاس چلی گئی ہیں۔ عذرا باجی کے علاوہ باقی بہنیں مجھ سے بڑی تھیں۔ مجھے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ ان چھ بہنوں نے ہمیں سگی بہنوں والا پیار دیا۔ ہم بھی ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ بچپن میں ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ان بہنوں میں آپا جی امۃ الحفیظ عین جوانی میں اپنے اللہ کے پاس چلی گئیں۔ بڑی خوبصورت اور محبت کرنے والی تھیں۔ مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑی ہوں گی۔ جب بھی

ان کی یاد آتی ہے، دل سے آہ نکلتی ہے۔ ماشاء اللہ صاحب اولاد تھیں۔ ان کا بیٹا یا بیٹیاں ملتی ہیں تو ان کی والدہ خوب یاد آتی ہیں۔

ہماری ان بہنوں اور بھائیوں نے ہمیں خوب پیار دیا۔ ایک ہی گھر میں رہنے کی بدولت ان کا ہمارے ساتھ حسن سلوک اور پیار مثالی تھا۔ والدہ صاحبہ نہایت خوش اخلاق تھیں۔ وہ ہمارے خاندان کی نہ تھیں، مگر انھوں نے خاندان کی خدمت کر کے اس میں ایک مقام بنالیا تھا۔ وہ کھانے بڑے مزیدار پکاتی تھیں۔ کسی کے گھر میں کوئی رشتہ دار آتا تو وہ مدد کے لیے والدہ صاحبہ کو بلا لیتے، والدہ صاحبہ بڑی خوش دلی سے ان کے لیے کھانا پکا دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ایک ہی دیگچی میں بیک وقت میٹھے اور نمکین چاول پکاتی تھیں۔ میں کئی مرتبہ ان سے پوچھتا: امی جان! آپ یہ کیسے پکا لیتی ہیں؟ وہ مجھے یہ کہہ کر خاموش کروا دیتیں کہ تمھارا ان باتوں سے کیا تعلق؟!

بچپن کے دوستوں میں جناب محمد یعقوب کیلانی، محمد فاروق کیلانی، عبدالرؤف کیلانی صاحب، جناب خالد محمود کیلانی، ریاض کیلانی صاحب، عبدالوکیل کیلانی، نوید احمد سپرا، نجیب الرحمٰن کیلانی حفظہ اللہ، محمد آصف سپرا صاحب اور چچا عنایت اللہ شامل ہیں۔ گاؤں میں چونکہ گھر قریب قریب تھے اس لیے محلے کے بچوں کے ساتھ اکٹھے ہی کھیلتے اور پڑھتے تھے۔ عموماً رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات بڑے اچھے تھے۔ کوئی مہمان آجاتا تو رات گئے تک سب لوگ کسی ایک کے گھر اکٹھے ہو جاتے۔ آپس میں تبادلہ خیال ہوتا، برادری کے مسائل پر گفتگو ہوتی، بعض احباب لطیفے اور نظمیں سناتے، محترم چچا جان عبدالغفار اور محترم تایا جان محمد یوسف کیلانی مل کر نعتیں اور نظمیں پڑھتے۔ ان مجالس میں شریک ہو کر بہت مزا آتا۔ بعض اوقات مجلس میں ایک عورت یا چند عورتیں بھی بیٹھی ہوتی تھیں، بچپن میں اس قسم

کی محفلوں کا بڑا انتظار رہتا۔

میرے والد محترم کوئی زیادہ مالدار تو نہ تھے، مگر بہت زیادہ غریب بھی نہ تھے۔ انھیں ان کے دوست احباب سیٹھ محمد یونس کے نام سے پکارتے تھے۔ ہمارے دادا جان جناب غلام مصطفیٰ صاحب بڑے پکے اہلحدیث تھے۔ وہ عقیدۂ توحید میں بہت پختہ تھے۔ یہ جاننے کے لیے کہ ان کا عقیدہ کیسا تھا، اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کی بہت با اثر شخصیت پیر سید نور الحسن شاہ پہلے شیعہ تھے۔ کچھ غور وفکر کیا تو شیعہ مذہب کا باطل ہونا ان پر واضح ہو گیا۔ شیعوں کو چھوڑا تو بریلوی ہو گئے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ کسی زمانے میں دادا جان سے اپنی کتابت کی اصلاح کروایا کرتے تھے۔ دادا جان کو ان کے شیعہ سے بریلوی ہونے کا علم ہوا تو بے ساختہ فرمایا: نور الحسن شاہ ایک کنویں سے نکل کر دوسرے کنویں میں گر گیا ہے۔

ہمارے تایا جان جناب محمد یوسف بھی کسی زمانے میں بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، بلکہ گاؤں کی مغربی جانب وریاؤں کی مسجد میں امامت بھی کرواتے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، مگر میں ان سے مسلک کے بارے میں بہت بحث وتمحیص بھی کیا کرتا تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ پکے اہل حدیث بن گئے۔ انھوں نے ''الوضاحت'' نامی کتاب بھی تالیف فرمائی جو عقیدہ توحید کی حقانیت ثابت کرنے کے باب میں ایک عمدہ کوشش تھی۔

ہمارے گھر کے بائیں جانب کوئی پچاس گز کے فاصلے پر اللہ دتہ تانگے والے کا گھر تھا۔ یہاں سے دائیں طرف کھیت تھا، کوئی سو گز چلنے کے بعد الٹے ہاتھ جامع مسجد اہلحدیث تھی۔ اس کی امامت اور خطابت محترم مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ کے سپرد تھی۔

انھوں نے نہایت حکمت اور محبت بھرے انداز میں پچاس سال سے زائد عرصہ تک اس مسجد میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیا۔ یہ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ اور مولانا عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا لہجہ بڑا میٹھا اور انداز گفتگو بہت دل آویز تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و حکمت کی وافر مقدار سے نواز رکھا تھا۔ فجر کی نماز پڑھانے کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ جاتے۔ گاؤں کے بہت سے نوجوان اور بچے ان سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرتے۔ تقریر پنجابی زبان میں کرتے تھے۔ جب تسلسل سے واقعات بیان کرتے تو سماں باندھ دیتے۔ یوں محسوس ہوتا کہ ہم چشم تصور سے اس واقعہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس وقت گاؤں کے لوگوں کی اکثریت بریلوی مسلک سے تعلق رکھتی تھی۔ اہلحدیث بہت تھوڑے تھے، مگر انھوں نے جس حکمت اور تحمل سے کیلیانوالہ میں دعوت کا کام کیا اور جس طرح اخلاص و محبت سے عقیدہ توحید کو پھیلایا اس کا اجر و ثواب یقیناً ان کو اللہ رب العزت سے مل چکا ہوگا۔ الحمد للہ! اب کیلیانوالہ کے آدھے یا اس سے زیادہ لوگ اہل حدیث ہو چکے ہیں۔ یہ ساری محنت چچا جان محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی جہود طیبہ کو ان کی میزان حسنات میں شامل فرمائے۔

میرے بچپن میں ہماری اس اکلوتی اہلحدیث مسجد میں رفع الیدین اور آمین بالجہر کی سنت پر بوجوہ عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ شاید کسی مصلحت یا حکمت کے تحت ایسا کیا جا رہا تھا کہ اچانک ایک واقعہ پیش آنے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ ہوا یوں کہ میرے والد گرامی وزیر آباد کے قریب منصور والی میں ایک جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کے ہمراہ ان کے بعض شاگرد بھی تھے۔ جلسہ میں کراچی سے تشریف لائے ہوئے مولانا عبدالوہاب سلفی دہلوی کی تقریر تھی۔ میری عمر اس وقت تین

چار سال ہی ہوگی۔ مولانا عبدالوہاب اس وقت اپنے حلقہ اثر میں آجانے والوں سے بیعت بھی لیتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان میں کتاب وسنت کی دعوتی تحریک کو عام کرنے میں ان کے خاندان کی بے شمار خدمات ہیں۔ والد محترم نے بھی اپنے شاگردوں کے ہمراہ ان کی بیعت کرلی۔ جب واپس تشریف لائے تو رفع الیدین اور آمین بالجہر کا تحفہ بھی ساتھ لائے۔ اس زمانے میں جو کوئی رکوع جاتے یا اٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھاتا اسے ''وہابی'' کہا جاتا تھا۔ جب مسجد میں انھوں نے آمین بالجہر اور رفع الیدین کی سنتوں پر عمل کیا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔

مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ صرف اہلحدیث ہی نہ تھے بلکہ وہ اس مسلک کے حد درجہ شیدائی اور کامیاب داعی بھی تھے۔ چونکہ برصغیر میں اس وقت تک اہلحدیث بہت تھوڑے تھے اور شاید اسی مصلحت کے پیش نظر اس وقت تک اس موضوع کو انھوں نے نہیں چھیڑا تھا۔ وہ کسی مناسب وقت کے انتظار میں تھے۔ اس وقت والد محترم نوجوان تھے۔ بڑے خوبصورت تھے، کسرتی جسم، گورا چٹا رنگ، نفیس لباس پہنتے، کیا مجال جو کپڑے پہ داغ لگ جائے۔ سر پر کُلّے دار پگڑی باندھتے تھے۔ جوانی کا جوش وجذبہ اور عزم صمیم بھی عجب چیز ہے۔ گاؤں میں ایک بحث چھڑ گئی۔ والد صاحب بھی تحفظ سنت نبوی کے مشن پر ڈٹ گئے۔ جب بھی کوئی اس موضوع پر بات کرتا وہ صحیح احادیث کا حوالہ دیتے، جس کے بعد مخاطب میں مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ رہتی، مگر برس ہا برس کے فقہی جمود کے باعث اس کا پرنالہ وہیں پر رہتا۔ چند دنوں کی بحث کے بعد والد صاحب نے ڈالا نوالہ کے کھوہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی۔ یہ مسجد کیا تھی بس مٹی کا ایک تھڑا تھا جس پر دس پندرہ افراد کے نماز پڑھنے کی جگہ تھی۔ والد محترم مجھے اور بھائی جان ایوب کو بھی ہمراہ لے جاتے، ان کے

چند شاگرد بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ یہ الگ نماز پڑھنے کا سلسلہ تھوڑے ہی دن چلا، بالآخر ان کی استقامت اور سنت سے محبت نے مصلحتوں کو پاش پاش کر دیا اور گاؤں کی مسجد اہلحدیث میں آمین بالجہر اور رفع الیدین کی سنت پر عمل شروع ہو گیا۔ احیائے سنت کی اطلاع ملتے ہی اباجان بھی مسجد میں واپس آ گئے اور بحث کا خاتمہ ہو گیا۔

والد صاحب ابراہیم کاسبی کی حویلی میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ ہمارے گھر کی دائیں جانب دو گھر چھوڑ کر تیسرا گھر یہ حویلی تھی جس میں والد صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک تین فٹ اونچا مٹی کا تھڑا ہوتا تھا۔ والد صاحب وہیں بیٹھ کر کتابت کیا کرتے تھے۔

کیلیانوالہ میں پرائمری سکول موجود تھا۔ گاؤں کے شمال مشرق میں یہ ایک کچا سکول تھا۔ میں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اس وقت یہ کچا سکول ہمارے گھر کے پیچھے واقع پکے سکول میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس میں غالباً تین بڑے کمرے تھے۔ سامنے وسیع گراؤنڈ تھا۔ ایک جانب پانی کا نلکا (ہینڈ پمپ) لگا ہوا تھا، لیکن یہ سکول چاردیواری سے محروم تھا۔ محترم ماسٹر عطا محمد صاحب اس سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ماسٹر الف دین صاحب چھوٹی کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا کوئی اسکول نہ تھا۔ والدہ محترمہ کوئی زیادہ پڑھی لکھی تو نہ تھیں، مگر قرآن کریم پڑھتی اور پڑھاتی تھیں۔ مجھے بچپن میں پڑھنے کا بڑا شوق تھا، گھر کی چھت پر چڑھ جاتا تو دور سکول میں لڑکے جب ا، ب، ت، اور ص، ض کا رٹا لگا رہے ہوتے تو میں بھی ان کے ہمراہ یہ الفاظ دہراتا۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے والد صاحب مجھے لے کر سکول میں داخلہ کروانے گئے تو ماسٹر عطا محمد صاحب نے کہا: بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے، اسے ابھی لے جائیں۔ جب انھوں نے میرا ٹیسٹ لیا تو میں نے

فر فر الف، ب، ت اور گنتی سنا دی۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد انھوں نے مجھے سکول میں داخل کر ہی لیا۔

چند ہفتوں کے بعد والد صاحب نے ان سے میری پراگرس پوچھی تو ان کا کہنا تھا: ''اگر یہ لڑکا پڑھتا رہا تو اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا۔'' ہمارے کچی پکی کے ٹیچر ماسٹر الف دین انڈیا سے حال ہی میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ وہ حقہ پیتے، کھانستے، لڑکوں کو پڑھاتے اور سبق نہ آنے یا غلطی کرنے پر خوب مارا کرتے تھے۔ ہمیں ان سے بڑا ڈر لگتا تھا، کئی لڑکے ان کی مار کے ڈر سے بھاگ گئے۔ کئی دن تک میں بھی ان سے خوف زدہ رہا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ شریر بچوں کو لانگڑی دے کر قابو کر لیتے اور خوب مارتے۔ بچے روتے تھے، ہم خوف کے عالم میں ان کا تماشہ دیکھتے۔ وہ شرارتیں نہ کرنے کا عہد کرتے، مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی اپنا وعدہ بھول جاتے۔

میں بلا شبہ کلاس کے نمایاں لڑکوں میں سے تھا۔ میرے والد صاحب چونکہ خوش نویس تھے اس لیے قدرتی طور پر میری ہینڈ رائٹنگ دوسرے لڑکوں کی نسبت بہتر تھی۔ والدہ صاحبہ گھر میں پڑھاتی تھیں اس لیے میں نے بہت کم اپنے اساتذہ سے مار کھائی۔ یوں بھی عرف عام میں ایک شریف بچہ تھا۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر محترم عطا محمد نہایت نفیس آدمی تھے۔ سکول سے چھٹی ہونے کے بعد بھی وہ لڑکوں کو پڑھاتے رہتے۔ اس وقت اساتذہ میں اخلاص پایا جاتا تھا۔ ٹیوشن کا کوئی تصور نہ تھا۔ اساتذہ محبت اور محنت سے پڑھاتے تو طلبہ بھی دل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کیا کرتے تھے۔

انھی دنوں ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا سکول بھی کھل گیا۔ سکول کے قیام کا سرکاری آرڈر تو جاری ہو گیا، مگر اس کے لیے عمارت میسر نہ تھی۔ اس کام کے لیے محترم چچا محمد

ادریس کیلانی نے اپنے گھر کا صحن اور کمرے پیش کر دیے۔ سکول کی واحد لیڈی ٹیچر محترمہ سکینہ صاحبہ تھیں جو حافظ آباد کے نواحی گاؤں ''پیرے دا کوٹ'' کی رہنے والی تھیں۔ ان کو رہائش کے لیے ہمارے گھر میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ والدہ صاحبہ کو بھی پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ دونوں خواتین میں بہت دوستی ہو گئی۔ اس کا صلہ انھوں نے یہ دیا کہ مجھے پڑھانا شروع کر دیا۔ چند مہینے وہ ہمارے گھر میں رہیں، پھر محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی کے چوبارے پر منتقل ہو گئیں۔ میں وہیں ان کے پاس پڑھنے کے لیے جانے لگا، میں ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا تھا۔ انھوں نے خوب شفقت اور محنت سے پڑھایا۔ بعد ازاں میں نے بہت کوشش کی کہ ان سے ملاقات کر سکوں، مگر ناکام رہا۔ ایک دن ایک شخص میرے پاس دارالسلام میں ملازمت کی تلاش میں آیا۔ میں نے اس سے پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا: میں حافظ آباد کے قریبی گاؤں ''پیرے دا کوٹ'' کا رہائشی ہوں۔ مجھے اپنی قابل قدر معلّمہ یاد آ گئیں۔ اپنی محسن معلّمہ کے احسان کا بدلہ میں نے اس طرح دینے کی کوشش کی کہ ان کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے اس آدمی کو فوری طور پر ملازمت فراہم کر دی۔ اس کی معرفت میں نے محترمہ سکینہ کے بارے میں پتہ کروایا تو اس نے پوری تحقیق کے بعد بتلایا کہ وہ وفات پا چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بوجوہ ان کی شادی نہ ہو سکی تھی یا ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ بہر حال آج بھی ان کا مشفقانہ چہرہ اور رویہ مجھے یاد ہے۔ ان کی رحلت کی خبر سن کر مجھے دھچکا سا لگا کیونکہ وہ میرے نزدیک والدہ ہی کی طرح تھیں۔ آج بھی وہ چوبارہ، ان کا کمرہ، ان کی سلیقے سے رکھی ہوئی اشیاء، تا حد نگاہ کھیت اور ان کی ہریالی نگاہوں کے سامنے ہے۔

حافظ آباد منتقلی

یہ 1962ء کی بات ہے والد صاحب نے حافظ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا، مہینوں پہلے گھر میں بحث چلتی رہی۔ میں نے تیسری جماعت پاس کی ہی تھی کہ ہم نے اپنے گھر کا سامان ایک بیل گاڑی پر رکھوایا اور حافظ آباد کے محلّہ بہاولپور منتقل ہو گئے۔ ابا جان نے 10 مرلہ کا ایک قطعہ زمین خرید رکھا تھا، جس میں تین کمرے بنائے گئے۔ احاطہ کے دوسرے کونے میں بیٹھک اور اس کے ساتھ ڈیوڑھی تھی۔ کمرے باہر سے پکے اور اندر سے کچے تھے۔ سبب یہ بتایا گیا کہ ایسے مکان گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم رہتے ہیں۔ یہ گھر ہمارے پہلے گھر کے مقابلے میں خاصا کھلا تھا، جس کے صحن میں مدت دراز تک میں اپنے بھائی کی سائیکل چلاتا رہا۔ حافظ آباد کوئی بڑا شہر نہ تھا، پھر بھی اگر میں اس کے بارے میں لکھنا شروع کر دوں تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا۔ یہ شہر بنیادی طور پر چاول کی منڈی ہے۔ یہاں غلے کی دو بڑی منڈیاں ہیں۔ یہاں کا باسمتی چاول ایک خاص قسم کی خوشبو رکھتا ہے۔ شہر کے وسط سے ریلوے لائن گزرتی ہے، جس نے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ ہمارا محلّہ غریبوں اور جفاکشوں کا محلّہ تھا۔

حافظ آباد کے محلّہ بہاولپور میں جہاں ہم نے گھر بنایا، اس کے ساتھ پرانا بھٹہ اور

محصول چونگی تھی۔ایک مدت تک ہمارے گھر کا ایڈریس پرانا بھٹہ کے نام سے چلتا رہا۔ ہمارے گھر کے سامنے تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کا بھٹہ نظر آتا تھا جو میاں فضل حق مرحوم کی ملکیت تھا۔ میاں صاحب آگے چل کر مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے ناظم اعلیٰ بنے، مگر ان دنوں بھی شہر میں ان کا کافی نام تھا۔شہر میں اہلحدیثوں کی متعدد مساجد تھیں۔ ہمارے گھر کے قریب گڑھی اعوان کا محلّہ گزر کر سرکاری پڑاؤ آتا تھا۔ اس وسیع وعریض میدان کے مغربی کنارے پر مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی کی خوبصورت اور بڑی مسجد تھی۔ والد صاحب قیام حافظ آباد کے دوران اکثر وبیشتر جمعہ کی نماز وہیں ادا کرتے تھے۔ مولانا یحییٰ مرحوم پنجابی میں بڑی خوبصورت تقریر کرتے تھے۔ انداز خطابت بہت عمدہ اور دل نشین تھا۔ اصلاح معاشرہ بالعموم خطاب کا موضوع ہوتا۔ ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ہمارے محلّہ میں اہلحدیثوں کی کوئی مسجد نہ تھی۔ محلّہ خاصا بڑا تھا، جس میں شاید دو چار گھرانے اہلحدیث بھی رہے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیوبندی حضرات کی مسجد میں ہی نماز ادا کرتے تھے۔ ہمارے امام مسجد کا نام مولوی کرم الٰہی تھا، بھلے سے شریف النفس انسان تھے، قد چھوٹا تھا، انھیں چند سورتیں یاد تھیں، نماز میں مختصر سی تلاوت کرتے تھے۔ مسجد چونکہ دور تھی اس لیے والد صاحب بعض اوقات ہم تینوں بھائیوں کو پیچھے کھڑا کر کے گھر پر ہی جماعت کروا لیتے تھے۔

ہماری کوئی ہمشیرہ نہ تھی اس لیے لڑکوں کا ہمارے گھر میں پڑھنے کے لیے آنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہمارے ہمسائے میں ماسٹر محمد سلیمان ہاشمی صاحب کا گھر تھا، جو ایم بی ہائی اسکول نمبر 1

میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ زمانہ بھلا تھا، ایک دوسرے کے ہاں ہر وقت آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جونہی کوئی اچھی چیز ہمارے گھر میں یا ان کے گھر میں تیار کی جاتی تو فوری طور پر اس کا آپس میں تبادلہ ہوتا تھا۔ ان کی اہلیہ خالہ غفور صاحبہ بڑی اچھی خاتون تھیں، پڑھی لکھی تو نہ تھیں مگر خاصی مدبر اور سمجھ دار تھیں۔

میں نے چوتھی جماعت گورنمنٹ پرائمری اسکول برانچ نمبر 5 میں پڑھی، والد صاحب کا حافظ آباد میں دل نہ لگ سکا، کہاں دیہات کا کھلا ماحول اور کہاں شہری زندگی کی پابندیاں، 1965ء میں جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ہندوستان کے ساتھ جنگ کی وجہ سے تقریباً سبھی لوگوں کے کاروباری حالات خاصے متاثر ہوئے۔ کتابت کا کام بند ہو گیا، ہم ایک مرتبہ پھر کیلیانوالہ چلے گئے، پانچویں کا امتحان میں نے وہیں جا کر پاس کیا تھا۔ چند ماہ کے بعد ہم پھر واپس حافظ آباد آ گئے اور میں چھٹی جماعت میں داخل ہو گیا۔ ہمارے اسکول کا نام ایم بی ہائی اسکول نمبر 1 تھا جو ریلوے اسٹیشن کے عقب میں واقع تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا نام محمد نذیر فاروقی تھا، جو بڑے اونچے قد کے خوبصورت جوان تھے۔ مجھے ان کے پاس پڑھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا تاہم سکول کی اسمبلی میں کی جانے والی ان کی تقاریر اب بھی یاد ہیں۔ وہ بڑے عمدہ منتظم، اعلیٰ کردار کے حامل اور نہایت پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے بھائی محمد ایوب صاحب مجھ سے دو تین کلاس آگے تھے، اس زمانے میں فیس غالباً ایک روپیہ چار آنے ماہوار ہوا کرتی تھی۔ اگر دو بھائی ایک ہی سکول میں زیر تعلیم ہوتے تو دوسرے بھائی کی آدھی فیس معاف ہو جاتی تھی، چنانچہ میں ساری تعلیم کے دوران ہمیشہ آدھی فیس ہی دیتا رہا، جبکہ میری بڑی خواہش ہوتی تھی کہ میں بھی پوری فیس ادا کروں۔

میں اپنے بارے میں اگر یہ کہوں کہ میں بہت نمایاں اور لائق طالب علم تھا تو شاید خودنمائی ہوگی، مگر یہ ضرور تھا کہ میں نالائق قطعاً نہ تھا۔ میں کلاس مانیٹر تو نہ رہا کہ اس کے لیے اونچا لمبا قد اور آسودہ گھرانے سے تعلق ضروری تھا تاہم میں گروپ مانیٹر عموماً بنتا رہا۔ محلے میں میرے بارے میں مشہور تھا کہ یہ لائق لڑکا ہے، چنانچہ میری کلاس کے لڑکے ہمارے گھر پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ ہماری کوئی ہمشیرہ نہ تھی اس لیے لڑکوں کا ہمارے گھر میں پڑھنے کے لیے آنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے تقاریر سننے کا بڑا شوق رہا ہے۔ چوتھی جماعت میں جانے تک قرآن کریم ناظرہ میں نے پڑھ لیا تھا، جس کا بیشتر حصہ والدہ صاحبہ نے پڑھایا۔ اس زمانے میں ہمارے ماحول میں تجوید کا کوئی خاص رواج نہ تھا، بس سادہ قرآن کریم ہی بچوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ چوتھی جماعت میں جب داخل ہوا تو والد محترم نے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا۔ مولانا شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے لفظی تراجم ان کے سامنے ہوتے۔ والد صاحب بڑی محبت سے لفظی ترجمہ پڑھاتے پھر اس کی مختصر تشریح کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد قرآن کریم پڑھنا ضروری تھا۔ اس میں معافی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ والد صاحب کی کوشش ہوتی کہ ہمیں ساتھ لے کر مسجد جائیں، لیکن اگر کبھی وقت کم ہوتا اور وہ ہمیں ساتھ نہ لے جاسکتے تو نماز سے آکر ہمیں پڑھایا کرتے۔ والدہ صاحبہ ان کے آنے تک ہمیں جگا کر نماز پڑھوا دیتیں۔ قرآن کا سبق نہ پڑھنا ناشتے سے محرومی کا باعث بن جاتا تھا۔ والدہ صاحبہ ناشتہ دینے سے پہلے والد صاحب سے پوچھتیں: ذرا بتائیے، کیا عبدالمالک نے سبق پڑھ لیا ہے؟ اگر ابا جان کا جواب ہاں میں ہوتا تو ناشتہ مل جاتا ورنہ حکم ہوتا: بھوکے اسکول جاؤ۔ الحمدللہ! ایسا کم ہی ہوا کہ مجھے بھوکے اسکول جانا پڑا ہو۔ والد صاحب قرآن کریم کا ترجمہ

پڑھاتے تو تشریح کے ساتھ ساتھ قرآنی واقعات اور قصے بھی بیان کرتے۔ مجھے سوال وجواب کا بڑا شوق تھا، والد صاحب پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں، وہ بڑی محبت اور تفصیل سے میرے سوالات کا جواب دیا کرتے۔ میں نے بہت سا بنیادی دینی علم والد صاحب سے سوالات کے ذریعے ہی حاصل کیا۔ اس زمانے میں جو بھی خاص جلسہ ہوتا والد صاحب خود بھی سننے جاتے اور ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔ خود مجھے بھی جلسوں کا بڑا شوق تھا، میں عموماً اسٹیج کے قریب بیٹھ کر علماء کی تقاریر سنتا، ان میں کئی تقاریر کے اقتباسات مجھے اب بھی یاد ہیں۔

اسکول میں میرے ہم جماعت اکثر بریلوی تھے، میں شاید واحد لڑکا تھا جو اہلحدیث تھا، جو اپنے ساتھیوں میں نمایاں تھا اور مختلف دینی مسائل اور عقائد پر بحث کرتا تھا۔ مجھے بریلوی اور اہلحدیث کے درمیان بنیادی اختلافات کے بارے میں خوب معلوم تھا، میں اپنے کلاس فیلوز سے خوب بحث کرتا۔ ان میں ایک قدرے مولوی تھا، میں اس کو نور بشر، حاضر ناظر اور علم غیب وغیرہ پر کتاب وسنت سے دلائل دیتا اور دلائل دے دے کر اسے زچ کر دیتا، مگر جب وہ نہ مانتا تو جوتا ہاتھ میں لے کر اس کے پیچھے بھاگتا وہ آگے آگے ہوتا اور میں پیچھے پیچھے، اسکول کے میدان کا چکر لگاتے، تھوڑی دیر بعد صلح ہو جاتی، اگلے دن پھر وہی دلائل کا تبادلہ اور وہی بحث وتمحیص ہو رہی ہوتی۔

اسکول میں بزم ادب کے تحت تقاریر میں بھی حصہ لیتا اور خوب مزا آتا۔ گھر میں والدین کی محبت بہت زیادہ تھی، والد صاحب مجھ پر خصوصی توجہ دیتے، عموماً کاروباری یا دیگر خطوط مجھی سے لکھوایا کرتے، وہ املا کرواتے جاتے، جب مشکل لفظ ہوتا تو اس کے ہجے بتا دیتے، اس طرح میں نے سکول میں داخل ہونے سے پہلے ان سے اردو سیکھی۔ چار

مضامین ایسے تھے جن کو میں گھر کے مضامین کہا کرتا تھا۔ اردو، معاشرتی علوم (تاریخ، جغرافیہ وشہریت) اسلامیات اور فارسی یا عربی۔ میرے نزدیک ان مضامین میں فیل ہونا ناممکن سی بات تھی۔ ان کی تیاری بھی کم ہی کرتے تھے، پھر بھی نمایاں نمبروں میں پاس ہوجاتے تھے کہ یہ مضامین تو دینی گھریلو ماحول کے باعث میرے لیے بہت آسان تھے۔ مجھے یاد ہے جب نیا تعلیمی سال شروع ہوتا اور نئی کتابیں ملتیں تو میں دو دنوں میں اردو کی کتاب ختم کرلیتا، اس کی نظمیں لہک لہک کر پڑھتا، والدین کو سناتا اور ان سے شاباش ملتی۔ خوشخطی مجھے والد محترم سے ورثے میں ملی تھی، ہمارے اسکول کے ایک استاذ عظیم صاحب نے لڑکوں کو دکھاتے ہوئے کہا: دیکھو! عبدالمالک نے مجھے رشوت دی ہے، دراصل یہ میری خوبصورت لکھائی تھی جس پر انھوں نے مجھے اچھے نمبر بھی دیے اور میری حوصلہ افزائی بھی کی۔

> وہ نہ مانتا تو جوتا ہاتھ میں لیے اسکے پیچھے بھاگتا، اسکول کا چکر لگاتے اور تھوڑی دیر بعد صلح ہوجاتی۔

ایک مرتبہ ہم دوست بیٹھے ہوئے گپ شپ لگا رہے تھے کہ ایک آواز آئی: یار! ہر کوئی اپنے نام کے ساتھ ایک تخلص بھی لگاتا ہے ہمارے ناموں کے ساتھ بھی تخلص کا اضافہ ہونا چاہیے۔ غالبًا یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ کسی نے کہا: میرا تخلص آزاد، کسی نے کہا: حزین، میں نے کہا: میرا تخلص مجاہد ہوگا، چنانچہ اس دن سے میں نے نام کے ساتھ مجاہد لکھنا شروع کردیا تاہم میرے تمام تعلیمی سرٹیفکیٹ بغیر کسی تخلص کے ہی ہیں۔ میں نے میٹرک تک تعلیم حافظ آباد کے اسی اسکول سے مکمل کی۔

میں نے میٹرک 1970-1971ء میں حافظ آباد سے کیا۔ بعدازاں جلال پور روڈ پر مسجد مبارک میں قائم دارالحدیث محمدیہ میں داخلہ لے لیا۔ مدرسہ میں اکلوتا طالب علم تھا جس نے میٹرک کیا ہوا تھا۔ میں نے دینی تعلیم دارالحدیث محمدیہ سے حاصل کی ہے۔ بعد میں تعلیم کے مواقع ملتے رہے جواب تک جاری ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں مدرسہ کا سب سے ذہین بچہ تھا، مگر کوئی ایسا غبی بھی نہیں تھا۔ لیڈری میرے رگ وپے میں داخل تھی۔ اساتذہ محبت کرتے تھے اور بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ میں اساتذہ سے خوب بحث کرتا۔ ان سے بہت زیادہ سوال کرتا، وہ بڑی محبت سے جواب دیتے۔ رات کو میں اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کے قدم دباتا اور ان سے سوالات کرتا، مجھے سوال کرنے میں اس وقت بھی اور آج بھی بڑا مزا آتا ہے۔ میں نے اپنے علم کا اکثر حصہ اساتذہ سے سوال و جواب کی صورت میں سیکھا ہے۔ مجھے اب بھی جس بات کا علم نہ ہو یا جس لفظ کا معنی نہ آتا ہو پوچھنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔ میرے اساتذہ میں حافظ محمد اسماعیل صاحب، مولانا رفیق صاحب اور مولانا حسین شاہ صاحب شامل ہیں۔ کلاس فیلوز میں قاری جاوید انور صدیقی صاحب نمایاں تھے۔ علماء سے مجھے اس دور میں بھی اور آج بھی شدید محبت ہے اور میں ان کے ساتھ عزت واحترام سے پیش آتا ہوں۔

زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ وابستگی رہی، میں اس کا پرجوش اور معروف کارکن یا رہنما تو نہ تھا بہرحال پروگراموں میں باقاعدگی کے ساتھ شرکت کرتا رہتا۔ میں نے کم ازکم تین سے چار مرتبہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات بھی کی ہے۔ مولانا کی مشہور تفسیر ''تفہیم القرآن'' کی مکمل کتابت میرے سگے تایا جان محمد یوسف کیلانی رحمہ اللہ اور چچازاد بھائی محمد داود کیلانی نے کی ہے، ہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے، اس

لیے مولانا مودودی رحمہ اللہ کا نام بچپن ہی سے سنتے رہے۔ ان کی شخصیت کا ایک باوقار نقش میرے ذہن میں موجود تھا۔ بڑے لوگوں سے ملنے کی خواہش تو مجھے ہر دم رہتی تھی، مگر دیہات کا رہنے والا ایک نوجوان جسے کوئی خاص رہنمائی بھی حاصل نہ ہو اور جس کی مالی حالت بھی اچھی نہ ہو وہ بڑے بڑے رہنماؤں سے کیسے مل سکتا ہے؟! میں نے ایک دن تایا جان سے کہا: میں لاہور جا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ مولانا مودودی سے ملاقات کروں، آپ مجھے تعارفی خط لکھ دیں، کہنے لگے: خط کی ضرورت نہیں، تم اچھرہ مولانا کی رہائش گاہ پر چلے جانا اور مولانا سے کہہ دینا: میں آپ کے کاتب محمد یوسف کا بھتیجا ہوں، وہ خود ہی پہچان جائیں گے۔

یہ 1972ء کی بات ہوگی، ایک دن میں مولانا سے ملنے کے لیے اچھرہ پہنچ گیا، غالبًا صبح کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا، ایک چوکیدار کھڑا تھا، میں نے اسے بتایا: میں مولانا مودودی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، کہنے لگا: وہ تو نہایت مصروف ہیں، اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی، آپ عصر کے بعد آجائیں۔ میں نے کہا: میں بہت دور سے آیا ہوں، عصر کے بعد دیگر بہت سی مصروفیات ہیں، میں صرف ان کو دیکھنا چاہتا ہوں، وہ انکار کرتا رہا، میرا اصرار بڑھتا رہا۔ دروازے کے قریب برآمدے میں یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ اچانک بجلی بند ہوگئی، مولانا اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ کام میں مصروف تھے، بجلی بند ہوئی تو مولانا نے دروازہ کھولا اور باہر تشریف لے آئے۔ میں آگے بڑھا اور لپک کر سلام کیا، بتایا کہ میں کیلیانوالہ سے آیا ہوں اور محمد یوسف کیلانی صاحب کا بھتیجا ہوں، مولانا نے ان کا نام سنا تو گلے لگا لیا، فرمانے لگے: پھر تو آپ میرے بھی بیٹے ہیں۔ اندر اپنی لائبریری میں لے گئے، کرسی پر بٹھایا، بجلی چونکہ بند تھی اس لیے مجھے ان کے ساتھ گفتگو

کا خاصا موقع مل گیا۔

میں ان دنوں پر جوش نوجوان تھا، بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو منظور کروانے پر تلے ہوئے تھے جبکہ اسلامی جمعیت طلبہ بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک چلا رہی تھی، میں بھی اس کا ایک کارکن تھا، نوجوان طبقہ بھٹو صاحب کے نظریات اور خیالات سے شدید اختلاف رکھتا تھا۔ انھوں نے میرا جذباتی موقف سنا اور پھر اپنی نصیحتوں سے نوازا، ان کا فرمانا تھا کہ آپ ایک اچھے خاندان سے اور اچھی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا کوئی ایسا کام مت کریں جس سے آپ پر کوئی انگلی اٹھا سکے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: میں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ کے بارے میں کہے کہ آپ فلاں جماعت سے تعلق رکھنے کے باوجود غلط کام کر رہے ہیں۔

میں نے شوکت اسلام کے جلوس میں بھی شرکت کی تھی، حافظ آباد سے جو بس گئی تھی، میں بھی اس میں سوار تھا، ہم سارے راستے میں زور زور سے نعرے لگاتے رہے۔ میری آواز قدرتی طور پر بلند ہے، اس لیے میں بڑی اونچی آواز میں نعرے لگا لیتا تھا۔ میں آج بھی میکلوڈ روڈ کی اس اونچی جگہ کو پہچانتا ہوں جہاں کھڑے ہو کر ہم نے جلوس کے شرکاء کو دیکھا تھا، مولانا مودودی اس روز ٹرک پر سوار تھے، آپ کے ساتھ نواب زادہ نصر اللہ خان، آغا شورش کاشمیری اور دیگر اکابرین ملت تھے۔ اس جلوس کے علاوہ مجھے اچھرہ میں مولانا کے گھر عصر کے بعد ہونے والی مجالس میں بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

بچپن میں مجھے والد صاحب اندرون موچی دروازہ مکتبہ تعمیر انسانیت میں بھی لے گئے تھے۔ میں غالباً چوتھی جماعت کا طالب علم تھا، والد صاحب حکیم فصیح الدین چغتائی کے ماہنامہ ''الحکیم'' کی کتابت کیا کرتے تھے۔ شیخ قمر الدین صاحب اس مکتبہ کے انچارج

تھے، خاصے بوڑھے تھے، تفہیم القرآن کو پہلی مرتبہ انھوں نے ہی شائع کیا تھا۔ اس میں قرآن کریم کی کتابت ہمارے ایک چچا عبدالغفار کیلانی مرحوم کی تھی، وہ عربی کے بہت اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے، ان کا بیٹا کوئی نہ تھا، صرف بیٹیاں ہی تھیں، میں نے اپنے ایک بیٹے کا نام عبدالغفار انھی کے نام پر رکھا ہے۔

بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو منظور کروانے پر تلے ہوئے تھے جبکہ اسلامی جمعیت طلبہ بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک چلا رہی تھی

تفہیم القرآن کی یہ کتابت لیتھو پر ہوئی تھی، اس کے اردو متن کی کتابت میرے تایا جان نے کی تھی، میرے پاس اس کی پہلی جلد ایک مدت تک رہی ہے، اس پر بطور مؤلف مولانا مودودی کے اور بطور ناشر شیخ قمرالدین کے، ان کے ہاتھ سے کیے ہوئے دستخط موجود تھے۔ شیخ قمرالدین صاحب نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے: برخوردار! قرآن پڑھتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے مجھے پاکٹ سائز چھوٹی چھوٹی سورتیں دیں، بڑی خوبصورت تھیں، کافی مدت میرے پاس رہیں۔

میرے ذہن میں اس مکتبہ کی تصویر اب بھی موجود ہے، مجھے گنپت روڈ پر مٹھائی کی وہ دوکان بھی یاد ہے جہاں سے اس سفر میں والد صاحب نے مجھے ''میسو'' لے کر دیے تھے۔ مجھے حلوائی کی دوکان پر بیٹھ کر مٹھائی کھانے کا بہت شوق تھا، انارکلی سے گنپت روڈ داخل ہوں تو بائیں جانب مٹھائی کی دوکانیں تھیں۔ والد صاحب مجھے دوکان کے اندر لے گئے، صوفے پر بیٹھ کر مجھ سے پوچھنے لگے: بتاؤ! تم کیا کھاؤ گے؟ میں نے کہا: ''میسو'' تو دوکاندار نے آدھ پاؤ میسو لوہے چینی کی پلیٹ میں ڈال کر اس کا وزن کیا

اور مجھے اشارہ کیا کہ لے لو، میں نے وہیں ٹیبل پر بیٹھ کر یہ مٹھائی کھائی۔ والد صاحب نے پوچھا: اور کھانی ہے؟ میں نے نفی میں جواب دیا کہ نہیں جی! بس کافی ہے۔

جماعت اسلامی کا ایک ادارہ اسلامک پبلی کیشنز بھی ہے جس کا ان دنوں دفتر رنگ محل میں ہوتا تھا، میں متعدد مرتبہ ان کے ہاں مختلف رشتہ داروں کی کتابت لے کر گیا۔

لاہور میں شیخ غلام علی اینڈ سنز کتب فروش کا ادارہ بڑا مشہور تھا۔ میں ان کے ہاں بھی کئی مرتبہ گیا ہوں۔ کشمیری بازار اس زمانے میں کتب کی تجارت کے لیے مشہور تھا۔ ہمارے خاندان کے بیشتر لوگ اس بازار کے مختلف کتب فروشوں کی کتابت کرتے تھے۔ میں جب بھی وہاں جاتا گھنٹوں ان کو دیکھتا رہتا، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے اسی وقت دارالسلام بنانے کا سوچ لیا تھا، مگر دل ودماغ میں ان اداروں کے نقشے باقی رہے اور کام کو آگے بڑھانے میں خاصی معاونت ملی۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، والد محترم ایک ادارے کا کام کرتے تھے جس کا نام ''کتب خانہ لطف زندگی'' تھا، یہ 22 لارنس روڈ پر چڑیا گھر کے عقب میں واقع تھا، حکیم مظفر حسین اعوان اس کے بانی تھے۔ ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر اختر حسین اعوان اس کے مالک تھے۔ ان دونوں کے علاوہ والد صاحب کا کوئی تیسرا قابل ذکر ادارہ نہ تھا، جن سے ان کو کتابت کا کام باقاعدگی سے ملتا ہو۔ ملک سراج الدین اینڈ سنز کے پاس کام بہت زیادہ ہوتا تھا، مگر وہ اجرت بہت کم دیتے تھے، مزید برآں پیسوں کی ادائیگی کے وقت تنگ بھی کرتے تھے۔

کشمیری بازار میں ایک اور تاجر کتب عبدالحنان تھا، والد صاحب کبھی کبھار ان کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ جب صرف کتابت شدہ صفحات لاہور پہنچانے ہوتے تو بعض اوقات ہم بچوں سے بھی یہ کام لیا جاتا تھا، اس کا فائدہ یہ تھا کہ بسوں کا کرایہ آدھا لگتا، نیز ان کا اپنا

وقت بھی بچ جاتا۔ شورش کاشمیری میرے پسندیدہ مقرر تھے، اگر کہیں سے ان کا پرچہ چٹان مل جاتا تو میری کوشش ہوتی کہ جس طرح بھی ہو اسے مکمل پڑھ لیا جائے۔ وہ اپنے وقت کے بہت ہی مایہ ناز خطیب تھے۔ مجھے بھی تقریریں سننے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ جن لوگوں نے ان کی تقاریر سنی تھیں میں ان سے پوچھا کرتا کہ انھوں نے آج اپنی تقریر میں کیا کہا تھا؟ والد محترم نے ان کی کئی تقاریر موچی دروازہ لاہور کی جلسہ گاہ میں سن رکھی تھیں۔

ایک دن اخبارات کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ شورش کاشمیری صاحب بیمار ہیں اور میو ہسپتال میں زیر علاج ہیں، میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی لاہور جاؤں گا ان کی تیمارداری کروں گا۔ مجھ سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ تاجر کتب عبدالحنان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مجھے شورش کاشمیری سے ملنے جانا ہے۔ اس نے میرا مذاق اڑایا اور کہنے لگا: وہ تو بہت بڑا آدمی ہے، اس سے تمھاری ملاقات خالی ہاتھ کیسے ہوسکتی ہے؟ تمھیں اگر ان سے ملنا ہے تو کم از کم 100 روپے کے پھل خریدو، وہ ان کے لیے تحفہ لے کر جاؤ۔ اس وقت میرے پاس 100 روپے کی گنجائش کہاں تھی؟ لہٰذا میں شورش کاشمیری سے ملاقات کی تمنا دل ہی میں لیے لوٹ آیا، جس کا مجھے اب تک افسوس ہے۔ البتہ اس امر پر اطمینان ہے کہ جب مولانا مودودی رحمہ اللہ نے وفات پائی تو میں لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں ان کے جنازے میں شرکت کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

میرے والد گرامی نے میرے اوپر بے شمار احسانات کیے، ان میں سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے مسلک اہل حدیث کے ساتھ گہری وابستگی اور عقیدہ توحید کے ساتھ مضبوط تعلق کو میرے دل و دماغ میں راسخ کر دیا تھا۔ حافظ آباد آنے کے بعد ہم جمعہ کی نماز مولانا محمد یحییٰ حافظ آبادی رحمہ اللہ کی اقتدا میں ادا کیا کرتے تھے، اباجی کو جلسوں میں

شرکت کا بڑا شوق تھا۔ جہاں بھی جلسہ ہوتا وہ خود بھی تشریف لے جاتے اور مجھے بھی اپنے ساتھ رکھتے، اس سے جہاں میری معلومات میں اضافہ ہوا وہاں علماء سے عقیدت اور محبت بھی بڑھی۔ میرے مزاج میں بچپن سے لیڈری تھی، میں کلاس میں مانیٹر تو نہیں رہا البتہ سیکنڈ مانیٹر یا گروپ مانیٹر عموماً رہا، اپنے ہم جماعت اور محلے کے بچوں میں میرا ایک نمایاں مقام ہوتا تھا اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافی امور پر فیصلے عموماً میں ہی کیا کرتا تھا۔ ان کے ساتھ اکثر اوقات مذہبی بحثیں بھی کیا کرتا، والد صاحب سے ترجمہ پڑھنے کی بدولت اکثر اختلافی مسائل کا علم ہو جاتا، ان سب چیزوں کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے عقیدہ توحید سے الحمدللہ! خالص محبت اور سچی لگن پیدا ہو گئی۔ بچپن میں مجھے صحافی بننے کا بڑا شوق تھا، مگر اس کے لیے رہنمائی کی ضرورت تھی، میں مختلف علمائے کرام اور خطیب حضرات کی تقاریر نوٹ کر لیتا تھا، مجھے یاد ہے کہ مولانا مفتی محمود صاحب ایک مرتبہ چنیوٹ جلسہ میں تشریف لائے تو میں نے ان کی پوری تقریر قلم بند کر لی تھی۔ اب بھی میرے دل و دماغ میں جلسوں اور پروگراموں کی رپورٹس تیار کرنے کا بڑا شوق ہے، چنانچہ میں نے متعدد پروگراموں اور کانفرنسوں کی رپورٹس لکھی ہیں۔ میری زندگی کی غالباً سب سے اچھی رپورٹ 2008ء میں لاہور میں منعقد ہونے والی اہلحدیث کانفرنس کی روداد تھی جو اردو میگزین جدہ میں صفحہ اول کی اسٹوری کے طور پر شائع ہوئی۔ یہ روداد اس کتاب میں بھی شامل ہے۔

مجھے یہ بات لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ میں تمام فقہی مسالک کا احترام کرتا ہوں، مختلف جماعتوں کے اکابرین سے میرے تعلقات ہیں، مگر جہاں تک مسلک اہلحدیث کا تعلق ہے میں نے اس کے بارے میں کبھی مداہنت اور چشم پوشی سے کام نہیں لیا۔

ریاض آنے کے بعد میں جماعت اسلامی کے مقامی حلقہ سے وابستہ ہو گیا، محترم محمد اقبال کیلانی نہ صرف میرے چچازاد ہیں بلکہ ان کے والد محترم مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ سے میں نے حدیث بھی پڑھی ہے۔ میں ان کا شاگرد خاص رہا ہوں اس لیے ان کے فرزند ارجمند مولانا محمد اقبال کیلانی کے لیے بھی میرے دل میں ہمیشہ کے لیے احترام کے جذبات رہے ہیں۔ ابتداء وہ بھی جماعت اسلامی سے متاثر تھے اور غالباً ایک حلقہ کے مسئول بھی تھے۔

میں اسلام کے لیے عصر حاضر کی ان تمام دینی تنظیموں کی خدمات کا معترف ہوں، بلاشبہ ان لوگوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں، مگر ان کے احترام کے ساتھ ساتھ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عقیدہ توحید اور اتباع سنت کے حوالے سے ان کے عقائد اور نظریات خاصے کمزور ہیں، مثلاً ریاض میں جماعت اسلامی کی ایک نہایت ذمہ دار شخصیت نے عقیدہ توحید کے بارے میں یہ تبصرہ کیا کہ یہ تو متنازعہ مسئلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بعض اوقات عرسوں اور میلوں میں جاتے نظر آتے ہیں اور موقع بن جائے تو قبر پر چادر چڑھانے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اس طرح اتباع سنت کے معاملہ میں بھی ان کا موقف ڈھیلا ڈھالا ہے۔

مجھے یاد ہے ریاض میں ایک بڑی ذمہ دار شخصیت جن کو میں بڑا عالم سمجھتا تھا ان کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے اجتماعی قرآن خوانی کی دعوت دے ڈالی، میں نے جب احتجاج کیا کہ یہ تو بدعت ہے تو ان کا جواب تھا: آپ لوگوں کو قرآن کریم پڑھنے سے روکتے ہیں؟! جماعت اسلامی والوں نے بعض اوقات مولانا مودودی رحمہ اللہ کو مجتہد ثابت کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی امام کے مقلد نہیں تھے، جبکہ میرے

نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے بعض مسائل میں ان سے جزوی اختلاف کیا، مگر میں کئی مرتبہ سوچتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے متعلقین رفع الیدین، آمین بالجہر اور دیگر نمایاں اور معروف مسائل میں صحیح احادیث پر عمل کیوں نہیں کرتے؟! کیا انھوں نے یہ احادیث پڑھی نہیں ہیں، یا ان کے پاس کتابیں نہیں ہیں جن میں یہ مسائل درج ہیں اور صحیح احادیث سے ثابت ہیں؟! اب اس کی دو ہی وجوہات ہوسکتی ہیں: یا تو یہ سیاسی مصلحت ہے یا پھر تقلید کا اثر، ورنہ یہ احادیث اس قدر واضح ہیں کہ تھوڑا سا علم رکھنے والا شخص بھی حق بات کو واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔

جب ہم ریاض میں آئے تھے تو اس وقت یہاں اہل حدیث مکتبہ فکر کے لوگ بہت زیادہ نہ تھے، اگر موجود تھے تو ان کا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم موجود نہ تھا۔ میرے لیے یہ بات بڑے شرف ومنزلت کی ہے کہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ دو مرتبہ میرے گھر تشریف لائے، اس وقت تک ہمارے ہاں جمعیت اہل حدیث کی با قاعدہ تنظیم نہ تھی۔ چند احباب اکٹھے ہوئے اور ایک جمعیت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ڈاکٹر امیر بخش چنہ صاحب کو اس کا صدر اور مجھے ناظم اعلیٰ مقرر کردیا گیا، یہ ڈھیلا ڈھالا سا ڈھانچہ ایک مدت تک کام کرتا رہا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ڈاکٹر چنہ صاحب نے اپنی بعض سرکاری مصروفیات کے باعث معذرت کرلی اور قاری محمد صدیق رحمہ اللہ نئے امیر مقرر کیے گئے، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔

علامہ احسان الٰہی رحمہ اللہ کی شہادت 30 مارچ 1987ء کو ہوئی۔ وہ شہادت سے قریباً ڈیڑھ ماہ قبل فروری 1987ء میں میرے گھر تشریف لائے تھے، ہمارے گھر کی چھت پر ہونے والے اجتماع سے انھوں نے یادگار خطاب بھی کیا تھا۔

عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے

میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز 1974 میں حافظ آباد میں نیلم شٹل انڈسٹری میں ایک منیجر کی حیثیت سے کیا۔ پاور لوم کے لیے لکڑی کے شٹل بنتے تھے۔ جن میں دھاگہ چلتا ہے۔ میری پہلی تنخواہ 150 روپے مقرر ہوئی۔ جلال پور روڈ پر پنڈی بھٹیاں جانے والی سڑک کے کنارے یہ چھوٹی سی فیکٹری بڑے عمدہ شٹل بناتی تھی۔ اس کے مالک کا نام محمد اکرم تھا، میرا ان سے آج بھی رابطہ ہے۔ میرے ذمہ مزدوروں کی حاضری لگانا اور ان کی تنخواہ کا حساب رکھنا تھا، دوسرے لفظوں میں ان کا منشی تھا، جسے منیجر کا نام میں نے از خود دے لیا تھا تاکہ میں لوگوں سے کہہ سکوں کہ میں منیجر لگا ہوا ہوں ورنہ درحقیقت میں ایک منشی تھا۔ اگلے ماہ میری تنخواہ 175 روپے کر دی گئی۔ میں صبح سویرے سائیکل پر گھر سے نیلم شٹل انڈسٹری میں جاتا شام کو واپس آجاتا۔ ایک ماہ اور گزرا تو میری تنخواہ 200 روپے کر دی گئی۔ میری خواہش تھی کہ میں کم از کم سات روپے روزانہ تو کماؤں، میں نے اکرم صاحب سے کہا تو انھوں نے تنخواہ 210 روپے کر دی۔ اس دوران میں ملازمین کے ساتھ تعلقات گہرے کر چکا تھا۔ فیکٹری ایک فورمین سردار کے ذریعے چل رہی تھی۔ یہ فیصل آباد کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہی سارے کام کرتا اور اسے چلاتا تھا۔ ایک دن ہم

دونوں بیٹھے ہوئے تھے کہ اس نے بتایا: مجھے فیصل آباد کی ایک فیکٹری سے کافی زیادہ تنخواہ کی آفر ہوئی ہے، لہٰذا میں جلد ہی اس فیکٹری کو خیر باد کہہ دوں گا۔ غالباً وہ اس وقت 500 روپے تنخواہ لیتا تھا۔ جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔ اسے غالباً 600 روپے کی آفر ہوئی تھی، کہنے لگا: میں فیصل آباد کے علاقے کا ہوں، وہاں اپنا گھر بھی قریب ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تمھارے جانے سے یہ فیکٹری بند ہو جائے گی، مگر اس کا پختہ ارادہ بن رہا تھا کہ وہ اس فیکٹری کو چھوڑ جائے گا۔ میں اسے بازار لے گیا۔ حافظ آباد میں ان دنوں پہلی کون آئس کریم والی مشین لاری اڈے کے پاس لگی تھی۔ آئس کریم کی یہ دکان خوب چلتی تھی۔ میں اسے وہاں لے گیا، آئس کریم کھلائی۔ مجھے اس کے الفاظ آج بھی یاد ہیں: کیسا وقت آ گیا ہے کہ آئس کریم جس برتن میں ڈالتے ہیں اسے کھانا بھی پڑتا ہے۔ اس نے یہ الفاظ پنجابی میں کہے تھے۔ وہ بالکل ان پڑھ تھا، نماز تو پڑھتا تھا، مگر غالباً سگریٹ بھی پیتا تھا۔ میں نے اسے قائل کر لیا کہ اگر تمھاری تنخواہ مالکان بڑھا دیں تو تم اس فیکٹری کو نہیں چھوڑو گے۔ اب میں نے اکرم صاحب سے بات کی کہ آپ کا سب سے اہم کاریگر تو آپ کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے کہنے لگے: کسی طرح اس گتھی کو سلجھاؤ۔ خیر سردار کی تنخواہ 750 روپے کر دی گئی اور اس وفا کے بدلہ میں میری تنخواہ بھی بڑھا کر 350 روپے کر دی گئی، گویا چار ماہ کے اندر ہی الحمدللہ! میری تنخواہ ڈبل سے بھی زیادہ ہو گئی۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا ہے جو میں ضرور لکھنا چاہوں گا۔ حافظ آباد میں بریلوی مسلک کے ترجمان مولوی بشیر صاحب تھے، جبکہ اہلحدیثوں کی قیادت مولانا محمد یحییٰ صاحب کرتے تھے۔ مولوی بشیر صاحب وفات پا گئے تو ریلوے لائن والے قبرستان میں

ان کا مزار بنایا گیا، جس کے اوپر گنبد بھی بنایا گیا۔ ان کے صاحبزادے اب اس کے متولی تھے، وہ مزار کے قریب ہی بیٹھے رہتے۔ ایک دن میں اور سردار وہاں چلے گئے۔ موصوف سگریٹ پی رہے تھے، چائے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ ماحول کچھ اس قسم کا تھا کہ کچھ مرید دور ''گھوٹا'' لگا رہے تھے۔ ہم نے مولوی صاحب سے گفتگو شروع کر دی، وہ ہم سے اپنی کرامتیں بیان کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں سگریٹ اور سامنے چائے تھی۔ میں نے ایک سوال کر دیا: کیا آپ کو کبھی خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت بھی ہوئی ہے؟! جواب ملا: بہت مرتبہ، میں نے پھر پوچھا: جناب کیسے اور کب، آخری مرتبہ کب زیارت ہوئی؟ کہنے لگے: جب چاہیں اللہ کے رسول ﷺ کی خواب میں زیارت کر لیتے ہیں۔ میں نے کہا: اگر میں کرنا چاہوں؟ بڑے موڈ میں کہنے لگے: آپ کو بھی کروا دیں گے۔ میں نے پوچھا: کب؟ کہنے لگے: آپ جب چاہیں، آ جائیں، بس! رات ہمارے ساتھ گزارنا ہو گی۔ ہم وہاں کچھ دیر بیٹھے موصوف کی غلط سلط باتیں سنتے رہے۔

مجھے اس کے الفاظ آج بھی یاد ہیں: کیسا وقت آ گیا ہے کہ آئس کریم جس برتن میں ڈالتے ہیں اسے کھانا بھی پڑتا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے! ایک ان پڑھ آدمی، جو سگریٹ بھی پیتا تھا، کس طرح دینی پیشوا بن کے بیٹھا ہوا تھا اور سادہ لوح عوام کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال رہا تھا۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو سردار مجھ سے کہنے لگا: مجاہد میاں! یہ آدمی نہایت جھوٹا اور مکار ہے۔ یہ ہمارے ساتھ غلط بیانی کر رہا تھا کہ میں جب چاہوں اللہ کے رسول ﷺ کی خواب میں زیارت کر سکتا

ہوں۔اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور اللہ کے رسول ﷺ کو تو بدبو سے سخت نفرت تھی۔ اس کا حلیہ تو دیکھو: بڑی بڑی مونچھیں، ہاتھ میں سگریٹ، گندا سا لباس، سامنے چائے...... یہ آدمی ٹھیک نہیں، اس کے پاس آئندہ کبھی نہیں آنا چاہیے۔میں نے کچھ عرصہ نیلم شٹل میں کام کیا۔فیکٹری کا کام کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ہمارے پاس دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی کام کرتے تھے۔غریب گھرانوں کے بچوں کو دوپہر کی روٹی اور شام کو ایک دو روپے بھی مل جاتے، یہ ان کے لیے بہت کچھ تھا۔ہمارے ہاں ایک قدرے سینئر لڑکا بھی تھا۔ایک چھوٹا سا بچہ دو دن پہلے آیا، میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔سینئر لڑکا اس نئے لڑکے سے کہنے لگا: تم ذرا مجھے اوزاروں کے نام بتاؤ۔اس نے کہا: یہ ہتھوڑی ہے، یہ کیل ہے، یہ قبضہ ہے، یہ قینچی ہے، یہ فلاں چیز ہے، فلاں چیز ہے...... وہ نام بتاتا گیا، مگر ایک چیز کا نام اسے نہ آیا۔اس کا نام ''ملو'' تھا، اسے اس کا نام معلوم نہ تھا، کہنے لگا: اس کا نام مجھے نہیں آتا۔تو سینئر نے جھٹ سے اسے کہا: ''اوئے کنجر! کان پکڑ لو'' وہ بے چارہ فوراً مرغا بن گیا، اس نے کان پکڑ لیے۔ادھر میں دوسری طرف منہ کیے بیٹھا ان کی باتیں سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا: انسان خواہ بچہ ہی کیوں نہ ہو اسے حکمرانی کا شوق ضرور ہوتا ہے۔اس کے کپڑے بوسیدہ بلکہ پھٹے ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود جس پر بس چل سکتا ہے اس پر حکم چلا کر اسے مرغا بنا دیا ہے۔یہ بے چارا تو دو دن پہلے آیا تھا، اسے ''ملو'' کا کیا علم ہوسکتا ہے۔

میں نے غالباً چھ سات ماہ یہاں کام کیا۔اب نہ جانے کیا صورت بنی کہ میں نے نیلم شٹل چھوڑ دی۔کتابت میں سیکھ چکا تھا۔ایک ماہ میں جوئیاں والہ میں رہا۔یہاں بابا عبداللہ رحمہ اللہ سے عربی کتابت کی اصلاح لیتا رہا، یہ میرا ننھیال تھا، میں یہاں کی مسجد میں

تقریریں بھی کیا کرتا تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا، سردی کا موسم تھا، ایک ماہ پورا ہوا تو میں عربی کتابت سیکھ چکا تھا۔ میں واپس آ گیا، مجھے عربی لکھنے کا شوق شروع ہی سے تھا۔ دارالحدیث محمدیہ میں جو کچھ پڑھا تھا اس کی بدولت میں کتابت کی غلطیاں بہت ہی کم کرتا تھا۔

جلد ہی مجھے معلوم ہوا چک چٹھہ کے قریب دوآبہ رائس ملز بنی ہے۔ یہ جگہ ہمارے گھر سے کوئی پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگی۔ ہمارے گھر اور ملز کے درمیان دو نہریں اپر چناب اور لوئر چناب آتی تھیں۔ نہر کے کنارے یہ ملز علاقے کی سب سے بڑی رائس ملز تھی۔ یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا، جس کا افتتاح بھٹو صاحب کے دور میں وزیراعلیٰ پنجاب جناب صادق حسین قریشی نے کیا تھا۔ ہمارے محلے کا ایک لڑکا نذر عباس وہاں مزدوری کرتا تھا۔ مجھے بھی شوق آیا تو میں نے ایک روز خصوصی طور پر کھدر کے کپڑے پہنے، اس زمانے میں ''لیڈر'' کھدر کے کپڑے لوگوں کو دکھانے کے لیے پہنتے تھے۔ میں بھی مزدوروں کی قطار میں لگ گیا۔ ایک صاحب مزدوروں کی حاضری لگا رہے تھے۔ میری باری آئی تو کہنے لگے: آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں۔ میں نے کہا: میں بھی مزدوری کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آپ تو پڑھے لکھے لگتے ہیں، وہ گویا ہوا۔ تو پھر کیا ہوا، میں بھی مزدوری کرسکتا ہوں۔ میں بھرپور جوان تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ آپ ذرا انتظار کریں۔ جب فارغ ہوا تو مجھے اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ یہ انجینئر خورشید صاحب تھے، بڑے خوبصورت اونچی ایڑی کی جوتی پہنے ہوئے، قدرے چھوٹے قد کے خورشید صاحب بہاری تھے۔ غالباً اب کراچی میں مقیم تھے۔ انھوں نے میرا انٹرویو کیا۔ کہنے لگے: ہمارے پاس فی الحال نوکری نہیں ہے، آپ پھر کسی وقت آئیں، مگر میں نوکری کرنے پر مصر تھا۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، آپ

مجھے مزدور رکھ لیں۔ بے شک تنخواہ دس روپے روزانہ دے دیں، کام مزدوری والا نہ لیں، بلکہ کوئی لکھنے پڑھنے والا کام مجھے دے دیں، یہ بات انھیں پسند آئی۔ میں چونکہ پیدائشی خطیب تھا، گفتگو کرنا میرے لیے مشکل تھی نہ ہی میں کسی سے مرعوب ہوتا تھا۔ شاید وہ اندر گئے اور پراجیکٹ منیجر صاحب سے منظوری لے لی، آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ملز کے چار بڑے بڑے ہال تھے۔ وہاں پر بہت بڑا ترازو رکھا ہوا تھا، جس پر مونجی کی بوریوں کا وزن کر کے مزدوروں کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ اس ترازو پر بیک وقت کوئی پچاس ساٹھ بوریاں رکھی جاتیں۔ ایک شخص اس وزن کو کاغذ پر نوٹ کرتا اور مزدوروں کو اشارہ کرتا، وہ بوریاں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے اور ترازو پر نئی بوریاں رکھ دی جاتیں۔

خورشید صاحب کھٹ کھٹ کرتے ہوئے مجھے وہاں لے آئے، ایک سینئر مزدور کو کہنے لگے: بخش! یہ تمھارا نیا افسر آیا ہے۔ آج سے یہ بوریوں کا ریکارڈ رکھیں گے۔ ان کو تجربہ نہیں، ذرا ان کو کام بتا دینا، جلد ہی یہ سمجھ جائیں گے۔ مجھے ''بخش'' کے الفاظ کبھی نہیں بھولتے، کہنے لگا: صاحب! فکر نہ کریں، ہم ان کو کام سکھا دیں گے۔ خیر وہ کام کون سا مشکل یا سیکھنے والا تھا۔ کامن سینس کی بات تھی، الحمدللہ! پانچ دس منٹ میں کام سمجھ گیا اور وہاں ملازمت شروع کر دی۔ میں صبح سویرے ملز میں آتا۔ والدہ صاحبہ ٹفن کیریر میں روٹی اور سالن رکھ دیتیں۔ صبح ناشتہ ان کے پاس بیٹھ کر کرتا، میرا معمول تھا کہ میں ہمیشہ کھانا ایک کی بجائے دو آدمیوں کا لاتا، اگر روٹی زیادہ نہ بھی ہوتی تو سالن بہرحال کافی ہوتا۔ دوپہر کو کھاتے وقت سب کو دعوت دیتا۔ ہم قریبی گاؤں سے روٹیاں منگوا لیتے اور جتنے بابو صاحبان تھے سب مل کر کھانا کھاتے۔ میں چند دنوں میں ہی خاصا معروف اور مقبول

ہو گیا۔ میں بہت تیز چلتا اور جلدی جلدی کام کرتا تھا۔

ملز کے اندر ایک طرف سٹور تھا جس کے انچارج محمد عارف بھٹی صاحب تھے، چند دنوں کے بعد ہی ان سے تعارف ہو گیا۔ علیک سلیک ہوئی اور ہم ایک دوسرے سے خوب واقف ہو گئے، یہ واقفیت بعد ازاں گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

ملز کے کئی گیٹ تھے۔ ایک گیٹ جو مغربی جانب تھا وہاں پر بڑا سا ترازو تھا۔ جس پر ٹرک سمیت بوریوں کا وزن ہو جاتا تھا۔ اس کے تین علیحدہ انچارج تھے۔ ملز میں چوبیس گھنٹے کام ہوتا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ڈسپنسری تھی جس کے انچارج ڈاکٹر خالد تھے۔ ان دنوں سیزن تھا، انھی ایام میں عارف صاحب کے بڑے بھائی محمد منور صاحب پراجیکٹ منیجر صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ بن کر آ گئے۔ ہمارے منیجر جناب خورشید صدیقی صاحب تھے، ان کا بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ بڑی خوبصورت انگلش بولتے اور لکھتے تھے۔ نہایت خوبصورت، وجیہ اور وضع دار انسان تھے۔ ان کا تعلق کسی بڑی فیملی سے تھا۔ بڑے ہی قابل اور سمجھدار انسان تھے۔ ہر روز تو دفتر میں نہ آتے مگر جب آتے تو پوری ملز میں مشہور ہوتا کہ صدیقی صاحب آئے ہیں۔ میں ڈیوٹی دیتا رہا، بڑی محنت کی، مگر میں ڈیلی ویجز کی بنیاد پر کام کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیسے ہی سیزن ختم ہو گا مجھے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ اکاؤنٹس کے شعبہ کے انچارج چاہ میراں لاہور کے رہنے والے جناب ایوب ثاقب صاحب تھے۔ یہ بڑے ہی نفیس انسان تھے۔ انھوں نے غالباً C.A چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا پارٹ ون کیا ہوا تھا، ممکن ہے پورا ہی کیا ہوا ہو، پوری ملز میں مشہور تھا کہ یہ بڑے رحم دل انسان ہیں۔ میں ملز میں کام کرنے کی بدولت مشہور تو ہو ہی چکا تھا، کام سیکھنے کا شوق بھی تھا۔ میری ڈیوٹی صبح کے علاوہ شام کو چار بجے سے بارہ بجے تک بھی ہوتی۔

ڈیوٹی یہ تھی کہ مجھے پیڈی Paddy (مونجی) کا حساب رکھنا ہوتا تھا کہ کس کس جگہ رکھی ہوئی ہے۔ چونکہ پیڈی باہر پڑی ہوتی تھی، اس پر ترپال بچھائے جاتے۔ اندر ملز کو کتنی بوریاں دی ہیں۔ پیڈی کو خشک کرنے کے لیے ڈرائی کرنے کا یونٹ تھا۔ میں جناب اولکھ کو اسسٹ کرتا تھا۔ ان کے ساتھ ضمیر حیدر بھی تھے۔ جن کا کام ہر وقت شغل لگانا تھا۔ میں مشہور تو ہو ہی چکا تھا، بہانے بہانے سے سارے کام سیکھ لیے تھے۔ ٹائم کیپر، سٹور کیپر، گیٹ کیپر سبھی کے کام جان گیا تھا، میں رپورٹیں بھی تیار کر لیتا، تاہم دستخط میں خود نہیں کر سکتا تھا، بلکہ متعلقہ شخص ہی ان پر دستخط کرتا۔ آہستہ آہستہ آپس میں اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کام کرنے اور سیکھنے کا شوق تھا۔ میں ان سے کہتا: آپ بے شک رپورٹوں پر دستخط کر کے چلے جائیں، میں آپ کے جانے کے بعد انھیں مکمل کر دوں گا۔

ایک دن مجھے کسی نے بتایا کہ اکاؤنٹس کے شعبہ میں جگہ خالی ہے۔ میں فوراً ایوب ثاقب صاحب کو ملا۔ ان سے گزارش کی کہ مجھے اپنے شعبہ میں رکھ لیں۔ کہنے لگے: تمھارے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: کوئی بات نہیں، میں آپ کے ہاں کام سیکھ لیتا ہوں۔ کہنے لگے: کیسے؟ تم تو ڈیوٹی کرتے ہو۔ میں نے عرض کی: جناب! ہماری ملز چوبیس گھنٹے کام کرتی ہے۔ میں اپنی ڈیوٹی دوسری شفٹ یعنی چار بجے سے بارہ بجے تک لگوا لوں گا۔ اور صبح آپ کے پاس کام کروں گا، اس طرح میں اکاؤنٹس کا کام سیکھ لوں گا۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کو بھی آدمی کی ضرورت تھی۔ کام خاصا تھا، انھوں نے ہاں کر دی۔ میں صبح نو بجے سے چار بجے تک اکاؤنٹس کے شعبہ میں کام سیکھتا اور شام کو ڈیوٹی دیتا۔ میرے مزاج میں بچپن ہی سے ہنسی مذاق اور مزاح کی حس ہے۔ میں رات آٹھ نو بجے ٹائم کیپر، سٹور کیپر اور گیٹ کیپر سے کہتا: جس کسی کو گھر جانا ہے، رپورٹس پر

دستخط کردے اور چلا جائے۔ میں رات کو بارہ بجے ان کو فل کر دوں گا۔ اس طرح مجھے کام سیکھنے کا خوب موقع ملا۔ رات بارہ بجے ڈیوٹی ختم کرتا تو کئی اور لوگ بھی ملز سے حافظ آباد شہر جانے والے ہوتے، ہم سب مل کر قافلہ کی صورت میں جاتے۔ نہروں کو کراس کرنے تک خوف ہوتا، شہر کے ذرا قریب آتے تو گویا سارا ماحول اپنا ہو جاتا۔ یہاں کا کونہ کونہ ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ سرکاری پڑاؤ کے سامنے کبابوں والا ہماری راہ تک رہا ہوتا۔ ہم اس سے سیخ کباب لیتے۔ ایک دو روٹیوں کے ساتھ اسے کھاتے، ٹھنڈا پانی پیتے اور گھر کی طرف چل دیتے۔ گھر پہنچتے پہنچتے ایک بج جاتا۔ آتے ہی نیند کی وادی میں چلے جاتے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو گزشتہ دن کی کارکردگی سے مطلع کرتا، والدہ کے پاس بیٹھ کر ناشتہ کرتا، اپنے ٹفن کیریر کو کھانے سے بھرتا، ایک کی بجائے دو افراد کا سالن اور روٹیاں لے کر پھر دوآبہ کی طرف روانہ ہو جاتا۔

> ۔۔۔آپ مجھے مزدور ہی رکھ لیں۔ بے شک تنخواہ دس روپے روزانہ دے دیں، مگر کام مزدوری والا نہ لیں۔

ایک دن محسوس کیا کہ والدہ صاحبہ رات کو جاگتی رہتی ہیں کہ کب عبدالمالک آئے گا اور میں اس کے لیے دروازہ کھولوں گی؟! میں نے گھر سے بستر اٹھایا اور ملز میں لے آیا۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے، جن میں ملز کے سیکیورٹی گارڈز رہتے تھے۔ میں نے ان سے ایک چارپائی لے لی اور بارہ بجے رات ڈیوٹی کرنے کے بعد وہیں سونے لگا۔ فجر کی نماز کے بعد سائیکل چلاتا ہوا گھر پہنچ جاتا۔ والد صاحب اور والدہ صاحبہ راہ تک رہے ہوتے۔ ان کے پاس قریباً دو گھنٹے

گزارتا اور پھر ملز کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس طرح کوئی بیس سے بائیس گھنٹے ملز ہی میں گزارتا، خوب محنت کی، خوب سیکھا۔ سارے افسران اور پورے سٹاف میں میری شہرت بہت اچھی ہوگئی۔ چند ماہ گزرے تو سیزن ختم ہوگیا اور ملز میں کام بھی ختم ہوگیا، ہمیں فارغ کر دیا گیا، مگر میں نے اکاؤنٹس کے شعبہ میں کام کرنا نہ چھوڑا۔ میں اس کا کوئی معاوضہ نہ لیتا تھا۔ کتابت کا کام تھوڑا بہت کرتا رہتا تھا۔ جناب صدیقی صاحب نے کئی مرتبہ مجھے کام کرتے دیکھا تھا۔ یہ نوجوان خوب محنتی ہے، میرے بارے میں انھیں سب نے گواہی دی تھی۔ ایک دن ایک افسر مجھ سے کہنے لگے: سٹور کیپر کی جگہ خالی ہے، اگر تم اپنے والد کو لے آؤ اور وہ صدیقی صاحب سے مل کر تمھاری سفارش کریں تو تمھیں نوکری مل سکتی ہے۔ میں نے والد صاحب سے کہا تو کہنے لگے: میں ساری زندگی کبھی افسروں کے پاس نہیں گیا، اب اس عمر میں کیا کسی کی منت سماجت کروں گا!!

ایوب ثاقب صاحب بڑے مہربان افسر تھے۔ میں نے اکاؤنٹس کے شعبہ سے ان کی رہنمائی میں بہت کچھ سیکھا۔ ان دنوں جو کچھ سیکھا تھا وہ آج بھی میرے کام آ رہا ہے۔ میری محنت رنگ لائی، صدیقی صاحب مجھے دیکھتے تو حوصلہ افزائی کرتے۔ پڑھائی کے بارے میں سوال کرتے۔

ادھر گھر میں ایک تبدیلی آ رہی تھی۔ انیسہ کے ساتھ منگنی کی بات چل رہی تھی برادری کے لوگ کچھ موافق اور کچھ ناموافق تھے۔ یہ میری خالہ زاد تھی، دونوں بہنوں کی خواہش تھی کہ ان کی آپس میں رشتہ داری ہو جائے۔ ایک دن والد صاحب، والدہ صاحبہ اور میں چاندی کوٹ گئے ہوئے تھے۔ رات گئے تک رشتہ کی بات چلتی رہی، بحث ہوتی رہی۔ بالآخر 26 فروری 1976ء کو رات دس بجے انیسہ فردوس کے دادا محترم حافظ عبدالحیی

صاحب نے رشتہ دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا: میں لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ابھی نکاح پڑھانا چاہتا ہوں، چنانچہ اسی وقت نکاح پڑھایا گیا۔ ایجاب وقبول ہوا۔ رات گئے ''جیلے'' کی ہٹی کھلوا کر چھوہارے لا کر گھر والوں میں تقسیم کیے گئے۔

یہ نکاح بڑا مبارک ثابت ہوا، نکاح کے پانچ دن بعد 3 مارچ 1976 کو مجھے محترم صدیقی صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ تمھاری نوکری کا فیصلہ ہوگیا ہے، تم آج سے ڈیوٹی جوائن کر سکتے ہو، چنانچہ میں نے اسی وقت نوکری جوائن کر لی۔ میں نے اپنے Joining letter میں لکھا: جناب پروجیکٹ مینیجر صاحب! آپ کی زبانی ہدایت کے مطابق میں نے تین مارچ 1976ء سے بطور سٹور کیپر اپنی ڈیوٹی جائن کر لی ہے۔

میری تنخواہ 512 روپے پچاس پیسے مقرر ہوئی، جو اس زمانے میں خاصی بڑی رقم تھی۔ میری زندگی کا نیا آغاز ہوگیا۔ نکاح کیا ہوا، گویا الحمدللہ! ترقی کے راستے کھلتے چلے گئے۔ اب میری ڈیوٹی بطور سٹور کیپر صبح کی ہوگئی۔ اس لیے اکاؤنٹس کے شعبہ میں میرا جانا موقوف ہوگیا کیونکہ وہاں صرف دن کے وقت ہی کام ہوسکتا تھا۔ ملز میں کام کوئی خاص نہ تھا۔ میرا کام نہایت آسان تھا، میں سارے کام سیکھ چکا تھا۔

میری ذمہ داری پیڈی کی بوریاں اور چاول کے سٹاک کو رکھنا تھا۔ ہم ملز میں کل چار سٹور کیپر تھے۔ ملز کی سروس کے اس زمانہ میں ہمارے ایک خاص دوست خالد اختر صاحب تھے، جو عارف صاحب اور منور صاحب کے ماموں تھے، یہ ڈسپنسر تھے۔ ملز میں گیٹ کے قریب ایک درمیانے سے کمرے میں انھوں نے مرکز ابتدائی طبی امداد بنایا ہوا تھا اور مختلف امراض کی گولیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ بڑے خوش مزاج تھے، بات بات پر مزاحیہ جملے کہتے، یاروں کے یار تھے۔ خالد کو ہم ڈاکٹر خالد کہتے تھے۔ جس کسی کی ذراسی

طبیعت خراب ہوئی ڈاکٹر خالد حاضر ہے۔ عارف صاحب کی ڈیوٹی سٹور کیپر سے اکاؤنٹس کے شعبہ میں ہو چکی تھی، ان کی تنخواہ اور عزت بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کے بڑے بھائی بھی P.M کے دفتر میں بطور P.S بیٹھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں ان کے پاس Addo ٹائپ رائٹر تھا۔ ہمارا ہم خیال دوستوں کا ایک گروپ بن گیا، جس میں ہم کوئی سات آٹھ لوگ تھے۔ امجد وڑائچ ان میں سب سے کم عمر تھا، یہ ایک بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ عطاء اللہ تارڑ صاحب، گوجرانوالہ کا ظفر اور لیبارٹری انچارج یونس بھی ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے۔ ملز کے اندر اور باہر ہم سب اکٹھے ہوتے، ضمیر حیدر شیعہ ہونے کے باوجود ہمارے گروپ کا رکن تھا۔ اس کا بہنوئی حافظ آباد میں تھانے دار تھا۔ ہم ملز میں کام تو کرتے، مگر چاولوں کا کاروبار سیزن کا ہوتا ہے۔ سیزن ختم ہوتا تو ہم عملاً فارغ ہو جاتے، مگر ڈیوٹی تو دینا ہوتی تھی۔ دوآبہ رائس ملز گوجرانوالہ روڈ پر واقع تھی۔ اس کا سرکاری بس سٹاپ منظور نہ تھا۔ بسوں والے تنگ کرتے، کبھی بس کھڑی کرتے کبھی نہ کرتے۔ کرایہ جتنا دل چاہا مانگ لیا۔ ہم نے ایک درخواست لکھی۔ ضمیر حیدر کے حوالے کی اور تھانے کی معرفت دوآبہ کا بس سٹاپ سرکاری طور پر منظور کروالیا۔ اب کوئی بس سواری بٹھانے سے انکار نہ کر سکتی تھی، چار آنے کرایہ مقرر ہوا، جو بہت معمولی سا تھا۔ وقت کا پہیہ تیزی سے گردش کرنے لگا۔

مجھے معلوم ہوا کہ گوجرانوالہ میں شیرانوالہ باغ کی مرکزی مسجد میں مفتی عبدالواحد صاحب کے ہاں کتابت کا ایک کام ہے۔ انھیں ''معانی الآثار'' نامی کتاب لکھوانا تھی۔ میں ان کے پاس گیا، اپنی کتابت کا ایک نمونہ میرے پاس تھا، جو پسند کرلیا گیا۔ یہ کافی بڑا کام تھا، غالباً 600 یا 700 صفحات تھے جو بڑی تختی میں لکھنا تھے۔ حاشیہ اردو رسم الخط میں

تھا۔ میں اس سے پہلے صحیح بخاری کے کافی صفحات کی کتابت کر چکا تھا۔ فی صفحہ دس روپے اجرت طے ہوئی جو اس زمانے میں بہت بڑی اجرت تھی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں پرائمری ٹیچر کی تنخواہ 180 روپے سے 220 روپے ماہوار تھی۔ میں خاصا تیز لکھنے والوں سے تھا۔ صبح سویرے اٹھتا اور فجر کی نماز کے بعد ایک گھنٹہ میں ایک صفحہ لکھ لیتا تھا، جب صفحہ لکھ لیتا تو گویا میں نے دس روپے کما لیے۔ اس زمانے میں مزدور کی یومیہ اجرت دس روپے ہوتی تھی۔ والدہ صاحبہ کو آواز دیتا: امی جان! میں نے دس روپے کما لیے ہیں، اب ناشتہ دے دیں۔ وہ پراٹھا بنا کر لے آتیں۔ کبھی کبھار ان کے پاس باورچی خانے میں ''پیڑھی'' پر بیٹھ کر ناشتہ کرتا۔ پراٹھے کے اوپر اچار، یا رات کا بچا ہوا سالن ہوتا، ساتھ چائے ہوتی۔ والدہ صاحبہ بہت مزیدار کھانے بناتی تھیں۔ رات کے باسی چاولوں پر دہی یا دودھ ڈال کر کھانے کا اپنا ہی مزا تھا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔

میں نے گوجرانوالہ کے مفتی عبدالواحد صاحب کا کام شروع کر دیا۔ میں اوسطاً ڈھائی صفحات روزانہ لکھتا۔ اس طرح مجھے پچیس روپے روزانہ یعنی 750 روپے ماہانہ آمدنی کتابت سے ہو جاتی۔ ملز کے اندر ایک ٹھیکیدار ''شیرا'' تھا۔ کوہستان کے علاقے سے تعلق رکھنے والے شیرا نے ملز کو لیبر سپلائی کی ہوئی تھی۔ ایک دن میرے پاس آیا، کہنے لگا: میں بالکل ان پڑھ آدمی ہوں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے، آپ ڈیوٹی ٹائم کے بعد میرے لیے بل بنا دیا کریں۔ میں آپ کو تین سو روپے ماہوار دے دیا کروں گا۔ یہ کافی ذمہ داری کا کام تھا، مگر جو مبلغ اس نے پیش کی کافی تھی۔ میں نے اس کی پیش کش قبول کر لی اور اس کے بل بنانے لگا۔ اس طرح مجھے کم و بیش مجموعی طور پر 1500 روپے ماہوار کی آمدن شروع ہو گئی۔ والد صاحب کتابت کرتے تھے، وہ بھی کم و بیش 500 روپے کما لیتے تھے۔ گھر کے حالات

بتدریج بہتر ہوتے چلے گئے۔ گھر میں ہم صرف چار افراد تھے۔ ابا جان، امی جان، میں اور طارق صاحب...... بھائی جان ایوب صاحب کراچی جا چکے تھے، وہ اپنا کماتے اور کھاتے تھے۔ ان کی شادی بھی الحمدللہ! ہم نے بڑے شوق سے کر دی تھی اور وہ فیملی کو لے کر کراچی سیٹ ہو گئے تھے۔

چار افراد کے لیے ہمارے ہاں جو آمدن تھی وہ الحمدللہ! بڑی معقول تھی۔ ہم جب اپنے حالات لوگوں کو بتاتے تو وہ تعجب کرتے۔ مجھے جمعہ پڑھانے کا بڑا شوق تھا۔ میں جب میٹرک میں پڑھتا تھا تو کسی نہ کسی مسجد کی تلاش میں رہتا، تاکہ مجھے جمعہ پڑھانے کا موقع مل جائے۔ جب دینی تعلیم حاصل کر لی تو یہ شوق اور بڑھ گیا۔ رسول نگر میں ہمارے ایک عزیز چچا مظفر حسین صاحب رہتے تھے۔ یہ والد صاحب کے بچپن کے دوست تھے۔ رسول نگر میں ایک مسجد کے متولی تھے۔ میں نے جمعہ پڑھانے کی خواہش ظاہر کی، ان کی طرف سے مثبت پیغام ملا تو میں کافی عرصہ تک شہر رسول نگر میں جمعہ پڑھاتا رہا۔ اس وقت میں چھوٹا سا تھا۔ عموماً سائیکل پر جاتا یا تانگے پر چار آنے کرایہ دے کر چلا جاتا۔ الحمدللہ! خطبے کا کبھی کوئی معاوضہ لیا نہ ہی کبھی ذہن میں اس کا خیال آیا۔ ہاں البتہ ایک مرتبہ چچا مظفر صاحب رحمہ اللہ نے ایک روپیہ مجھے ضرور دیا تھا۔ نہ جانے انعام کے طور پر تھا یا کرایہ کی مد میں تھا۔ یہ ایک روپیہ آج 42 سال گزرنے کے باوجود مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

دوآبہ رائس ملز کے قریب ایک گاؤں چک چٹھہ تھا۔ وہاں پر احناف کی مسجد تھی۔ وہاں حکیم عطاء اللہ صاحب تھے، جو بڑے مشہور طبیب تھے، دماغی امراض کے ماہر تھے۔ ایک بار میں ان سے ملا اور انھیں بتایا: میں اہلحدیث ہوں، جمعہ پڑھانے کا شوق ہے، اگر اجازت دے دیں تو میں فی سبیل اللہ پڑھاؤں گا، وہ مان گئے، مگر ساتھ یہ شرط رکھی کہ تم

صرف تقریر کرو گے، عربی میں جمعہ ہمارا مولوی پڑھے گا، میں نے موافقت کر لی۔ ان مولوی صاحب کو تقریر کرنا نہ آتی تھی۔ میں خوب تیاری کر کے جاتا، بڑے جوش وخروش سے تقریر کرتا وہ عربی میں خطبہ پڑھاتے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ سلسلہ خاصی مدت تک چلتا رہا۔

اس گاؤں میں مرزائیوں کے بھی کئی گھرانے آباد تھے۔ اس لیے حکیم صاحب مختلف علمائے کرام کی تقاریر کرواتے رہتے تھے، موضوع ختم نبوت ہوتا، حکیم عطاء اللہ صاحب ختم نبوت کے پروانے تھے۔ مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ کی متعدد تقاریر میں نے چک چٹھہ میں سنی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ حکیم صاحب نے ایک دن مجھے چائے بھی پلائی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرا شوق پورا ہوتا رہا۔ میرا مقصد پیسہ کمانا نہیں تھا۔ اللہ تعالی نے مجھے بڑی برکت دی تھی۔ ایک دن حکیم صاحب نے مجھے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے دور کا چھپا ہوا اشتہار بھی دکھایا جس میں مرزا نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی ہوئی تھی۔ بعدازاں مرزا صاحب مباہلہ میں شکست کھا کر مولانا ثناء اللہ کی زندگی ہی میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔

اسی دوران مجھے حافظ آباد میں جمعیت شبان اہلحدیث کی مقامی تنظیم قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت یہ اہل حدیث نوجوانوں کی فعال تنظیم تھی اور یہ اہل حدیث یوتھ فورس کی تشکیل سے پہلے کی بات ہے۔ میں مختلف اہل حدیث مساجد میں جاتا، وہاں مختصر سی تقریر کرتا اور نوجوانوں کو اس تنظیم میں شامل ہونے پر ابھارتا۔ الحمدللہ! دیکھتے ہی دیکھتے مختلف مساجد سے ہمیں متعدد نوجوان مل گئے۔ ہم نے اس کا ایک ڈھانچہ بنایا۔ صدر کے لیے ہم نے مولانا محمد داود نتوی صاحب کا انتخاب کیا۔ نائب صدر میاں فضل حق کے بھتیجے

جناب چوہدری محمد عارف صاحب بنے۔ اس کا ناظم اعلیٰ مجھے بنایا گیا، چلیے جناب! شہر میں جمعیت شبان اہلحدیث بن گئی۔ ہم نے مختلف اکابرین کے ساتھ مل کر مختلف علاقوں میں تبلیغی پروگرام بنائے۔ مولانا حکیم ابراہیم صاحب سے لمبی ملاقاتیں ہوئیں، حافظ آباد ان کا شہر تھا، انھوں نے بھی ہماری حوصلہ افزائی کی۔ ہم نے علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب کو حافظ آباد آنے کی دعوت دی۔ مولانا عبداللہ صاحب گوجرانوالہ سے آئے۔ مگر علامہ صاحب نہ آسکے کیونکہ اسی دن ساہیوال میں ان کا جلسہ عام پہلے سے طے تھا۔ میں ان کے گھر شادمان کالونی میں ان سے ملا۔ خاصی دیر ان کو منانے کی کوشش کرتا رہا، مگر ان کا کہنا تھا: میں ساہیوال پہلے سے وقت دے چکا ہوں۔ ہمیں تو بعض بزرگوں نے یہ کہا تھا کہ آپ پروگرام کی تاریخ تبدیل کر لیں، علامہ صاحب آپ کے جلسہ میں آجائیں گے، مگر بوجوہ ایسا نہ ہوسکا، بہرحال علامہ صاحب کے انکار سے ہمیں خاصی مایوسی ہوئی۔ پروگرام مولانا یحییٰ صاحب مرحوم کی مسجد میں رکھا گیا۔ ہم نوجوان علامہ صاحب کے شیدائی تھے۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ نہیں آرہے تو ورکرز نے پروگرام کی کامیابی کے لیے کوئی زیادہ محنت نہ کی۔ ہمارے پاس کوئی خاص مقرر نہیں تھا۔ بس کامونکی سے سٹوڈنٹ لیڈر مسعود کھوکھر کو بلا لیا گیا۔ ان کی خطابت کی بڑی دھوم تھی، مگر سامنے زیادہ مجمع نہیں تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریر زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔ پھر بھی شبان اہلحدیث حافظ آباد کا کام کسی حد تک چلتا رہا۔ ہم کبھی کبھار چھوٹا موٹا پروگرام کر لیتے۔ کبھی کسی قریبی گاؤں چلے جاتے اور وہاں پروگرام ہو جاتا۔ ان دنوں میں نے تحریک پاکستان میں اہل حدیث کی خدمات پر مشتمل ایک دو پمفلٹ بھی شائع کروائے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ہم نے بہت زیادہ کام کیا۔ ہمارے پاس فنڈز نہ ہونے کے برابر تھے، پھر بھی ایک ڈھانچہ

ضرور تھا۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے بتا تا چلوں کہ ہماری یہ ملز پاکستان رائس ملز ایسوسی ایشن کے تحت حکومتی نگرانی میں بھٹو صاحب کے دور میں قائم کی گئی تھی، یہ نیم سرکاری ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ پورے پنجاب میں اس طرح کی چھ ملز قائم کی گئیں۔ ہماری ملز میں مستقل اور جز وقتی ملازمین ملا کر کل تعداد تین سو کے قریب بن جاتی تھی۔ سرکاری حکام سے مطالبات منوانے کے لیے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھی ایام میں دوآبہ رائس ملز میں ملازمین کی یونین بنانے کا جنون مجھ پر طاری ہوگیا، چنانچہ ہم لوگوں نے دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین کے نام سے ایک ورکرز یونین بنالی۔

میں اس کا چیف آرگنائزر اور جنرل سیکرٹری تھا۔ اس کے لیٹر ہیڈ پر میرے گھر محلّہ بہاولپور کسو کے روڈ گلی نمبر 2 کا پتا دیا ہوا تھا بلکہ اسی ایڈریس پر یونین کی رجسٹریشن ہوئی۔ بڑی ہنگامہ خیز زندگی تھی، میں بارہ چودہ گھنٹے کام کرتا، خوب کماتا اور خوب خرچ کرتا۔ ہاتھ کھلا تھا۔ ورکرز گھر آتے تو انھیں کھانا کھلاتے یا کم از کم برفی اور چائے کے بغیر تو کسی کو جانے نہ دیتے۔ ہر چند کہ گھر کے اخراجات والدہ صاحبہ کے سپرد تھے اور اچھی بات یہ تھی کہ وہ بھی کھلے دل کی تھیں۔ گھر میں ہر روز گوشت پکتا، امی جان مہمان نواز تھیں۔ ہمارا گروپ جس کا ذکر میں کر چکا ہوں خاصا مضبوط تھا۔ میں جو بھی ان دوستوں سے کہتا وہ فوراً مان جاتے۔ میرے نزدیک کسی بھی جگہ کسی بھی گروپ کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ساتھیوں کو ایک دوسرے پر بے حد اعتماد ہو۔ جسے آپ اپنا لیڈر منتخب کریں اس کی ہر بات بلاچون وچرا تسلیم کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ساتھیوں کو بہت زیادہ باہمی اعتماد حاصل تھا۔ یونین کے سلسلہ میں مجھے شروع میں بے حد محنت کرنا پڑی۔ کتنی ہی بار اس کی رجسٹریشن

کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ پنجاب میں مختلف جگہوں پر دوآبہ رائس ملز کے چھ یونٹ تھے۔ میں نے کوشش کی کہ ہم ان تمام یونٹوں کے ورکرز کو ایک جگہ اکٹھا کریں۔ میں نے ان یونٹس کا دورہ کیا۔ لاہور میں مینار پاکستان تلے اجتماع بھی کیا۔ کافی جگہ سے نمائندے آئے تھے۔ ورکرز کے نہ ختم ہونے والے مطالبات ہوتے ہیں۔ سب سے اہم مطالبہ تنخواہوں میں اضافے کا ہوتا ہے۔ ہم نے ہیڈ آفس کو لکھا ہوا تھا کہ ہماری تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ ہمارا صدر ایک ان پڑھ ورکر تھا، مگر تھا بڑا دلیر اور بہادر، نام غالباً لطیف شاہ تھا، مشکل وقت میں اس نے مکمل ساتھ دیا اور کبھی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں۔

برادران محمد عارف اور محمد منور صاحبان میرے مشیران خاص تھے۔ بجلی محلّہ میں ان کے گھر اکثر جایا کرتا تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھ کر مختلف کاموں کی پلاننگ کرتے۔ منور صاحب کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کی اس وقت چھوٹی سی پیاری سی ایک بیٹی شائستہ تھی میں اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی۔ اس سے پوچھتے: آپ کا نام کیا ہے؟ تو جواب میں کہتی: اس ناچیز بندی کو شائستہ منور کہتے ہیں۔ عارف اور منور دونوں بھائی چونکہ ایڈمن گروپ کا حصہ تھے اس لیے ہمیں اندر کی خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ ہم سب کی مالی حالت بتدریج بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ نوکری کے پہلے سال 1976ء میں عید قربان آئی تو میں نے قربانی کرنے کی نیت کی، مگر قربانی کے پورے پیسے پاس نہ تھے۔ والد صاحب کی اجازت سے ضمیر حیدر سے ایک سو روپے ادھار لیے اور خوبصورت جانور خرید کر لائے۔ برادر عزیز محمد طارق شاہد ان دنوں سکول میں زیر تعلیم تھے۔ اس قسم کے کام وہی کرتے تھے۔ ہم نے بڑے شوق سے قربانی دی۔ اس کے بعد سے میں نے الحمدللہ! آج تک غربت نہیں دیکھی۔ اب اللہ کا فضل ہے میں ہر سال کئی قربانیاں کرتا ہوں۔ میرے

نزدیک میرے رزق میں برکت کا ایک سبب قربانی بھی ہے۔ گھر میں برکتیں تھیں، بہاریں تھیں۔ والد اور والدہ ٹوٹ کر محبت کرتے۔ گھر میں ہر روز کھانا میری مرضی کا پکتا۔ میں جو کہہ دیتا گھر والے وہی مانتے تھے۔ انھوں نے مجھے بہت پیار دیا۔

اکاؤنٹس سیکشن نے بنک والوں سے مطالبہ کیا کہ ہمارے ورکرز کو تنخواہ پر نئے نوٹ ملنے چاہییں۔ پانچ روپے کے سو نوٹوں کی گڈی تنخواہ میں ملتی تو سیدھا گھر لا کر گن کر آدھے والد صاحب اور آدھے والدہ صاحبہ کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ یہ سلسلہ الحمدللہ! جب سے میں نے کمانا شروع کیا جاری تھا کہ اپنی تنخواہ لا کر والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو دیتا۔ اس زمانے میں پانچ روپے کے نئے نوٹوں کی بہت اہمیت تھی۔ میں عموماً والدہ صاحبہ سے کہتا: امی جان! جھولی آگے کریں وہ جھولی پھیلا دیتیں، میں نوٹ ان کی گود میں ڈال دیتا، کبھی کبھار وہ ان نوٹوں کو چوم لیتیں اور کہتیں: یہ میرے عبدالمالک کی کمائی ہے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے، کس قدر مسرت اور خوشی ملتی، وہ دونوں کتنی دیر تک دعائیں دیتے رہتے۔ میرے ہاں جو برکت آئی ہے، اس کا ایک بہت بڑا سبب والدین کی رضا اور ان کی دعائیں بھی تھیں، گھر کا بجٹ کوئی زیادہ بڑا نہ تھا۔ پیسے اکٹھے ہو گئے تو انھی ایام میں ہم نے پرانا گھر گرا کر نیا گھر بنایا اور جو پس انداز کیا تھا، گھر پر خرچ کر دیا۔

ان دنوں جب میں گھر میں ہوتا تو والدین کو ہر وقت ہنساتا رہتا۔ کوئی نہ کوئی لطیفہ کوئی چٹکلہ، مزے لے لے کر دفتر کی باتیں سناتا تو وہ ہنستے رہتے، خوش ہوتے اور دعائیں دیتے۔ قارئین کرام! میں خود نمائی کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ کی نعمت کے بیان اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ میرے والدین مجھ سے کتنے راضی تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کتنی ہی بار والد اور والدہ صاحبہ نے کہا: اللہ نے ہمیں بیٹا نہیں فرشتہ عطا

کیا ہے۔ گھر میں خوشیاں تھیں، رونقیں تھیں اور بہت برکتیں تھیں۔ والدہ صاحبہ اپنے محلے میں بڑی مقبول تھیں۔ وہ لوگوں کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتی رہتیں۔ میں نے گھر کی الماری میں بخار، نزلہ اور کھانسی وغیرہ کی کچھ دوائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ امی جان محلّہ کی عورتوں کو دوائیں دیتی رہتیں۔ کسی کو بخار، نزلہ یا پیٹ میں درد ہوا تو وہ خالہ جی کے پاس دوڑتی آتی، والدہ اسے دوائی دیتیں اور واقعی اسے اللہ کے فضل سے آرام آجاتا۔ میں ان سے کہتا: امی جان! اللہ کے لیے یہ دوائیں ان کو نہ دیا کریں، یہ ڈاکٹر کا کام ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی کو غلط دوا دے دی تو پھر کیا بنے گا؟ وہ جواب میں فرماتیں: ان لوگوں کو مجھ پر بڑا اعتماد ہے۔ الحمدللہ! میں ان کو دوائیں دیتی ہوں تو یہ ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ ہماری ایک رشتہ کی پھوپھی مریم صاحبہ کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔ ایک دن کہنے لگیں: ''رضیہ'' ایم بی بی ہے اور میں صرف ''ایس'' ہوں۔

محلّہ میں اہلحدیثوں کی کوئی مسجد نہ تھی۔ ہمارے گھر کے بالکل سامنے بریلوی مکتب فکر کی مسجد تھی، مولوی محمود صاحب اس کے پیش امام تھے۔ ان کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ میں ان کے پاس بیٹھتا تو خوب بحث کرتا، ان کا عقیدہ زیادہ خراب نہ تھا، بلکہ کافی اچھا تھا۔ بس لوگوں کے ڈر اور طمع کے باعث بریلوی بنے ہوئے تھے، ورنہ دلی طور پر اچھے عقائد رکھنے والے تھے۔ جب میں کافی دیر تک گھر نہ آتا تو والدہ صاحبہ فرماتیں: جاؤ دیکھو! عبدالمالک مولوی محمود صاحب کے پاس بیٹھا ہوگا، وہ خاصے بوڑھے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی بڑی محبت سے پیش آتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محلّہ کی تمام چھوٹی بڑی عورتیں ہمیں عزت، احترام اور شفقت سے دیکھتی تھیں۔ ہم بھی ان کو اپنی ماں بہن سمجھتے تھے۔ کوئی بھی پردہ نہ کرتی تھی۔ گھروں کے دروازے عموماً کھلے ہوتے تھے۔ خاص طور پر جن سے دیوار ملی

ہوتی تھی، ان سے تو بہت قریبی تعلقات ہوتے تھے۔ ذرا سا اچھا کھانا بنا تو لازماً ایک دوسرے کو بھجواتے ورنہ وہ خود مانگ لیتے اور اس چیز کو قطعاً معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ہمسایے میں سید سلیمان ہاشمی کا گھر سب سے قریب تھا۔ خالہ غفور صاحبہ ماؤں جیسا سلوک کرتیں، ہر بات ان سے شیئر ہوتی۔ اللہ مغفرت کرے! دونوں اللہ کے پاس جاچکے ہیں، مگر ان کی سنہری یادیں باقی ہیں۔

کاتب یا خوشنویس کی زندگی بھی ایک محنت کش کی زندگی ہوتی ہے۔ جب تک قلم چل رہا ہے یعنی کاتب لکھ رہا ہے تو اسے آمدنی ہو رہی ہے۔ جیسے ہی اس نے قلم رکھا اور لکھنا بند کیا تو اسی وقت پیسے ملنے بند ہو گئے۔ ہمارے خاندان کے لوگ عموماً صبح سویرے فجر کے بعد کتابت کے لیے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ الحمدللہ! ساری نمازیں ادا کرتے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرتے۔ باقی وقت بیٹھ کر کتابت کرتے رہتے۔ میں بھی نوکری کے ساتھ ساتھ کتابت کرتا تھا۔ عام لوگوں کے مقابلہ میں بڑی اچھی اجرت لیتا تھا۔ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ میں فی صفحہ اجرت دس روپے لیتا تھا، جو خاصی معقول بلکہ عام کاتبوں سے زیادہ تھی۔ جب مجھے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو میں مفتی عبدالواحد صاحب کو خط لکھ دیتا کہ میں فلاں دن آ رہا ہوں میرے لیے پیسے تیار رکھیے گا۔ حافظ آباد سے گوجرانوالہ تک کراؤن بس سروس ایک سے سوا گھنٹہ میں پہنچا دیتی تھی۔ مفتی عبدالواحد، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، بڑے شریف النفس اور بھلے مانس انسان تھے۔

ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ بڑے متواضع عالم دین تھے۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا، وہ بھی محبت و شفقت فرماتے تھے۔ انھیں میرا انتظار رہتا، میں میٹھی میٹھی باتیں کر کے ان کا دل بہلاتا۔ شاید اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت کم مسکراتے تھے، میں جاتا تو کھل اٹھتے،

پہلی منزل پر ان کا حجرہ تھا، معاملے کے بڑے کھرے تھے۔

کاتب کے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہوتی تھی کہ اسے کام کا معاوضہ فوراً مل جائے۔ میں جاتا تو فوراً پیسے ادا کر دیتے، میرے کام سے بڑے مطمئن تھے۔ میں ان سے کہتا: مفتی صاحب! آیئے پورا صفحہ پڑھتے ہیں۔ اب اصل مسودہ ان کے ہاتھ میں ہوتا اور میں کتابت شدہ صفحہ ہاتھ میں لے کر پڑھنا شروع کر دیتا۔ مجھے الحمدللہ! اپنے اوپر مکمل اعتماد تھا کہ میں بہت کم غلطی کرتا ہوں۔ خیر ہم A4 جتنا صفحہ پڑھ جاتے کوئی غلطی نہ نکلتی، میں کہتا: مفتی صاحب! لایئے ایک روپیہ، وہ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور ایک روپیہ نکال کر کہتے: تم بہت تنگ کرتے ہو، یہ رہا تمھارا انعام۔ اب میں ان سے کہتا: مفتی صاحب! کیا میں آپ کا مہمان نہیں ہوں؟ میں حافظ آباد سے آیا ہوں۔ وہ کہتے: بے شک تم میرے مہمان ہو، تو پھر میری ضیافت کریں۔ وہ فرماتے: ٹھیک ہے، بیٹھو ابھی لڑکا بھجواتے ہیں، وہ گھر سے کھانا لے کر آتا ہے۔ میں کہتا: نہیں جناب! میں نے تو سیالکوٹی دروازے سے سری پائے کھانے ہیں۔ وہ فرماتے: جاؤ! جا کر پائے کھاؤ، مگر اس کے لیے سات روپے آپ دیں گے کیونکہ میں آپ کا مہمان ہوں۔ وہ انکار کرتے، میں اصرار کرتا، تھوڑا سا تنگ کرنے کے بعد وہ بالآخر سات روپے دے دیتے۔ ایک روپیہ اور دیجیے مجھے کشمیری چائے بھی پینی ہے۔ وہ روپیہ مل جاتا تو میں تین روپے کھیر کے لیے مانگ لیتا، وہ مجھے اولاد کی طرح چاہتے تھے، اسی لیے تو اس قسم کے محبت بھرے مطالبات ہوتے، وہ میرے یہ مطالبات سن کر اور مان کر خوشی محسوس کرتے۔ ساتھ ساتھ کہتے: بھئی تم تو بڑے عجیب مہمان ہو۔ یہ ان کا اعلیٰ اخلاق تھا، ورنہ بعض علماء تو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔

کبھی کبھار کھانا ان کے گھر سے بھی آجاتا، بڑا مزیدار کھانا ہوتا تھا۔ ایک دن میں گیا تو

ان کے کمرے میں اسٹوو پر دیگچی رکھی ہوئی تھی۔ مفتی صاحب کو سلام کیا اور سیدھا دیگچی کی طرف بڑھا، ڈھکنا اتار کر دیکھا تو اس میں کھیر تھی۔ میں نے نعرہ مارا: مفتی صاحب! آج تو بہت مزا آئے گا۔ کہنے لگے: پہلے کام دو...... یہ کھیر میں نے تمھارے ہی لیے خصوصی طور پر تیار کروائی ہے، اس لیے کہ تمھیں کھیر بڑی پسند ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، میں ان کے ساتھ اسی طرح باتیں کرتا تھا جس طرح کوئی لاڈلا بیٹا اپنے والدین کے ساتھ کرتا ہے۔

"معانی الآثار" بہت بڑی کتاب تھی۔ ایک دن فرمانے لگے: گوجرانوالہ کی کچی آبادی میں مولانا قاضی شمس الدین صاحب ہیں۔ انھوں نے عربی میں تفسیر لکھوانی ہے۔ اس میں پورا قرآن بھی ہے اور اس کی عربی میں تشریح بھی ہے۔ ہمارا کام تو کافی لمبا ہے، اس میں اب کچھ عرصے کے لیے وقفہ آئے گا، مگر قاضی صاحب کو ایک اچھے خطاط کی ضرورت ہے، آپ ان سے ضرور ملیں۔ دراصل اچھا خطاط آسانی سے ملتا نہ تھا۔ میں بہت اچھا خطاط تو نہ تھا، مگر کام کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا۔ میرے والد، دادا، پردادا، ان کے والد اور دادا سبھی خطاط تھے۔ اس لیے یہ کام میرے رگ و پے میں داخل تھا۔ اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ میں کتابت میں بہت کم غلطیاں کرتا تھا اور یہ خوبی بہت کم کاتبوں میں تھی۔ پھر مجھے عربی زبان بھی آتی تھی۔ خیر میں قاضی صاحب کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے دس روپے فی صفحہ دینے کی پیشکش کی۔ اس صفحہ کی لمبائی چوڑائی بھی پہلے کام کی نسبت بہت تھوڑی تھی، اس لحاظ سے یہ معاوضہ بہت زیادہ تھا۔ الحمدللہ! میں نے اور والد صاحب نے مل کر یہ تفسیر لکھی۔ قاضی شمس الدین معاملے کے نہایت کھرے تھے۔ میں جب بھی ان کے پاس جاتا لازماً خط لکھ کر جاتا کہ میں فلاں دن اور فلاں وقت آ رہا ہوں، میں وقت کی پابندی

کرتا، اور وقت مقررہ پر پہنچ جاتا۔ آیئے اب آپ کو قاضی صاحب سے ملاقات کا منظر دکھاتا ہوں۔

میں کچی آبادی میں ان کے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا ہو کر گھنٹی دباتا۔ پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد گھر کا کوئی فرد بیٹھک کا دروازہ کھولتا، میں اندر داخل ہوتا۔ سامنے قاضی صاحب بیٹھے ہوتے۔ میں سلام کرتا۔ اچھا، عبدالمالک! تم آگئے، میں کتابت شدہ صفحات پیش کرتا۔ وہ اوپر والا اور نیچے والا صفحہ نمبر دیکھتے۔ جتنے صفحات میں لکھ کر لایا ہوتا اسے دس سے ضرب دیتے۔ بڑی عمر کے باعث کانپتے ہاتھوں سے اوپر پڑا ہوا بریف کیس اتارتے، اس کام میں اکثر ان کی مدد کرتا۔ وہ بریف کیس کھولتے، کڑک کی آواز آتی، اس میں پیسے پڑے ہوتے، انھیں گنتے اور میرے حوالے کر دیتے۔ میں پیسے جیب میں ڈالتا، اور وہ اگلا مسودہ میرے حوالے کر دیتے۔ میں اسے اپنے بریف کیس میں ڈال لیتا۔ اب وہ پوچھتے: آپ پانی پئیں گے یا چائے؟ اب بھلا جسے آتے ہی معقول رقم مل جائے، اسے اور کیا چاہیے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا، وہ فرماتے: اپنے والد صاحب کو میرا سلام کہنا۔ میں ان شاء اللہ کہتا اور دعائیں دیتا ہوا واپسی کے لیے چل پڑتا۔ قاضی صاحب کے اس حسن سلوک کو میں علمائے کرام کے اخلاق فاضلہ سے تعبیر کرتا ہوں۔

دوآبہ رائس ملز میں ہمارے پاس اپنی آمدنی کے علاوہ یونین فنڈ بھی ہوتا تھا۔ ڈاکٹر خالد اختر اس کے انچارج تھے۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے تھوڑا بہت لین دین کرتے رہتے تھے۔ یونین کا کاروبار بھی اسی وقت چلتا ہے جب وہ مشکل میں کارکنوں کے کام آئے۔ ہم ضرورت مند کارکن کو چھوٹا موٹا قرض اپنی جیب سے، دوسرے لوگوں سے یا پھر یونین فنڈ سے دلوا دیتے۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو جاتا۔

ایک واقعہ جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے، مگر اس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ہم صبح سویرے جب ڈیوٹی پر پہنچتے تو سارا گروپ کھڑے ہو کر اخبار دیکھتا۔ آپس میں گپ شپ لگاتے، انتظامیہ کو کوستے کہ اس نے ہماری تنخواہیں نہیں بڑھائیں۔ پھر ڈیوٹی کی جگہ روانہ ہو جاتے۔ ایک دن ایک چپڑاسی میرے پاس آیا اور آ کر قرض حسنہ کا مطالبہ کیا۔ اس دن نہ جانے میرا موڈ خراب تھا یا کوئی بات شیطان نے دل میں ڈال دی تھی کہ جب اس نے قرض مانگا تو میں نے انکار کر دیا۔ وہ شدید ضرورت مند تھا۔ اس نے پھر درخواست کی، میں نے پھر انکار کر دیا۔ کہنے لگا: مجاہد صاحب! آپ کے لیے قرض دینا کون سا مشکل کام ہے؟ آپ مجھے کسی بھی ساتھی سے دلوا دیں۔ ہمارے ہاں یہ عام سی بات تھی کہ کسی کو بھی ضرورت ہوتی تو میں اپنی طرف سے نہ دے سکتا تو کسی کو اشارہ کر دیتا اور اسے قرض مل جاتا، وہ تنخواہ پر واپس کر دیتا۔ اس روز میں نے اس کی یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ اب وہ کہنے لگا: صاحب! اگر آپ کسی سے نہیں دلوا سکتے تو یونین فنڈ سے دلوا دیں۔ ہمارے پاس یونین فنڈ میں ہمیشہ معقول رقم موجود ہوتی تھی۔ ڈاکٹر خالد بھی ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے کہا: نہیں، یونین فنڈ سے بھی نہیں دوں گا۔ اب وہ مایوس ہو گیا۔ اس نے واپس جاتے ہوئے اسی دائرے میں کھڑے ایک ساتھی سے کہا: مجاہد صاحب تو قرض نہیں دے رہے، آپ دے دیں۔ اس نے اسی وقت کہا: ٹھیک ہے، یہ لو! اور اس کے ساتھ ہی اس نے جیب سے رقم نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

قارئین کرام! اس واقعہ نے میری زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ لوگوں کے کام آنا، ان کی خیر خواہی کرنا، اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ میں نے سوچا: عبدالمالک! ذرا غور تو کرو، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی حاجت پوری کرنا تھی۔ وہ تمھارے پاس آیا،

درخواست کی، التجا کی، اس نے کئی طریقے بتائے لیکن تم نہیں مانے۔ تم نے خیر کا یہ کام نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ کسی اور سے کروادیا اور ایک دوسرے شخص کو یہ نیکی اور اجر وثواب مل گیا۔ میں واقعی بہت پشیمان تھا۔ میں نے توبہ واستغفار کی اور آئندہ کے لیے تہیہ کرلیا کہ اگر میرے پاس گنجائش ہوئی تو میں کسی کو حتی الامکان قرض دینے سے انکار نہیں کروں گا۔

اللہ کا شکر ہے نماز تو میں نے ہمیشہ ادا کی ہے اور کبھی نہیں چھوڑی۔ سفر میں کبھی تاخیر ہوگئی ہو تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ سفر میں بالعموم نمازیں جمع کر لیتا تھا۔ ملز کے باہر نہر کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تھی، عموماً ہم وہاں نماز ادا کرتے تھے۔ پھر ہم نے ایڈمن بلاک کے قریب مسجد کے لیے تھڑا بنالیا۔ اس کا باقاعدہ محراب بنایا، اوپر صفیں رکھ دیں۔ اگر میں خود ہوتا تو اذان کہہ کر جماعت کرواتا ورنہ کوئی بھی ساتھی امامت کے لیے آگے بڑھ جاتا۔

لیڈری کا شوق تو تھا ہی اس لیے ایک مرتبہ دماغ میں یہ سمایا کہ ہمیں اپنے مطالبات اخبارات کے ذریعہ حکام بالا تک پہنچانے چاہییں۔ اس مقصد کے لیے پریس کانفرنس کا اہتمام کرڈالا۔ حافظ آباد کے چار پانچ صحافیوں اور ایک فوٹو گرافر کو گھیر گھار کر ملز میں لے آئے۔ اکاؤنٹس کے شعبہ میں علی محمد اقبال اور ان کے بھتیجے محمد افضل تھے، وہ بھی کچھ دیر کے لیے یونین کے صدر اور سیکرٹری رہے۔ ان کے ساتھ مل کر یہ پریس کانفرنس کی۔ فوٹو گرافر کو پوز دیے۔ حافظ آباد میں وحید ٹائپ رائٹر کے نام سے ایک ادارہ تھا جو ٹائپ رائٹر پر درخواستیں لکھ کر دے دیتے تھے۔ حافظ آباد میں غالباً سب سے پہلے وہی فوٹو سٹیٹ مشین لائے تھے۔ اس کے مالک ''پاکستان ٹائمز'' کی نمائندگی کرتے تھے، شہر میں ان کی بڑی شہرت تھی، کسی پریس کانفرنس میں ان کی آمد بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ ہم ان کو

منت سماجت کر کے اس پریس کانفرنس میں لے آئے۔ صحافیوں کو غالباً ہم نے کھانا بھی کھلایا تھا۔ انتظامیہ کا کوئی آدمی شریک نہ ہوا۔ تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اندر سے خوش ہیں۔ کیونکہ تنخواہیں تو سب کی بڑھنی تھیں۔ خیر چند دنوں کے انتظار کے بعد اخبارات میں چھوٹی چھوٹی خبریں لگ گئیں۔ یہ خبریں ہماری توقع سے کہیں چھوٹی تھیں۔ مشرق میں میری فوٹو چھپی تو ہمارے محلّہ میں بڑا شور تھا کہ عبدالمالک کی فوٹو اخبار میں چھپی ہے۔ پاکستان ٹائمز میں سنگل کالمی خبر اس طرح لگی تھی:

Doaba Rice Mills workers demand for new pay scales.

اس کے آگے میرے نام کے حوالے سے لکھا تھا کہ اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہا ہے اور میری مختصر سی تقریر کا ذکر تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کسی شخص کا اخبار میں نام یا فوٹو آجاتا تو اسے بڑی بات سمجھا جاتا تھا۔

انھی ایام میں ایک مزدور لیڈر ''زیدی'' صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ علی پور کے قریب علی پور سیداں کے رہنے والے تھے۔ ہمیں لیبر یونین کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ ان دنوں ضیاء الحق صاحب کا مارشل لاء نیا نیا لگا تھا۔ مارشل لاء کے باوجود ابھی تک یونین پر زیادہ پابندیاں نہیں لگی تھیں۔ زیدی صاحب ہمارے پاس آئے، انھوں نے اچکن پہنی ہوئی، داڑھی صاف، لمبا اور بھاری بھرکم جسم، مجھ سے پہلے دوسرے ساتھیوں کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ان کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کمیونسٹ ذہن کے تھے۔ میں شکل وصورت ہی سے مذہبی تھا۔ جلد ہی یہ ہمارے اندر گھس گئے۔ ان کے پاس عدالتوں میں جانے کا، مقدمات لڑنے کا اور وکلاء کے ساتھ معاملہ طے کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔ خیر ہم نے انھیں بطور ایڈوائزر رکھ لیا۔ دوآبہ کا ہیڈ آفس لاہور میں تھا۔

انتظامیہ نے اب یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اگر میں یونین کی میٹنگ کے لیے حافظ آباد سے باہر جاؤں تو وہ چھٹی اور ٹی اے ڈی اے بھی دیں گے۔ ہم نے انتظامیہ پر کئی مقدمات دائر کر دیے، جن کے سلسلے میں تاریخیں بھگتنے کے لیے میں اکثر و بیشتر لاہور جاتا۔ میرے اوپر اخراجات کا بوجھ اس لیے نہیں تھا کہ ہر ملازم کی تنخواہ سے یونین فنڈ کٹ جاتا۔ یہ اچھی خاصی رقم بن جاتی تھی۔ اسے خرچ کرنے کا اختیار بڑی حد تک میرے ہی پاس تھا، تاہم حسابات ڈاکٹر خالد کے پاس ہوتے تھے۔ ہیڈ آفس نے بھی ہمارے وجود کو تسلیم کر لیا تھا، مگر اس کے لیے مجھے ایک یا دو سال تک خاصی جدو جہد کرنا پڑی۔ بلاشبہ میں نے یونین میں آ کر بہت کچھ سیکھا۔ اعلیٰ افسران سے ملاقات کیسے کی جاتی ہے؟ میٹنگ کیا اور کیسے ہوتی ہے؟ اس کے نتائج کیسے سمیٹے جاتے ہیں؟ سب کچھ معلوم ہو گیا۔ عموماً افسران انگلش بول کر اپنا رعب جھاڑتے تھے۔ الحمدللہ! میں نے بھی انگلش بولنا سیکھ لی۔ ایک خطیب کے لیے کسی بھی زبان میں مافی الضمیر کا اظہار مشکل نہیں ہوتا۔ میں کوئی فرشتہ نہیں لیکن الحمدللہ! یونین فنڈ سے کبھی کوئی فائدہ اٹھایا نہ ہی انتظامیہ سے کچھ لیا۔ میرا ضمیر مکمل طور پر مطمئن تھا، اس لیے میں کھل کر بولتا۔ میرے پیچھے صرف میرا گروپ ہی نہیں بلکہ ملز کے مزدوروں کی اکثریت تھی، جو میرا دم بھرتے تھے۔ نہایت عزت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ آدمی میٹنگ میں جب بولتا ہے تو اگر اس کے پیچھے قوت اور طاقت ہو تو پھر وہ خوب گرجتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا گروپ مضبوط تھا۔ جناب منور صاحب، عارف صاحب، ڈاکٹر خالد صاحب، عطاء اللہ تارڑ صاحب جیسے با اعتماد خاص دوست اور مخلص لوگ میرے ساتھ تھے، ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔

ان دنوں کراچی میں بعض ورکر یونینز کا بڑا چرچا تھا۔ اخبارات میں ان کے بیانات

چھپتے، سرخیاں لگتیں، وہ لوگ جب چاہتے ہڑتال کروا دیتے۔ زیدی صاحب کہنے لگے: چلو ہم کراچی چلتے ہیں، وہاں لیبر لیڈر ''نبی احمد'' صاحب کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں۔ تمھارا ان سے تعارف کرواتے ہیں۔ تم بڑے بڑے لیڈروں سے ملو۔ ان لوگوں کا تعاون مل گیا تو سمجھ لو کہ حکومت تمھارے مطالبات تسلیم کر لے گی۔

میں کراچی پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ ساتھیوں سے طویل مشورے کے بعد تیار ہو گیا۔ حافظ آباد سے شاہین ایکسپریس کراچی کے لیے عصر کے بعد چلتی تھی اور اگلے دن دس بجے کے بعد کراچی پہنچا دیتی تھی۔ زیدی صاحب کا تو معلوم نہیں البتہ میری چچازاد بہن آپا جی عزیز کراچی ڈرگ روڈ میں رہتی تھیں، میں انھی کے پاس ٹھہرا۔ ان کے خاوند برادرم رشید شاہد صاحب روزنامہ مشرق کراچی میں کام کرتے تھے۔ اس سفر میں متعدد لیبر لیڈروں سے ملاقات ہوئی۔ بدقسمتی سے میری طبیعت خراب ہو گئی۔ بہرحال یہاں کی لیبر یونین نے ہمارے اعزاز میں ''ایرو کلب'' میں استقبالیہ دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر دیکھا۔ آپا جی عزیز نے بڑی محبت کی، ان کے بچے اس وقت چھوٹے چھوٹے تھے۔ ہم نے اپنا بچپن ایک ہی گھر میں گزارا تھا۔ ان کی محبت آج بھی یاد ہے۔ برادرم رشید صاحب کے الفاظ آج بھی یاد ہیں۔ آپ جن جن لوگوں سے مل رہے ہیں ان کی کارروائی ہمیں بتا دیں۔ مشرق میں شائع ہو جائے گی، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ہماری کوئی کارروائی اخبار میں چھپی تھی۔

وہ ایام میری زندگی کے اس لحاظ سے سنہرے ایام تھے کہ ہر طرف سے عزت وشہرت مل رہی تھی۔ نہ صرف محلے کے بلکہ شہر کے بیشتر لوگ بھی ہمیں جانتے اور پہچانتے تھے۔

ایک دن والدہ صاحبہ نے ایک خواہش کا اظہار فرمایا۔ کہنے لگیں: بیٹا عبدالمالک! مجھے

حج کا بڑا شوق ہے، مگر اس کے لیے وسائل درکار ہیں۔ تم ایسا کرو کہ سعودی عرب چلے جاؤ، وہاں کچھ عرصہ نوکری کرو۔ جب کچھ کما لو گے تو اولین فرصت میں مجھے حج کروا دینا۔ والد صاحب نے مثبت جواب نہ دیا۔ ادھر والدہ صاحبہ کا حکم تھا، ان سے شدید محبت تھی۔ بالآخر ان کی خاطر سعودی عرب جانے کا ارادہ کر لیا۔ ہاتھ پیر مارنے شروع کیے۔ برادرم عزیز نجیب الرحمٰن کیلانی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے ایک کرایہ دار کی سعودی عرب بھجوانے کے لیے شہزادا ایجنسی کے نام سے ریکروٹنگ ایجنسی ہے۔ یہ ایک لمبی سٹوری ہے کہ انھوں نے کتنا وقت اور پیسہ مجھے ریاض بھجوانے کا لیا۔ بہر حال میں دوآبہ سے اس حال میں رخصت ہوا کہ تین ماہ کی چھٹی لی۔ اس وقت ہمارے منیجر چوہدری محمد افضل صاحب تھے، ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے جانے دیا۔ میں نے ایک اجلاس بلوایا جس میں تمام ورکرز نے شرکت کی۔ ان سے معذرت کی، بتایا کہ میں سعودی عرب جا رہا ہوں۔ سچ پوچھیے تو میں وہاں سے روتے ہوئے نکلا۔ ساتھیوں کی اتنی محبت...... اتنی عزت...... لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو ووٹ دیا تھا۔ ہمیں آپ پر بھرپور اعتماد تھا، میں نے ان سے کہا: کوئی بات نہیں! میں مضبوط ہاتھوں میں یونین کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ میرے بعد عارف بھٹی صاحب نے یونین کے کام کو خوب آگے بڑھایا، نہایت قابل قدر کام کیے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک وہ بھی سعودی عرب نہ آگئے۔ بعد میں دوآبہ رائس ملز فروخت ہوگئی۔ شروع شروع میں خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رہا، جو آہستہ آہستہ کمزور ہوا اور بالآخر ختم ہوگیا۔

ذہن میں دوآبہ رائس ملز کی یادیں تو بہت ساری ہیں، مگر چند نام ضرور لکھوں گا: ہمارے پروجیکٹ منیجر جناب مسعود اکمل صاحب بڑے لمبے قد کے، خوبصورت جسم کے

مالک تھے۔ ان کے دور میں ہماری ملز نے خاصی ترقی کی۔ میری شفٹ کے انچارج جناب اختر صاحب بڑے نفیس آدمی تھے، ان کا تعلق لاہور سے تھا۔ اپنی فیملی سمیت حافظ آباد میں رہتے تھے۔ ہم رات کو اکٹھے سائیکلوں پر ملز ڈیوٹی کرنے کے لیے جاتے تھے۔ درمیانے قد کے سفید رنگ کے اختر صاحب سے میری خوب بنتی تھی۔ میں کئی مرتبہ عشاء کے بعد ان کے گھر آجاتا، ان کے ہاں سو جاتا۔ ہم اکٹھے نماز ادا کرتے اور آپس میں گپ شپ لگاتے۔ رات کو ہم لیبارٹری میں یونس صاحب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے۔ کام بھی کرتے، اس طرح ہنسی خوشی وقت اچھا گزر جاتا۔

ہماری ملز کا ایک کردار اقبال ڈرائیور تھا۔ مری کے علاقے کا رہنے والا اقبال بڑا خوبصورت آدمی تھا، اس کا چہرہ سفید و سرخ تھا۔ اونچے لمبے قد کا اقبال گاڑی چلاتا تھا۔ شام کے وقت فارغ ہوتا تھا۔ غریب آدمی تھا۔ اس نے کچھ اضافی مبلغ کمانے کے لیے چائے کا ایک کھوکھا بنا لیا۔ ہم اس سے چائے پیتے اور اسے پورے پیسے دیتے۔ کچھ باہر سے بھی گاہک آجاتے، مگر اس کے برتن زیادہ صاف ستھرے نہ تھے۔ ایک مرتبہ ہیڈ آفس سے جی ایم صاحب آئے۔ یونین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے میری ان سے ملاقات تھی۔ میں نے دوران ملاقات کنٹین کی زبوں حالی کی شکایت کی۔ اب مجھے صحیح یاد نہیں کہ انھوں نے برتنوں کے لیے پانچ سو روپے یا اس سے زائد رقم منظور فرمائی۔ یہ مبلغ یا برتن اقبال کو مل گئے۔ میری وہ عزت پہلے بھی کرتا تھا۔ اب مزید کرنے لگا، سارا دن دودھ کاڑھتا۔ اس پر جو ملائی آتی اسے علیحدہ رکھتا جاتا۔ میرا شام کو چائے پینے کا وقت مقرر تھا۔ میں چائے پینے کے لیے جاتا تو کئی اور لوگ بھی میرے ساتھ چل پڑتے۔ میرا یہ معمول تھا کہ جو بھی میرے ساتھ چائے کے لیے جاتا اس کے پیسے بھی میں ادا کرتا۔ اقبال میری

چائے میں بطور خاص ملائی ڈالتا۔ میرے ساتھیوں کو بھی ملائی میں سے حصہ مل جاتا۔ جو لوگ میرے ساتھ آئے ہوتے، اقبال انھیں دبے لفظوں میں کوستا رہتا: یہ مفت خورے ہر روز آجاتے ہیں، انھیں کچھ خیال کرنا چاہیے۔ میں اسے سمجھاتا رہتا کہ کیا کبھی میرے پاس پیسوں کی کمی آئی ہے۔ اس زمانے میں مرغی کی ٹانگ جسے Leg Piece کہتے ہیں بڑی مقبول تھی۔

وہ روزانہ مرغیاں ذبح کرتا، انھیں پکاتا اور بطور خاص میرے لیے رکھ دیتا۔ میں لیٹ بھی آتا تو بھی اس نے میرا حصہ بچا کر رکھا ہوتا۔ ہر چند کہ میں اسے پورا معاوضہ ادا کرتا، مگر اس کا میرے لیے اہتمام کرنا اور مجھ سے محبت کرنا میں ابھی تک نہیں بھولا۔ میں کبھی کبھار سوچتا ہوں، یہ غریب لوگ کتنے مخلص اور صاف دل ہوتے ہیں۔ اللہ اسے خوش رکھے، اب مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے، مگر ابھی تک اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

دوآبہ میں کام کے دوران میں نے موٹر سائیکل چلانا بھی سیکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑی بات تھی کہ کسی کو موٹر سائیکل چلانا آتی ہو یا وہ اس کا مالک ہو۔ میرے والدین کے لیے بھی یہ بڑی خوشی کی بات تھی۔ ایسا ہی سمجھ لیں کہ آج اگر آپ کو کوئی کہے کہ فلاں کا بیٹا پائلٹ ہے؟ سبحان اللہ! حالات کا پتہ نہیں چلتا کیا اور کیسے رخ اختیار کر جائیں۔ والدہ صاحبہ نے ایک رشتہ دار سے ذکر کیا: میرا عبدالمالک تو موٹر سائیکل چلاتا ہے۔ اس نے جواب میں کہا: دیکھنا، دیکھنا کہیں وہ کل کلاں کار چلانی شروع نہ کر دے۔ والدہ صاحبہ نے کہا: ہاں، ہاں، کیوں نہیں میرا اللہ اس پر بھی قادر ہے، ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی اور پھر واقعی وہ وقت آیا کہ ہمارے گھر میں پانچ اپنی کاریں تھیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ۔

■ والدہ صاحبہ بیت اللہ کو دیکھ رہی تھیں۔
میں ذرا قریب ہوا تو ماں جی مامتا کی شفقت
کے ساتھ بے اختیار کھڑی ہو گئیں، اور گلے لگا لیا۔

■ اچھا بیٹا! میں ابھی دو نفل پڑھ کر تمھارے لیے دعا کرتی ہوں۔

والدہ محترمہ کی یاد میں

1982ء کی بات ہے، مجھے سعودی عرب آئے ہوئے کم وبیش سوا دو سال گزر چکے تھے۔ یہ سال میرے لیے اس لیے بھی اہم تھا کہ والدہ صاحبہ حج کے لیے سعودی عرب آ رہی تھیں۔ مسجد الحرام کے بہت سارے دروازوں میں ایک بابِ بلال ہے۔ اس کے اندرونی حصوں میں ایک مرد درویش حافظ فتحی رحمہ اللہ بیٹھا کرتے تھے۔ ہندوستان و پاکستان سے آنے والے بہت سارے علمائے کرام کا مرکز یہی باب بلال ہوتا تھا۔ یہاں قرآن وسنت سے وابستہ علمائے کرام سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ محمد فتحی بصارت سے محروم تھے مگر دل کی بصیرت سے مالا مال تھے۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ انھیں ہاتھوں کے لمس ہی سے معلوم ہو جاتا کہ اُن سے کون ہاتھ ملا رہا ہے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات برادر عزیز ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی حفظہ اللہ کے توسط سے ہوئی تھی، پھر ان سے تعلقات کے مواقع بڑھتے چلے گئے۔ ریاض سے جب بھی عمرہ کے لیے جاتا، پہلے حافظ صاحب کو سلام عرض کرتا۔

والدہ محترمہ دو دن پہلے ہی حج بیت اللہ کے لیے محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب اور محترمہ باجی ثریا بتول صاحبہ کے ساتھ تشریف لائی تھیں۔ میں ان دنوں وزارت الدفاع والطیران ریاض میں ملازم تھا۔ بوجوہ ان کے استقبال کے لیے جدہ نہ جاسکا جس کا ہم دونوں کو ملال تھا۔ یہ بدھ کا دن تھا، وزارت دفاع میں ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد جب ہوائی جہاز کے ذریعہ جدہ اور پھر مکہ پہنچا تو احرام کی حالت میں تھا۔ میں جب سے سعودی عرب آیا تھا ابھی تک والدہ صاحبہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس وقت کہاں قیام فرما ہیں۔

باب بلال کے اندر حافظ فتحی تشریف فرما تھے۔ میں نے نہایت خاموشی سے ان کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ہاتھوں کے لمس سے معاً پہچان گئے، فرمانے لگے: عبدالمالک! ریاض سے آ گئے۔ تمھاری والدہ ماجدہ حرم کے صحن میں سیڑھیوں پر تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ میں بے تابانہ دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ والدہ صاحبہ بیت اللہ کو دیکھ رہی تھیں۔ میں ذرا قریب ہوا تو ماں جی ممتا کی شفقت کے ساتھ بے اختیار کھڑی ہو گئیں، گلے لگا لیا۔ میں ان کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ گردوپیش کے ماحول سے بے نیاز ہم دونوں ماں بیٹا رو رہے تھے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے، اللہ کی حمد وثنا بیان ہو رہی تھی۔ وہ فرما رہی تھیں: اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے ایسا بیٹا دیا ہے جس نے مجھے حج کی سعادت سے مشرف کرا دیا ہے۔ میں نے ان سے دعاؤں کی درخواست کی۔ انھوں نے فوراً اپنے

میں ان کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔ گردوپیش کے ماحول سے بے نیاز ہم دونوں ماں بیٹا رو رہے تھے۔

ہاتھ اٹھالیے۔دیر تک میرے لیے دعائیں مانگتی رہیں اور میں آمین کہتا رہا۔ یہ میرا اُن کے ساتھ پہلا حج تھا۔اس کے بعد الحمدللہ! متعدد بار ان کے ساتھ حج کرنے کی سعادت ملی۔عمرے تو اتنے ہوئے کہ ان کی تعداد کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

جب پہلا حج کیا تو ان کی صحت بڑی اچھی تھی۔اس دوران روزانہ کتنے ہی طواف کرتی تھیں۔ان کی ایک سہیلی حافظ آباد سے حج کے لیے آئی ہوئی تھیں۔دونوں میں یہ قابل رشک مقابلہ ہوتا کہ کس نے آج زیادہ طواف کیے ہیں۔میں نے ان سے عرض کی: امی جان آپ تھک جائیں گی، اپنے اوپر اتنی سختی کیوں کرتی ہیں؟ ان کا جواب تھا: بیٹا! کل کس نے دیکھی ہے، اللہ نے موقع دیا ہے تو اس سے خوب فائدہ اٹھانا چاہیے۔جب پاکستان میں تھیں تو وہاں بھی عموماً فجر کے بعد مصلے پر ہی بیٹھی رہتی تھیں۔میں جب بھی سعودی عرب سے فون کرتا تو مصلے پر ہی ہوتیں۔میں کہتا: امی جان! آج فلاں جگہ میری میٹنگ ہے، میرے لیے دعا فرمائیں۔وہ کہتیں: اچھا بیٹا! میں ابھی دو نفل پڑھ کر تمھارے لیے دعا کرتی ہوں۔اللہ کا شکر ہے کہ ان کی دعائیں قبول ہوتیں اور میں ہمیشہ میٹنگ سے کامیاب ہو کر اٹھتا تھا۔

ہر بچے کی طرح میں بھی اپنے والدین کا بڑا چہیتا تھا۔بچپن سے جوانی تک والدین کی بے پناہ محبت دیکھی۔ہم تین بھائی تھے۔ایک مجھ سے بڑے، محمد ایوب سپرا صاحب اور ایک مجھ سے چھوٹے محمد طارق شاہد۔یوں میں اپنے محترم والدین کا منجھلا بیٹا تھا۔ایک بھائی جو مجھ سے چھوٹا اور محمد طارق صاحب سے بڑا تھا بچپن ہی میں وفات پا گیا تھا۔عموماً والدین کی نگاہ میں سب سے بڑا بیٹا چہیتا ہوتا ہے، یا سب سے چھوٹا بیٹا مگر مجھے یہ صحیح طرح معلوم نہیں کہ ہم میں سے والدین کے نزدیک زیادہ چہیتا کون تھا؟

میرے خیال میں ہر ایک کا دعویٰ یہی ہوگا کہ وہ والدین کا لاڈلا تھا۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں بلا شک وشبہ اپنے والدین کا بڑا لاڈلا تھا۔ میری تعلیم وتربیت اور میری بہترین پرورش میں میرے والدین نے بڑا احسن کردار ادا کیا۔ میں بلاشبہ اپنے والدین کی نہایت عزت کرنے والا اور اُن سے محبت کرنے والا تھا اور آج میں الحمدللہ جس مقام پر کھڑا ہوں وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، میرے والدین کی اعلیٰ تربیت اور ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آج میرے والدین کو مجھ سے جدا ہوئے ایک مدت بیت گئی ہے، مگر اُن کی تربیت، اُن کی یادیں اور ان کی باتیں آج بھی لوحِ حافظہ پر چمکتی ہیں اور میرے خیالوں میں اُجالا کر دیتی ہیں۔

اللہ کے فضل سے مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہمارا گھرانہ دینی اور مذہبی تھا۔ میں نے بچپن میں قرآن کریم اپنی والدہ صاحبہ ہی سے پڑھا۔ وہ بہت زیادہ پڑھی لکھی نہ تھیں مگر قرآن کریم ان کو آتا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کتابیں، حافظ محمد بن بارک اللہ لکھوی کی احوال الآخرت اور زینت اسلام پڑھ لیتی تھیں۔ یہ کتابیں تو اس وقت اہل حدیث گھرانوں کی خواتین کو عموماً ازبر ہوتی تھیں۔ والدہ صاحبہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دوپہر کے وقت چرخہ کاتتیں اور یہ کتابیں ایک دوسری کو سنایا کرتی تھیں۔ خود مجھے بھی بچپن میں ان کے کچھ اشعار یاد ہو گئے تھے۔ ہمارے گھر کے افراد کو دینی مجالس میں شرکت کا ذوق وشوق رہتا تھا۔ والد صاحب جلسوں میں جاتے تو والدہ صاحبہ بھی بڑے شوق سے جاتیں۔ جمعہ پڑھنے کا خوب اہتمام کرتیں۔ اس طرح الحمدللہ! انھیں مسائل کا خوب علم ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں کتابیں بھی پڑھ لیتی تھیں۔ عورتوں کو باقاعدہ وعظ ونصیحت بھی کرتی تھیں۔ انھیں قرآن کریم حفظ کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ انھوں نے آخری پارے یاد کر

> گھر میں اصول تھا کہ اگر سبق پڑھ لیا ہے اور ابا جان کو یاد کر کے سنا دیا ہے تو ناشتہ ملتا تھا ورنہ نہیں۔

رکھے تھے۔ بچپن میں ہمیں لالچ دے دے کر اپنا سبق ہمیں سنا کر پختہ کرتیں۔ اپنے یاد کیے ہوئے پارے اور سورتیں ہمیں سنایا کرتی تھیں۔ نوافل کا بے حد اہتمام کرتیں۔ انھیں روزمرہ کی دعائیں خوب یاد تھیں۔ اٹھتے جاگتے اور سوتے وقت ان کے پڑھنے کا خوب اہتمام کرتیں۔ چوتھی جماعت سے فارغ ہونے تک میں نے سادہ قرآن کریم پڑھ لیا تھا، پھر والد محترم نے نہایت محبت سے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا۔ میں ساتویں جماعت میں تھا، جب ترجمہ ختم ہو گیا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد والد صاحب مجھے اور بھائی جان محمد ایوب صاحب کو سبق پڑھاتے۔ محبت اور پیار اپنی جگہ، مگر سبق کے معاملہ میں کوئی معافی نہ تھی۔ گھر میں اصول تھا کہ اگر سبق پڑھ لیا ہے اور ابا جان کو یاد کر کے سنا دیا ہے تو ناشتہ ملتا تھا ورنہ نہیں۔ والد صاحب خطاطی کا کام کرتے تھے۔ خطاطوں کو اس زمانے میں کاتب کہا جاتا تھا۔ والدہ صاحبہ باورچی خانے سے سر نکال کر والد محترم سے پوچھتیں: عبدالمالک نے سبق پڑھ لیا ہے؟ جواب اثبات میں ملتا تو ناشتہ مل جاتا ورنہ حکم ہوتا کہ سبق سنا دو تو ناشتہ مل جائے گا ورنہ بھوکے سکول جانا پڑے گا۔ ہر چند ایسے مواقع بہت کم آئے، مگر یہ خوف ضرور طاری رہتا تھا کہ سبق سنائے بغیر ناشتہ نہیں ملے گا۔

نماز کے معاملہ میں بھی والدین نے کبھی معاف نہ کیا۔ جیسے ہی والد صاحب گھر آتے تو والدہ سے پوچھتے کہ بچوں نے نماز ادا کی ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو پھر فوراً وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کا حکم ہوتا۔ ہم سب کے والدین پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں

ہوں! ان کی اعلیٰ تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں معاشرے میں بہترین مقام عطا ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اپنے والد محترم کی کمزوری تھا، وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے، مگر تربیت کے معاملہ میں کوئی معافی نہ تھی۔

میری والدہ کا تعلق راجپوت گھرانے سے تھا۔ دین کے معاملے میں سخت تھیں اور عام معاملات میں نہایت نرم دل تھیں۔ بچپن کی بے شمار باتیں اور واقعات میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں بچپن میں قدرے شرارتی تھا۔ ایک دن میں ترنگ میں تھا۔ اچانک کہہ بیٹھا کہ میں بڑا ''اُچا'' آدمی ہوں۔ والدہ صاحبہ نے سن لیا۔ فرمانے لگیں: یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے سُنی اَن سُنی کردی۔ اب کے قدرے سختی سے فرمایا: میں پوچھ رہی ہوں کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے اپنے الفاظ دہرا دیے۔ فرمانے لگیں: جانتے ہو ''اُچے'' کے منہ میں کیا ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ پنجاب میں آگ کے انگاروں کو پکڑنے والے چمٹے کو اُچا کہا جاتا ہے)۔ میں نے پھر توجہ نہ دی۔

۔۔۔اب ان کی آواز بلند ہوگئی: میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ ''اُچے'' کے منہ میں کیا ہوتا ہے؟

اب ان کی آواز بلند ہوگئی: میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ ''اُچے'' کے منہ میں کیا ہوتا ہے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا: 'آگ'۔ ارشاد فرمایا کہ اب خود سمجھ لو جو ''اُچا'' ہوتا ہے اس کے منہ میں آگ ہوتی ہے۔ اب تمھاری مرضی ہے کہ تم ''اُچا بنو یا نہ بنو۔''

قارئین کرام! حرم مکی کے صحن میں بیٹھ کر والدہ صاحبہ نے بے حد دعائیں دیں۔ میری بدقسمتی کہ والد محترم کا جلد ہی انتقال ہوگیا۔ ابھی میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھیں اللہ

نے بلالیا۔ میری شادی کے دو سال بعد والدہ محترمہ مستقل طور پر سعودی عرب آگئیں۔ پھر ان کا آنا جانا لگا رہا۔ ان کا سعودی عرب میں کبھی دل نہ لگا۔ کئی مرتبہ ویزا کینسل ہوا۔ میں پھر کوشش کر کے ان کو ویزا بھجوا دیتا، مگر میری یہ خوش قسمتی رہی کہ وہ مجھ سے راضی تھیں۔

یہ 1988ء کی بات ہوگی جب ہم نے ریاض میں مدرسہ فاطمۃ الزہراء کے نام سے لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کیا۔ والدہ صاحبہ بھی اس میں پڑھاتی تھیں۔ ان کے الفاظ مجھے کبھی نہیں بھولے: ہمارے پاس بڑی بڑی بے پردہ، فیشن زدہ بغیر دوپٹے کے عورتیں آتی ہیں، لیکن چند ہی دنوں میں مکمل حجاب کرتے ہوئے رخصت ہوتی ہیں۔

بڑی پرانی بات ہے۔ ایک مرتبہ میں ریاض سے حافظ آباد آیا تو والدہ صاحبہ سے عرض کی کہ آج میں نے باورچی خانے میں بیٹھ کر آپ کے ہاتھ کے پراٹھے کھانے ہیں۔ خیر میں پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ وہ پراٹھے پکاتی چلی گئیں۔ ایک برتن میں انھوں نے کچھ روپے رکھے ہوئے تھے، جسے ڈھکنے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اتنے میں ہمارے محلے کا ایک بچہ تیزی سے داخل ہوا۔ والدہ صاحبہ نے اس سے پوچھا کہ ''وے سبق پڑھ آیاں ایں'' ہاں خالہ جی! یہ سن کر انھوں نے ایک روپیہ اس بچے کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ اتنے میں ایک اور آ گیا۔ اس سے بھی پہلے والا سوال و جواب ہوا۔ اسے بھی ایک روپیہ ملا۔ لڑکے آتے چلے گئے ان کو ایک ایک روپیہ ملتا گیا۔ میں کچھ دیر تو یہ منظر دیکھتا رہا، پھر رہ نہ سکا۔ عرض کیا: امی جان! یہ کیا ہے؟

فرمانے لگیں: میں نے اپنے محلے کے بچوں کو یہ لالچ دے رکھا ہے کہ جو صبح صبح قرآن کریم کا سبق قاری صاحب سے پڑھے گا اسے ایک روپیہ انعام ملے گا۔ اب یہ صبح صبح

بڑے شوق سے قرآن کا سبق پڑھتے ہیں اور مجھ سے انعام پاتے ہیں۔ میری آنکھوں میں محبت کے آنسو آ گئے۔ امی جان! آپ کتنی عظیم ہیں۔ آپ نے بچوں کو قرآن پڑھانے کے لیے کتنا عمدہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ آج وہ نسل جوان ہو چکی ہے۔ آپ کا یہ صدقہ جاریہ ہے۔ ان شاء اللہ جب بھی وہ قرآن کریم کی تلاوت کریں گے، آپ کو اجر و ثواب ملتا رہے گا۔

والدہ محترمہ کے حوالے سے لکھنا شروع کیا تو مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا:

میں ایک مرتبہ امریکہ کے شہر ہیوسٹن میں تھا۔ وہاں پر حافظ عبدالوحید صاحب کے ہمراہ پرانی کاروں کے شوروم پر مجھے ایک گاڑی پسند آ گئی۔ اس میں سات سیٹیں تھیں۔ میں نے والدہ صاحبہ کو وہاں سے فون کیا: امی جان! میں نے ایک گاڑی خریدی ہے، اس میں ایک سیٹ آپ کے لیے مخصوص ہے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیے! انھیں میری اس بات سے اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ کئی دن تک میرے اس فون کی بات اپنے ملنے والوں کو بتاتی رہیں کہ میرے عبدالمالک نے گاڑی خریدی ہے جس میں اس نے ایک سیٹ میرے لیے مخصوص کی ہے۔ نہ جانے اس دوران انھوں نے میرے لیے کتنی دعائیں کی تھیں۔

امی جان جب سعودیہ میں ہوتیں تو میری مصروفیات اپنی جگہ، مگر میں کوشش کرتا کہ کچھ وقت والدہ صاحبہ کے لیے لازماً نکالوں۔ بعض اوقات ہم دونوں ماں بیٹا اکیلے ہوتے، میں پیار سے ان کے ہاتھ چومتا، ان کو گلے لگاتا۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوتا کہ وہ لیٹی ہوتیں تو ان کے پاؤں اٹھا کر اپنے گالوں پر رکھ لیتا۔ پیار سے ان کو چومتا۔ ان کو گدگدی کرتا، ان کو ہنساتا، میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ ان سے پوچھتا: امی جان! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟ وہ کہتیں: بھلا میں تم سے کیوں ناراض ہوں گی۔ تم میری اتنی خدمت تو کرتے ہو۔ میں

پھر کہتا: نہیں، امی جان! آپ سچ سچ بتائیں کہ آپ واقعی دل سے راضی ہیں؟ وہ فرماتیں: ہاں میں دل سے راضی ہوں۔ میں کہتا: اچھا پھر قسم کھائیں کہ آپ مجھ سے دل سے راضی ہیں۔ وہ فرماتیں: میں قسم کھاتی ہوں کہ میں تم سے دل سے راضی ہوں۔ پھر ہم ماں بیٹا کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر سال رمضان المبارک کے آخری ایام بیت اللہ شریف میں گزاروں۔ میں اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے جاتا۔ ایک سال کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ بچوں کا پروگرام نہ بن سکا۔ صرف میں اور والدہ صاحبہ ہی پانچ چھ دن کے لیے مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔ میں غالباً پہلی مرتبہ والدہ صاحبہ کے ساتھ اتنے دنوں کے لیے اکیلا جا رہا تھا۔ میں قدرے گھبرایا ہوا تھا کہ والدہ صاحبہ کو راضی رکھ سکوں گا یا نہیں۔ میں نے کوشش کر کے نزدیک ترین ہوٹل بک کروایا اس کے لیے جدہ کے برادرم مختار عثمانی صاحب نے تعاون کیا۔ یہ ہوٹل اسی سال کھلا تھا۔ ہم ماں بیٹا ہوائی جہاز کے ذریعے جدہ پہنچے، عمرہ کیا اور میں والدہ صاحبہ کی خدمت میں لگ گیا۔ کہاں میں گھبرایا ہوا کہ والدہ صاحبہ کو وقت دے پاؤں گا یا نہیں، مگر الحمدللہ! ثم الحمدللہ! یہ پانچ چھ دن اس طرح گزرے کہ ہم ماں بیٹے کی باتیں ہی ختم نہ ہوتیں۔ دو تین مرتبہ ان کو میں اپنے ہمراہ حرم شریف لے کر گیا۔ پھر فرمانے لگیں: اب مجھے راستے کا علم ہو گیا ہے۔ اب میں اکیلی بھی حرم آ جا سکتی ہوں۔ یہ جو وقت ان کی معیت میں گزرا میری زندگی کے اہم ترین ایام میں

> میرے عبدالمالک نے گاڑی خریدی ہے جس میں اس نے ایک سیٹ میرے لیے مخصوص کی ہے۔

سے تھا۔ میں نے حتی الامکان ان کی خوب خدمت کی۔ خدمت کیا کرنا تھی بس وہ تو ہر حال میں خوش رہتی تھیں اور دعائیں دیتی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تمام دعائیں قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین!

قارئین کرام! مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں آپ کو اپنی کامیابی کے اسرار بتاؤں۔ یقین جانیے! میری کامیابیوں کے پیچھے والدین کی دعائیں ہیں۔ میں نے 1976 میں حافظ آباد میں دوآبہ رائس ملز میں سٹور کیپر کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ رات 12 بجے ڈیوٹی ختم ہوتی۔ یہاں سے گھر تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ سردی کی راتوں میں جب سائیکل پر گھر پہنچتا تو رات کے ساڑھے بارہ تو بج ہی جاتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ والدہ صاحبہ رات کو میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہیں کہ کب عبد المالک آئے تو میں دروازہ کھولوں۔ رات گئے تک جاگنا ان کی صحت کے لیے مضر تھا۔ میں نے اپنا بستر لیا اور ملز کے اندر ہی ایک خیمہ میں سونے کا انتظام کر لیا۔ اب میں فجر کی نماز کے بعد گھر جانے لگا تھا۔ ابا جان اور امی جان بڑی بے تابی سے انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ ان کو گزشتہ دن کی رپورٹ دیتا اور پھر واپس چلا جاتا۔

> وہ لیٹی ہوتیں تو ان کے پاؤں اٹھا کر اپنے گالوں پر رکھ لیتا اور پوچھتا: امی جان! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

میں اُس زمانے میں جمعیت شبان اہل حدیث حافظ آباد کا ناظم تھا۔ اس کے ساتھ دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین کا جنرل سیکرٹری بھی تھا۔ بڑی بھرپور زندگی تھی۔ ایک دن والدہ صاحبہ فرمانے لگیں: بیٹا عبد المالک! مجھے حج کرنے کا بڑا شوق ہے، اگر تم سعودی عرب

چلے جاؤ تو مجھے حج کرواسکو گے۔ مختصر سی جدوجہد کے بعد میں سعودی عرب آ گیا۔ جیسا کہ اس دنیا کا دستور ہے، ہر نئی جگہ پر شروع شروع میں کچھ آزمائشیں ضرور پیش آتی ہیں، پھر اللہ کے فضل سے آدمی اپنی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ میرے بھی ابتدائی چند ماہ اِدھر اُدھر خواری میں گزرے، اس دوران میں ہر دوسرے دن والدین کو خط لکھتا تھا جس کے جواب میں والد صاحب بھی بڑی تفصیل سے جواب مرحمت فرماتے تھے۔ وقت کا پہیہ بڑی تیزی سے گردش کرتا رہا، تا آنکہ والد محترم رحلت فرما گئے۔ ان کی وفات کے بعد میری شادی ہوئی تو دو سال کے بعد والدہ صاحبہ سعودی عرب آ گئیں۔

اس زمانے میں والدہ کا اقامہ ملنا بڑا مشکل تھا۔ میں وزارۃ الدفاع والطیران کے شعبہ آرمی ایوی ایشن میں ملازم تھا۔ ادارے کے سربراہ سمو الأمیر کرنل فیصل بن محمد بن سعود الکبیر آل سعود تھے۔ وہ مجھے ذاتی طور پر بہت پسند کرتے تھے۔ متعدد بار انعام سے نوازا۔ بارہا ایسا ہوا کہ میرے آفس میں آکر بیٹھ جاتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ دراصل انھیں خطاطی پسند تھی اور یہ میرا پیشہ تھا۔ ایک دن ان سے والدہ صاحبہ کے ویزا کی بات کی۔ انھوں نے فوراً ہاں کر دی کہ میں خود کوشش کروں گا۔ چند ہفتے گزرے وزارۃ الداخلیہ میں پریزنٹیشن (Presentation) تھی۔ مجھ سے کہنے لگے: درخواست لکھو۔ اب عربی میں کون درخواست لکھے، پھر خود ہی انھوں نے اس کا ڈرافٹ تیار کر کے میرے حوالے کیا اور فرمایا: اسے اپنے ہاتھ سے لکھو۔

قارئین کرام! میں خوش نویس ہوں، میں نے اپنی زندگی کی جو سب سے خوبصورت خطاطی کی، وہ یہی ویزا کی درخواست تھی۔ واقعی موتی پرو دیے۔ سارے دفتر میں ایک دھوم مچی ہوئی تھی کہ عبدالمالک کی والدہ آ رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صرف

میری ہی والدہ نہیں بلکہ پورے دفتر پر ان کی مامتا کا سایہ پڑ رہا ہے۔ ہر شخص ان کی دعاؤں اور خیر مقدم کا متمنی تھا۔ پھر وہ دن آیا جب امیر فیصل کی ملاقات سمو الأمیر نایف بن عبدالعزیز آل سعود سے ہوئی۔ انھوں نے درخواست دیکھی تو کہنے لگے: میں نے آج تک اتنی خوبصورت خطاطی نہیں دیکھی۔ اسی وقت درخواست منظور فرمائی۔ اگلے دن ہمارے دفتر میں شور تھا کہ عبدالمالک کی والدہ محترمہ کا ویزا مل گیا ہے۔

عزیزی عکاشہ اس وقت ایک ہفتہ کا تھا جب والدہ صاحبہ ریاض کے ائرپورٹ پر اتریں۔ میں اہلیہ سمیت استقبال کے لیے پہنچ چکا تھا۔ یادش بخیر عکاشہ کا سن ولادت 1404 ہجری ہے۔ والدہ محترمہ نے کہا: اپنی اہلیہ کو کیوں لائے ہو؟ چھوٹا سا بچہ اس کی گود میں ہے۔ انھیں اپنی بہو کو معمولی سی زحمت دینا بھی گوارا نہ ہوا۔

والدہ صاحبہ کے آنے کے بعد گویا گھر میں ایک ٹھہراؤ آ گیا۔ ان کا پاکستان آنا جانا لگا رہا۔ انھوں نے متعدد مدارس قائم کیے۔ مساجد میں حصہ ڈالا۔ چھوٹے بھائی محمد طارق نے خاصی جدوجہد کے بعد گھر میں فون لگوالیا۔ اس زمانے میں کال اتنی آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ عموماً آدھ گھنٹہ، بعض اوقات پون گھنٹہ تک کال ملاتے رہتے تب جا کر کال ملتی۔ نماز فجر کے بعد قدرے آسانی سے لائن مل جاتی۔ فون پر ان کی ہدایات ملتیں کہ ایسا کردو، فلاں کو اتنا دے دو، اسے گندم خرید دو، اس کے ہاں چاول ختم ہیں۔ فلاں کی شادی ہے اس کے ساتھ تعاون کردو۔ اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہے اس کو انعام میں گھڑی لے کر دو۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کر رکھا تھا کہ حتی الامکان والدہ صاحبہ کو ''نہ'' نہیں کہنی۔ ہاں اگر کوئی بات میری حیثیت سے بڑھ کر ہوتی تو میں ان سے عرض کرتا: آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں۔

میری والدہ کو مساجد اور مدارس بنانے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن فون پر فرمانے لگیں: منیجر صاحب! مجھے ''اتنے'' قرآن چاہئیں (صحیح تعداد یاد نہیں ہے) میں بے اختیار رو پڑا عرض کیا: امی جان! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔

دارالسلام نے کیسے ترقی کی؟ اس کے بہت سے اسباب ہیں، مگر ان میں والدہ صاحبہ کی دعاؤں کا خاص اثر ہے۔ جب فون پر احکام دیتیں تو مجھے بڑا مزا آتا۔ میں مسکراتا رہتا، دعاؤں کے لیے کہتا رہتا۔ فون پر جب وہ بات شروع کرتیں تو میں پیار سے کہتا: ہاں جی! اب شاہی آرڈر جاری ہونے لگا ہے۔ ایک مرتبہ ان کی خاصی زیادہ فرمائشیں تھیں جو الحمدللہ! میں نے سب پوری کر دیں۔ فون کیا تو اس روز انھوں نے بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ میں نے فون بند کیا تو اہلیہ سے کہا: انیسہ! آج ہمارے ہاں خیر و برکت کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ کہنے لگی: کیسے؟ میں نے کہا کہ والدہ صاحبہ پہلے بھی ہم سے بڑی خوش تھیں، مگر آج جتنی اور جس انداز کی دعائیں ملی ہیں، پہلے کبھی نہیں ملیں۔

پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ میں دفتر پہنچا تو وزارت مذہبی امور سے فون آ گیا۔ ہم نے ایک مدت پہلے قرآن کریم کے تراجم کی طباعت کی کوٹیشن دے رکھی تھی۔ کم و بیش چوبیس لاکھ ریال کا پراجیکٹ تھا۔ ہوسا اور بوسنیا زبان میں قرآن کریم کے تراجم شائع ہونے تھے۔ یہ منصوبہ وزارتِ مذہبی امور کے زیر اہتمام تھا۔ مالی تعاون پرنس ولید بن طلال آل سعود کا تھا۔ میں واقعی بھول چکا تھا کہ ہم نے ایک مدت پہلے کوٹیشن دی تھی۔ بہر حال وزارت سے برادرم محمد الزبیر نے مبارک باد دی اور مجھے فوری طور پر دفتر پہنچنے کا کہا۔ اس طرح ایک عظیم پراجیکٹ پر دارالسلام نے کام شروع کر دیا اور ہم پر خیر و برکت کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

ایک مرتبہ ہم عمرہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ نماز عصر ادا کی تو امام کعبہ شیخ صالح بن حمید ﷾ باب الملک عبدالعزیز کے راستے واپس جا رہے تھے۔ میں نے والدہ صاحبہ سے کہا: میں امام صاحب سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں، کہنے لگیں: جاؤ۔ ان کے ساتھ خاصی سکیورٹی تھی جو کسی کو ہاتھ ملانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ خیر باب الملک عبدالعزیز کی سیڑھیوں پر ان کو روک لیا۔ دارالسلام نے ان کے والد محترم کی کتاب کا انگلش میں ترجمہ کیا تھا جس کا انھیں علم تھا۔ میں نے ان کو اپنا تعارف کروایا تو گلے لگا لیا۔ سکیورٹی والوں کو انھوں نے اشارہ کیا تو وہ دور ہٹ گئے۔ ہم ایک دو منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے ان سے دعا کی درخواست کی۔ انھوں نے ہاتھ اٹھا لیے۔ والدہ صاحبہ دور سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب واپس آیا تو فرمانے لگیں: عبدالمالک! تینوں ستے خیراں نیں۔ تمھارے لیے امام کعبہ نے دعا کی ہے، تمھارے لیے ترقی ہی ترقی ہے۔

انھوں نے میری اہلیہ کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ دعا دی: ''شالا تم سات بیٹوں کا منہ دیکھو'' ہمارے یہاں پنجاب میں عموماً بزرگ خواتین اپنی بہو، بیٹیوں کو اسی قسم کی دعائیں دیتی ہیں۔ والدہ صاحبہ کی دل سے نکلی ہوئی دعا پوری ہوئی اور الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے سات بیٹوں ہی سے نوازا۔ ان میں ایک بیٹا عبیداللہ بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ میرے علم کی حد تک میرے پورے خاندان میں سوائے برادرم محمد ابراہیم کیلانی صاحب کے کسی کے بھی چھ بیٹے نہیں، یہ میری خوش قسمتی رہی کہ والدین مجھ سے بے حد راضی رہے۔ میں بھی ان کی بے حد عزت کرتا تھا۔ آج الحمد للہ! مجھ پر جو بھی اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد والدین کی دعاؤں کی بدولت ہیں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میری اولاد بھی میری بے حد عزت کرتی ہے۔ میں الحمد للہ! ہر روز

والدین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ والدین کی بہترین تربیت کا نتیجہ آج میں اپنی زندگی میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

محترمہ والدہ صاحبہ کی وفات مارچ 2000ء کو حافظ آباد میں ہوئی۔ میں ریاض میں تھا۔ بروقت اطلاع مل گئی۔ میں اہلیہ سمیت بلا تاخیر حافظ آباد پہنچ گیا۔ برادر عزیز محمد طارق شاہد صاحب آخری وقت میں ان کے پاس تھے۔ انھیں آخری وقت ان کی خدمت کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کی تمنا اور خواہش تھی کہ ان کا جنازہ اس مدرسہ میں پڑھایا جائے جو انھوں نے خود بنایا تھا۔ محلّہ خان پورہ میں بڑا خوبصورت مدرسہ بنات الاسلام انھوں نے بنوایا تھا۔ چنانچہ ان کا پہلا جنازہ اسی مدرسہ میں جامعہ سلفیہ کے نائب شیخ الحدیث حافظ مسعود عالم صاحب نے پڑھایا۔ دوسرا جنازہ حافظ آباد کے گڑھی اعوان کے قبرستان میں جناب پروفیسر ساجد میر صاحب امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان نے پڑھایا تھا۔ دور دور سے رشتہ دار، عزیز و اقارب اکٹھے ہو گئے تھے۔ میں جب آخری دیدار کے لیے قبر میں اترا تو یقین جانیے ان کا چہرہ تر و تازہ تھا۔ بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ میں نے بے اختیار کہا: لوگو! جس نے ایک جنتی عورت کا چہرہ دیکھنا ہو وہ میری ماں کو دیکھ لے۔ آنکھوں کے سامنے یہ آیت آگئی اور اس کی تفسیر کا مجھے اسی روز علم ہوا۔

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَٱدْخُلِى فِى عِبَٰدِى ﴿٢٩﴾ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ﴿٣٠﴾

”اے مطمئن روح! تو اپنے رب کی طرف چل، اس حال میں کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر تو میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“[1]

[1] الفجر 89:27-30.

عبدالمالک! تینوں ستے خیراں نیں۔ تمھارے لیے امام کعبہ نے دعا کی ہے، تمھارے لیے ترقی ہی ترقی ہے۔

حافظ آباد میں آبائی گھر ہم نے دینی کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ میں نے والدہ صاحبہ کی موجودگی میں اپنے آبائی گھر میں مدرسہ قائم کر دیا تھا۔ محلے کی بچیاں قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتی تھیں۔ والدہ صاحبہ کی وفات کے بعد تو ہم نے اس مدرسہ کو خوب ترقی دی۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ ایک زمانے میں دارالسلام کو ایک بڑا کنٹریکٹ ملا۔ میں نے شروع دن سے نیت کر لی تھی کہ اگر یہ منصوبہ بغیر کسی رکاوٹ کے مکمل ہو گیا تو دس ہزار ڈالرز اس مدرسہ پر خرچ کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے میری خواہش پوری کر دی۔ وہ کنٹریکٹ بغیر کسی رکاوٹ کے مکمل ہو گیا۔ میں نے حسب وعدہ دس ہزار ڈالرز والدہ صاحبہ کے مدرسہ پر لگا دیے۔ الحمدللہ بڑی خوبصورت بلڈنگ بن گئی۔ حافظ آباد اور اس کے گرد و نواح میں چلنے والے مدارس جن کے بارے میں والدہ صاحبہ وصیت کر گئی تھیں، الحمدللہ! وہ برادر عزیز محمد طارق شاہد صاحب کی نگرانی میں مصروفِ عمل ہیں۔ مصروفیت کے سبب میرا تو حافظ آباد کم ہی جانا ہوتا ہے، مگر جب جاتا ہوں تو والدہ صاحبہ کے مدرسہ سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے وہاں سے ان کی خوشبو آتی ہے۔ میں ساتھ آئے ہوئے بچوں سے کہہ دیتا ہوں، سب لوگ خاموش ہو جائیں، مجھے آرام سے بیٹھنے دیں، مجھے والدہ صاحبہ کے مدرسہ میں آ کر بڑا سکون اور لطف آتا ہے۔

میرے استاذ اور مربی
مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ

مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ کا ذکر میں کتاب کے شروع میں کر چکا ہوں۔ بڑے نفیس، دھیمے لہجے، لمبے قد، قدرے پتلے جسم کے چچا جان پورے علاقے کی پہچان تھے۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور عمل بھی...... تہجد گزار بلکہ سب سے پہلے مسجد میں تہجد کے لیے آنے والے چچا جان نے اپنا صدقہ جاریہ بہت سے شاگردوں کی صورت میں چھوڑا ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی ان شاء اللہ ان کا صدقہ جاریہ ہوں۔ وہ پکے اہل حدیث تھے، موحد تھے۔ اعلیٰ درجے کے خطاط تھے۔ ان کو غالبًا یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے پوری کتب ستہ کو اپنے ہاتھ سے کتابت کیا تھا۔ خطاط کے پاس جتنا علم ہوگا اتنی ہی کم غلطیاں کرے گا۔ میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میں نے ان کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔

ہم نے بچپن میں ان کے پیچھے نہ جانے کتنے ہی جمعے ادا کیے۔ ان کے دروس سنے، پھر

ایک وقت آیا جب میں حدیث کا طالب علم تھا۔ میں نے ''سنن ابن ماجہ'' ان سے سبقاً پڑھی۔ میں اکیلا ہی ان کا شاگرد تھا۔ میرے اندر ایک خوبی کہہ لیں کہ میں سوالات بہت کرتا تھا۔ حدیث پڑھنے کے دوران جہاں عبارت سمجھ نہ آئی یا مسئلہ سمجھ نہ آیا، میں ان سے سوالات شروع کر دیتا۔ وہ ماشاء اللہ علم کا خزانہ تھے۔ میرے سوالات کے جوابات بڑے پیار اور تحمل سے دیتے۔ سبحان اللہ! استاد شاگرد کا رشتہ بھی بڑا عجیب ہے۔ وہ رشتہ میں میرے چچا تھے۔ میرے ساتھ محبت کرتے، میں بھی ان سے خوب محبت کرتا تھا۔

> **سب سے پہلے مسجد میں تہجد کے لیے آنے والے چچا جان نے اپنا صدقہ جاریہ بہت سے شاگردوں کی صورت میں چھوڑا**

آیئے میں اپنے قارئین کو ایک مزے کی بات سناتا ہوں۔ میں ''علم لدنی'' کا قطعاً قائل نہیں ہوں۔ میرے نزدیک یہ صوفیاء کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرے نزدیک ''علم لدنی'' کیا ہے۔ یہ غالباً 1972ء کی بات ہے۔ ہم کیلیانوالہ میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ہم لوگ رات کا کھانا مغرب کے فوراً بعد کھا لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ موٹاپا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کھانے کے فوراً بعد میں چچا جان کے گھر کا رخ کرتا۔ وہ بستر پر آرام کر رہے ہوتے۔ مجھے سوالات کرنے کا بڑا ''چسکا'' تھا۔ میں ان کے گھر جاتے ہوئے سوالات سوچ لیتا کہ آج میں ان سے یہ سوال کروں گا۔ میں جاتے ہی ان کے پاؤں دبانے لگ جاتا، کبھی جسم کو دباتا، کبھی ٹانگیں، کبھی بازو دباتا اور ساتھ ہی ان سے جو سوال سوچ کر آیا ہوتا وہ کرنے لگتا۔ میں پھر عرض کروں گا کہ وہ علم کے سمندر تھے، میں ان

مجھے سوالات کرنے کا بڑا ''چسکا'' تھا۔ ان کے گھر جاتے ہوئے سوالات سوچ لیتا کہ آج میں ان سے یہ سوال کروں گا۔

سے ہر قسم کے سوالات کرتا۔ بعض اوقات بحث بھی کرتا۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ بڑی محبت اور وضاحت سے میرے سوالات کا جواب دیتے۔ میرے نزدیک یہ ''علم لدنی'' ہے جو میں نے بہت سارے بزرگوں سے حاصل کیا ہے۔ ان میں سے سرفہرست محترم چچا جان مولانا محمد ادریس کیلانی رحمہ اللہ تھے۔

مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی، مسرت اور فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میرے خاندان کے بعض لوگ واقعی ولی کامل تھے۔ مولانا محمد ادریس انھی میں سے ایک تھے۔ انھوں نے ساری زندگی حق بات کہی، اس پر پہرہ دیا، نہ کسی سے ڈرے، نہ بکے، نہ جھکے، نہ ان کو کوئی لالچ تھا، نہ مسجد سے تنخواہ لی، نہ کسی معاوضے کی تمنا کی۔ وہ اعلیٰ درجے کے خطاط تھے۔ ساری زندگی وہ کتابت کرتے رہے۔ اس سے معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور فرمائے۔ میں کئی مرتبہ اپنی دعاؤں میں ان کا نام لے لے کر ان کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے کہتا ہوں: اللہ! میں ان کا صدقہ جاریہ ہوں۔ ان کی مغفرت اور درجات بلند فرما۔ یہ انھی کی تربیت کا اثر ہے کہ الحمد للہ! مجھے اسلام، عقیدہ توحید، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور علمائے حدیث سے خوب محبت ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کے کتنے شاگرد ہیں۔ میں بھی فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی ان کے شاگردوں میں سے ایک ہوں۔

مولانا عبدالغفار کیلانی رحمہ اللہ

خطاطِ قرآن کریم

میری یہ خوش قسمتی رہی کہ میرے خاندان کی تمام بڑی بڑی شخصیات مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میں نے ان بزرگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ میرے والد صاحب کے چچا زاد بھائی مولانا عبدالغفار کیلانی رحمہ اللہ تھے۔ اونچے لمبے قد کے چچا جان بڑے خوبصورت تھے۔ ہر روز برادری کے گھروں میں چکر لگاتے۔ تھوڑی دیر بیٹھتے، حال احوال پوچھتے اور اگلے گھر کی طرف چل دیتے۔ جب تشریف لاتے تو خبروں پر تبصرہ بھی کرتے۔ بڑی کھنکھناتی ہوئی آواز، طبیعت میں جلالی پن، اعلیٰ درجے کے عربی کے خوش نویس تھے۔ انھوں نے ساری زندگی قرآن کریم کی کتابت کی ہے۔ سفر سے قدرے گھبراتے تھے، اس لیے بہت کم گاؤں سے باہر جاتے تھے، جن تاجران کتب کا کام کرتے تھے ان سے بذریعہ ڈاک رابطہ مسلسل رہتا تھا۔ چچا جان اتنی خوبصورت کتابت کرتے تھے کہ ناشرین کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ وہ صرف انھی کا کام کریں۔ وہ ڈاک کے ذریعے ان کو پیسے بھجوا دیتے تھے۔ بڑے تیز لکھنے والے تھے۔ تین دن میں ایک پارہ کی کتابت کر لیتے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ کسی کو شاگرد نہیں بناتے۔ اب اسے میری خوش قسمتی کہہ لیں کہ میں نے ان

> اس زمانے میں گرفتاریاں عام تھیں، چچا جان عبدالغفار کو ڈر تھا کہ کہیں یہ لڑکے گرفتار نہ ہو جائیں

سے بھی کچھ عرصہ عربی میں ''اصلاح'' لی ہے۔ اس طرح مجھے ان کا شاگرد بننے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان کا کوئی بیٹا نہ تھا، البتہ بیٹیاں تھیں۔ میں ان سے اور وہ مجھ سے خوب محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہم طالب علم تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے خوب خلاف تھے۔ ہم نعرہ بازی کرتے، مسجد میں جلسے کرتے، اس زمانے میں بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک چل رہی تھی، میں اس کا ایک کارکن تھا۔ میں بھی حکومت کے خلاف کچھ اشتہار لاہور سے لایا۔ ان کو گاؤں کی گلیوں میں چسپاں کیا۔ جہاں بیٹھتے حکومت کو کوستے۔ اس زمانے میں گرفتاریاں عام تھیں جو گرفتار ہوتے ان کو مارا پیٹا جاتا اور ان پر مقدمات چلتے، چچا جان عبدالغفار کو ڈر تھا کہ کہیں یہ لڑکے گرفتار نہ ہو جائیں۔ وہ ہمیں سمجھاتے، ناراض ہوتے، ہم ان کی باتیں سنتے اور ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے۔ جوانی بھی عجیب شے ہے۔ بعض لڑکے ان پر اعتراض کرتے، میں جب علیحدہ ہوتا تو ان سے کہتا: دیکھو بھائیو! وہ ہماری بھلائی کی بات سوچتے ہیں۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ مجھ سے شدید محبت کرتے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار اس طرح کیا کہ اپنے ایک بیٹے کا نام ان کے نام پر عبدالغفار رکھا ہے۔ ان کی شادی سانگلہ ہل کے قریب غالباً ''ٹبی'' میں ہوئی تھی۔ ایک دن اپنی چھوٹی بیٹی سکینہ سے کہنے لگے: اگر برفی کھانے کا شوق ہو تو سانگلہ ہل کے ریلوے اسٹیشن کی کھاؤ۔ میں سن رہا تھا، پھر جب کبھی میں سانگلہ ہل کے ریلوے اسٹیشن سے گزرتا تو یہاں کی سوغات برفی ضرور خرید کر کھاتا۔

کیلیانوالہ میں دارالسلام فری ہسپتال

ایک دن میں اور محمد طارق شاہد صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: طارق صاحب! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں دنیا میں بڑی عزت اور مقام عطا فرمایا ہے۔ یہ بتائیں کہ ہم نے اپنے گاؤں کو کیا دیا ہے؟ وہ مٹی وہ سرزمین جو ہماری جنم بھومی ہے اس کے ہمارے اوپر کچھ حقوق ہیں۔ ہماری کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ذرا سوچیں کہ ہم اپنے گاؤں کو کیا دے سکتے ہیں؟ ہم نے سوچا کہ گاؤں میں مسجد اور سکول تو موجود ہے۔ کیوں نہ ہم وہاں ایک چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کر دیں۔ بس اسی پر اتفاق ہو گیا۔ برادر محترم یعقوب صاحب کی بیٹھک کرایے پر لے کر 2001ء میں چھوٹی سی ڈسپنسری قائم کر دی گئی، جس کے انچارج ہمارے بھتیجے ڈاکٹر محمد عثمان بن مسعود احمد صاحب مقرر ہوئے، ان کی اہلیہ نے بیمار ہونے والی خواتین کا علاج شروع کر دیا۔ لو جی! خدمت انسانی کا ایک کام شروع ہو گیا۔ شروع میں معمولی سی مخالفت بھی ہوئی۔ ہم صرف دس روپے پرچی لے کر لوگوں کو دوائیاں مفت دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ کام آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کے انچارج برادرم محمد طارق شاہد صاحب مقرر ہوئے۔ ان کی رہنمائی اور قیادت میں ہم نے گاؤں کے شروع میں دو کنال جگہ خریدی، اب وہاں ہسپتال کی ایک خوبصورت بلڈنگ بن گئی ہے۔ اس ہسپتال کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ہم نے جناب پروفیسر ساجد میر صاحب کو بلوایا۔ بڑا خوبصورت پروگرام ہوا۔ آج کل یہاں کم وبیش 120 سے زائد مریض روزانہ آتے ہیں۔ محمد طارق

شاہد صاحب چونکہ لاہور میں ہوتے ہیں اس لیے ان کی نیابت ہمارے چچازاد بھائی محمد یعقوب صاحب کرتے ہیں۔ اب دس افراد کا عملہ ہے۔ ارد گرد کے بیس دیہاتوں سے لوگ یہاں علاج کے لیے آتے ہیں۔ ان دنوں ہم کوئی ڈیڑھ پونے دو لاکھ روپے ماہوار خرچ کر رہے ہیں۔ ہمارے بھتیجے محمد نعیم صاحب بھی ہسپتال سے منسلک ہیں۔ انھوں نے ہسپتال کی خالی جگہ پر سبزیاں اور پھل دار درخت لگا رکھے ہیں۔

ایک رات میری چھوٹی بیٹی عفراء مجاہد کو خواب آیا کہ وہ اس گاؤں میں مسجد کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہے جس میں ابو پیدا ہوئے ہیں۔ کہنے لگی: ابو! میں نے پہلی اینٹ خود رکھی ہے، دوسری اینٹ آپ کو پکڑا دی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جس گاؤں میں آپ پیدا ہوئے ہیں وہاں میں مسجد بناؤں گی۔ میں نے کہا: میں تو کیلیا نوالہ میں پیدا ہوا ہوں۔ کہنے لگی: میں نے خواب میں وہیں مسجد بنائی ہے۔ اس وقت اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ کالج کی سٹوڈنٹ تھی۔ کہنے لگی: میرے پاس بارہ ہزار ریال جمع ہیں، وہ میں آپ کو دے دیتی ہوں، اس سے آپ مسجد کا کام شروع کریں۔ باقی مبلغ آپ دیں گے کیونکہ دوسری اینٹ آپ کو پکڑائی تھی۔ اس کی والدہ کہنے لگی: کیلیا نوالہ میں کافی مساجد ہیں کسی اور جگہ مسجد بنا لیتے ہیں، مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ نہیں! جہاں ابو پیدا ہوئے ہیں وہیں مسجد بنے گی۔ اس مشکل کو بھی برادرم طارق صاحب نے حل کر دیا کہ ہسپتال میں ایک چھوٹی سی مسجد بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ ہسپتال میں ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بنا دی گئی ہے جس کا نام مسجد عفراء بنت عبدالمالک مجاہد ہے۔ ہسپتال کا عملہ اور مریض اس میں نمازیں ادا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی نیکی کو قبول فرمائے۔ میرے علم کی حد تک ہمارے خاندان میں غالباً وہ پہلی لڑکی ہوگی کہ اس قدر نوعمری میں اس کے نام کی مسجد بنی ہے۔ الحمدللہ! وہ حافظہ قرآن بھی ہے۔

کچھ پیارے بھائیوں کے بارے میں

میں نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ ہم تین بھائی ہیں۔ ہماری کوئی بہن نہیں ہے۔ مجھ سے بڑے جناب محمد ایوب سپرا صاحب ہیں۔ جو مجھ سے چار سال بڑے ہیں۔ مجھ سے چھوٹے محمد طارق شاہد صاحب ہیں۔ جناب محمد ایوب سپرا صاحب نے میٹرک حافظ آباد میں ہی کیا۔ اس کے بعد کتابت سیکھنے کے لیے کھیالی اور پھر لاہور چلے گئے۔ اس دوران ریلوے میں ملازمت بھی کی، بعدازاں 1979ء میں کراچی چلے گئے۔

بھائی جان نے بھی والدہ صاحبہ سے قرآن کریم اور والد صاحب سے ترجمہ پڑھا۔ انھیں شروع دن سے ہی شوق تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ ہمارے خاندان میں کوئی بڑا ایسا نہ تھا کہ وہ اس زمانے میں مشورہ دیتا کہ تم فلاں شعبے میں چلے جاؤ، اس میں ترقی کے زیادہ چانسز ہیں۔ کتابت البتہ ہمارے خاندان کے رگ و پے میں داخل تھی۔ اس لیے بھائی جان ایوب صاحب نے بھی شروع میں محترم ماموں محمد سلیم صاحب سے کھیالی میں کتابت سیکھی۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں وہ مشق کرتے رہے ہیں، وہ مختلف اساتذہ سے سیکھتے رہے، سیلف میڈ شخصیت ہیں۔ کراچی گئے تو جسارت اخبار کے ساتھ منسلک ہو گئے، نہایت محنت کرنے والے، قدرے کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بھائی

جان ایوب صاحب کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ انھوں نے مختلف اداروں میں ملازمت کرنے کے باوجود کراچی یونیورسٹی سے ایم اے صحافت کا امتحان پاس کیا۔ جسارت میں وہ بطور خوشنویس کام کرتے رہے۔ میں جب سعودی عرب آتا جاتا تو ان کے پاس کراچی میں ایک آدھ دن کے لیے ٹھہر جاتا۔ ان کی شادی والدہ صاحبہ کے خاندان میں ہوئی، ہماری بھابھی محترمہ نصرت صاحبہ ہمارے ماموں رانا ڈاکٹر محمد اکرم رحمہ اللہ کی صاحبزادی ہیں۔ بھائی جان کی شادی 1975ء میں ہوئی، بارات جویانوالہ گئی تھی۔

> اس زمانے میں کوئی ایسا نہ تھا جو مشورہ دیتا کہ تم فلاں شعبے میں چلے جاؤ، اس میں ترقی کے زیادہ چانسز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی جان کو اولاد کی نعمت سے نوازا، چار بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں۔ بھائی جان کو شوق تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں، چنانچہ انھوں نے بڑے جوش اور شوق سے اپنی تین بیٹیوں کو ایم ایس سی کروایا۔ تیسری بیٹی عزیزہ خدیجہ قدسیہ نے ماشاءاللہ قرآن کریم بھی حفظ کیا ہے۔ بڑی تینوں بیٹیاں الحمدللہ! اپنے اپنے گھروں میں آباد اور اولاد سے بہرہ ور ہیں۔ چھوٹی بیٹی کی شادی ابھی ہونے والی ہے۔ اس نے بی اے کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔

بھائی جان محمد ایوب صاحب کے بڑے صاحبزادے جناب انجینئر انعام الاحد صاحب نے جرمنی سے بائیومیڈیکل انجینئرنگ میں ایم ایس سی کیا۔ آج کل پولینڈ میں مقیم ہیں اور اپنی فیلڈ ہی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، نہایت ذہین وفطین ہیں۔ کراچی

میں اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہے، جس یونیورسٹی سے انھوں نے پڑھا تھا وہاں ان کو پڑھانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچرز دیتے ہیں۔ ان کے کئی تحقیقی مقالات انٹرنیشنل لیول کے پرچوں میں چھپ چکے ہیں۔ چھوٹے بیٹے حافظ حسن ایوب صاحب سرسید یونیورسٹی کراچی میں انجینئرنگ کے آخری سال میں ہیں۔ ان سے چھوٹے بیٹے احسن ایوب صاحب ہیں۔ یہ بھی یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس کے طالب علم ہیں۔

بھائی جان ایوب صاحب فروری 1993ء میں ریاض، سعودی عرب تشریف لائے۔ بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک بطور ریسرچ اسکالر دارالسلام میں کام کرتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے بعض انگلش کتابوں کی تصحیح کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ بعض اخبارات میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ سات آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں۔ الحمدللہ! گزشتہ دس سال سے دارالسلام کراچی برانچ کے منیجر ہیں۔ نہایت شریف النفس ہیں۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکوہ، اپنے کام سے غرض، الحمدللہ! دارالسلام کراچی برانچ ان کی نگرانی میں نہایت مناسب انداز میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

مجھ سے چھوٹے بھائی محمد طارق شاہد صاحب ہیں۔ انھوں نے بھی میٹرک تک تعلیم حافظ آباد ہی میں حاصل کی۔ مروجہ طریقہ کار کے مطابق گھر میں والدہ صاحبہ سے قرآن پاک اور اس کا ترجمہ والد صاحب سے پڑھا۔ کتابت بھی سیکھی اور کچھ عرصہ کتابت کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ شروع دن سے کاروباری ذہن تھا، اس لیے کاروبار کرتے رہے۔ اس میں منافع بھی کمایا۔ کچھ وقت گزرا تو میں نے انھیں ریاض میں اپنے پاس بلوا لیا۔ ایک مدت تک دارالسلام میں کام کرتے رہے۔ کچھ عرصہ چاولوں کا بھی کاروبار

کرتے رہے۔ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

اپنے کام کے دھنی ہیں۔جس کام کا ارادہ کر لیتے ہیں اسے کر کے دم لیتے ہیں۔ان کی خوش قسمتی کہ والدہ صاحبہ کی خاص خدمت کرنے کا موقع انھیں میسر آیا۔اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کتنے ہی عمدہ کام کروائے۔مجھے یہ بتاتے اور لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ طارق صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے یہ سارے انتظامات سنبھال رکھے ہیں۔میرا طریق کار یہ ہے کہ جس پروجیکٹ کا کسی کو ذمہ دار بناتا ہوں، اسے مکمل اختیارات دے دیتا ہوں تاکہ وہ اپنی مرضی سے کام کر سکے۔

برادر عزیز ایک مدت تک دارالسلام میں کام کرنے کے بعد اپنا ذاتی کاروبار کرنے لگے ہیں۔''الطیبہ انٹرنیشنل'' کے نام سے بڑا خوبصورت ادارہ بنایا ہے۔جو بتدریج ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔انھوں نے لاہور میں اپنے گھر کے سامنے بڑی خوبصورت ''کیلانی مسجد'' بنائی ہے۔رقبے کے اعتبار سے یہ کوئی بڑی مسجد نہیں۔مگر یہ طارق صاحب کی مساجد کے ساتھ محبت کی آئینہ دار ضرور ہے۔میں بھی شروع دن سے امکانی حد تک مسجد کی تعمیر اور انتظام وانصرام میں تعاون کرتا رہتا ہوں۔

تینوں بھائیوں میں مجموعی طور پر اتفاق واتحاد مثالی ہے۔ایک دوسرے کے امور میں غیر ضروری مداخلت کا میں شروع دن سے قائل نہیں، اسی لیے جب بھی ملاقات ہوتی ہے مثالی محبت واخوت کا اظہار ہوتا ہے۔تینوں بھائیوں میں ممکن حد تک تعاون کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔

سعودی عرب آمد

میں ریاض سعودی عرب میں 20 مارچ 1980ء کو پہنچا۔ پاکستان میں شہزادا ایجنسی کی معرفت یہ ویزا خریدا گیا۔ اس سلسلہ میں برادرم نجیب الرحمٰن کیلانی اور محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی کی خدمات اور تعاون قابل قدر ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کا سفر کیا تھا۔ اس وقت میری عمر 24 سال سے کچھ اوپر تھی۔ ریاض کا پرانا ائرپورٹ کوئی بڑا نہ تھا۔ شہزادا ایجنسی والوں نے مجھے ایک فون نمبر دیا تھا کہ ائرپورٹ سے نکل کر اس نمبر پر فون کر لینا، سامان تھوڑا سا تھا۔ کسٹم سے جلد ہی فارغ ہو گیا تو باہر خاصا رش نظر آیا۔ ایک طرف فون کا کیبن تھا، وہاں ایک سعودی فون کر رہا تھا۔ میرے پاس سکے بھی نہ تھے، البتہ سو ریال کا ایک نوٹ تھا۔

جن صاحب کا میرے پاس فون نمبر تھا وہ درزی کی دکان کرتے تھے۔ لوگوں کے درمیان مجھے پہچاننے کی خاطر پوچھنے لگے: آپ نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہوں گے؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے: آپ ٹھہریں! ہم ابھی ائرپورٹ آتے ہیں۔ غالباً ان کی دکان ''العلیا'' کے علاقے میں تھی۔ دس منٹ میں پہنچ گئے۔ سعودی عرب میں پہلی رات تھی، نیند بالکل نہ آئی۔ اللہ تعالیٰ میرے اس میزبان کو جزائے خیر عطا فرمائے، رات 12 بجے وہ

میرے لیے بادام والا دودھ لے کر آ گئے۔

دو دن کے بعد میں اپنے کفیل کے پاس تھا۔ اس کا نام تیسیر العلمی تھا۔ بطحاء کے علاقے میں اس کی ہینڈی کرافٹ کی دکان تھی۔ یہ سوریا اور دیگر ممالک سے کپڑے اور پیتل کی مختلف اشیاء منگوا کر فروخت کرتا تھا۔ ہم چار پانچ سیلز مین تھے۔ دکان کے مسئول سید قیصر کو پہلے دن سے ہی میں پسند نہ آیا، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے، آمین۔ اس کا سبب میرے چہرے پر سجی داڑھی اور نمازوں کی پابندی سے ادائیگی تھی، ہر چند کہ کام کے دوران نماز کا وقفہ ہوتا تھا، مگر دکان کا شٹر گرا کر کام جاری رکھا جاتا اور اندر گاہک بھی موجود رہا کرتے۔ دکان ایسی جگہ واقع تھی، جہاں کا «هَيئَةُ الأَمرِ بِالمَعرُوفِ وَالنَّهيِ عَنِ المُنكَر» والے کم ہی رخ کرتے تھے۔ میں ہر روز نماز کے اوقات میں اجازت لیتا اور عمارت کے قریب ہی واقع مسجد میں نماز پڑھنے چلا جاتا۔ اس دوران برادرم شفیق اور عتیق بھائی نے خاصا تعاون کیا۔ مجھے خطاطی آتی تھی، میں نے آتے ہی کام تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کوئی دو یا تین ماہ خاصے مشکل گزرے، مگر اللہ نے کرم کیا اور سیٹھ نے مجھے پہلی تنخواہ ایک ہزار ریال دے کر کہا: تمھاری قیمت اور کارکردگی تو ایک ہزار سے بھی کم ہے، مگر میں تمھیں ایک ہزار دے رہا ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پیسے گھر بھیج دیے۔

وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا رہا، برادرم عتیق صاحب کی کوششوں سے ایک دن سیٹھ ہم پر مہربان ہو گیا۔ جب نماز کا وقت آتا تو میں اس سے کہتا: میں نماز پڑھ آؤں؟ وہ یہ تو نہ کہہ سکتا کہ نہ پڑھو، ناگوار لہجے میں کہتا: جاؤ۔ غالباً تین ماہ کے بعد اس نے مجھے آزاد کر دیا اور کہا: تم جہاں چاہو نوکری تلاش کر سکتے ہو، مگر اس کے ساتھ ہی ہماری رہائش چھوڑنا ہوگی۔ تین ماہ کی اس مدت کے دوران میرا اقامہ بن چکا تھا۔ میں نے ابھی تک عمرہ ادا نہیں کیا

تھا۔ رمضان المبارک کا انتظار تھا، ملز کے علاقے میں امیر عبداللہ روڈ کے آخر پر "شِـرْكَةُ مَـرْوَةَ لِـلإِعْلَانِ" کا دفتر تھا۔ نہ جانے میں وہاں کس ذریعے سے پہنچ گیا۔ وہاں کے آرٹ ڈائریکٹر جناب منظور حسین صاحب تھے۔ ان کا آبائی شہر جہلم تھا، بڑے اچھے اخلاق کے سلجھے ہوئے انسان، پاکستانیوں کے ساتھ خوب محبت کرتے اور حتی الامکان ان کے کام آتے تھے، یہی وجہ تھی کہ دفتر میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ یہ خود بھی پاکستان سے اپنی ٹیم کو اکٹھا کر کے لائے تھے۔ انٹرویو دیا، پوچھنے لگے: کتنی تنخواہ لو گے؟ میں نے کہا: جناب وہاں تو بارہ سو ریال ماہانہ تھی۔ مگر ملتی کبھی ایک ہزار تھی اور کبھی زیادہ۔ کہنے لگے: ہم تمھیں چودہ سو ریال دیں گے۔ مجھے نوکری اور رہائش درکار تھی جو فوراً مل رہی تھی، میں نے ہاں کر دی اور اس طرح مروہ ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں نوکری لگ گئی۔ ان کی رہائش بطحاء کے علاقے میں تھی اور دفتر ملز میں تھا۔ آنے جانے میں دو بسیں تبدیل کرنا پڑتی تھیں، رہائش ایک فلیٹ میں تھی، جس میں ایک فوٹو گرافر اور تین چار آرٹسٹ رہتے تھے۔ ایک ایک کمرے میں دو دو آدمی رہتے تھے۔ مجھے جس کمرے میں رہنے کے لیے کہا گیا اس میں ایک آدمی کی جگہ خالی تھی۔ اس میں راولپنڈی کے اسلم صاحب رہتے تھے، یہ کیمرہ مین تھے۔ مجھے دیکھ کر خاصے سیخ پا ہوئے کہ یہ کہاں سے آ گیا ہے؟ بولے: دیکھو میاں! کوئی اور کمرہ تلاش کرو، میں رات کو بہت تاخیر سے سوتا ہوں۔ آدھی رات تک گیت سنتا ہوں، پان کھاتا ہوں۔ میں بجلی بند نہیں کروں گا، تم کیسے سو سکو گے؟ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، کوئی کمرہ خالی نہ تھا، میں دوبارہ ان کے پاس آیا اور کہنے لگا: بھائی! یہ تو کمپنی کا آرڈر ہے، تم بھی ملازم ہو اور میں بھی یہاں نوکری کروں گا۔ یہ کہہ کر اپنا سامان کمرے میں رکھ دیا اور کہا: اسلم صاحب آپ رات ڈھائی تین بجے جب سونے لگیں تو مجھے

اٹھادیا کریں تاکہ میں تہجد پڑھ لیا کروں۔ایک دو دن تو انھوں نے تنگ کیا،مگراس کے بعد نہایت اچھے ہمسائے ثابت ہوئے اور میرے ساتھ عزت واحترام سے پیش آنے لگے۔

میں نے کم وبیش پانچ ماہ مروہ میں کام کیا اور بہت کچھ سیکھا۔چند دن تو دفتر جانے کے لیے بس کا انتظار کیا،مگر محسوس ہوا کہ بس اپنی مرضی سے آتی ہے۔اب دومرتبہ بس بدلنے سے بہتر ہوگا کہ پیدل جایا جائے دوریاں بھی بچ جائیں اور ورزش بھی ہوجائے گی۔گھر سے دفتر پہنچنے میں پینتالیس منٹ لگتے تھے،تیز قدموں سے چلتا چلتا دفتر پہنچ جاتا۔میں منظور حسین صاحب کا سیکرٹری تھا۔ان کے بڑے سے دفتر میں ایک کونے میں میری کرسی اور میز تھی۔مروہ والوں کے پاس مختلف اخبارات کے اعلانات کا معاہدہ تھا۔دفتر میں اخبارات،مجلّات،جرائد وغیرہ کے لیے اشتہارات کی ڈیزائننگ ہوا کرتی تھی،کوئی سات آٹھ آرٹسٹ تھے،کچھ سینئر آرٹسٹ اور کچھ جونیئر آرٹسٹ تھے۔

منظور صاحب بڑے کمال کے انسان تھے،وہ پنسلوں کے ساتھ کھیلتے،اشتہارات آتے تو آناً فاناً پنسل سے اس کا خاکہ بنا کر میرے حوالے کر دیتے کہ فلاں آرٹسٹ کو فائنل کرنے کے لیے دے دو۔میں ان اشتہارات کو ایک بڑے سے رجسٹر میں درج کرتا اور آرٹسٹ کے حوالے کر دیتا،میرے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ صبح سویرے وقت پر پہنچ کر دیکھوں کہ کون وقت پر آفس میں آیا اور کون تاخیر سے پہنچا،اس طرح گویا میری ڈیوٹی میں ان کی حاضری چیک کرنا بھی شامل تھا۔میرے لیے بہت ساری باتیں نئی تھیں،میں منظور صاحب کو انگریزی بولتے ہوئے غور سے سنتا،ان کی نقالی کی کوشش کرتا،انھوں نے مجھے خاص طور پر کہا تھا: میری انگلش غور سے سنا کرو،اس سے تمھاری انگلش بہتر ہوجائے

گی۔ یہ دور میرے سیکھنے کا تھا، میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے مروہ میں آرٹ کے حوالے سے بہت ساری باتیں سیکھیں۔

منظور صاحب میرے آنے کی وجہ سے کہہ لیں یا ویسے ہی اب وہ زیادہ تر باہر مختلف کمپنیوں میں جاتے، وہاں سے اشتہارات لاتے۔ میری وجہ سے اب ان کا دفتر کھلا رہتا، جو بھی ملاقاتی آتا میں اسے بٹھاتا، اس سے باتیں کرتا، دفتر کے نیچے ایک مصری تھا جس کا نام ''صلاح'' تھا۔ یہ دفتر کا چوکیدار اور آفس ٹی بوائے تھا۔ اس نے تھوڑا سا سائڈ بزنس بھی شروع کیا ہوا تھا۔ وہ فریج میں بوتلیں رکھ لیتا تھا اور نصف ریال کی بوتل فروخت کرتا تھا۔ دفتر میں بعض اوقات کوئی معزز شخص آتا تو، میں انھیں دفتر میں بٹھاتا، پانی پلاتا اور اگر مناسب سمجھتا تو صلاح کو کھڑکی سے آواز دیتا کہ ایک بوتل لے آؤ۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا، مجھے اس سے سکون اور خوشی ملتی کہ کوئی شخص اتنی شدید گرمی میں ہمارے دفتر آیا ہے تو کم از کم اس کی اتنی مہمان نوازی تو ہو جائے کہ ایک بوتل پلا دی جائے۔ ایک دن منظور صاحب مجھ سے کہنے لگے: تمھاری تنخواہ کتنی ہے جو تم لوگوں کو ہر وقت کھلاتے پلاتے رہتے ہو!! میں نے کہا: جناب! دیکھیں لوگ اتنی دور سے چل کر آتے ہیں، باہر سخت گرمی ہوتی ہے، اگر ان کی ضیافت کر دیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے، یہ تو میری خاندانی روایات ہیں۔ کہنے لگے: اچھا! کچھ حصہ میں بھی ڈال دیا کروں گا۔ میں نے مسکرا کر بات کو ٹال دیا۔

میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے کہ جس شخص کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے اس کی معاشرے میں خوب عزت ہوتی ہے اور جو سخت کنجوس ہوتا ہے اس کو بچتا بھی کچھ نہیں اور وہ لوگوں سے بے عزتی بھی کرواتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کنجوسی سے بچائے، میرے نزدیک یہ

تمھاری تنخواہ کتنی ہے جو تم لوگوں کو ہر وقت کھلاتے پلاتے رہتے ہو!!

بہت ہی بری خصلت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ بخل سے پناہ مانگا کرتے تھے۔

دفتر میں دو مصری خطاط پارٹ ٹائم کام کے لیے آتے تھے، میں نے بھی قلم دوات رکھ لی تھی، جب وقت ملتا مشق کرنا شروع کر دیتا، مصری خطاطوں سے بھی اصلاح لیتا۔ ان میں سے ایک مصری کو میں نے دیکھا کہ وہ پیمانہ رکھ کر اس کی مدد سے لکھتا تھا۔ عربی زبان میں یہ خوبی ہے کہ آپ الفاظ کو لمبا کر کے لکھ سکتے ہیں، اب کسی لفظ کو لمبا کرنا مقصود ہوتا تو وہ قلم کو پیمانے کے ساتھ ساتھ چلاتا، اس طرح بڑی خوبصورت لکھائی ہو جاتی۔ اس وقت تک کمپیوٹر نہیں آیا تھا، اس لیے خطاط کی قدر و منزلت تھی۔ میں نے بھی اسی کی طرح لکھنا شروع کر دیا، جب وہ آتا تو میں اسے اپنی مشق دکھاتا، مجھے عربی کچھ زیادہ نہ آتی تھی، وہ مسکراتا، اشاروں کی زبان سے سمجھاتا، اور کبھی کبھار قلم پکڑ کر میری اصلاح بھی کر دیتا۔ وقت گزرتا گیا، میں بتدریج اپنے کام کو سنبھالتا چلا گیا۔

مروہ للإعلان کی انتظامیہ مجھ سے خاصی خوش تھی، صبح کا ناشتہ ہم گھر سے کر کے آتے۔ نماز ظہر کے بعد سے شام چار بجے تک کا وقفہ ہوتا تھا۔ یہ چار گھنٹے ہم دفتر ہی میں گزارتے، رہائش پون گھنٹے کی پیدل مسافت پر تھی، آنے جانے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا اور پھر ہم یہ سوچتے کہ اس شدید گرمی میں کون بطحاء تک جائے۔ دفتر میں چونکہ ائرکنڈیشنر چل رہے ہوتے تھے، ہم نماز ظہر ادا کرتے، بقالہ سے ایک ریال کا روٹی کا پیکٹ خریدتے، سالن صبح گھر سے لے آتے تھے اور وہیں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا لیتے،

سالن کبھی گرم بھی کر لیتے، مگر عموماً ٹھنڈا ہی چل جاتا۔ دسترخوان پر دہی، لسی یا پھر ''صلاح'' کی مہیا کردہ بوتلیں کام آتیں۔

ایک بوڑھا خطاط جس کی داڑھی سفید تھی، دفتر میں میرے پاس اکثر آیا کرتا تھا، سوریا سے تعلق رکھنے والا یہ خطاط بہت خوبصورت لکھتا۔ منظور صاحب کی عدم موجودگی میں میرے پاس کوئی خاص کام نہ ہوتا تھا، ایک دن اس نے مجھے بتایا: میری بیٹی بھی خطاط ہے اور وہ وزارت تعلیم میں بطور ٹیچر کام کر رہی ہے، چونکہ وہ غیر شادی شدہ ہے اس لیے میں بطور محرم اس کے ساتھ مقیم ہوں اور مجھے بھی وزارت تعلیم نے اقامہ دے رکھا ہے۔

ان دنوں وزارت کی نوکری سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ وزارت کی ڈیوٹی صبح ساڑھے سات بجے شروع ہوتی اور ڈھائی بجے دوپہر کو ختم ہو جاتی تھی۔ جمعرات اور جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی، جبکہ پرائیویٹ ادارے صبح 8 سے 12 بجے تک اور شام 4 سے 8 بجے تک یا 9 بجے تک کھلے رہتے تھے۔ البتہ جمعرات کو آدھا دن کام ہوتا اور ایک بجے چھٹی ہو جاتی، دفتر سے گھر تیز قدموں سے چلتے تو 45 منٹ لگتے تھے، دفتر کے ساتھیوں کے ساتھ یہ سفر ایک گھنٹے میں طے ہوتا۔ ہر شخص کی دلی خواہش تھی کہ اسے وزارت میں نوکری مل جائے۔ میں نے سوری خطاط سے کہا: کیا ایسا ممکن ہے کہ مجھے بھی وزارت تعلیم میں بطور خطاط نوکری مل جائے؟ کہنے لگا: ہاں کیوں نہیں! میں کوشش کروں گا، مگر تمھاری یہ جو ''مروہ'' کی ڈیوٹی ہے اس کا کیا ہوگا؟ میں نے کہا: یہاں مجھے 14 سو ریال ملتے ہیں، وزارت تعلیم میں تنخواہ 25 سو ریال اور پھر 8 ہزار ریال سالانہ بدل سکن، پاکستان کے سالانہ 4 ٹکٹ اور 45 دن کی چھٹیاں ہوں گی، مروہ والوں کو تو کوئی اور بھی شخص مل سکتا ہے۔

وزارت تعلیم میں

چند دن کے بعد بوڑھے خطاط نے بتایا کہ وزارت تعلیم کو خطاطوں کی ضرورت ہے، شارع جامعہ پر ادارہ تعلیم البنات کا دفتر ہے، وہاں پر فلاں شخص سے مل لو، تمھارا کام ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ٹیکسی کا کرایہ عموماً 10 ریال ہوا کرتا تھا اور بسیں ایک ریال یا دو ریال لیتی تھیں، یہاں مروہ میں 12 بجے چھٹی ہوئی تو میں ٹیکسی کے ذریعے شارع جامعہ پہنچ گیا۔ وزارت تعلیم والوں کے لیے میں نے اپنا بائیو ڈیٹا بنالیا، کچھ خطاطی کے نمونے بنالیے اور انھیں پیش کر دیا، ابتدائی طور پر انھوں نے میرا کام پسند کیا، انھیں لڑکیوں کے سرٹیفکیٹ لکھنے کے لیے خطاط کی ضرورت تھی۔ وہاں پر ایک مصری خطاط ''محمود'' تھا، پہلے ہی دن اس نے میرے ساتھ بڑی شفقت کا مظاہرہ کیا، کہنے لگا: میں تمھاری بھرپور مدد کروں گا۔ میں روزانہ وزارت تعلیم کے دفتر پہنچ جاتا، چونکہ جاتے وقت جلدی ہوتی اس لیے ٹیکسی پر دس ریال دے کر چلا جاتا، دفتر عملاً دو بجے بند ہو جاتے تھے، میں وہاں سے پیدل اپنے دفتر آ جاتا اور 10 ریال بچ جاتے۔

ہر روز ہی انٹرویو ہوتا، میری فائل آگے بڑھتی چلی گئی، امید کی کرنیں روشن ہوتی گئیں، ایک دن سعودی مدیر کہنے لگے: تم پاکستانی ہو، تمھیں تو عربی پڑھنی نہیں آتی ہوگی، ہمارے لیے مشکل ہوگی۔ میں نے بھرپور اعتماد کے ساتھ کہا: ایسی کوئی بات نہیں جناب، مجھے عربی آتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کوئی مسودہ مجھ سے پڑھوا کر دیکھ لیں۔ انھوں نے بھی میرا چیلنج قبول کر لیا اور ایک مسودے کی کاپی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولے: لو! اسے پڑھ کر سناؤ۔

میں نے مکمل اعتماد کے ساتھ مسودہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور با آواز بلند بڑی تیزی

سے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ اپنے اطراف میں موجود لوگوں سے بے نیاز خود کو مکمل قابو میں رکھتے ہوئے صحیح یا غلط جتنی بھی عربی مجھے آتی تھی، اس کے مطابق مسودہ پڑھتا چلا گیا اور پہلا صفحہ ختم کرنے کے بعد میں نے دادطلب نگاہوں سے مدیر کی طرف دیکھا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی...... پھر اچانک مدیر کا ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا...... کمرے میں موجود لوگ بڑے محظوظ ہوئے۔

مدیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: دیکھو بھئی! تم نے مسودہ پڑھنے میں خاصی غلطیاں کی ہیں، مگر تم تیز آدمی ہو، ہمیں یقین ہے کہ جلد ہی اپنی غلطیوں پر قابو پاتے ہوئے اصلاح کر لو گے۔ دفتر میں موجود دیگر سعودیوں نے بھی مسکراتے ہوئے مدیر کی بات کی تائید کی۔ اس طرح میری نوکری پکی ہوگئی۔

استاذ محمود خطاط بہت خوش تھا کہ اسے ایک نائب میسر ہو رہا ہے۔ میں بھی ہر روز انٹرویو کے بعد اس کے پاس جاتا، وہ مجھے چائے پلاتا، خطاطی میں اس کا اپنا ''ہاتھ'' کوئی زیادہ خوبصورت نہ تھا، مگر وہ بذات خود نہایت خوش اخلاق تھا، میری حوصلہ افزائی کرتا اور یقین دلاتا: تمھارا کام بن جائے گا۔

ایک دن وزارت والوں نے کہا: آج تمھارا تحریری امتحان ہوگا، ہم کچھ سوالات لکھ کر دیں گے تمھیں ان کے جوابات دینے ہوں گے۔

میں نے ذہنی طور پر خود کو تیار کرتے ہوئے کہا: ٹھیک ہے، میں تیار ہوں، آپ سوالات کا پرچہ دیں، اس روز استاذ محمود کو بھی بلوالیا گیا۔

میرے ہاتھ میں سوالات کا پرچہ تھما دیا گیا۔ یہ سوالات میری ذاتی زندگی کے بارے میں تھے۔ میں نے بسم اللہ پڑھ کر سوالات کے جواب دینے شروع کیے، مگر بعض سوالات

تھوڑی دیر خاموشی رہی...... پھر اچانک مدیر کا ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا......

میری سمجھ سے بالا تر تھے، میرے چہرے پر قدرے گھبراہٹ تھی لیکن میں مطمئن ضرور تھا۔ جن سوالات کے جواب مجھے نہیں آتے تھے ان کے جوابات محمود نے ایک کاغذ پر لکھ کر میرے سامنے رکھ دیے، مدیر کا منہ دوسری جانب تھا جس سے محمود نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میں نے ان سوالات کے جوابات نقل کر دیے۔ مدیر نے بھی دیکھ لیا کہ محمود میری مدد کر رہا ہے، وہ مسکرا کر رہ گیا، نہ جانے اس نے محمود سے کیا کہا، تاہم محمود نے اپنے بازو لہراتے ہوئے میری نوکری کے حق میں بھرپور سفارش کی۔

میں نے تمام انٹرویوز پاس کر لیے تھے، تمام مدیروں نے لکھا کہ یہ نوکری کے لیے اہل شخص ہے۔ استاذ محمود کو اللہ جزائے خیر دے، انھوں نے بھرپور تعاون کیا تھا، میں اب پر امید تھا کہ کام بن گیا ہے۔

اگلے روز مدیر نے مجھے بلوا کر کہا: تمھیں سعودی عرب میں آئے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے، میں بولا: کم وبیش چھ ماہ ...... کہنے لگا: ایک سال مکمل ہونے سے پہلے تم کسی سرکاری ادارے میں کام نہیں کر سکتے، لہٰذا جب تمھیں ایک سال ہو جائے تو پھر آ جانا، یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ مجھے ریاض گھومتا ہوا نظر آیا، مدیر کے کمرے سے نکلا تو سیدھا استاذ محمود کے پاس پہنچا، اس نے سنا تو فوراً قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتے ہوئے کہنے لگا:

﴿عَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا

وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ﴾

''عین ممکن ہے کہ تم ایک کام کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک کام کو پسند کرو، مگر وہ تمھارے لیے برا ہو۔''

مؤمن رضائے الٰہی پر راضی رہتا ہے، ممکن ہے تمھارے لیے اس نوکری سے فی الحال انکار میں کوئی بہتری ہو، خیر! میں استاذ محمود کی بات سن ان سنی کر کے واپس مروہ کے دفتر چلا آیا، مگر ذہنی طور پر خود کو مروہ کی نوکری چھوڑنے پر تیار کر چکا تھا۔ دل کافی اداس تھا، اللہ سے بہتری کی دعا کی۔

مروہ میں البتہ ایک دن یہ ہوا کہ ہمارے جنرل مینیجر شیبانی صاحب تشریف لائے، کمرے میں اس وقت صرف میں ہی تھا، منظور صاحب کہیں گئے ہوئے تھے، انھوں نے کچھ سوالات پوچھے، میں نے خاصے اطمینان بخش جوابات دیے، وہ مطمئن ہو کر واپس لوٹے، دوسرے دن جب منظور صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا: کل شیبانی صاحب سے تمھاری ملاقات ہوئی تھی؟

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے سوال کیا: خیریت! کیا ہوا، انھوں نے کچھ کہا؟

کہنے لگے: ہاں! وہ تم سے بہت خوش ہیں، انھوں نے تمھاری تنخواہ 18 سو ریال کر دی ہے، مگر میرا مطالبہ کچھ زیادہ تھا۔ کچھ لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں وزارت تعلیم میں نوکری کی کوشش کر رہا ہوں، میری خواہش تھی کہ میں مروہ چھوڑ دوں، مگر اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار ضروری تھا۔

ایک دن محمود خطاط کا فون آ گیا کہ ادارہ تعلیم البنات منطقہ وسطیٰ والوں کو تمھاری شدید

ضرورت ہے، جب انھیں معلوم ہوا کہ قانونی طور پر فی الحال تمھاری تقرری نہیں ہو سکتی تو انھوں نے کنٹریکٹ کی بنیاد پر رکھنے کی منظوری لے لی ہے۔ تم فوراً ملز میں واقع ادارہ سے مدیر امتحانات شیخ زید الخرعان سے مل لو، چنانچہ میں ان سے ملنے کے لیے چلا گیا۔

میں شیخ زید الخرعان سے ملا تو انھوں نے نمونے کے طور پر چند سرٹیفکیٹ لکھنے کے لیے مجھے دیے۔ طالبہ اور اس کے والد کا نام، تاریخ پیدائش، مدرسہ کا نام، وغیرہ، اس نوعیت کے مختلف معلوماتی کالم بنے ہوئے تھے جن کی کتابت کرنا تھی، میں نے پہلا ہی سرٹیفکیٹ لکھ کر انھیں دکھایا تو خاصے مطمئن ہو گئے، اگلے دن سے کام شروع ہو گیا، مجھے کہنے لگے: تمھیں ایک سرٹیفکیٹ کے تین ریال ملا کریں گے۔ ہمارے پاس کوئی ڈھائی ہزار سرٹیفکیٹ ہیں۔ گویا یہ ساڑھے سات ہزار ریال کا کام تھا۔ میں نے سوچا: مروہ میں یہ آمدنی مجھے چار ماہ میں حاصل ہو گی، اب وقت آ گیا ہے کہ میں مروہ والوں کو جواب دے دوں۔ میں نے وزارت تعلیم والوں سے دو چار دن مانگے تا کہ میں پرانی کمپنی سے معاملات کلیر کر لوں، انھیں کوئی اعتراض نہ تھا، میں نے مروہ والوں کو دو لائنوں کا استعفا لکھ کر دے دیا۔

اسے حسن اتفاق کہیں کہ منظور صاحب دمام گئے ہوئے تھے مجھے انھی کی طرف سے استعفا کی منظوری میں رکاوٹ کا اندیشہ تھا۔ ان کے نائب جناب طاہر صاحب شروع دن سے ہی مجھے ناپسند کرتے تھے۔ اس کی وجہ مجھے معلوم نہ ہو سکی، بہر حال اکاؤنٹس والوں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا: بڑا نالائق آدمی ہے، جاتا ہے تو جانے دو، اس طرح ان کی ''مہربانی'' سے میرا کام بن گیا، میرا استعفا منظور ہو گیا اور میں نے وزارت تعلیم میں کام شروع کر دیا۔

چند دن کے بعد منظور صاحب آئے تو میرے بارے میں معلوم ہونے پر سخت ناراض ہوئے، مجھے فوراً بلا بھیجا۔ انھوں نے پتہ کیا کہ استعفا کس نے منظور کیا، ہم نے تو اس کی اچھی کارکردگی کی بنا پر اس کی تنخواہ بڑھانے کی بات کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کے خاص دوست طاہر صاحب نے استعفاء منظور کیا ہے۔

خیر منظور صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو سخت ناراض تھے، میں نے اپنے بہتر مستقبل کا حوالہ دیا کہ 18 سو ریال میں میرا کیا بنتا، بہر حال حکم ہوا کہ آج ہی رہائش چھوڑنی ہوگی، میں نے مہلت طلب کی، جو نہ مل سکی، میں اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا، شمیسی میں کچھ سنگل نوجوان رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کمرے میں حصہ دار بن گیا، کل تین یا چار آدمی ایک کمرے میں رہتے تھے، سو ریال ماہوار کرایہ تھا، اور کھانے کا خرچ بھی کم وبیش سو ریال ہی آتا تھا۔

میں نے ادارہ تعلیم البنات میں پہلے دن 40 سرٹیفکیٹ لکھے، اس طرح اس روز 120 ریال کمائے، اپنی ڈائری میں تحریر کیا کہ آج میں نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ کمائی کی ہے۔ ان دنوں پاکستانی کرنسی ایک ریال کے مقابلے میں 2 روپے 75 پیسے تھی۔ اس طرح 330 روپے ایک دن کی آمدنی خاصی زیادہ تھی۔ اگلے دنوں میں میری رفتار خاصی تیز ہوگئی، دفتر ساڑھے سات بجے کھلتا تھا اور دو بجے دوپہر کو بند ہو جاتا تھا، سعودی مدیر نے مجھے تاکید کی کہ یہ خفیہ دستاویزات ہیں، کوئی ورق یا سرٹیفکیٹ ادھر سے ادھر نہیں ہونا چاہیے۔ ہر چیز کو تالا لگایا جائے گا، چابی صرف سعودی کے پاس ہوگی، وہی کمرہ کھولے اور بند کرے گا۔ اب میں تو صبح سویرے آجاتا، مگر سعودی حضرات خاصی تاخیر سے دفتر پہنچتے، تین دن کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا: ہم نے تمھیں دیکھ لیا ہے، تم

خاصے ایمان دار لگتے ہو، لہٰذا یہ چابی ہم تمھارے حوالے کرتے ہیں، اس طرح میری رفتار مزید تیز ہونے لگی۔

دفتر کے درمیان میں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں نماز ادا کی جاتی تھی، ایک پی ایچ ڈی سعودی ڈاکٹر شعلان ادارے کے سربراہ تھے، وہ ظہر کی نماز پڑھاتے تھے۔ جوانی کے ایام تھے، میری آواز ان دنوں خاصی بلند ہوتی تھی، میں ظہر کی اذان بڑے اہتمام سے کہتا، چند دنوں میں تمام ادارے میں میری اذان ہی میری پہچان بن گئی۔ سب لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ ایک روز ایک سعودی شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا: تمھاری اذان سن کر میرا جی چاہتا ہے کہ تمھیں اپنے گاؤں لے جاؤں اور وہاں کی امامت تمھارے سپرد کردوں، تمھاری آواز خاصی اچھی اور بلند ہے۔ میرے لیے یہ الفاظ آج بھی بڑے اہم ہیں، ان کو میں اپنے لیے بڑا سرٹیفکیٹ سمجھتا ہوں، اللہ کرے قیامت والے دن اس کے یہ الفاظ میرے کام آجائیں۔ (آمین)

مدیر امتحانات جناب زید الخرعان مجھ پر خاصے مہربان تھے، میں وقت سے پہلے آتا اور آخری وقت تک کام کرتا رہتا، اب میری اوسط رفتار 150 سرٹیفکیٹ تک پہنچ چکی تھی، جمعرات، جمعہ البتہ چھٹی ہوتی تھی۔ شیخ زید الخرعان کام ہوتے ہی اپنی جیب سے مجھے کام کے ساتھ ساتھ اس کی اجرت دے دیا کرتے تھے، میں نے پہلے قرضہ اتارا، والدین کو جی بھر کے پیسے بھیجے اور پھر موٹر سائیکل خرید لی، اب آنے جانے میں آسانی ہوگئی۔

ادارہ تعلیم البنات کی انتظامیہ میرے لیے مزید سرٹیفکیٹ نکال کر لاتی چلی گئی، کوئی ایک ماہ دس دن میں سارا کام مکمل ہوگیا، میں مالی طور پر الحمدللہ خوشحال ہو چکا تھا۔ میرے کام کا بل بنا، انتظامیہ نے کیش دے دیا۔ اس روز شیخ زید الخرعان دفتر میں نہ تھے، اگلے

دن میں آیا، انھوں نے جو ایڈوانس دیا تھا ان کو واپس کیا، خاصے خوش ہوئے، کہنے لگے: تم بڑے ایمان دار آدمی لگتے ہو، تم نے کل ہی سارا حساب لے لیا تھا، ہم نہیں جانتے کہ تم کہاں رہتے ہو، اگر تم چاہتے تو یہ پیسے لے کر چلے جاتے، تمھیں کون پکڑ سکتا تھا، میں اس پر مسکرا دیا۔ کہنے لگے: ہمیں ایک محنتی شخص کی ضرورت ہے۔ ''دیرہ'' میں ہمارا کپڑے کا وسیع کاروبار ہے وہاں مینیجر درکار ہے، آج شام ہماری دکان پر آ جانا، تم ہمارے ساتھ کام کرنا، اچھی تنخواہ ملے گی، شام کو ان کے بھائی سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بڑی عزت کی، مگر مجھے کام پسند نہ آیا اور میں واپس آ گیا۔

زندگی کے دن تیزی سے گزر رہے تھے، میں جہاں رزق حلال کمانے میں کامیاب ہو رہا تھا وہاں گھر سے دوری کا احساس بھی شدید تر تھا، میں نے اپنے گھر والوں کو خاصا اداس چھوڑا تھا، بطور خاص والد صاحب تو زیادہ ہی اداس تھے، میں ان کا بڑا چہیتا تھا، گھر میں زندگی بڑی متوازن اور مزیدار تھی، میں خود تو مصروف ہو گیا جبکہ اس کا علاج یہ سوچا کہ والدین کو ہر وقت اپنے حالات سے آگاہ رکھوں، میں کم و بیش ہر روز ان کو خط لکھتا، اپنے سارے حالات سے آگاہ کرتا، ادھر والد صاحب بھی مجھے گھر کے تمام حالات سے آگاہ رکھتے، محلے کے حالات سمیت تمام جاننے والوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا کرتے تھے۔

اسی طرح اگر ہر روز نہیں تو دوسرے دن مجھے خط ضرور مل جاتا تھا، میرے دوست احباب اور جاننے والے بھی مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ میں اس دوران جو کچھ کماتا، اپنے معمولی اخراجات رکھ کر باقی سارے گھر بھجوا دیتا۔ قرضہ کافی حد تک ادا ہو گیا تھا۔ جب میں مروہ میں تھا تو دوپہر کے وقفہ میں ہم سب دوست تین کام کرتے: نماز ظہر اور عصر ادا

کرتے، دوپہر کا کھانا کھاتے اور گھر سے آئے ہوئے خطوط بار بار پڑھتے، ان کے جوابات لکھتے اور فرش پر سو جاتے۔ دفتر سے چھٹی ہوتی تو گھر پہنچتے پہنچتے نو بلکہ ساڑھے نو بج جاتے، جا کر کھانا پکاتے، کھاتے ہوئے رات کے گیارہ بج جاتے، جس کے بعد بستر پر لیٹتے تو فوراً ہی نیند کی وادی میں پہنچ جاتے تھے۔

وزارت تعلیم والوں نے تو کام ختم ہونے پر مجھے فارغ ہی کر دیا تھا، تاہم ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ جب بھی کام ہوگا وہ مجھے ضرور بلوالیں گے۔ وزارت تعلیم کے دفتر سے ساتھیوں نے نہایت محبت اور شفقت سے رخصت کیا، اب میری جیب میں خاصی معقول رقم تھی، میں نے شکرانے کے طور پر عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سے پہلے عمرہ اور حج کر چکا تھا اور مدینہ منورہ بھی جا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ جب عمرہ کیا تو یہ سعادت رمضان المبارک میں حاصل ہوئی تھی۔ اس سفر میں ریاض سے طائف تک ٹیکسی پر گئے تھے۔ کرایہ ان دنوں اسی ریال تھا۔ طائف سے جناب ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی کی معیت میں مکہ گئے تھے۔ وہ عمرہ میں نے رمضان المبارک کی 27 ویں شب کو کیا، اس موقع پر میں غیر معمولی طور پر جذباتی تھا، حرم میں تاریخی رش تھا، اس روز جنرل ضیاء الحق بھی عمرہ کے لیے آئے ہوئے تھے، سعی کے دوران ان سے ملاقات ہوئی، خاصی دیر تک ہاتھ پکڑے کھڑے رہے۔ خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں اس مرتبہ شکرانے کا عمرہ کرنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز پہلے طائف گیا پھر مدینہ منورہ سے ہوائی جہاز ہی کے ذریعے ریاض واپس آ گیا۔

انجینئر محمد عبدالحق کے دفتر سے وابستگی

مدینہ سے ریاض کے سفر کے دوران طیارے میں ''المدینہ'' اخبار پڑھنے کا موقع ملا،

میں اس کی ورق گردانی کررہا تھا کہ چھوٹا سا اشتہار نظر آیا: ایک کمپنی کو خطاط کی ضرورت ہے، میں نے اس کی کٹنگ جیب میں رکھ لی۔ اس زمانے میں ریاض ائرپورٹ شہر کے اندر ہی واقع تھا، میں نے ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی ٹیکسی پکڑی اور سیدھا اخبار میں دیے گئے اشتہار کے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ یہ ایک انجینئرنگ کمپنی کا دفتر تھا، جو عمارتوں کے نقشے بناتے تھے، نقشوں کے اوپر ہاتھ سے غرفۃ، صالۃ، مطبخ، غرفۃ نوم، غرفۃ اطفال وغیرہ لکھنا ہوتا تھا، جس کے لیے خطاط کی ضرورت تھی کہ وہ خوبصورتی کے ساتھ یہ الفاظ لکھ دیا کرے۔ شارع الوزیر اور شارع الخزان کے سنگم پر الجزیرہ بنک کی عمارت میں چھوٹا سا دفتر تھا جس میں چند آرکیٹکٹ انجینئرز اور چند ڈرافٹس مین کام کررہے تھے، بھارت سے تعلق رکھنے والے جناب سفیر احمد اس کے منیجر تھے۔ میں نے ان کو بتایا: میں عربی خطاط ہوں اور ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں، پہلے تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ کوئی پاکستانی بھی عربی لکھ سکتا ہے؟! ان کے پاس ایک لبنانی خطاط ''عماد دبوق'' تھا جو ان کو غالباً تنگ کرتا تھا، کہنے لگے: چلو یہ شیٹ پکڑو اور لکھ کر دکھاؤ۔ میں نے فوراً مطلوبہ کلمات لکھ دیے، چیف آرکیٹکٹ جناب عبدالحلیم بھی بھارت ہی سے تعلق رکھتے تھے ان کو دکھایا تو بڑے خوش ہوئے، کہنے لگے: اس ادارے کے مالک ابھی آنے والے ہیں تم تھوڑا سا انتظار کرو۔ میں نے پوچھا: مگر مجھے تنخواہ کیا ملے گی؟

میرے سوال پر انھوں نے کہا: اچھی مل جائے گی۔ اس زمانے میں 2000 ریال تنخواہ اچھی سمجھی جاتی تھی، میں نے کہا: میں 2200 سے کم نہ لوں گا، جواب ملا: ہمارا سیٹھ آنے والا ہے اگر تم پسند آگئے تو تمھیں تنخواہ ٹھیک مل جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد انجینئر محمد عبد الحق آگئے، ان کے دادا پردادا ہندوستان سے ہجرت کرکے مدینہ آئے تھے۔ انھیں اردو

نہیں آتی تھی، بڑے اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے، ملاقات ہوئی، کام دیکھا، چند سوالات کیے اور نوکری پکی کر دی۔ تنخواہ 2200 ریال طے پا گئی، اگلے دن سے کام شروع ہو گیا۔

یہ ایک کنسلٹنگ کمپنی تھی جس کا نام مکتب نقشبندی تھا، انھوں نے وزارۃ الدفاع والطیران کو کچھ انجینئرز، ڈرافٹس مین، خطاط اور مترجم وغیرہ دے رکھے تھے۔ ملازمین کو جو تنخواہ دیتے اس کا کم وبیش دوگنا حکومت سے وصول کرتے، شام کے وقت یہی عملہ اس دفتر میں کام کرتا، جس کا انھیں الگ معاوضہ ملتا، اسی لیے شام کے وقت دفتر میں خاصی رونق ہوتی تھی۔ میرے ذمہ ڈرائنگ پر کتابت کرنا ہوتی تھی، جیسے ہی ڈرائنگ ختم ہوتی، عربی انجینئر پنسل سے لکھ دیتا اور میں پندرہ، بیس منٹ میں ڈرائنگ ختم کر کے کہتا: مزید کام ہے تو لاؤ، جو بھی کام ہوتا میں آناً فاناً ختم کر دیتا، باقی وقت دوستیاں بنانے میں اور شغل مذاق میں گزر جاتا۔

چند دن گزرے تو مینیجر نے مجھے بلا کر کہا: وزارت دفاع والوں کو ایک اور خطاط کی ضرورت ہے، تمھیں وہاں انٹرویو کے لیے بھجوا رہے ہیں۔ دیکھو، اگر تم پاس ہو گئے تو تمھاری نوکری پکی ہوگی، بصورت دیگر ہمارے پاس فل ٹائم خطاط کی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ان کو یقین دہانی کروائی کہ آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ میں انٹرویو میں ناکام نہیں ہوں گا۔ دراصل مجھ میں بہت زیادہ خود اعتمادی آ چکی تھی، والدین کی دعائیں شامل حال تھیں، میں ان کو حسب سابق ہر دوسرے دن حالات سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔

وزارت دفاع ان دنوں پرانے ائرپورٹ روڈ پر تھی، اس کی عمارت بھی خاصی پرانی تھی، کوئی خاص سکیورٹی بھی نہ تھی، میں نے اپنی موٹر سائیکل پارکنگ میں گاڑیوں کے درمیان کھڑی کی اور ادارہ اشغال عسکریہ پوچھتا ہوا متعلقہ دفتر پہنچ گیا۔

اس ادارے کا کام عمارتوں کے نقشے بنانا تھا، ایک لمبے سے ہال میں خاصی تعداد میں انجینئرز اور ڈرافٹس مین میزیں سجائے بیٹھے تھے، انجینئرز چھوٹی میزوں کے ساتھ کرسیاں لگائے ہوئے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ادارے کے انچارج ایک سعودی کیپٹن تھے جن کا نام صلاح تھا، ان کے بعد پاکستانی انجینئر سلیم احمد صاحب تھے۔ وہاں متعدد پاکستانیوں سمیت مصری اور سعودی کاریگر کام کر رہے تھے، میرے پاس مکتب نقشبندی کی طرف سے بند لفافہ تھا، جس میں میرے انٹرویو کا ذکر تھا۔ میں نے سلیم صاحب کو وہ لفافہ دے دیا، انھوں نے لفافہ میں موجود ورق پر نظریں دوڑانے کے بعد میرا جائزہ لیا اور پوچھنے لگے: تمھیں عربی آتی ہے؟

میں نے اثبات میں جواب دیا، میرے اوراق کے ساتھ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے نمونے بھی تھے، وہ میرا لفافہ اور نمونے لے کر فوراً سعودی کیپٹن کے پاس چلے گئے، میں وہیں ان کی کرسی کے پاس انتظار کرتا رہا، کچھ دیر کے بعد سلیم صاحب آئے اور کہا: ہم کام دیتے ہیں، کر کے دکھاؤ تو پھر دیکھتے ہیں کیسا کام آتا ہے!

پورے ہال میں بیٹھنے کے لیے کوئی بھی کرسی خالی نہ تھی، ایک کرسی کا بندوبست کیا گیا، کوئی مجھے اپنے ساتھ بٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا، سبھی اپنے اپنے کاموں میں منہمک تھے۔ انجینئر مصباح صاحب نے داڑھی رکھی ہوئی تھی، ان کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا، انھوں نے مجھے اشارہ کیا، میں نے میز سے اوراق سمیٹے اور کرسی لے کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا، اس میں سے قلم دوات نکالی اور لکھنا شروع کر دیا، میں لکھنے میں منہمک تھا اور ادھر سلیم صاحب میرے پیچھے آ کھڑے ہوئے، ابھی تھوڑا سا لکھا تھا کہ کہنے لگے: یار تمھارا خط تو بہت اچھا ہے۔ چند سطور کی مزید کتابت کی تو

ہاتھ سے کاغذ لے کر سعودی کیپٹن کے کمرے میں چلے گئے، چند منٹ بعد آئے اور کہنے لگے: یار یہ تو عربوں سے بھی بہتر لکھتا ہے، چلیے جناب وزارت دفاع میں نوکری پکی ہوگئی۔

سلیم صاحب کی اللہ تعالیٰ مغفرت کرے! بڑے اچھے انسان تھے، پاکستانیوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ذہنی رجحان پیپلز پارٹی کی طرف تھا، چنانچہ داڑھی والوں کو بظاہر پسند نہ کرتے تھے، بلکہ پھبتیاں بھی کستے رہتے، مگر دل کے کھرے اور صاف تھے۔ اس زمانے میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی۔ وہ ان کے سخت مخالف تھے۔ شروع شروع میں تو ہم خاموش رہتے اور مسکراتے رہتے، مگر آہستہ آہستہ ہم نے بھی ہلکی پھلکی تبصرہ آرائی شروع کردی، جس کا وہ قطعاً برا نہ مناتے۔

وزارت دفاع والوں نے غالبًا اگلے ہی دن میرے بارے میں لکھ دیا کہ یہ آدمی ہمارے لیے قابل قبول ہے، چنانچہ چند ہی روز میں وزارت دفاع میں داخل ہونے کا اجازت نامہ جسے عربی میں ''تصریح'' کہتے ہیں، بن گیا۔

یہاں ڈیوٹی عملاً صبح 8 بجے شروع ہوتی اور 2 بجے دوپہر ختم ہوجاتی۔ شام کو ہم مکتب نقشبندی چلے جاتے۔ شروع میں انھوں نے کہا: آپ کو ہمارے یہاں مفت کام کرنا ہوگا، مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا بلکہ مجھے کام کے آغاز ہی میں ڈرائنگ کی ایک شیٹ پر 15 ریال ملنا شروع ہوگئے۔ ہم دو خطاط تھے، ایک لبنانی عماد دبوق اور دوسرا میں تھا، اس میں خوبی یہ تھی کہ عربی دان تھا، وہ مسودہ اچھی طرح پڑھ لیتا تھا، اس لیے غلطیاں کم ہوتی تھیں، ہم دونوں بیٹھے رہتے کہ کب شیٹ ملے اور ہم اس پر خطاطی کریں۔

دو تین دن گزرے میں نے غالبًا دو شیٹیں لکھ لی تھیں، ایک دن شام کا وقت ہونے کو

تھا، بھوک لگ رہی تھی، میں دفتر سے نیچے اترا، ان دو دنوں میں تیس ریال کما چکا تھا، سامنے شاورما کی دکان تھی، ایک صامولی دو ریال میں ملتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے دفتر کے تمام افراد کے لیے صامولیاں بنوالیں۔ دفتر پہنچ کر سب کو صامولیاں پیش کیں۔ کچھ نے ناک بھوں چڑھایا، کسی نے لینے سے انکار کیا، مگر جب ایک دو نے قبول کر لیں تو سبھی نے لے لیں اور کھانا شروع کر دیا، دفتر میں اچھا خاصا رونق کا ماحول بن گیا۔

میری نوکری وزارت دفاع میں تھی، یہاں اضافی کام بھی تھا، ریاض میں ان دنوں شمیسی کے علاقے میں مٹھائی کی ایک ہی دوکان ہوتی تھی، میں نے اگلے دن دوکلو گلاب جامن خریدے اور دفتر میں سب کو کھلائے، چند ایک سیٹھ صاحب کے لیے بھی رکھ لیے۔ انھوں نے بھی شوق سے کھائے۔ میرے اس طرز عمل سے دفتر کے لوگوں کا دل میرے لیے مزید کشادہ ہو گیا، دوسرے روز شام کو سیٹھ صاحب آئے تو کہنے لگے: وہ عبدالمالک کہاں ہے؟ میں حاضر ہوا تو کہنے لگے: وہ جامو، جامو کدھر ہیں؟ انھیں گلاب جامن کا نام نہیں آ رہا تھا، ان کی بات میری سمجھ میں تو نہ آئی تاہم میں نے اندازے سے گلاب جامن کا نام لیا تو سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے: ہاں وہی وہی اور 50 ریال مجھے دیتے ہوئے کہا: میرے گھر کے لیے لے آؤ، اس طرح دفتر میں میری اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میرے لیے پیسے کی اہمیت کبھی نہ رہی تھی، میں جب بھی دفتر آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لیتا ہوا آتا، خود بھی کھاتا دوسروں کو بھی کھلاتا۔ اب انجینئرز نے اس کا صلہ یہ دیا کہ ان کی کوشش ہوتی کہ شیٹیں صرف مجھ سے لکھوائیں، چند دن کے بعد عماد دبوق نے خود ہی آنا چھوڑ دیا، غالباً اسے کسی بہتر جگہ کام مل گیا تھا جبکہ میں یہیں وزارت دفاع میں ہی

بدستور کام کرتا رہا۔

میں بہت تیز کام کیا کرتا تھا، وزارت دفاع میں جتنے انجینئر تھے سب ہی پارٹ ٹائم کام کرتے تھے۔ چند دنوں کے بعد ایک ترک آرکیٹکٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کے دفتر میں خطاط کی ضرورت ہے، اردلان نامی یہ ترک بڑا اچھا آدمی تھا، اس سے ریٹ کم وبیش دوگنا مل گئے، اب میں تین جگہ کام کرنے لگا: صبح وزارت دفاع میں، شام کے وقت اپنے ہیڈ آفس میں اور اردلان ترک کے پاس بھی جاتا تھا۔

ایک دن میں نے وزارت دفاع کے لیے گلاب جامن خریدے اور صبح سویرے سلیم صاحب کو جا کر پیش کر دیے، کہنے لگے: بھئی! یہ کیا ہے؟ میں بولا کہ جناب میری نوکری پکی ہوئی ہے، پہلی تنخواہ ملی ہے، بڑے خوش ہوئے، سارے عملے نے خوب مزے سے گلاب جامن کھائے۔ اب جن جن کی نوکری لگی تھی باری باری سب کو سلیم صاحب نے کہا: اگر عبدالمالک گلاب جامن لا سکتا ہے تو تم بھی لاؤ، اس طرح دفتر میں خوب شغل چلتا رہا۔ مجھے جو کام دیا جاتا میں اسے آناً فاناً ختم کر دیتا، اس لیے دفتر میں خاصی عزت تھی، باقی وقت سلیم صاحب کے ساتھ گپ شپ میں گزر جاتا، دفتر میں کوئی زیادہ کام بھی نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن ہمیں معلوم ہوا کہ بھارت سے کچھ نئے لوگ آرہے ہیں، ان کی رہائش کے لیے ہمارے سیٹھ صاحب نے ایک عمارت کرائے پر لی، یہ وزارت دفاع سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر تھی۔ ایک ایک کمرے میں دو دو اور بعض میں تین تین آدمیوں نے قیام کیا۔ ایک دن سیٹھ نے مجھے بلا کر کہا: تم اس رہائش گاہ کے انچارج ہو گے، اس کی صفائی ستھرائی کروانی ہوگی اور ضروری مرمت کے حوالے سے ہمیں بتانا ہوگا، یہ میرے

لیے بہر حال ایک اعزاز تھا۔ میرے کمرے کا ایک ہی ساتھی تھا جو بھارتی مسلمان تھا۔ اس کا نام آصف تھا، وہ امریکہ سے انجینئرنگ کر کے نیا نیا آیا تھا، غالباً والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔اس کے باپ کا ممبئی میں ایک سینما ہال تھا، بڑا شوقین مزاج اور خوبصورت بھی تھا، شادی ہوچکی تھی اور ایک بیٹا بھی تھا، والدین کا بڑا لاڈلا تھا،کھانے پینے کا نہایت شوقین تھا۔ ہماری پہلے ہی دن دوستی ہوگئی، ہر وقت ہنستا مسکراتا اور شرارتیں کرتا رہتا تھا۔ہم چونکہ ''روم میٹ'' تھے اس لیے چند دن بعد ہی ہم نے کھانے کا مشترکہ انتظام کرلیا، اسے کھانا پکانے کا بڑا شوق تھا، میں نے اسے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ میرے لیے خرچہ کا کوئی مسئلہ نہیں، مگر باورچی خانے میں کھانا پکانے کے لیے کھڑا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی مجھے پکانا آتا ہے۔ اس کی ضرورت تھی کہ کوئی اس کے ساتھ کھانے کا آدھا خرچہ برداشت کرلے اور مجھے پکے پکائے کھانے سے مطلب تھا، ہم دونوں کے مقاصد یکجا ہو گئے تو دوستی اور بھی گہری ہوتی چلی گئی، اب وہ مزے مزے کے کھانے پکاتا اور ہم مل کر کھاتے۔ دفتر میں وہ میرے پاس آتا، میری میز پر کھڑے ہوکر کہتا: آج میں نے ممبئی فون کرکے بیگم سے نئے کھانے کا طریقہ سیکھا ہے۔ میں کہتا: بالکل ٹھیک ہے پکاؤ، مزا آئے گا۔ اس طرح ہم دونوں کی دوستی بڑی اچھی رہی، عام لوگوں کا خرچ سو یا ڈیڑھ سو ریال آتا تھا جبکہ ہمارا کم از کم پانچ سے چھ سو ریال فی کس آتا تھا، ہم دونوں بڑے خوش تھے، موٹر سائیکل پر ادھر ادھر جاتے، سیر کرتے، نئے نئے کھانے پکاتے اور کبھی کبھار دوستوں کی دعوت بھی کرتے تھے۔

سلیم صاحب کی باتیں بھی بڑی مزیدار ہوتی تھیں۔ ہمارا دفتر دراصل ایک بہت بڑا ہال تھا، جس میں بڑی بڑی میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میزوں کو بوقت ضرورت کھڑا بھی کیا

جاسکتا تھا، تاکہ ڈرافٹس مین کھڑے ہوکران پر کام کرسکیں۔ میری میز کے بعد ہمایوں ملک کی میز تھی، یہ الیکٹریکل انجینئر تھے، پاکستان میں غالباً واپڈا میں ایس ڈی او تھے، ان سے میری خوب دوستی ہوگئی، ہم کام بھی خوب کرتے اور باتیں بھی بہت کرتے۔

سلیم صاحب ہمیں دیکھتے تو دور سے آواز دیتے: ارے! چپ کرجاؤ، باتیں نہ کرو، مگر ان کی تنبیہ کا اثر ہم کم ہی لیتے، ان کی توجہ ہٹتے ہی پھر شروع ہوجاتے، اب سلیم صاحب آواز لگاتے: اوئے خدا کی قسم! میں تمھیں ''چک'' دوں گا، چک سے مراد یہ تھی کہ دونوں کی بیٹھنے کی جگہیں تبدیل کردوں گا، ہم مسکرا کر رہ جاتے۔ کبھی کبھار غصہ بھی کرلیتے، میں عموماً غالب کا ایک مصرعہ پڑھا کرتا تھا:

''وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں''

ہم صبح گھر سے آتے وقت کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز ضرور لے کر آتے، دس ساڑھے دس بجے قدرے بھوک ستاتی۔ الحمدللہ! میں ہمیشہ ہی سینڈوچ زیادہ لاتا، سلیم صاحب کے پاس ان کی میز پر بیٹھ کر مل کر کھاتے، تھوڑی دیر پہلے وہ ہمیں دھمکیاں دے رہے ہوتے کہ میں تمھیں چک دوں گا اور آدھ گھنٹے بعد ہم مل کر چائے پی رہے ہوتے تھے۔ وہ کہتے: یار مالک! آج تو تمھارا سینڈوچ بڑا مزیدار ہے، وہ خود بھی کھلے ہاتھ کے مالک تھے، اس لیے بڑا مزا آتا۔

دفتر میں راولپنڈی کے ایک نوجوان طارق کے ساتھ میری خوب بنتی تھی، عرف عام میں ہم دونوں دوست تھے اور یہ دوستی خاصی دیر تک باقی رہی، جب ہماری شادیاں ہوگئیں تو بھی ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔

دفتر میں سرگودھا سے تعلق رکھنے والے محمد یوسف ڈرافٹس مین بھی تھے، عمر میں خاصے

بڑے تھے، چونکہ میرے تایا جان کا نام بھی محمد یوسف تھا اس لیے میں ان کے نام کے لحاظ سے انھیں چچا یوسف کہتا تھا۔ بہت بھلے آدمی تھے، انھوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا، میں کہا کرتا تھا: قیامت کے روز میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھیں پیش کر کے کہوں گا: یا اللہ! یہ بندہ میری وجہ سے اہل حدیث بنا تھا، اب تو اس کا اجر مجھے بھی عطا فرما۔ چچا یوسف میرے ساتھ بڑی محبت کرتے، لیڈری میری نس نس میں بچپن سے تھی، دفتر میں ہر چند کہ میں خطاط تھا، مگر ایک نمایاں مقام رکھتا تھا۔ کبھی کبھار ترنگ میں آتا تو چچا یوسف کے پاس جا کر سرگوشی کرتا: ''چاچا! چاچی کتھے ای'' چاچی کے نام پر وہ بڑا خوش ہوتا اور مسکرا کر اپنے کام میں مگن ہو جاتا۔

کبھی کبھار ترنگ میں آتا تو چچا یوسف کے پاس جا کر سرگوشی کرتا: ''چاچا!۔۔۔ چاچی کتھے ای''

سلیم صاحب کوئی خبر لے کر آتے تو بعض اوقات میری میز پر آ کر کہتے: یار مالک! آج تو کمال ہو گیا، پھر وہ کوئی واقعہ یا خبر سناتے اور داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔

وقت کا پہیہ بہت تیزی سے چلتا رہا، میری سعودی عرب آمد کا بڑا مقصد والدہ صاحبہ کو حج کروانا تھا، جس کا انھیں بڑا شوق تھا، میں گزشتہ سال مروہ میں نوکری کے دوران حج کر چکا تھا۔ اب میں نے والدہ صاحبہ کی حج کی درخواست کے لیے مطلوبہ رقم بھجوا دی، جو کم پڑی وہ چچا یوسف نے ادھار دے دی۔ یہ 1982ء کی بات ہے کہ والدہ صاحبہ محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی اور باجی محترمہ ثریا بتول کے ہمراہ گروپ کے ساتھ حج پر تشریف لائیں، میری بڑی خواہش تھی کہ ان کے استقبال کے لیے جدہ جاؤں، مگر ان دنوں غالباً دفتر میں کام زیادہ تھا کہ میں ڈیوٹی کے ایام

میں وہاں نہ جا سکا، البتہ خواہش تھی کہ جمعرات اور جمعہ کے ساتھ ایک دو دن اور ملا لوں اور والدہ صاحبہ کے پاس چار دن مکہ مکرمہ میں رہوں۔ سلیم صاحب موڈی آدمی تھے، میں نے دفتر کے ایک انجینئر چوہدری اسلم صاحب سے کہا: جب ہم ان کے پاس سینڈوچ کھا رہے ہوں گے تو تم بات چھیڑ دینا، ان سے مکہ جانے کی اجازت لینی ہے۔

حسب پروگرام چوہدری اسلم صاحب نے بات چھیڑ دی، یار مالک سنا ہے کہ تمھاری والدہ حج پر آرہی ہیں، ہاں یار کچھ ایسا ہی ہے، میں نے آہ بھر کر اثبات میں جواب دیا۔ تو پھر تمھیں ان سے ملنے کے لیے نہیں جانا؟ سلیم صاحب بات سمجھ گئے، کہنے لگے: ہاں ہاں جائے گا، عبدالمالک جائے گا، اپنی والدہ کو ملنے کے لیے ضرور جائے گا، اور اس کے ساتھ ہی چھٹی منظور ہوگئی، ہمارا منصوبہ کامیاب ہوگیا۔

والدہ صاحبہ سے ملاقات کا ایک ایک لمحہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے اور یاد رہے گا، میں نے اپنی کتاب والدین میں ان پر ایک مضمون لکھا ہے جو اس کتاب میں بھی درج ہے، اس میں بھی اس ملاقات کا ذکر ہے۔ بہرحال میں تین چار دن کے لیے مکہ مکرمہ چلا گیا، بڑا یادگار سفر تھا، والدہ صاحبہ سے میں بار بار پوچھتا تھا: کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں، انھوں نے چپاتی کی فرمائش کی، اس زمانے میں مکہ میں زیادہ پاکستانی ہوٹل نہ تھے، میں نے سارا مکہ چھان مارا مگر توے کی روٹی نہ ملی۔

ایک دن والدہ صاحبہ فرمانے لگیں: عبدالمالک یہ سعودی لوگ معافیاں بڑی مانگتے ہیں، ہر بات پر کہتے ہیں: معافی، ان کا اشارہ اس لفظ کی طرف تھا جس میں دکانداروں کے پاس کوئی چیز نہ ہوتی تو وہ کہتے: ''مافی''، یہ عربی کا لفظ ہے کہ جس کے معنیٰ ہیں یہ چیز موجود نہیں، اسی بات کو والدہ محترمہ نے اردو والا ''معافی'' سمجھ لیا۔

یہ حج بلاشبہ میرے لیے تاریخی تھا، اس نے میرے لیے خیر و برکت کے دروازے کھول دیے تھے، میرا نکاح 26 فروری 1976ء کو ہوا تھا، ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی، میں نے والدہ صاحبہ کو جی بھر کر شاپنگ کروائی اور جاتے ہوئے انیسہ کے لیے دس تولے وزن کا سونے کا سیٹ بھی خرید کر دیا۔

ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا کہ سلیم صاحب کہنے لگے: پرانی عمارت میں کوئی پرنس ہے، اسے ایک خطاط کی خدمات ایک ہفتہ کے لیے درکار ہیں، لہٰذا تم کل سے وہاں پر ڈیوٹی کرو گے، میں اگلے روز وہاں چلا گیا۔ سعودی آرمی ایوی ایشن کا دفتر ابھی بن رہا تھا، اس کا منصوبہ زیر غور تھا، پاکستانی لیفٹیننٹ کرنل عصمت اللہ نیازی اور کرنل جنجوعہ بھی وہیں تھے اور ادارے کے سربراہ شہزادہ فیصل بن محمد بن سعود الکبیر تھے، ان کے علاوہ دو پاکستانی حوالدار اور چند سعودی سپاہی بھی یہاں تعینات تھے۔ چونکہ ادارے کا منصوبہ ابھی زیر غور تھا، اس کا بنیادی ڈھانچہ بن رہا تھا اس کے لیے انھیں سلائیڈیں بنانے کی ضرورت تھی، کچھ چارٹ بھی بننے تھے، میں نے ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ وہاں کام کیا، خوب محنت کی، چند ہی دنوں میں ادارے میں عزت بن گئی۔ ایک دن اچانک دفتر کا دروازہ کھلا اور شہزادہ فیصل بن محمد دیگر عملے کے ساتھ داخل ہوئے، بڑے ہی سجیلے نوجوان تھے، لمبا قد، قدرے بھاری جسم اور نہایت سرخ و سفید رنگت، میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ انھوں نے کام دیکھا اور میرے کام کی تعریف کی، ساتھ ہی کیپٹن راشد الزہرانی تھے، ان سے کہنے لگے: ہمیں اس آدمی کی ضرورت ہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے: جب بھی تمھیں کام کی ضرورت ہو تو ہمارے پاس آ جانا ہم تمھیں رکھ لیں گے، اگلے روز مجھے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا شکریہ کا خط اور 5 سو ریال بھجوا دیے۔

> عبدالمالک یہ سعودی لوگ معافیاں بڑی مانگتے ہیں، ہر بات پر کہتے ہیں: معافی۔۔

وزارت دفاع والوں نے اچانک ہی مکتب نقشبندی کا معاہدہ منسوخ کر دیا یا ویسے ہی ختم ہو گیا، ہمیں بتایا گیا کہ آپ لوگ فلاں تاریخ سے فارغ ہوں گے، اپنی نوکریوں کا بندوبست کر لیں۔

نئی رہائش کے مقیمین میں واحد پاکستانی میں تھا، ورنہ ایک فلسطینی اور ایک مصری کے سوا وہاں مقیم تمام ملازمین ہندوستانی ہی تھے، ان میں غالباً دو تین ہندو بھی تھے۔ سب کو کھانے کا مسئلہ ہوتا تھا، مگر میں ان مسئلوں سے مبرا تھا کیونکہ میرے کمرے کا ساتھی آصف خوب مزے مزے کے کھانے پکاتا تھا۔ ہم خوب سیر و تفریح کرتے، مسجد ہماری رہائش سے کچھ فاصلے پر تھی، تاہم الحمدللہ! میری کوئی بھی نماز قضا نہیں ہوتی تھی، فجر البتہ کبھی کبھار انفرادی ہوتی۔ ہماری رہائش سے کچھ فاصلے پر رہائشگاہ میں ایک پاکستانی سرویئر رہتے تھے، باشرع تھے اور تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، اکثر ملاقات کے لیے آ جاتے، ان کے ساتھ دینی حوالے سے باتیں ہوتیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا: جناب! یہ دوستی کیا ہوئی کہ آپ میرے پاس آئے میں نے آپ کو کھانا کھلا دیا یا چائے پلا دی، اسی طرح میں آپ سے ملنے گیا تو آپ نے بھی اچھی خاطر تواضع کر دی۔ ہمارے لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہماری فجر کی نماز بعض اوقات باجماعت ادا نہیں ہوتی اس کا کیا بندوبست کریں؟ کہنے لگے: جناب! میں آپ کو اٹھا دیا کروں گا، چلیے یہ مسئلہ بھی حل ہوا، اب وہ صبح سویرے یا تو مجھے فون کرتے، یا خود تشریف لے آتے اور دروازہ کھٹکھٹاتے، اللہ ان کو جزائے خیر دے ان

کی وجہ سے باجماعت نماز میں کوتاہی بھی نہ رہی۔ایک دن مجھ سے فرمانے لگے: مجاہد صاحب! اب آپ کی وجہ سے میری فجر کی نماز میں بھی پہلے سے زیادہ نظم وضبط پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے؟ کہنے لگے: آپ کو چونکہ جگانا ہوتا ہے لہٰذا میں بھی خوب اہتمام کرتا ہوں، الارم لگاتا ہوں اور جلد سونے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرا اس تمام عرصے میں اپنے گھر سے بھی مسلسل رابطہ رہتا تھا، اس زمانے میں ٹیلی فون کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ پاکستان کی کال مل جانا ہی بڑی بات تھی، اور میرے معاملے میں تو یہ اور بھی مشکل تھا، کیونکہ میں حافظ آباد سے تعلق رکھتا ہوں، میرے والدین اور خاندان حافظ آباد میں رہائش پذیر تھے۔ حافظ آباد کے جس محلے میں ہم رہتے تھے وہاں کوئی ٹیلی فون نہ تھا۔ خطوط کا سہارا ہوتا یا کوئی ملنے والا آجاتا تو اس کے ہاتھ حافظ آباد سے یعقوب حلوائی کی دکان سے برفی آجاتی جو مجھے بہت پسند تھی۔ مکتب نقشبندی میں نوکری کوئی سال بھر رہی ہو گی، اس دوران بہت کچھ سیکھا، اعتماد آیا، انگریزی اور عربی زبان بولنی سیکھی، مالی حالت قدرے بہتر ہو گئی، مارکیٹ میں میرا نام خاصا معروف تھا، جہاں جاتا کام مل جاتا۔ لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا، کئی بار وہ خود ہی میرے پاس آجاتے، میں بھی نخرہ نہ دکھاتا۔ بھئی! ہم پاکستان سے یہاں پیسہ کمانے کے لیے آئے ہیں۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں سو رہا ہوتا کہ لوگ آکر جگا دیتے کہ ہم نے بلدیہ میں کام بھجوانا ہے اس لیے خطاطی کر دو، اب میں مختلف کمپنیوں میں کام کرتا، بعض میں کام کم ہوتا، بعض میں زیادہ، یا وہ فون کر لیتے یا میں کر لیتا، معاوضہ 50 ریال فی گھنٹہ کے حساب سے مل جاتا تھا بلکہ ایک مرتبہ فی گھنٹہ 200 ریال بھی ملے تھے۔

وزارت الدفاع والطیران میں......

مکتب نقشبندی سے نوٹس ملا تو میں اگلے روز ادارہ اشغال عسکریہ چلا گیا، شہزادہ فیصل تو امریکہ گئے ہوئے تھے البتہ کیپٹن راشد الزہرانی موجود تھے، میں نے نوکری کے لیے کہا تو کہنے لگے: ہاں تمھارے بارے میں شہزادہ فیصل نے ہمیں کہہ دیا تھا پھر غالبًا انھوں نے امریکہ فون کیا، اور شہزادہ فیصل سے منظوری لی، ان کے پاس کوئی ویکنسی نہیں تھی۔ کیپٹن راشد بڑے سمجھ دار اور تیز آدمی تھے، انھوں نے مختلف اداروں میں رابطے کیے، پرنس کا حوالہ دیا کہ انھیں اس آدمی کی ضرورت ہے، کوئی دو تین دن کے بعد ادارہ اشغال عسکریہ میں نوکری تلاش کی گئی، ان سے یہ طے ہوا کہ یہ کام تو ہمارے پاس کرے گا تاہم تنخواہ آپ سے وصول کرے گا۔ اس زمانے میں وزارت کی نوکری بہت بڑا عطیہ الٰہی سمجھی جاتی تھی۔ کوئی سال بھر پہلے مجھے وزارت تعلیم میں نوکری تو نہ مل سکی تاہم وزارۃ الدفاع میں مل گئی۔ تنخواہ کم وبیش ساڑھے تین ہزار ریال یا شاید اس سے کچھ کم مقرر ہوئی۔

انجینئرنگ آفس میں کام کے دوران وزارت تعلیم والوں کے ساتھ بھی رابطہ رہا، ایک دن شیخ زید الخرعان کا فون آیا: عبدالمالک! چند دن کا کام ہے کچھ سرٹیفکیٹ ہیں جن کی غلطیاں درست کرنی ہیں، کہنے لگے: «سَوْفَ أُعْطِيكَ رِيَالَيْنِ وَلَوْ بِنُقْطَتَيْنِ» ''تمھیں

ہر سرٹیفکیٹ کے بدلے دو ریال دوں گا خواہ دو نقطے ہی کیوں نہ ڈالو' میں ایک دن سلیم صاحب سے چھٹی لے کر چلا گیا۔ کام کافی زیادہ تھا، میں نے شیخ زید سے کہا: میرے لیے ڈیوٹی سے نکل کر کام کے لیے آنا مشکل ہے۔ اس اللہ کے بندے نے رات کو آنا شروع کر دیا، میں مغرب کے بعد وزارت میں چلا جاتا، زید الخرعان بھی آ جاتے اور واقعی انھوں نے اپنا وعدہ نبھا کر دکھایا، بہت سارے سرٹیفکیٹ ایسے بھی تھے جن میں 2 ہی نقطے ڈالنے تھے، ان کے بھی دو ریال مل گئے، البتہ متعدد نئے بھی لکھنے پڑے۔

چند ہفتوں کے بعد میں آرمی ایوی ایشن میں کام کرنے لگ گیا اور سبحان اللہ! وہی ہال جس میں ہم بیٹھا کرتے تھے اسی میں ہمارا دفتر بنا، اس ہال کی پارٹیشن کر کے کمرے بنا دیے گئے، مجھے ایک کمرہ الاٹ ہو گیا، جس کی لوکیشن بڑی خوبصورت تھی۔ یہ ادارے کے آخری حصے میں مناسب سائز کا کم وبیش 4 میٹر لمبا اور 3.5 میٹر چوڑا کمرہ تھا، پانچویں فلور کے اس دفتر سے باہر کا منظر بڑا خوبصورت تھا، کوئل اور فاختہ کی مسحور کن آوازیں دل کو لبھاتی تھیں۔ ہمارے دفتر کے نیچے «مَعْهَدُ اللُّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ» کی عمارت تھی، دور سامنے ملز کا ایریا تھا جبکہ خوبصورت پہاڑی کا نظارہ اس میں چار چاند لگا دیتا تھا۔ اس دفتر کی چابی میرے پاس تھی، کمرے میں فون تھا، گویا ایک لحاظ سے میں خود ہی مدیر تھا، میری ڈیوٹی ادارہ کے لیے خطاطی کرنا تھی یا چھوٹا موٹا ڈیزائن بنانا اور ادارے کی پرنٹنگ کی نگرانی کرنا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ ہمارے ادارے کے اس وقت کے سربراہ شہزادہ کرنل فیصل بن محمد بن سعود الکبیر تھے جو مجھ پر خاصے مہربان تھے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ میرے پاس ضرور تشریف لاتے، کوئی نہ کوئی کام ساتھ لاتے اور پاس بیٹھ کر کرواتے یا کھڑے کھڑے ہدایات دے کر چلے جاتے۔ تمام عملہ ان کے نام سے کانپتا تھا، وہ جب کوریڈور

میں آ رہے ہوتے تو دور سے معلوم ہو جاتا کہ وہ آ رہے ہیں، زور زور سے بولتے ہوئے وہ جب آتے تو ان کے پیچھے پیچھے سعودی افسران ہوتے، میرا کمرہ چونکہ سب سے آخر میں تھا اس لیے آ کر کہتے: ہیلو ینگ مین کیسے ہو؟ میں ہاتھ ملاتا یا کبھی کبھار ہاتھ کے اشارے سے سلام کر دیتا چونکہ وہ میرے اوپر بڑے مہربان تھے اس لیے تمام دفتر میں میری عزت کی جاتی تھی۔ میں بھی الحمدللہ! کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا، دفتر میں دو پاکستانی تھے۔ ایک نائب صوبیدار اشرف صاحب اور دوسرے کھاریاں سے تعلق رکھنے والے حوالدار امانت تھے۔ یہ زمانہ شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعود رحمہ اللہ کی حکمرانی کا تھا، اس زمانے میں سعودی عرب میں چیزیں نہایت سستی تھیں۔

میرے دفتر میں فرنیچر اور دیگر اسٹیشنری کی کمی تھی، میں نے ایک مرتبہ شہزادہ فیصل صاحب کی توجہ دلائی تو کہنے لگے: میرے ساتھ آؤ، تھوڑے فاصلے پر وزارۃ الدفاع کا اسٹور تھا جو اسٹیشنری سے بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں کسی کا جانا قریباً ممنوع ہی تھا، مجھے ساتھ لیا اور وہاں پہنچ گئے۔ اس کا انچارج ایک سعودی بوڑھا شخص تھا، پرنس نے اسے سلام کر کے گلے لگایا اس کا ماتھا چوما یا اس نے پرنس کا چوما، میری طرف اشارہ کیا اور کہا: عبدالمالک کو بعض چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بزرگ فوراً مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے اور کہا: جو چیز چاہتے ہو اٹھا لو، پرنس فیصل بھی ساتھ تھے، انھوں نے اشارہ کیا کہ جس چیز کی بھی تمھیں ضرورت ہے بے دریغ اٹھا لو، بلکہ اگلے دو تین سالوں میں بھی جن چیزوں کی تمھیں ضرورت ہو سکتی ہے وہ بھی لے لو، مجھے بعد میں یہ نہ کہنا کہ فلاں چیز موجود نہیں ہے، یہ اسٹور انجینئرنگ اور ڈیزائننگ کی اشیاء سے بھرا پڑا تھا۔ بڑی بڑی قیمتی اشیاء نہ جانے کب سے پڑی ہوئی تھیں، اس طرح میرا کمرہ ضروری اشیاء سے آراستہ ہو گیا۔

ہمارے دفتر میں سوڈان سے تعلق رکھنے والے ایک مترجم محمد ابراہیم تھے، بہت ہی شریف النفس اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے، اپنے کام سے غرض رکھتے تھے، میرے ساتھ ان کے بہت ہی عمدہ تعلقات تھے، میں ان کو موسیو ابراہیم کے نام سے پکارتا تھا، وہ مسکرا دیتے۔ یہ وہ دور تھا جب مجھے نت نئی شرارتیں سوجھتی رہتی تھیں۔ میں ان کے کمرے میں آتا، باتیں کرتا، ان سے انگریزی زبان سیکھتا، بلاشبہ وہ اعلیٰ درجہ کے مترجم تھے، مگر ہر وقت چہرے پر سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ میں نئے نئے منصوبے سوچتا اور موسیو کے ساتھ شیئر کرتا۔ بعد میں بھی انھیں ایک دو مرتبہ اہل وعیال سمیت اپنے گھر بلایا اور ایک مرتبہ میں بھی ان کے ہاں گیا تھا، سعودیوں کے ساتھ تعلقات بہت زیادہ نہ تھے، تاہم عموماً جب وہ دعوتیں کرتے تو ہمیں بھی ضرور بلواتے اور کھانے کھلاتے۔ اس زمانے میں ڈیزائننگ کے لیے لیٹرا سیٹ استعمال ہوتے تھے، اس کے علاوہ بھی کچھ آرٹ کی چیزیں درکار تھیں۔ چونکہ پرنس فیصل کو خود بھی آرٹ اور خوشنویسی سے خاصی دلچسپی تھی، اس لیے وہ میری ضروریات سے آگاہ رہتے تھے۔

ایک دفعہ ہمارے دفتر میں تمام سینئر اسٹاف کی میٹنگ تھی، مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے بھی بلوایا گیا تھا، میں میٹنگ شروع ہونے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گیا، میں چیئر مین کی کرسی سے چند کرسیاں چھوڑ کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں پرنس خود بھی پہنچ گئے، دیگر افسران آہستہ آہستہ آتے رہے، اچانک انھوں نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: (I want this man to be seated here)

پھر مجھے حکم دیا کہ میں ان کے پاس بیٹھوں، نہ جانے انھوں نے کوئی چیز سمجھانی تھی یا میرا سب سے پہلے آنا ہی ان کو بھا گیا، بہرحال اس دن خوب عزت ملی اور میری حیثیت

میں بلاشبہ اضافہ ہوگیا، میں نے یہ واقعہ اپنے والد محترم کو لکھا تو انھوں نے غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا۔

اس روز شہزادہ فیصل نے مجھ سے کہا: مجھے شارع الوزیر سے کچھ اسٹیشنری خریدنی ہے تم بھی میرے ساتھ چلو، طے ہوگیا کہ ہم لوگ وزارت میں اکٹھے ہوں گے۔ انھوں نے نئی گاڑی خریدی تھی، میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے لگا تو قدرے سختی سے حکم دیا: اگلی سیٹ پر بیٹھو۔ ڈرائیونگ سیٹ انھوں نے خود ہی سنبھال لی، پرچیزنگ آفیسر اور دیگر عملہ شاید علیحدہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شارع الوزیر پر اسٹیشنری کی بہت بڑی دوکان تھی، ان کو پہلے سے علم تھا، بڑا خوبصورت استقبال ہوا، آخر ان کی دوکان پر پرنس آیا تھا، مجھے اشارہ ہوا کہ میں بھی جو چاہوں اٹھالوں، وزارت کی جانب سے پرچیزنگ آفیسر ہر چیز کے بارے میں سر ہلاتا جاتا تھا کہ کل تک دفتر پہنچ جائے گی، یہ عز وشرف میرے جیسے آدمی کے لیے بہت بڑا تھا۔ میں اس روز واقعی بڑا خوش تھا، کہاں کیلیانوالہ کا ایک ادنیٰ دیہاتی اور کہاں یہ کہ وہ شہزادہ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ اس روز پرنس نے میری ذاتی زندگی کے حوالے سے، والدین، گھر بار اور ہر چیز کے بارے میں پوچھا، ان کی انگریزی بہت عمدہ تھی۔

ریاض میں ہمارے کوئی زیادہ رشتہ دار نہیں تھے، جناب اقبال کیلانی صاحب تھے جو دور کسی کیمپ میں رہتے تھے، ایک مرتبہ ان سے ملنے کے لیے گیا تھا، والدہ صاحبہ کے رشتہ داروں میں ایک دور کے ماموں جناب احسان اللہ ظفر صاحب اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے، ان کی اس وقت دو چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں، کبھی کبھار ان کے گھر چلا جاتا یا کبھی وہ آجاتے۔ ایک مرتبہ یاد ہے کہ میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ان کا فون آیا: میں کل مدینہ جارہا ہوں، ہمیں ضرورت ہے کہ کوئی دوسرا مرد بھی ساتھ ہو، اگر تم چل سکتے ہو تو ہمارے ساتھ

گاڑی میں چلو۔ اب جس کو مدینہ منورہ کی دعوت ملے وہ بھلا کیوں اور کیسے انکار کرسکتا ہے، بہرحال یہ سفر بڑا خوبصورت اور عمدہ تھا ان کی اہلیہ بھی بڑی شفقت کرتی تھیں کبھی کبھار سالن بھی بھجوا دیتیں۔

وہ رات بہت لمبی تھی......

اسی شام احسان اللہ ظفر صاحب تشریف لائے، ساتھ کوئی دو تین دوست بھی تھے، میں اس روز پرنس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کی وجہ سے بہت خوش تھا۔ ظفر صاحب آئے تو میں نے غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا اور ان کو پوری روداد اور خریداری کے بارے میں بتانے لگا، مگر ان کا دل میری بات میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس روز وہ خاصے پریشان دکھائی دیے، میں نے ان سے پوچھا بھی، مگر وہ کچھ چھپا رہے تھے۔ وہ اس کشمکش میں تھے کہ آخر یہ اندوہناک خبر مجھے کیسے سنائیں کہ میں اب یتیم ہوگیا ہوں۔ وہ کیسے بتائیں کہ تمھارے سر کا سایہ، تمھارا مشفق ورحیم باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا، خیر ہمت کر کے انھوں نے مجھے بتایا: تمھارے والد سخت بیمار ہیں، لہٰذا تم فوری پاکستان چلے جاؤ۔ مجھے پھر بھی اندازہ نہیں ہوا، ابھی چند دن پہلے ہی مجھے پرنس فیصل صاحب نے کہا تھا: تم تیار رہنا، اس مرتبہ میں تمھیں اپنے ساتھ امریکہ لے کر جاؤں گا، وہاں ہمیں بعض کتابوں کی پرنٹنگ کروانی ہے اور تم ان کی نگرانی کروگے۔ میں ماموں جان کو کھانے کی دعوت دے رہا تھا، مگر وہ مجھے والد کی بیماری کی اطلاع دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا: کس نے آپ کو بتایا کہ والد صاحب بیمار ہیں؟

کہنے لگے: فون آیا ہے، اب میرا ماتھا ٹھنکا کہ فون تو کسی ہنگامی صورت حال کے لیے

ہی آسکتا ہے۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا، میں نے دو تین مرتبہ دہرایا کہ ابا جی بیمار ہیں؟ اس دوران انھوں نے کہہ ہی دیا: وہ اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں «إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» پھر انھوں نے بتایا: آج شام طائف میں آپ کے عزیز آصف صاحب کو ان کی والدہ نے بتایا کہ انھیں فوت ہوئے بھی دو تین دن گزر چکے ہیں...... یہ خبر مجھ پر پہاڑ بن کر گری، آج کی رات میری زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور طویل رات تھی۔ ظفر صاحب اصرار کر کے مجھے اپنے گھر لے آئے، میں رات بھر روتا رہا، جب چین نہ آیا تو نوافل پڑھنے شروع کر دیے۔ اللہ سے ابا جان کی مغفرت کی بار بار دعائیں مانگتا رہا، میں ظفر صاحب کی اس نیکی کو کبھی نہ بھولوں گا کہ میری پوری کوشش کے باوجود جب آدھی رات کے بعد ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں چیخیں مار کر رونے لگا تو دونوں میاں بیوی اٹھ کر آئے اور مجھے دلاسہ دیا۔

اگلے دن صبح میں ڈیوٹی پر چلا گیا، ادارے کے لوگ کمرے میں آئے اور دلاسہ دیا، اتنے میں پرنس فیصل میرے کمرے کے سامنے سے گزرے تو مجھے روتا ہوا دیکھ کر رک گئے، پوچھنے لگے: کیا ہوا؟ یہ آنسو کس بات کے؟ میں نے بتایا: والد صاحب انتقال کر گئے ہیں تو مجھے گلے لگا لیا، مجھے اپنے دفتر لے گئے، وہاں کافی دیر دلاسہ دیتے رہے، اور کہنے لگے: تم فوراً پاکستان چلے جاؤ، اپنے گھر والوں سے ملو تمھیں تسلی ہوگی۔ پرنس نے اپنے عزیز و اقارب کے واقعات سنا کر تسلی دی، کہنے لگے: تمھارا ٹکٹ میں دوں گا، کیپٹن راشد ان کے پرسنل سیکرٹری بھی تھے، اس زمانے میں دخول وخروج پر کم از کم دو دن لگتے تھے، عام حالات میں تین سے چار دن بھی لگ جاتے تھے۔ پرنس نے اسی وقت مدیر جوازات کو فون کیا اور کہنے لگے: میرا خاص موظف ہے، اس کا فوراً دخول وخروج لگانا

ہے۔انھوں نے اپنے لیٹر ہیڈ پر مدیر جوازات (ڈائریکٹر) پاسپورٹ آفس کے نام خط لکھ کر دیا،اس کے مندرجات مجھے آج تیس سال بعد بھی یاد ہیں۔لکھا تھا:اس رقعہ کا حامل وہ شخص ہے جس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔

میری کفالت ابھی وزارت دفاع کے نام منتقل نہ ہوئی تھی۔ہمارے کفیل انجنیئر محمد عبدالحق کو تلاش کیا گیا جب وزارت سے فون جائے تو پھر کون انکار کرتا ہے،دفتر کے ایک ڈرائیور کو حکم ملا کہ آج وہ سارا دن عبدالمالک کے ساتھ رہے گا تاکہ پاسپورٹ آفس کے معاملات سمیت خریداری وغیرہ میں آسانی رہے۔پاسپورٹ آفس میں اس زمانے میں زیادہ رش نہیں ہوتا تھا،ہمارا کفیل بھی آ گیا،اور اسی وقت دخول وخروج لگا کر پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا گیا،پرنس فیصل نے نہ صرف ٹکٹ بلکہ اس کے علاوہ بھی غالباً ہزار ریال زیادہ دیا اور کہنے لگے:تم جلد از جلد واپس آ جانا میں نے تمھیں امریکہ لے کر جانا ہے۔

میں نے شاپنگ کیا کرنا تھی جو کچھ پہلے سے خرید رکھا تھا وہی پیک کر لیا۔جس روز والد صاحب کا انتقال ہوا اس کے اگلے دن انھوں نے منڈی وار برٹن میں میری شادی کی تاریخ طے کرنے جانا تھا،میں نے ان کو لکھ دیا تھا:میں فلاں تاریخ کو سعودی عرب سے آؤں گا۔والد صاحب کی خواہش تھی کہ بارات جمعہ کے روز جائے اور میں وہاں منڈی وار برٹن میں خطبہ جمعہ پڑھاؤں۔یہ ایک نئی بات ہوتی کہ دولہا میاں اپنی شادی کے روز جمعہ پڑھا رہے ہوتے،مگر اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔ان کو ہارٹ اٹیک ہوا،ان کے آخری الفاظ یہ تھے:اللہ!میرے گناہ معاف کرنا اور میری نزع آسان کرنا،کچھ ہی دیر کے بعد والد محترم اللہ رب العزت کے پاس پہنچ چکے تھے۔ہر بچے کے لیے اس کے والدین

آئیڈیل شخصیات ہوتے ہیں، مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں ان سے اتنی محبت نہ کرتا تھا جتنی وہ مجھ سے کرتے تھے۔ بلاشبہ میں ان کی کمزوری تھا، جو چاہتا ان سے منوالیتا، ان کو مجھ سے کتنی ہی توقعات تھیں، ان کی خواہش تھی کہ میں بڑا آدمی بنوں، امت مسلمہ کے لیے، مسلک اہل حدیث کے لیے کام کروں۔ وہ گھنٹوں مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھتے، تاریخی واقعات سناتے، اپنے تجربات سے نوازتے، میری اصلاح کرتے، میں نے کہیں تقریر کرنا ہوتی تو اس کے لیے تیاری کرواتے۔ وہ حافظ قرآن تو نہ تھے، مگر ان کو قرآن کریم پر مکمل عبور تھا، ادھر میں کسی آیت کا ذکر کرتا ادھر وہ اپنی حمائل کھولتے اور متعلقہ آیت بتادیتے۔ آج جب میں ان کی تربیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ میں اپنی اولاد کی تربیت کے حوالے سے والد محترم کی نسبت کتنا پیچھے ہوں، میں ان کی وہ تربیت نہ کرسکا جو مجھے کرنی چاہیے تھی۔

والد محترم کی جملہ خوبیوں میں ایک بات یہ تھی کہ وہ بڑے پکے اہل حدیث تھے، مسلک حق پر جان دیتے تھے، انھوں نے مار کھائی، اپنے گاؤں کو چھوڑا اور مسلکی حمیت پر ہر چیز کو قربان کردیا۔ والدہ محترمہ نے بھی ان کا ہر معاملہ میں خوب ساتھ دیا، میری تربیت میں اباجان کا بہت زیادہ دخل تھا، انھوں نے میرے دل ودماغ میں عقیدہ توحید کوٹ کوٹ کر بھردیا تھا، نماز کے بارے میں وہ بے حد سخت گیر تھے، میرے ساتھ شدید محبت کے باوجود نماز کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اگر نماز ادا نہیں کی تو پھر کوئی معافی نہیں، ہمیں بھی آہستہ آہستہ یہ بات ذہن نشین ہوگئی کہ نماز میں سستی ناقابل قبول ہے۔ وہ اچھے کاموں پر میری تحسین بھی کرتے، خوب حوصلہ افزائی کرتے، شاباش دیتے، جب ان کو محلے کے لوگ میرے بارے میں اچھی باتیں بتاتے تو ان کا سر فخر سے بلند ہوجاتا۔ میں

اس زمانے میں جمعیت شبان اہل حدیث حافظ آباد کا ناظم اعلیٰ تھا، دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہمارے محلّہ میں اکثریت بریلوی حضرات کی تھی، گھر کے قریب جو مسجد تھی وہ بھی بریلوی مسلک والوں کی تھی، میں وہیں نماز ادا کرتا تھا، بلکہ اس مسجد کا انتظام کسی حد تک میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس کے چندہ کے انچارج چٹھہ صاحب کے ساتھ میں ہی معاونت کرتا تھا۔ محلّہ کے لوگ میرے ساتھ محبت رکھتے اور مجھ پر اعتماد کرتے تھے، ان کا کہنا تھا: عبدالمالک کے پیچھے ہماری نماز ہو جاتی ہے۔ میں اس مسجد میں کبھی کبھار تقریر بھی کرتا تھا، مولوی محمود صاحب اگر بیمار ہو جاتے تو امامت کے لیے لوگ مجھے ہی آگے کرتے تھے۔ واپڈا، میونسپل کمیٹی، پولیس اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ کے لوگوں سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ ہر ادارے میں میرا کوئی نہ کوئی جاننے والا موجود تھا، کسی بھی سرکاری کام کے لیے درخواست لکھنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ والد صاحب مجھے لکھنے کا طریقہ اور سلیقہ سکھاتے، وہ اپنے تمام تر خطوط مجھی سے لکھواتے، وہ بولتے جاتے اور میں لکھتا جاتا، اس طرح میں نے ان سے خطوط اور درخواستیں لکھنا سیکھ لی تھیں۔ والد صاحب ہی میرے مربی اور محسن تھے، وہ لاہور جاتے تو نسیم حجازی کے ناول عاریتاً لے آتے، خود بھی پڑھتے اور ہمیں بھی پڑھنے کے لیے کہتے۔ میں نے تاریخ کے متعلق جو کچھ بھی جانا وہ والد صاحب سے ہی پڑھا اور سیکھا، انھیں تاریخ کے بہت سارے واقعات ازبر تھے۔ وہ مجھے سناتے اور تربیت کرتے، ان کی تربیتی کوششوں کا حال بیان کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ میں نے قرآن کریم کا مکمل ترجمہ انھی سے پڑھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ وہ بہت بڑے عالم دین یا اسکالر تھے، مگر انھیں قرآن کریم کے ترجمے پر عبور حاصل تھا۔ عقیدہ توحید پر وہ کسی بھی حال میں مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے۔

میں نے اپنے رب سے دعا کی: اے اللہ! بلاشبہ بتقاضائے بشریت ابا جان سے زندگی میں کچھ خطائیں بھی سرزد ہوئی ہوں گی، مگر اے اللہ! تو جانتا ہے وہ عقیدہ توحید میں بڑے پکے تھے، اے اللہ! تو انھیں اس توحید کی برکت سے بخش دے۔ (آمین)

والد محترم سے محبت ان کی وفات کے بعد اور زیادہ ہوگئی، میں اکثر تنہائی میں روتا رہتا تھا اور بار بار اپنے رب سے کہتا: اللہ! مجھے میرے والد کا ٹھکانہ دکھا دے، میں صوفی تو ہرگز نہیں ہوں کہ اس قسم کے خیالات رکھوں مگر اتنی بات ضرور ہے کہ کثرت دعا کے باعث اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ اطمینان ڈال دیا کہ تمھارے والد کے ساتھ عمدہ سلوک ہو رہا ہے اور اللہ کے فضل وکرم سے وہ جنت میں جائیں گے۔ اس سے پہلے شدت غم کے باعث میری آنکھیں خشک نہ ہوتی تھیں، مگر اس کے بعد دل کو قرار سا آ گیا۔

وطن عزیز کو روانگی......

ریاض سے لاہور کا سفر سعودیہ کی پرواز سے تھا، اگرچہ میرا ٹکٹ اکانومی کلاس کا تھا، مگر ائر لائن والوں نے درجہ اول میں بٹھا دیا۔ میں نے اپنی آمد سے گھر والوں کو دانستہ لاعلم رکھا جب میں لاہور پہنچا تو رات کا وقت تھا، میں رات گئے والدہ صاحبہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے سیدھا محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کے گھر وسن پورہ چلا گیا۔ ان کے بیٹے بھائی نجیب الرحمٰن کیلانی صاحب کے ساتھ دوستی بڑی گہری تھی، ان سے خط وکتابت جاری رہتی تھی، کھلے بازوؤں سے استقبال ہوا، بڑی محبت ملی، خصوصاً محترمہ چچی جان حمیدہ صاحبہ مرحومہ مغفورہ نے جس محبت کا اظہار کیا اور جس انداز سے دلاسہ دیا وہ مجھے کبھی نہیں بھولا۔ میں لاہور پہنچا تو گھر والوں کو بھی میری آمد کا علم ہو گیا، اگلے روز صبح سویرے حافظ آباد پہنچا تو گھر کے افراد منتظر تھے، والدہ صاحبہ نے گلے لگا لیا، اور بجائے

اس کے کہ میں اس صدمہ پر انھیں دلاسہ دیتا انھوں نے مجھے ہی دلاسہ دینا شروع کر دیا۔ کہنے لگیں: عبدالمالک! زیادہ رونے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ! تمھارے ابو بخشے ہوئے ہیں، زندگی بھر ان کی ایک نماز بھی ضائع نہیں ہوئی۔ انھوں نے عقیدہ توحید پر، کلمہ پڑھتے ہوئے اور گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جان اللہ کے سپرد کی ہے۔ اہل محلّہ، حافظ آباد کے شہری، جماعتی ساتھی، دوآبہ رائس ملز کے دوست احباب، رشتہ دار جس جس کو میرے آنے کی خبر ہوئی وہ والد صاحب کے انتقال پر تعزیت کرنے چلا آیا۔ کیلیانوالہ سے محترم تایا جان محمد یوسف کو زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے روتے ہوئے دیکھا، وہ نہایت سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ میں آ گیا ہوں تو فوراً ملنے کے لیے تشریف لائے، گلے لگا لیا اور بے اختیار رو دیے۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ تایا جان کو ابا جان کے ساتھ اس قدر زیادہ محبت تھی۔

چند دن گزرے تھے کہ دوست احباب، گلی محلّہ کے جاننے والوں اور رشتہ داروں نے کہنا شروع کر دیا: آپ کے والد نے شادی کی تاریخ پکی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا بہتر ہوگا کہ آپ اس فرض کو بھی پورا کر دیں۔ طے ہوا کہ شادی میں کوئی شور شرابہ نہیں ہوگا، نہ ہی زیادہ مہمان بلائے جائیں گے، بس خاموشی کے ساتھ گھر ہی گھر میں شادی ہو جائے گی، چنانچہ محترم تایا جان مجھے اور میرے دونوں بھائیوں کو لے کر وار برٹن گئے اور انیسہ فردوس دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئیں۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر میں بہت رونق اور چہل پہل ہو گئی۔ دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا اور زندگی اپنی خوبصورت راہوں پر ایک بار پھر سے رواں ہو گئی۔ چند دن کے بعد ہم لوگ چھوٹے بھائی محمد طارق شاہد کی برات لے کر کیلیانوالہ گئے اور محترم محمد داود صاحب کی صاحبزادی شمیم اختر کو بیاہ کر لے آئے، یہ دسمبر

1981ء کی بات ہے۔ میں شادی کے بعد کم وبیش دو ہفتہ پاکستان میں رہا اور واپس سعودی عرب آ گیا، آتے ہی انیسہ کے ویزے کی درخواست دے دی، جو نہایت آسانی سے منظور ہوگئی اور ویزا مل گیا۔ شادی کے کم وبیش تین ماہ بعد انیسہ سعودی عرب آ گئیں۔

میرے حالات الحمد للہ! شادی کے بعد مزید بہتر ہوتے چلے گئے، ایک دن مجھے حکم ہوا: تم سلیمانیہ میں ایک ادارے سعودی میڈیا سسٹم میں ڈیوٹی دیا کرو گے۔ میں نے وہاں کام کرنا شروع کر دیا، یہ ادارہ ملٹی میڈیا کے مختلف کام کرتا تھا، یہاں کا عملہ امریکی تھا، دو تین امریکی خواتین بھی ملازم تھیں، تین چار آرٹسٹ تھے، ہمارا ادارہ آرمی ایوی ایشن ان سے سلائیڈ بنوا رہا تھا۔ میرے ذمہ خطاطی تھی، یہاں میں نے بہت کچھ سیکھا، اس ادارے کا منیجر جعفری نام کا ایک شامی تھا جسے سعودی نیشنلٹی مل چکی تھی۔ دفتر میں ہر کوئی اپنا کام کرتا تھا کسی کو کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا، دفتر کے سامنے فاسٹ فوڈ کے لیے ''ہارڈیز'' تھا، ملازمین یہاں لنچ کیا کرتے تھے۔ یہاں میں نے پہلی مرتبہ برگر دیکھا اور کھایا، ایک بڑا برگر، چپس اور پیپسی کا بڑا گلاس سولہ ریال میں ملتا تھا، آج تیس سال گزر جانے کے باوجود ان اشیاء کی قیمتیں کم وبیش وہی ہیں۔ دفتر کے نیچے مچھلی اور چپس کی دکان بھی تھی، یہ ریاض میں فش برگر اور چپس کی پہلی دکان تھی، اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے اس قسم کی دکانوں میں بہت اضافہ ہوا، اس زمانے میں ریاض کا فیشن ایبل علاقہ یہی سمجھا جاتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد یہاں سے کام ختم ہوا، میں واپس وزارت میں ڈیوٹی دینے لگا، مجھے سعودی میڈیا سسٹم والوں نے آفر کی کہ میں ان کے ہاں پارٹ ٹائم کام کروں، میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ ان کے ہاں جو خطاطی کا کام تھا وہ مجھے کرنا ہوتا تھا، ان کا دفتر ساڑھے تین بجے بند ہوتا تھا، جبکہ وزارت دفاع کا دفتر ڈھائی بجے بند ہوتا تھا۔ یہ الگ

بات تھی کہ کم وبیش سارے ملازمین دو بجے وہاں سے نکل جاتے تھے، ہمارا دفتر بھی دو بجے تک خالی ہو جاتا تھا، ہم غیر ملکی سب سے آخر میں نکلنے والے ہوتے تھے۔ میں سیدھا گھر جاتا، انیسہ نے کھانا تیار کر کے میز پر لگا کر رکھا ہوتا تھا، جلدی جلدی کھانا کھاتا اور سیدھا سعودی میڈیا سسٹم پہنچ جاتا، ایک گھنٹہ وہاں کام کرتا، اگر کام زیادہ ہوتا تو اسے گھر لے آتا، اس کام کے لیے مجھے 2 ہزار 2 سو ریال ماہوار مل جاتے۔ چند دنوں کے بعد مجھے ''المھندس السعودی'' میں کام مل گیا، ان کا دفتر چار بجے شروع ہوتا اور شام کو سات بجے بند ہوتا، میں سعودی میڈیا سسٹم سے نکلتا اور یہاں آجاتا، یہاں مجھے 2 ہزار 5 سو ریال تنخواہ ملتی تھی، نماز عشاء کے بعد گھر آتا تو مختلف انجینئرز کام دے گئے ہوتے تھے، ایک ولاّ (کوٹھی) کے نقشے کی آٹھ سے دس شیٹیں ہوتی تھیں، ان پر خطاطی کا معاوضہ 80 ریال سے 200 ریال تک مل جاتا تھا۔ اسی دوران میری واقفیت سعودی خطاط موسیٰ العتیبی سے ہوگئی، وہ وزارت پٹرولیم میں کام کرتا تھا، وہ مجھ سے پہاڑوں کے نقشوں پر خطاطی کرواتا تھا، بڑا بھلا مانس اور شریف النفس تھا، وہ مجھے ہر لفظ کے لیے 3 ریال ادا کرتا تھا، یہ کام کوئی مشکل نہ تھا، میں نے وکالہ مروہ میں مصری خطاط سے پیمانہ رکھ کر جو کام سیکھا تھا یہاں وہ میرے کام آیا اور میں مدتوں یہ کام کرتا رہا، اس طرح عموماً مجھے 10 ہزار ریال سے زائد ماہانہ مل جاتے تھے، کبھی اس سے کم بھی ہوتا مگر عموماً زیادہ ہی ہوتا تھا۔

ایک دن دفتر میں لینڈ فورسز کمانڈر کی طرف سے کچھ کام کرنے کے لیے کہا گیا، میں نے کچھ شوخی دکھائی، مگر ہمارے پاکستانی کرنل عصمت اللہ نیازی کہنے لگے: یہ کام تمھارے لیے اعزاز ہے۔ کوئی فائلیں بنانا تھیں، کچھ صفحات کو درست کر کے ایک کتاب

بنانا تھی، میں نے ایک ہفتہ لگایا، خوب محنت کی اور نہایت خوبصورت کام ان کے حوالے کیا، جب کمانڈر صاحب نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے مجھے اپنے دفتر میں بلایا، شاباش دی، وزارت دفاع کے ''لوگو'' والی راڈو گھڑی دی اور ہمارے ادارے کے سربراہ کے نام پیغام بھیجا کہ اس کو چھ ماہ کا ''انتداب'' دیا جائے، انتداب کا یہ سلسلہ اس زمانے میں وزارتوں میں عام تھا، جو لوگ نہایت محنتی ہوتے یا قابل ہوتے اور اپنے ادارے کے لیے اچھا کام کرتے یہ ان کو نوازنے کا ایک طریقہ تھا، کاغذات میں یہ لکھ دیا جاتا: ہم نے اسے کام کے لیے دوسرے شہر بھیجا ہے اس لیے اس کو ٹی اے، ڈی اے دیا جائے، یہ ایک معقول رقم ہوتی تھی جو تنخواہ کے ساتھ اضافی طور پر مل جاتی تھی، چونکہ قوانین کے مطابق تنخواہ میں اضافہ آسان نہ تھا اس لیے محنتی ملازمین کی حوصلہ افزائی اس طریقے سے کی جاتی تھی۔ ہمارے پرنس فیصل کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور 6 ماہ کے لیے مجھے انتداب پر بھجوا دیا، پھر یہ سلسلہ خاصی مدت تک چلتا رہا۔ جیسے ہی یہ مدت ختم ہوتی اس کی تجدید کر دی جاتی، عموماً پرنس مجھ سے پوچھ لیتے یا ہم خود اشارہ کر دیتے کہ انتداب ختم ہونے والا ہے، جس کی وہ بخوشی تجدید کر دیتے۔ الحمد للہ! میں نے گیارہ سال وزارت دفاع میں نوکری کی ہے، اور یہ وقت بہت ہی عزت اور احترام کے ساتھ گزارا۔

اس دوران مجھے وزارت دفاع کے پرنٹنگ پریس میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا، پرنس فیصل مختلف کاموں کے لیے وہاں بھجواتے رہتے تھے، مجھے بڑا شوق تھا کہ میرا اپنا پریس ہو، اس لیے میں جب بھی وہاں جاتا پریس کو خوب غور سے دیکھا کرتا، وزارت دفاع کے دینی امور کے شعبہ سے ماہوار رسالہ ''الجندی المسلم'' نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹر تو شیخ

عبدالمحسن آل الشیخ تھے،ان کا مرتبہ جنرل کے برابر تھا اور وہ وزارت الشئون الدینیہ کے مدیر تھے،مگر اصل کام سیکنڈ لیفٹیننٹ نادر المزینی اور شیخ محمد السعدون کرتے تھے۔اس پرچہ کا عملہ بھی پرنٹنگ پریس میں بیٹھتا تھا، دو یا تین بھارتی آرٹسٹ تھے، جو اسے ڈیزائن کرتے تھے، الخرج روڈ پر واقع یہ پرنٹنگ پریس بہت بڑا تھا، اور یہاں جدید ترین مشینری تھی۔عملہ کے سبھی لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے تھے۔ میں جب بھی وہاں جاتا سرکاری گاڑی سے جاتا، وزارت دفاع کی گاڑی اور باوردی فوجی ڈرائیور ہوتا جو مجھے لے کر جاتا، میں دفتر کے کام بھی نپٹاتا اور وہاں سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر بھی آتا۔ میں ایک عام سا آدمی ہوں مگر ایک بات کہہ سکتا ہوں کہ میری قوت مشاہدہ عام آدمی کی نسبت قدرے تیز ہے، میں جس چیز کو دیکھتا یا جس ادارے میں جاتا چند منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہاں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیتا کہ یہ ادارہ کیسا ہے؟اس میں کس قسم کا کام ہو رہا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ متعاون ہیں یا نہیں؟ عموماً بھارتی، بنگلہ دیشی اور پاکستانی ایک دوسرے کے ساتھ خوب تعاون کرتے، میں چونکہ پارٹ ٹائم کام کرتا تھا اس لیے لوگ میری تلاش میں رہتے تھے، بلکہ میں یوں کہوں گا کہ لوگ نہیں، رزق میری تلاش میں رہتا تھا۔

ایک مرتبہ مجھے اطلاع ملی کہ بطحاء کے علاقے میں پاکستان سے ایک صاحب آئے ہیں جن کے پاس تمھاری کوئی ڈاک ہے، میں ان سے ڈاک لینے چلا گیا۔ یہ ایک بڑی سی عمارت تھی جس میں کافی تعداد میں اپارٹمنٹ تھے،ان پر نمبر لگے ہوئے تھے، مجھے 14 نمبر میں جانا تھا، غلطی سے 13 نمبر کی گھنٹی دبا دی، چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا، اندر سے ایک پاکستانی نکلے اور مجھے دیکھ کر نہایت گرمجوشی سے گلے لگا لیا اور ایک ہی سانس میں بولتے

چلے گئے: ارے مجاہد صاحب! آپ کہاں اور کدھر ہیں؟ ہم آپ کی تلاش میں ہیں، ہمارے دفتر میں کچھ خطاطی کا کام ہے اور میری ذمہ داری لگی ہے کہ میں آپ کو تلاش کر کے لاؤں، مگر میں تو فلاں صاحب کو ملنے آیا ہوں، وہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے: وہ تو فلیٹ نمبر 14 میں رہتے ہیں اور یہ نمبر 13 ہے، مگر کوئی بات نہیں، آپ بیٹھیں میں ان کو بلوا لاتا ہوں، مگر آپ یہ بتائیں آپ کب ہمارے دفتر آ رہے ہیں؟ اور ہاں سنیں: ہمارے ادارے کے پاس بہت پیسے ہیں، ان سے کم معاوضہ نہ لینا، میں سوچتا رہ گیا کہ قدرت کے کام نرالے ہیں، کس کس طرح رزق انسان کو تلاش کرتا ہے۔

اوپر میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب میں وزارت دفاع میں آیا تو یہاں میری ملاقات جماعت اسلامی کے بعض احباب سے ہوئی، ان کی وساطت سے دروس کے مختلف حلقوں میں جانے کا اتفاق ہوا، میں نے بھی کچھ دروس دینے شروع کر دیے، اس سلسلے کی اہم ترین مصروفیت کارسون کمپنی میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دینا تھا۔ ایک مرتبہ جمعہ کے روز میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ درعیہ کے علاقے میں پکنک کے لیے گیا ہوا تھا، جمعہ کی نماز ادا کی تو ہمارے ساتھی طارق کا بھائی بھی نظر آیا، پوچھا: کہاں کام کرتے ہو؟ اس نے کارسون کمپنی کا نام لیا، جو ان دنوں کنگ سعود یونیورسٹی کی تعمیر میں مصروف تھی۔ میں نے پوچھا: کمپنی میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟ جواب ملا: کم وبیش 1800 ہوں گے۔ مسلمان کتنے ہیں اور غیر مسلموں کی تعداد کیا ہوگی؟ میرے سوال پر انھوں نے بتایا کہ اکثریت پاکستانیوں کی ہے، کہنے لگے: کیمپ میں ایک مسجد ہے۔ میں نے پوچھا: جمعہ کی نماز کہاں ادا کرتے ہیں؟ کہنے لگے: کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا، جمعہ کے وقت دو بسیں آتی ہیں جن لوگوں کو جمعہ پڑھنا ہوتا ہے وہ چلے جاتے ہیں، میں نے کہا: دو بسوں میں زیادہ سے زیادہ

ڈیڑھ سو آدمی آتے ہوں گے۔ یہ کیمپ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان واقع تھا، پیدل جانے کا کوئی تصور نہ تھا، پھر شدت کی گرمی بھی تھی، میں نے اگلے ہی ہفتہ کوشش شروع کر دی کہ اس کمپنی میں کوئی جاننے والا ہو تو میں جمعہ پڑھا سکتا ہوں۔ ایک آدھ ہفتے کی کوشش کے بعد جماعت اسلامی کے کچھ دوستوں کو ساتھ لیا اور نماز مغرب وہاں ادا کی، مسجد میں خاصے نمازی نظر آئے، نماز کے بعد میں کھڑا ہو گیا، حاضرین کو جمعہ کی اہمیت سے آگاہ کیا اور کہا: نماز جمعہ ادا نہ کرنا بڑا گناہ ہے، میں جمعہ پڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ مسجد کے امام مولوی یوسف صاحب اڑ گئے، کہنے لگے: یہاں پانچ وقت کی نماز تو ہوتی نہیں، انتظامیہ بھی رکاوٹ ڈالے گی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مولوی شاید یہاں سے کچھ مانگنے یا ذاتی مفاد کے لیے آیا ہے، میں نے ان سے کہا: دیکھیے مولانا! آپ رکاوٹ نہ بنیں میں محض اللہ کے لیے یہ کام کرنا چاہتا ہوں، ان شاء اللہ! آپ کے ہاں سے پانی بھی نہیں پیوں گا۔ آئندہ جمعے کو میں نے چھوٹے چھوٹے اشتہار کیمپ میں لگوا دیے کہ اب کیمپ کی مسجد میں جمعہ ہوا کرے گا۔ انتظامیہ سے ہم نے درخواست کی کہ آج یہاں سے بسیں روانہ نہ کریں، میں جمعہ سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا، مسجد میں لاؤڈ اسپیکر نہ تھا، خلاف توقع مسجد بھری ہوئی تھی، کچھ لوگ جھانک رہے تھے کہ مولوی صاحب آتے ہیں یا نہیں، الحمد للہ! ان دنوں بھرپور جوانی تھی، آواز بہت بلند تھی، میں نے جمعہ پڑھانا شروع کیا تو مسجد کا برآمدہ بھی بھر گیا، بڑا شاندار جمعہ ہوا، جمعہ ختم ہوا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ہمیں لاؤڈ اسپیکر کی فوری ضرورت ہے۔ میں نے سب سے پہلے اپنا حصہ 100 ریال ڈالا، پھر ہر شخص نے اپنا اپنا حصہ ڈالا، پانچ منٹ میں خاصی رقم جمع ہو گئی، میں نے وہاں کے ایک معتبر شخص کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ اگلے جمعہ تک لاؤڈ اسپیکر لے آئیں۔

میں اس مسجد میں الحمدللہ ایک مدت تک جمعہ پڑھاتا رہا، خوب تیاری کرتا، اچکن پہنتا اور خوب جوش اور جذبے سے تقریر کرتا، سامعین سے پہلے مقرر خود اپنی تقریر سے محظوظ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میرے پاس گاڑی میں ائرکنڈیشنر نہیں تھا، میں پانی کی بوتل گھر سے لے جاتا، جب کیمپ قریب آتا تو گاڑی روک کر پانی پیتا پھر مسجد میں داخل ہوتا۔ الحمدللہ! میں اہل مسجد سے کسی معاوضے یا ضیافت وغیرہ سے مکمل بے نیاز تھا، آہستہ آہستہ احباب کا حلقہ بنتا چلا گیا، بعض لوگوں کو مہمان کی تکریم کا احساس ہوتا تو ہر جمعہ کو وہ کھانے کی دعوت دیتے۔ میں پیار سے ٹال دیتا، کوئی بہانہ بنا دیتا۔ ایک دن چند لوگ اکٹھے ہو کر آ گئے، کہنے لگے: ہم ایک مسئلہ پوچھنا چاہتے ہیں، میں نے کہا! جی بتائیں کیا مسئلہ ہے؟

کہنے لگے: اگر کسی شخص کو کھانے کی دعوت دی جائے تو اسلام اس بارے میں کیا حکم دیتا ہے؟ میں سمجھ گیا، مسکرا کر کہا: ساتھیو! میں روایتی مولوی نہیں بننا چاہتا، میرے گھر میں اللہ کے فضل سے بڑی خیر ہے، اگر آپ اس قدر محبت سے دعوت دیتے ہیں تو چلیے میں قبول کیے لیتا ہوں۔ دیکھیے! رمضان المبارک کا مہینہ قریب ہے، آخری عشرہ میں ہم شب بیداری کریں گے، اور آپ کی طرف سے سحری کھائیں گے، میں بھی اپنے گھر سے کچھ چیزیں پکوا کر لے آؤں گا۔ پھر واقعی ہم نے 27 ویں شب کو پروگرام کیا، مسجد میں یہ پروگرام ہوا اور ہم سب نے اکٹھے سحری کی۔

بیتے دنوں کی چند خوب صورت یادیں

میری زندگی کے سنہرے ایام میں وہ دن بھی شامل ہے جب شادی سے بھی پہلے 1982ء میں حی الوزارات الریاض میں ایک کمرے میں مقیم تھا۔ میں نے یہ کمرہ اکیلے ہی کرایہ پر لیا تھا۔ میرے پاس فریج تھی، جو میں نے کمرے ہی میں رکھی ہوئی تھی۔ ایک دن ایک انڈین احمد پاشا آ گئے اور کہنے لگے: میں آپ کے ساتھ کمرے میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ آدھا کرایہ میں دے دوں گا۔ میں نے موافقت کر لی۔ کھانا میں اکیلا ہی بناتا اور کھاتا تھا، مجھے کھانا بنانا کبھی نہیں آیا۔ جس جگہ رہائش اختیار کی چند ہی دنوں کے بعد وہاں رہنے والوں سے تعارف ہوا تو اللہ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے وہ میرے لیے کھانا پکانے کی خدمت سرانجام دینے لگے۔ انسان کا ہاتھ کھلا ہو کنجوس نہ ہو تو پھر لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ میں اس زمانے میں خوب کام کرتا تھا۔ وزارۃ الدفاع کے علاوہ شام کے وقت مختلف کمپنیوں میں کام کرتا، بڑی معقول آمدنی ہوتی۔ ان حالات میں مجھے اس بات کی قطعاً پرواہ نہ ہوتی تھی کہ میرے ماہانہ اخراجات کیا ہیں۔ عام لوگ کھانے پر 150 ریال ماہوار خرچ کرتے جبکہ میرا خرچ کم از کم 600 ریال ہوتا تھا۔ ریاض اس زمانے میں واقعی بہت سستا تھا۔ خیر جس دن احمد پاشا میرے کمرے میں آئے میرے

لیے خیر و برکت بن کر آئے۔ یہ عمر میں مجھ سے خاصے بڑے تھے میں نے ان کو چچا کہنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے: اگر اجازت ہو تو آپ کی فریج سے میں بھی استفادہ کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا: بڑے شوق سے، اگلے دن کہنے لگے: بھتیجے! اگر ایک کام کر دو تو میری مدد بھی ہو جائے گی اور تمھارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ کہنے لگے: مجھے ایک سو ریال ماہانہ دے دیا کریں۔ میں آپ کا ناشتہ اور کھانا بنا دیا کروں گا۔ ہم بنگلور کے رہنے والے ہیں۔ ہر روز آپ کو دال چاول اور ناشتہ ملے گا۔ میں نے اسی وقت سو ریال نکال کر انھیں دیتے ہوئے کہا: میں پنجابی ہوں، ہم لوگ جب تک ہفتہ میں تین چار مرتبہ گوشت نہ کھالیں ہمارا گزارا نہیں ہوتا، لیکن آپ اس پر کوئی ٹینشن نہ لیں، میں بازار سے کھانا کھاتا ہوں۔ بس میری ایک شرط ہے کہ جب کسی کا جی چاہے وہ اکیلا کھانا کھالے گا، دوسرے ساتھی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دستر خوان پر آپ میرا انتظار کریں گے نہ میں آپ کا کروں گا۔ اللہ احمد پاشا کو جزائے خیر دے، انھوں نے میری ہر بات سے اتفاق کیا اور ہمارا سمجھوتہ ہو گیا۔

میں الحمدللہ شروع دن ہی سے صبح کی نماز با جماعت ادا کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میری چارپائی کے ساتھ کھڑکی تھی وہاں سے اذان اور جماعت کی خوبصورت آواز آتی، اگر کبھی میں سویا بھی رہ جاتا تو امام صاحب اتنی خوبصورت اور لمبی تلاوت کرتے کہ میں ان کی آواز پر اٹھتا اور وضو کر کے جماعت میں شامل ہو جاتا، نماز پڑھ کر پھر سو جاتا۔ احمد پاشا میرے

> بھتیجے! اگر ایک کام کر دو تو میری مدد ہو جائے گی اور تمھارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ کہنے لگے: مجھے ایک سو ریال ماہانہ دے دیا کریں۔

لیے دو چھوٹے پراٹھے، آملیٹ اور چائے بناتے اسے تپائی پر رکھتے اور میرے قریب آ کر کہتے: بھتیجے! اٹھ جائیں! ناشتہ تیار ہے، اور دفتر جانے کا بھی وقت ہو رہا ہے۔ فریج میں چوبیس گھنٹے دال چاول پڑے ہوتے، جب بھی میرا جی چاہتا میں مزے لے لے کر کھاتا۔ وہ دال بڑی مزے دار بناتے، اس میں کوئی کھٹی چیز ڈالتے تھے۔ مرچ میرے مزاج کے مطابق کم ہی ڈالتے۔ جمعہ کے دن البتہ وہ خصوصی اہتمام کرتے اس روز وہ گوشت یا مرغی پکاتے۔ میں موڈی آدمی تھا، جس ریسٹورنٹ سے چاہا کھانا کھایا، ورنہ فریج میں دال چاول کی ہمہ وقت موجودگی باعث اطمینان تھی۔ انیسہ کے ریاض آنے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اللہ چچا احمد پاشا کو جہاں بھی ہوں خوش رکھے، ہمارا یہ وقت بڑا عمدہ گزرا۔ اس دوران کھانے کا کبھی مسئلہ نہ بنا۔ کمرے کی صفائی بھی عموماً وہی میری عدم موجودگی میں کر دیتے تھے۔

شیخ پروفیسر ظفر اللہ صاحب سے ملاقات

ایک دن میں نے اپنے پڑوس کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی تو ایک دبلے پتلے، اچکن میں ملبوس باوقار، چہرے پر لمبی ڈاڑھی والے ایک پاکستانی نے نماز عشاء کے بعد امام صاحب سے ہاتھ ملایا۔ جس کے جواب میں امام صاحب نے مائیک ان کی طرف کر دیا۔ انھوں نے شیخ ابن باز کا مختصر سا لیٹر پڑھ کر نمازیوں کو سنایا اور بتایا کہ کراچی میں جامعہ ابی بکر بن رہی ہے اس کے لیے تعاون کی ضرورت ہے؟ بس اتنا کہنے کی دیر تھی کہ لوگوں نے ان پر ریالوں کی بارش کر دی۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے حسب توفیق تعاون کیا۔ بعد میں جب لوگ چلے گئے تو میں نے ان سے ہاتھ ملایا، ان سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام پروفیسر ظفر اللہ ہے۔ میں نے غائبانہ ان کا نام سن رکھا تھا، مگر کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان سے بڑا متاثر ہوا۔ میں نے ان کو پیش کش کی

> **سعودی عرب میں لوگ شیخ ابن باز کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ جس کسی کے نام لیٹر لکھ دیتے، اسے وہ اپنے لیے سعادت سمجھتا۔۔**

کہ میرے پاس موٹر سائیکل ہے اس پر جہاں چاہیں میں آپ کو لے کر جا سکتا ہوں۔ خیر اس روز تو انھوں نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا مگر ہماری آپس میں اچھی سلام دعا ہو گئی اور ہمارا آپس میں رابطہ ہو گیا۔ وہ جب ریاض تشریف لاتے تو میری ان سے ضرور ملاقات ہوتی۔ یہ وہ دور تھا جب شیخ ابن باز رحمہ اللہ زندہ تھے۔ وہ دارالافتاء کے رئیس اور مملکہ کے مفتی عام تھے۔ اس عظیم مجدد نے دنیا کے ہر کونے میں سلفی دعوت کو پھیلانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

سعودی عرب میں لوگ شیخ ابن باز کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ جس کسی کے نام لیٹر لکھ دیتے، اسے وہ اپنے لیے سعادت سمجھتا اور اس کا بے حد احترام کرتا۔ دراصل شیخ ابن باز کی شخصیت اتنی بے داغ اور اجلی تھی کہ حکمرانوں سے لے کر عام آدمی تک ان سے محبت کرتا۔ مجھے یہ بات کہتے اور لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے محترم پروفیسر ظفر اللہ صاحب بھی ان شخصیات میں شامل تھے جنہیں شیخ ابن باز کا بے حد اعتماد حاصل تھا۔ پروفیسر ظفر اللہ کے ساتھ میرے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ انیسہ بھی شادی کے فوراً بعد ریاض آ گئی تو پروفیسر صاحب اکثر میرے گھر میں تشریف لاتے، ہم اکٹھے کھانا کھاتے، بیٹھتے، مشورے ہوتے۔ ان کا تعلق اور جھکاؤ سید احمد اور سید اسماعیل شہید کی جماعت المجاہدین کی طرف تھا، جو سو سال کے بعد بھی علامتی طور پر زندہ تھی۔ اس وقت اس کے امیر غازی عبدالکریم چمرکنڈی تھے۔ چودھری ظفر اللہ مجھے اس جماعت کے

کارناموں سے آگاہ کرتے رہتے۔ میں خود بھی شاہ اسماعیل شہید کی دعوت اور افکار سے بڑا متاثر تھا، اس لیے میں بھی ان کے قریب آتا چلا گیا۔ انھوں نے مجھے کچھ کتب بھی گفٹ کیں جن میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ''تحریک المجاہدین'' بھی شامل تھی، یہ کتب آج بھی میری لائبریری میں موجود ہیں۔ اس دوران میں نے گاڑی بھی خرید لی۔ شیخ ظفر اللہ کو میں مختلف جگہوں پر لے کر جاتا انھوں نے مختلف مشائخ سے ملنا ہوتا تھا۔ کبھی تو میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہتا اور کبھی میں بھی ان کی اجازت سے ان کے ساتھ اندر چلا جاتا۔

فضیلۃ الشیخ عبداللہ المعتاز سے ملاقات

ایک دن پروفیسر ظفر اللہ کے ساتھ میں بھی شیخ عبداللہ بن محمد المعتاز کے گھر گیا، ان کے ساتھ تعارف ہوا۔ میں نے پہلے ہی سے ان کا نام سن رکھا تھا۔ یہ اہلحدیث کے سچے خیر خواہ ہیں۔ علمی حلقوں میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ قدرے بھاری جسم اور درمیانے قد کے شیخ عبداللہ المعتاز نہایت زیرک اور دور اندیش شخصیت ہیں۔ خاندانی اعتبار سے یہ مدینہ طیبہ کے مشہور قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں، گویا اصلاً مدینہ کے باسی ہیں اور انصار مدینہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے آباؤ اجداد بھی رزق کی تلاش میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ القصیم کا علاقہ سعودی عرب کا بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے سمجھدار، ذہین و فطین اور اہل عمل ہیں۔ عنیزہ اور بریدہ اس علاقے کے مشہور شہر ہیں۔ شیخ عبداللہ المعتاز بھی عنیزہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کی بہت زیادہ زمینیں تھیں، جو آج بھی بے آباد ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے: اگر کوئی پاکستانی انھیں آباد کرنا چاہے تو میں بیس سالوں کے لیے اسے مفت زمین دے دوں گا، بشرطیکہ وہ

انھیں آباد کرے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ کہنے لگے: جو آدمی یہاں پر غلہ بوئے گا لوگ اسے کھائیں گے تو مجھے بھی اجر وثواب ہوگا۔ ریاض میں ربوہ کے علاقے میں ان کا گھر بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ ایک دن میں نے چودھری ظفر اللہ صاحب سے کہا: شیخ عبداللہ کا گھر ماشاء اللہ بہت بڑا ہے، تو کہنے لگے: چودھری جو ٹھہرے، ان کا گھر بڑا ہی ہونا چاہیے۔

ایک زمانے میں شیخ عبداللہ المعتاز وزارۃ المالیہ میں اعلیٰ پوزیشن پر ملازمت کرتے تھے۔ اچھی تنخواہ تھی۔ خیر کے کاموں میں پیش پیش ہوتے۔ شیخ عبداللہ المعتاز ایک چلتا پھرتا مدرسہ ہیں، میں جب بھی ان کی مجلس میں گیا ان سے کوئی نہ کوئی بات ضرور سیکھی، بہت بڑے عالم دین ہیں، فقیہ ہیں، شاعر ہیں، حافظ قرآن ہیں۔ بہت ساری کتابوں کے مؤلف ہیں۔ اپنے دل میں اسلام کی سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ میں گاہے گاہے مختلف علماء کی معیت میں ان کے پاس جاتا رہا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس اللہ کے نیک بندے نے دنیا بھر میں کتنی مساجد اور مدارس تعمیر کروائے ہیں۔ دنیا کے اکثر ممالک میں انھوں نے دین کی دعوت کو فروغ دینے کے لیے کام کیا۔ انھی ایام میں دارالسلام کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ کاروبار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں نشر واشاعت کا کام کرتا ہوں۔ وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے، میں بھی بہت سے اہم امور میں ان سے مشورہ کر لیتا، ہم ان کے گھر جاتے تو قہوہ اور اعلیٰ درجے کی کھجوروں سے ہماری ضیافت فرماتے۔ علمائے کرام آتے تو ان کی ضیافت میں بھی کوئی کمی نہ کرتے۔ ان کے یہاں سال ہا سال سے معمول چلا آ رہا ہے کہ ہر جمعرات کو نماز عشاء کے بعد وسیع دستر خوان لگ جاتا ہے۔ ان کے تمام بیٹے، بیٹیاں اپنی اولادوں کے ساتھ لازماً اور عزیز واقارب، علماء،

مشائخ، مہمان، دوست سبھی عموماً شرکت کرتے ہیں۔

قریباً چھ برس پہلے ان کی اہلیہ ام محمد اللہ کو پیاری ہوگئیں، اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، بڑی نیک اور صالحہ خاتون تھیں، بڑے کھلے ہاتھ کی تھیں۔ اسلام کے لیے دل کھول کر خرچ کرتیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے مہمانوں کے لیے کھانا پکاتیں۔ انھیں مقامی روایات کے مطابق کھانے بنانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ قرصان، مرقوق، کبسہ باللحم، جریش اور دوسری کتنی ہی مقامی ڈشیں بناتیں۔ مجھے بڑا رشک آتا کہ شیخ عبداللہ کے تمام عزیز واقارب اور جاننے والے ہر جمعرات کو اکٹھے ہو جاتے۔ ہم جب جاتے تو پہلے قہوہ اور کھجوریں پیش کرتے، پھر چائے۔ اس دوران دستر خوان لگ جاتا۔ ہم مزے لے لے کر سعودی عرب کے مقامی کھانے کھاتے اور انھیں دعائیں دیتے۔ جب تعلقات زیادہ بڑھ گئے تو میرا اس مبارک خاندان کے ساتھ رابطہ مزید بہتر ہوتا چلا گیا۔ یہ دارالسلام کے شریک کار ہو گئے، کیسے شریک ہوئے اس کا ذکر آگے کروں گا۔ میرے لیے اعزاز ہے کہ اس گھرانے کا ہر فرد مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ام محمد ہماری والدہ کی طرح تھیں۔ کئی مرتبہ مجھے خصوصی یاد کرتیں کہ عبدالمالک کب قرصان، مرقوق، کبسہ اور جریش کھانے آئے گا۔ انھیں معلوم تھا کہ مجھے مقامی بدوی کھانے بڑے پسند ہیں۔ میں اگر دو چار ہفتے نہ جاتا تو شیخ عبداللہ کا فون آجاتا: عبدالمالک! تم کہاں ہو؟ کتنے دنوں سے آئے نہیں!! جب میں جمعرات کے روز ان کے دستر خوان پر کھانا کھاتا تو جہاں میرے لیے باعث شرف ہوتا وہاں یہ خاندان بھی میرے جانے سے دلی خوشی محسوس کرتا اور بڑی قدر وعزت کے ساتھ بٹھاتا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سعودی عرب میں کاپی رائٹ کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کسی

اسلامی کتاب کے کوئی کاپی رائٹ نہیں تھے۔ نہ کوئی اتنی زیادہ پرواہی کرتا تھا، البتہ ان کی تحقیق کرنی پڑتی تھی، انھیں نئے سرے سے کمپوز کرنا پڑتا۔ اس زمانے میں اسلامی کتاب یا اس کے ترجمے کی کسی بھی زبان میں اشاعت مؤلف کے لیے باعث شرف سمجھی جاتی تھی۔ اگر کسی مؤلف سے اجازت طلب کی جاتی تو فوراً بغیر کسی معاوضے کے مل جاتی۔

مجھے ایک کتاب شائع کرنا تھی جس کے لیے سولہ ہزار ریال درکار تھے، جو اس وقت میرے پاس نہ تھے۔ میں اس سے پہلے شیخ عبداللہ المعتاز کے لیے چھوٹے چھوٹے کام نہایت کامیابی سے کر چکا تھا۔ میں ادارۃ المساجد کے لیے قرآن کریم کے آخری تین پاروں کے ایک لاکھ نسخے بیروت سے چھپوا کر انھیں دے چکا تھا۔ وہ میرے اوپر اعتماد کرنے لگے تھے۔ یہ ایک بڑا پروجیکٹ تھا جو میں نے نہایت ارزاں نرخوں پر چھپوا کر مہیا کیا تھا۔ ان کے پاس بہت سارے دعاۃ آتے تو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے۔ گفتگو بالعموم جماعت کے خلاف ہی ہوتی۔ الزام یہی ہوتا کہ یہ لوگ کچھ کام نہیں کرتے، سیاست کرتے ہیں۔ اللہ کے فضل وکرم سے میں ہر ایسی مجلس میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا اور پروفیسر ساجد میر صاحب کا دفاع کرتا۔ کچھ بھی تھا میں ایک خطیب آدمی تھا، یہ درست ہے کہ مجھے اتنی زیادہ عربی نہیں آتی ہوگی، مگر میں گونگا بہرہ تو نہ تھا۔ میں جم کر ان کی باتوں اور الزامات کا جواب دیتا۔ پروفیسر ساجد میر صاحب ریاض تشریف لاتے تو ان کو بھی لے کر شیخ عبداللہ کے

مجھے اتنی زیادہ عربی نہیں آتی ہو گی، مگر میں گونگا بہرہ تو نہ تھا۔ میں جم کر ان کی باتوں اور الزامات کا جواب دیتا۔

پاس جاتا۔ وہ ان کی عزت کرتے، کھانا کھلاتے، مگر وہ بعض دعاۃ کے نظریات کی حمایت کرتے تھے۔ مجھے بارہا کتنی ہی مجالس میں انھوں نے فرمایا کہ دیکھو تم واحد شخص ہو جو مرکزی جمعیت اہل حدیث یا ساجد میر صاحب کا دفاع کرتے ہو۔ ریاض میں تم اکیلے ان کی وکالت کرتے ہو۔ میں اپنے دلائل دیتا، ان کو جواب دیتا۔ وہ اندر سے میرا احترام کرتے۔ یہی تو وجہ تھی کہ گاہے گاہے اپنے دسترخوان پر فون کر کے بلوا لیتے۔

ایک دن میں نے ان سے کہا: شیخ صاحب! مجھے ایک کتاب بیروت سے چھپوانی ہے، اس کے لیے مجھے سولہ ہزار ریال ادھار چاہیے۔ فرمانے لگے: کب واپس دو گے؟ میں نے اندازہ لگا کر بتایا کہ بس ان شاء اللہ! چار ماہ کے اندر واپس کر دوں گا۔ کہنے لگے: مجھے تم پر اعتبار ہے تمھیں سولہ ہزار دے دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اسی وقت یہ رقم میرے حوالے کر دی۔ مجھے پیسے تو مل گئے، مگر ساتھ ہی ذہن پر ایک بوجھ بھی سوار ہو گیا کہ اگر خدانخواستہ چار ماہ میں ان کو یہ مبلغ واپس نہ کر سکا تو پھر کیا ہوگا؟ انھیں مجھ پر جو اعتماد ہے وہ ختم ہو جائے گا جو بہت بڑا خسارہ ہوگا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اچانک ان کی آواز گونجی عبدالمالک! یہ تو بتاؤ تم ان پیسوں کا کیا کرو گے۔ میں نے بتایا: میں ان پیسوں سے مشہور کتاب شائع کرنا چاہتا ہوں۔ اگلا سوال تھا: تم اس کو فروخت کرو گے تو کیا تمھیں منافع ہوگا؟ میں نے کہا: جی ہاں! کیوں نہیں، بلاشبہ مجھے اس سے منافع ہوگا۔ کہنے لگے کہ پھر تم مجھے منافع میں شریک کیوں نہیں کر لیتے؟ میں نے لمحہ بھر سوچا: اس طرح یہ مبلغ میرے اوپر قرض نہیں ہوگی بلکہ یہ تو مضاربت ہو جائے گی اور چار ماہ کی بجائے یہ مبلغ ادا کرنے میں آٹھ ماہ یا سال بھی گزر جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا، کتاب کی فروخت میں چار ماہ سے زائد بھی لگ سکتے ہیں۔ میں نے تھوڑا سا غور کیا اور کہا: شیخ! اس

> پھر تم مجھے منافع میں شریک کیوں نہیں کر لیتے؟

طرح تو میری ذمہ داری ختم ہو جائے گی، ہم نفع ونقصان میں شریک ہوں گے۔ انھوں نے بھی فرمایا: ہاں ٹھیک ہے، اب ہم دونوں اس منصوبے میں شریک ہو گئے۔ خیر ہم نے وہاں نفع کی ایک نسبت طے کی اور میں خوش دلی سے وہاں سے اٹھ آیا۔ یہ میری شیخ عبداللہ المعتاز کے ساتھ سب سے پہلی کاروباری شراکت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کتاب میں توقع سے بڑھ کر فائدہ دیا جو میں نے ان کو مع اصل زر شکریے کے ساتھ واپس کیا۔ ان کا مجھ پر اعتماد مزید بڑھ گیا۔ ایک دن فرمانے لگے: دیکھو عبدالمالک! ہمیں تمھارے اوپر اعتماد ہے، تم محنتی ہو اور نشر واشاعت کے کام کو خوب سمجھتے ہو۔ ہمارے پاس پیسہ ہے ہم چاہتے ہیں کہ تم وزارۃ الدفاع کی نوکری چھوڑ دو اور سارا وقت دارالسلام کو دو۔ ہم تمھیں بھی اس میں سے حصہ دیں گے۔ ہمارے ساتھ ایک اور شریک شیخ سلیمان الفیز بھی ہوں گے۔ میں نے ان کی پیش کش قبول کر لی۔ ابھی تک میں دارالسلام کا کام شام کے وقت چلاتا تھا۔ ان کے ساتھ سمجھوتا ہو گیا۔ میں نے دارالسلام کے تمام اثاثہ جات، جو دو لاکھ ریال سے زیادہ کے ہی ہوں گے، اصل قیمت پر ادارے کو دے دیے۔ شیخ عبداللہ المعتاز اور شیخ سلمان نے دو دو لاکھ ریال دے دیے۔ میری تنخواہ دس ہزار ریال مقرر کی گئی۔ اور میں نے وزارۃ الدفاع سے استعفا دے دیا۔

میں نے عرصہ دس سال وزارۃ الدفاع میں طیران الجیش میں کام کیا۔ ایک مدت تک طیران الجیش کے کمانڈر جنرل فیصل بن محمد بن سعود الکبیر تھے۔ جو مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ پھر میری ڈیوٹی اسی بلڈنگ میں الشؤون الدینیہ کے سپرد ہو گئی۔ وہاں ہمارے

انچارج بریگیڈیر جنرل شیخ مناور حربی تھے۔ ان کے ساتھ میری بڑی گہری دوستی تھی۔ بڑے نفیس شخص تھے۔ سلفی العقیدہ، قدرے چھوٹا قد، پھرتیلا جسم، اعلیٰ سوچ وفکر کے مالک شیخ مناور سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی دو بیویاں تھیں، مگر دونوں کا آپس میں بے حد اتفاق تھا، دونوں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔

اللہ ان کی مغفرت فرمائے، بڑی مدت پہلے وفات پا چکے ہیں۔

وزارۃ الدفاع میں کوئی خاص کام نہ تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم کچھ نئے نئے آئیڈیاز متعارف کروائیں گے، مگر اس کے لیے بجٹ کی ضرورت تھی۔ اس کی منظوری کے لیے وقت درکار تھا۔ چھوٹا موٹا کام ہوتا جو میں الحمد للہ چند منٹوں میں ختم کر دیتا۔ ہم دونوں بعض اوقات گھنٹوں لائبریری میں بیٹھے کتابیں دیکھتے رہتے۔ میں اپنی مرضی سے جب جی چاہتا دفتر جاتا، میرا اپنا کمرہ تھا جس کی چابی میرے پاس تھی۔ دفتر آتا تو سیدھا شیخ مناور کے کمرے میں جاتا۔ انھیں سلام کرتا تو پاس ہی بٹھا لیتے۔ مزے مزے کا قہوہ اور کھجوروں کا ''طبق'' آ جاتا۔ ہم دونوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے۔ ان کے پاس زندگی کے بڑے تجربات تھے۔ قہوے کا دور چلتا رہتا اور اس دوران کھجوروں کا ''طبق'' بھی آدھا رہ جاتا۔ اتنی دیر میں ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا اور ہم نماز کی تیاری کرنے لگتے۔ نماز کے بعد عربی اخبارات آ جاتے۔ ایک اخبار مجھے بھی مفت مل جاتا، میں اسے پڑھتا رہتا۔ عربی زبان کے حصول میں اضافہ کرتا رہتا۔ اس دوران کوئی کام آ جاتا تو بخوشی کر دیتا، کبھی دیگر مختلف اداروں سے بھی کام آ جاتا، وہ بھی میں بخوشی کر دیتا۔ میں بنیادی طور پر خطاط تھا اور ہوں۔ میں باریک قلم سے بہت خوبصورت لکھتا۔ اس بلڈنگ میں کام کرنے والے اکثر لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے تھے اور عزت کرتے تھے۔ کتنے ہی

افسران تھے جن کے نام تو میں نہیں جانتا تھا مگر وہ مجھے اپنے کمرے میں ساتھ بٹھا کر قہوہ اور چائے پلاتے، میری سنتے اپنی سناتے۔ ادھر جب شیخ عبداللہ المعتاز کے ساتھ معاملات طے پا گئے تو میں نے شیخ مناور سے تذکرہ کیا کہ میں وزارت سے استعفا دینا چاہتا ہوں۔ سچ پوچھیں تو پہلی مرتبہ ان کا لہجہ قدرے تلخ ہوا، کہنے لگے: میں اتنی کوشش سے تمھیں اپنے ادارے میں لے کر آیا ہوں، اب تم ہمیں چھوڑنا چاہتے ہو؟! یہ نہیں ہوگا۔ تمھیں کوئی پرابلم یا مسئلہ ہے تو بتاؤ۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس بات کے کہ میں دارالسلام کو مکمل وقت دینا چاہتا تھا۔ ''دارالسلام'' کا سارا معاملہ ان کے علم میں تھا۔ وہ کہنے لگے: ابھی تو تمھیں کئی ایک کام کرنے ہیں، کتنے ہی نئے آئیڈیاز ہمارے ذہنوں میں ہیں...... خیر میں انھیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ کھجور اور قہوے کی محفل چند دن نہ جمی۔ میں نے فی الحال وزارت سے استعفا دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا، تعلقات پھر بحال ہو گئے۔ پھر وہی باتیں، وہی قہوہ اور کھجوریں۔ کوئی دو یا تین ہفتے گزر گئے تو مجھے کہنے لگے: عبدالمالک! یہ تم چند دن پہلے کیا بات کر رہے تھے؟ مجھے سمجھ تو آ گئی تھی لیکن میں نے ذرا انجان بن کر پوچھا: کون سی بات؟ کہنے لگے: وہی استعفے کی بات! میں نے کہا: آپ تو ناراض ہو گئے تھے، اس لیے فی الحال اس موضوع کو ملتوی کر دیا ہے۔ کہنے لگے: اگر اب تم استعفا دینا چاہو تو میں استعفا قبول کر لوں گا۔ میں نے پوچھا: وجہ؟ کہنے لگے: میرا اپنا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے۔ میں تمھیں نئی جگہ اپنے ساتھ لے جا نہیں سکتا۔ اس لیے اب تمھارا یہاں کام کرنا یا نہ کرنا میرے لیے برابر ہے، تم چاہو تو چھوڑ سکتے ہو۔

میرا ایک سعودی دوست خالد الوہیبی تھا۔ یہ بھی وزارت دفاع کے شعبہ مالیات میں

کام کرتا تھا، میرے پاس اکثر آتا رہتا تھا۔ اسے خطاطی کا بڑا شوق تھا اور معلوم تھا کہ میں وزارت سے استعفا دینا چاہتا ہوں۔ میری خواہشات اور تمنا کا انھیں بھی علم تھا۔ اب وزارت کو کیسے چھوڑا جائے، کیونکہ قانون کے مطابق دوران معاہدہ میں استعفا نہیں دے سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے غالباً تین ماہ کی تنخواہ اور اپنی گریجویٹی کے کچھ حصے سے بھی محروم ہونا پڑتا تھا۔ میرے سالانہ معاہدے میں ابھی خاصی مدت باقی تھی، تاہم اگر ادارہ چاہے تو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کو مکمل اختیارات تھے کہ وہ کسی بھی ملازم کو اس کی خواہش پر ادارے سے فارغ کر سکتا تھا۔ استاذ خالد الوہیبی کے ایک چچا وزارت الدفاع میں جنرل تھے۔ ہم دونوں ان سے ملے۔ میں نے انھیں بتایا کہ انگلش زبان میں اسلامی کتب کی نشر و اشاعت کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ادارۃ الاشغال العسکریہ کے مدیر کے نام لیٹر لکھا، اس کی کاپی آج بھی میرے پاس موجود ہے، جس میں انھوں نے سفارش کی کہ میرا استعفا قبول کر لیا جائے۔

میں وہ لیٹر لے کر جنرل عبدالعزیز العطیشان کے پاس گیا، ان کو لیٹر دیا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائے، کہنے لگے: اتنی بڑی سفارش کی کیا ضرورت تھی، خود ہی چلے آتے بھلا ہم تمھیں جانتے نہیں! وہ کیسے اور کیونکر جانتے تھے؟ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ہمارے دفتر کے سامنے وزارت دفاع کا کمپاؤنڈ تھا۔ جس میں صرف افسران رہتے تھے۔ کمپاؤنڈ میں ایک بہت بڑی مسجد تھی۔ اس مسجد میں سعودیوں کے علاوہ پاکستانی بھی نماز جمعہ کے لیے آتے تھے۔ میں گزشتہ کئی سالوں سے اس مسجد میں خطبۂ جمعہ کا ترجمہ کر رہا تھا۔ اس وقت وزارۃ الدفاع میں بریگیڈیئر جنرل کے عہدے پر فائز ڈاکٹر شیخ محمد الجعوان تھے۔ یہ بڑے زبردست خطیب تھے، لوگ ان کا خطبہ سننے کے لیے دور دور سے آتے۔ میں ان کو

ہر جمعہ گیارہ بجے فون کرتا۔ وہ مجھے اس دن کے جمعہ کا خلاصہ آیات اور احادیث فون پر لکھوا دیتے۔ جمعے کے فوراً بعد میں ایک مخصوص جگہ پر کھڑا ہو جاتا اور خطبۂ جمعہ کا خلاصہ بیان کرتا۔ جوانی کا دور تھا، میری آواز الحمد للہ! بڑی بلند تھی۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد میرے چاروں طرف بیٹھ جاتی۔ انڈین، پاکستانی بنگلہ دیشی سارے ہی استفادہ کرتے۔ کم وبیش تین سو سے لے کر پانچ سو تک لوگ جمع ہو جاتے۔

میں نے اس مسجد کی لائبریری میں اردو کتابیں بھی رکھوائیں۔ ہم جمعے کے بعد وہاں چلے آتے، کتنے ہی ملنے والے بھی آتے، ہم نے باقاعدہ ایک لائبریرین مقرر کیا۔ لوگ کتابیں عاریتاً لے جاتے اور اگلے ہفتہ واپس کر جاتے۔ الحمد للہ! لوگوں نے اس سے بہت استفادہ کیا، یہ سلسلہ خلیج کی جنگ شروع ہونے تک چلتا رہا۔ بعدازاں سیکورٹی کی وجہ سے بند ہوگیا۔ اس زمانے میں وزارت دفاع کے بڑے بڑے افسران میرے واقف تھے۔ کیونکہ وہ مجھے ہر ہفتے مسجد میں تقریر کرتے دیکھتے تھے۔ میں تحدیث نعمت کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی ایک پیسہ بھی اس کام کے مقابل وصول نہیں کیا۔ نہ مجھے کسی نے دیا، نہ میں نے مانگا اور نہ کبھی مانگنے کا سوچا ہی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے مالی طور پر لوگوں سے بے نیاز کیا ہوا تھا۔

جنرل عبدالعزیز العطیشان نے اپنا فون گھمایا۔ شؤون الموظفین کے مدیر سے بات کی کہ عبدالمالک آ رہا ہے اس کی مدد کریں اور ہاں! استعفے کے وقت اس کی کوئی رقم کٹنی نہیں چاہیے۔ میں ان کے پاس گیا، بڑی محبت سے پیش آئے، میری پرسنل فائل منگوائی، کہنے لگے: تمھاری تنخواہ میں کتنے سالوں سے اضافہ نہیں ہوا، اگر تم استعفا نہ دو تو تمھاری تنخواہ پندرہ فی صد بڑھانے کی سفارش کی جا سکتی ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا: بس آپ میرا

استعفا قبول کرلیں، میرے لیے یہی کافی ہے۔ بندہ بڑی اچھی نیت والا تھا، کہنے لگا: میں تمھیں ایک مشورہ دیتا ہوں کہ تم یہ استعفے کا کاغذ واپس لے جاؤ۔ کیونکہ دفتری کارروائی اور تمھارے آخری حقوق کی منظوری کرنے میں کوئی دو ماہ لگ سکتے ہیں۔ اگر آج تمھیں فارغ کردوں تو تمھارے لیے خاصی مشکلات ہوسکتی ہیں، تمھیں اس دوران تنخواہ نہیں ملے گی۔ اب تم گھر بیٹھ جاؤ، جب تک رسمی کارروائی نہیں ہوجاتی تنخواہ ملتی رہے گی۔ اس کی بات معقول تھی۔ میرا معاملہ ہیڈ کوارٹر میں منظوری کے لیے بھجوادیا گیا۔ ان دو ماہ میں مجھے وزارت میں کام نہیں کرنا تھا۔ میں نے ''دارالسلام'' کو وقت دیا۔ مجھے وزارت سے جو گیارہ سالہ نوکری کے حقوق ملے، وہ کوئی 45000 ریال کی رقم تھی۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی۔ یہ میں نے دارالسلام کو دے دیے۔ اب مسئلہ نقل کفالہ کا تھا۔ وزارت والوں نے ویسے تو منظوری دے دی تھی۔ انھیں کوئی اعتراض نہ تھا، مگر عملاً وزارت سے مکتبے کی طرف ٹرانسفر اتنا آسان کام نہ تھا۔ یہاں پر پھر میرا دوست خالد الوهيبی کام آگیا۔ یہ وزارت دفاع کے شؤون المالیہ میں مؤظف تھا۔ ایک بڑے ٹھیکیدار کا بل ان کے پاس آیا ہوا تھا۔ اس نے اسے بلایا اور کہا: میرے خاص دوست اور استاد کا کام ہے، اسے جلدی سے کروادو۔ اللہ اسے جزائے خیر دے، اس کے لیے اوپر سے آرڈر، جسے عربی میں ''امر'' کہتے ہیں، کی ضرورت تھی۔ وہ ہفتہ بھر میں اوپر سے ''امر'' لے آیا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ آرڈر کا فیکس آگیا۔ اس طرح میرا نقل کفالہ وزارۃ الدفاع سے مکتبہ دارالسلام کے نام ہوگیا۔ میرا الحمد للہ ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ انھوں نے میرا پیشہ میرے مشورے سے مدیر تسویق لکھوادیا۔ خالد الوهيبی امریکہ میں سعودی سفارت خانے میں افسر ہے۔ میرے اس سے آج بھی عمدہ تعلقات ہیں۔ یہ ایک مشہور اور بڑی

فیملی کا فرزند ہے۔ ایک مدت قبل میں واشنگٹن گیا تو ان کے گھر بھی گیا تھا۔ خالد ہی نے مجھے واشنگٹن کی سیر کروائی تھی۔ وائٹ ہاؤس بھی انھوں نے دکھایا تھا۔ یہ شخص واقعی بڑے اعلیٰ اخلاق کا مالک ہے۔ اس وقت یہ نوکری بھی کرتے تھے اور ساتھ ساتھ پڑھ بھی رہے تھے۔ ہم نے اکٹھے اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ خوب باتیں کیں۔ اب بھی ان سے رابطہ رہتا ہے۔ رمضان شریف اور عید المبارک کے موقعوں پر ان سے ضرور دعا سلام ہو جاتی ہے۔

یہاں میں اپنے قارئین، اپنے پیاروں اور عزیزوں کو ایک مشورہ دینا اور تلقین کرنا چاہوں گا کہ جس کسی نے آپ کے ساتھ احسان یا نیکی کی ہے، اس کی نیکی کو ضرور یاد رکھیں اور اس کا شکریہ ضرور ادا کریں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے:

«مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ» (جامع الترمذي، حديث: 1955)

''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا۔''

مجھے نہایت افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب انھیں ضرورت ہوتی ہے تو وہ بار بار فون کرتے ہیں، ملاقات کرتے ہیں، مگر جیسے ہی ان کا مطلب نکل گیا وہ بالکل آپ کو بھول جاتے ہیں۔ شکریہ کا ایک فون یا چند لائنیں تحریر کی صورت میں بھی لکھنا گوارا نہیں کرتے۔ مجھے بعض اوقات بڑا تعجب ہوتا ہے کہ یار یہ شخص کل تک کتنا میرے پیچھے پیچھے تھا، مگر آج یہ مجھے بالکل بھلا چکا ہے۔ بلکہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی جگہ ان سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ ہاتھ ملانے سے بھی گریز کر جاتے ہیں۔

دیکھیے! اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ لوگوں میں محبوب بن جائیں، لوگ آپ کی عزت اور قدر کریں تو یہ معمولی معمولی ''گر'' ہیں ان کو سیکھیے۔ چند منٹ کی کال، یا چھوٹے سے پیغام پر چند منٹ لگتے ہیں، مگر جس نے آپ کا کام کیا ہے، اسے احساس ہوتا ہے کہ میں نے کسی

اچھے خاندان کے فرد کی خدمت کی ہے، پھر دوبارہ اگر آپ کو اس سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ بخوشی انجام دے گا۔ مجھے یاد ہے اس خالد الوہیبی کو میں نے کئی مرتبہ وزٹ ویزے کے کیس بھجوائے۔ الحمد للہ اس نے بڑے شوق سے میرے کام کیے۔

میرے وزارت دفاع کو چھوڑنے کا ایک سبب ایک بڑا خوبصورت واقعہ ہے۔ میں ضرور اپنی سنہری یادوں میں اس کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ وزارت دفاع میں الحمد للہ! معقول آمدنی تھی۔ زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ بڑے آرام سے میں دس بارہ ہزار ریال کما لیتا تھا، مجھے کوئی پریشانی نہ تھی، لوگ عزت کرتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں بڑی عزت پائی۔ جس طرف جاؤ لوگ آپ سے ہاتھ ملاتے، بات چیت کرتے اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دفتر جب جی چاہتا جاتے، جب جی چاہتا واپس آجاتے۔ میرا اپنا دفتر، فون، چائے، قہوہ، میڈیکل کی سہولت، ملٹری ہسپتال، جو دنیا کے بہترین ہسپتالوں میں ایک ہے، میں مفت علاج۔ مجھ پر حاضری لگانے کی پابندی بھی نہیں تھی۔ نہ کبھی کسی نے پوچھا ہی کہ تم کب آئے اور کب گئے؟ ہاں! کام میں فوراً کر دیتا تھا، مگر میں کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر ایک تڑپ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں الحمد للہ! بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اس کتاب میں ایک اور جگہ بیروت کی اس عیسائی عورت کا ذکر کر چکا ہوں جو بیروت میں سب سے بڑے اشاعتی ادارے کی مالکہ تھی۔ میں وہ خبر پڑھ کر روتا رہا اور عزم کرتا رہا کہ مجھے اشاعت کے میدان میں نئے نئے افکار متعارف کروانا ہوں گے۔ میں نے اوپر عرض کی کہ بعض بڑے سعودی افسران سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ میں کبھی کبھار ان کے پاس جاتا، اگر ان کے پاس وقت ہوتا تو کافی دیر تک پاس بٹھاتے۔ ایک بڑے افسر سے میری بڑی اچھی ملاقات تھی۔ ایک دن دوران گفتگو میں

نے ان سے کہا: میں وزارت سے استعفا دینا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے: کیوں؟ میں نے انھیں بتایا کہ میں ایک اشاعتی ادارہ بنانا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے: یہ بتاؤ کہ تمھیں یہاں کیا کیا سہولتیں ملتی ہیں؟ میں نے گن کر بتائیں۔ پوچھنے لگے: تنخواہ بروقت ملتی ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جناب مہینہ گزرنے سے پہلے ہی مل جاتی ہے۔ فرمانے لگے: پھر تمھیں اور کیا چاہیے؟

قارئین کرام! اسی وقت میرے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت آ گئی:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾

''کیا تم یہ گمان کیے ہو کہ ہم نے تمھیں بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہ لوٹائے جاؤ گے۔''[1]

سبحان اللہ! یہ آیت جیسے ہی سامنے آئی، میں نے ان سے اجازت چاہی۔ ان کے دفتر سے نکلا تو بار بار یہ آیت میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا: دیکھو عبدالمالک! تمھیں اللہ تعالیٰ نے بے کار پیدا نہیں کیا ہے۔ تمھیں ایک بڑے مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تمھارے سامنے کتاب وسنت کی دعوت کو نشر کرنے کا بہت بڑا مشن ہے۔ تمھیں اس کے لیے اپنی زندگی صرف کرنی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہی آیت بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتی چلی گئی۔ میرے ارادوں اور ہمتوں میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وزارت دفاع کی نوکری اچھی اور محفوظ تھی۔ کسی کو بتاتا کہ میں وزارۃ الدفاع میں کام کرتا ہوں تو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ کئی لوگوں نے دبے لفظوں میں مشورہ دیا کہ آپ اچھی طرح غور وفکر کر لیں، اتنی اچھی نوکری نہ چھوڑیں، مگر میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میں

[1] المؤمنون 115:23.

سمجھتا ہوں کہ تقدیر اس گنہگار بندے سے کچھ کام لینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ الحمد للہ! میرا استعفا دینے کا فیصلہ بڑا بروقت، درست اور صحیح تھا۔

میں نے بات تو شیخ عبداللہ المعتاز سے شروع کی تھی، مگر وہ کہاں سے کہاں چلی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سنہری یادیں اتنی زیادہ ہیں کہ انھیں اگر لکھنے بیٹھ جاؤں تو سیکڑوں صفحات بن جائیں۔ شیخ عبداللہ المعتاز اور شیخ سلیمان الفیز کے مال میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت عطا فرمائی، ان کا مال حلال کمائی سے تھا۔ میں نے بھی الحمد للہ! خوب محنت کی۔ ''دارالسلام'' کے شروع کے ایام آسان نہ تھے۔ میں خود بارہ چودہ گھنٹے کام کرتا۔ بعض اوقات دورانیہ اس سے بھی بڑھ جاتا۔ ان ایام میں صحت بالکل ٹھیک تھی۔ میں نے دفتر سے شاید ہی کبھی چھٹی کی ہو، بلکہ میرا کہنا یہ ہے اور شاید درست ہی ہوگا کہ میں نے پہلے سات سال تک ''دارالسلام'' سے ایک بھی چھٹی نہیں کی۔ عید کے دن بھی صبح کا وقت بچوں کے ساتھ گزارتا اور شام کو دفتر آ جاتا۔ مجھے اپنے کام سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ میں الحمد للہ! اس دوران شاید ہی کبھی بیمار ہوا ہوں۔ اگر کبھی طبیعت خراب ہوئی اور صبح کے وقت دفتر نہیں جا سکا تو شام کو چلا گیا۔ اور اگر شام کو گھر چلا گیا تو صبح دفتر میں موجود ہوتا۔ ہمارے سامنے ایک مشن تھا کہ ہم نے ''دارالسلام'' کو دنیا کے بڑے اشاعتی اداروں میں شامل کرنا ہے۔ جمعہ کا دن تو میرے لیے بڑے مزے کا ہوتا تھا، میں عموماً عصر کے بعد دفتر آ جاتا۔ اکیلا ہوتا تھا، نہ کوئی ملنے والا ہوتا تھا اور نہ ٹیلی فون کالز۔ میں حسابات کا جائزہ لیتا۔ کتب کی فروخت کے امور کو چیک کرتا، نئے منصوبے سوچتا۔ الحمد للہ! میں پہلا ناشر ہوں جس نے باریک ورق پر کتب کو متعارف کروایا۔ صحیح بخاری، کتب ستہ، مسند امام احمد بن حنبل اور المصباح المنیر جیسی بڑی کتابوں کو ایک مجلد میں لانا میرا ہی آئیڈیا تھا۔ یہ

درست ہے کہ بعض شخصیات نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا،مگر اس کی تنفیذ الحمدللہ میرے ہاتھوں ہوئی۔ میں اکثر صبح کی نماز پڑھ کر نئے منصوبے سوچتا۔ دفتر میں سینیئر اسٹاف سے مشورہ کرتا اور پھر اس کام کو کرنے میں جت جاتا۔ میں اس زمانے میں چھوٹی موٹی بیماری کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ سٹاف کا کوئی شخص اگر مجھ سے کہتا: مجھے سر درد، نزلہ زکام، کھانسی یا بخار ہے اس لیے میں دفتر نہیں آیا، تو میں اس پر ہنسا کرتا تھا کہ ارے یہ تو معمولی بیماریاں ہیں، نوجوان بیماروں کو گھر میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔

شیخ عبداللہ بن محمد المعتاز اور شیخ سلیمان الفیز کے لیے الحمدللہ میں سجدوں میں دعائیں کرتا ہوں۔ یہ عظیم شخصیات ہیں اور بڑے اعلیٰ کردار کے لوگ ہیں۔ ہم تینوں بہت کم ہی اکٹھے ہوتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کا نام ریاض میں بڑا معروف ہے۔ ہم کسی بھی جگہ جاتے لوگ ''دارالسلام'' کے بارے میں پوچھتے: تم کون ہو؟ ہم شیخ عبداللہ المعتاز کا نام لیتے تو لوگ ان کا احترام کرتے۔ ان کا تذکرہ خیر کے ساتھ کرتے اور ہمارا کام ہو جاتا۔ ایک زمانے میں وہ تاجروں کو محض چھوٹی سی پرچی پر لکھ بھیجتے کہ فلاں جگہ مسجد، مدرسہ یا ہسپتال ہے تو تاجر اس مختصر تحریر کا بھی بے حد احترام کرتے۔

اللہ انھیں جزائے خیر دے، انھوں نے میرے اوپر مکمل اعتماد کیا، اللہ کا شکر ہے کہ میں نے بھی ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میں آج پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے الحمدللہ! کسی بیرونی ادارے سے، ناشر سے یا پرنٹنگ پریس سے یا پیپر والے سے یا کسی بھی شخص سے ایک ریال بھی کمیشن کے طور پر وصول نہیں کیا۔ میں نے بڑے بڑے معاہدے کیے۔ مجھے کوئی دیکھنے والا یا پوچھنے والا نہ تھا، الحمدللہ! میں ایک ایک سنٹ کے لیے پریس والوں سے لڑتا، معاہدوں پر دستخط کرنے سے تھوڑی دیر پہلے لڑ جھگڑ کر

ریٹوں میں کمی کروالیتا۔ میں کہتا: چلو! ٹکٹ کی قیمت مل گئی یا ہوٹل کا کرایہ نکل آیا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کی، نہ ہی ''دارالسلام'' کی کتب فروخت کر کے اس کا پیسہ کبھی اپنی جیب میں ڈالا، اگر بھول کر یا غلطی سے ایسی کوئی چیز ہوگئی ہو تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ گزشتہ دس بارہ سال سے میرا معمول یہ ہے کہ میں کیش کبھی اپنی جیب میں نہیں رکھتا۔ اگر کوئی نقد مبلغ ادا کرے تو فوراً اکاؤنٹس سیکشن کو بھجوا دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بھول جاتا ہوں، اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ فوراً معاملہ صاف ہو جائے۔

ایک مرتبہ ہم تینوں شیخ عبداللہ المعتاز، شیخ سلیمان الفیز اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: دیکھیے! ہمارا کام الحمدللہ! مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اس میں بعض اوقات ہم سے کوئی چیز اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ کسی کو کتاب دے دی، کسی کو اچھا کھانا کھلا دیا، کسی مؤظف کو اوور ٹائم دے دیا وغیرہ وغیرہ۔ آپ لوگوں نے اگر حساب لینا ہے تو دنیا میں مجھ سے لے لیں۔ قیامت کے روز میں کسی کو حساب نہیں دے سکوں گا۔ اللہ ہمارے مشائخ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ مجھ سے کہنے لگے: دیکھو! عبدالمالک! اگر تم نے ہمارا مال غلطی سے لاشعوری طور پر کھایا ہے تو ہم تمھیں معاف کرتے ہیں۔ پھر کہنے لگے: اگر تم نے جان بوجھ کر بھی کھایا ہے تو بھی تمھیں معاف کرتے ہیں۔ ہم تم سے قیامت کے روز حساب نہیں مانگیں گے۔ میں عش عش کر اٹھا، میں نے مشائخ کا شکریہ ادا کیا اور مزید جذبے، ہمت اور شوق سے کام شروع کر دیا۔ میں نے ''دارالسلام'' میں کچھ نئے اصول وضوابط مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سچائی کے عنصر کو غالب کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

میرا مقصد قارئین سے اپنی تعریف کروانا نہیں، بلکہ اپنی نوجوان نسل کو بتانا مقصود ہے کہ کامیابیاں کیسے ملتی ہیں۔ میں اسی لیے یہ کتاب لکھ رہا ہوں کہ نوجوانوں کو بتاؤں کہ آپ بھی اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ سچے ہیں، اپنے کاز سے مخلص ہیں، تو لوگ آپ کی عزت کریں گے۔ دیکھیے! مسلمان کو جھوٹ سے نفرت ہے۔ جو لوگ جھوٹے ہیں وہ مجھے خاص طور پر نہایت ناپسند ہیں۔ میری زندگی میں کتنی بار ایسا موقع آیا کہ میں نے فون ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے، مخاطب کو جواب دینا ہے، اب حالات ایسے ہیں کہ میں ان کا کام نہیں کر سکا تو میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ عبدالمالک! کیا تمھارے سچ بولنے سے یہ تمھیں زمین کے نیچے اتار دے گا؟ آخر تم کیوں جھوٹ بولو گے؟ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے اپنے معاملات میں بے حد شفافیت رکھی۔ میرے پاس اگر پیسے ہیں تو جن سے معاملات چل رہے ہیں میں ان سے کہتا ہوں: جی الحمد للہ! ہمارے پاس پیسے ہیں، ان شاء اللہ کل یا پرسوں ضرور بھجوا دوں گا۔ اب میں نے اس قسم کا بندوبست کیا ہوا ہے کہ اگر تو ڈرائیور بنک میں گیا ہوا ہے تو میں اپنے مخاطب سے کہتا ہوں: دیکھو بھئی! آدمی کو بنک بھیجا ہوا ہے، اب مجھے معلوم نہیں کہ تمھیں آج پیسے بھجوا سکوں یا نہ بھجوا سکوں، اگر حوالہ چلا گیا تو آپ کو فوراً بتا دیں گے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ جی ہاں رقم چلی گئی ہے وہ انتظار میں ہوگا۔ ادھر ممکن ہے بنک کا کمپیوٹر خراب ہو۔ اللہ نہ کرے ہمارے ورکر کا ایکسیڈنٹ ہو جائے اور رقم کسی بھی وجہ سے نہ جا سکے تو ہماری ساکھ خراب ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک کامیابی کا سب سے بڑا فارمولا سچائی ہے۔ ہم نے آج تک الحمد للہ! بینکوں سے کام نہیں کیا۔ نہ سودی کاروبار کیا اور نہ کبھی کسی سے سود لیا، نہ کسی کو دیا۔ ہم نے آج تک بنک میں ایل سی نہیں کھلوائی، میں جس پر

اعتماد کرتا ہوں مکمل کرتا ہوں۔ جب کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہوں تو پھر استخارہ کی صورت میں اللہ سے مشورہ کرتا ہوں۔

بنک سے سودی رقم لینے کی بات آئی ہے تو آیئے اپنی زندگی کا بہت خوبصورت اور اہم واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ اس واقعے نے میری زندگی میں ایک رہنما اصول مرتب کر دیا۔ قطر میں ایک بڑا معروف مکتبہ ہے۔ اس کے مالک بڑے اچھے انسان تھے۔ (نام نہیں لکھوں گا) یہ بڑی پرانی بات ہے۔ وہ جب ہمارے پاس آتے، کتابیں خریدتے۔ ہمیشہ کیش دیتے۔ ہمیں ان کے آنے سے خوشی ہوتی۔ ایک تو وہ کیش دیتے دوسرے یہ کہ بڑی تعداد میں کتب خرید کر قطر بھجواتے۔ وہاں ان کے کئی مکتبات تھے۔ ہماری ان سے بڑی اچھی دوستی ہوگئی۔ یہ وہاں فوج میں آفیسر تھے۔ پہلی مرتبہ جب میں نے قطر کا وزٹ کیا تھا تو انھوں نے ہی ویزا بھیجا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ ریالوں کے نئے نئے نوٹ کہاں سے لیتے ہیں؟ جواب ملا: میں یہ سارے نوٹ اسلامی بنک سے لاتا ہوں۔ میں ان کے ساتھ مضاربہ کی صورت میں کام کرتا ہوں، یہ حلال ہے۔ علماء نے اس پر فتوی دے رکھا ہے۔ میں نے ان سے کہا: ہمیں بھی مضاربت پر بنک سے کچھ رقم دلوا دیں۔ کہنے لگے: ہم نفع ونقصان کی بنیاد پر بنک سے پیسے لیتے ہیں۔ اسلامی بنک کا مدیر میرا دوست ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے تمھاری ملاقات کروا دوں گا۔ وہ بڑا ہی نیک سیرت آدمی ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، میری بھی اس سے ملاقات کروا دیجیے گا۔ چند ہفتے گزرے تو وہ ایک باریش اور بڑے ہی معزز شخص کو لے کر آگئے۔ کہنے لگے: یہ اسلامی بنک قطر کے منیجر ہیں۔ اسی بنک سے میں نے اپنے مکتبے کے لیے رقوم لے رکھی ہیں۔ ہمارا کام مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ وہ شخص بہت ہی معقول آدمی تھا۔ میں نے اس سے گفتگو

کی، اس نے ہمارے منصوبوں کی تفصیل چاہی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم اٹلی سے قرآن کریم، صحیح بخاری اور بعض دیگر کتب چھپوانا چاہتے ہیں۔ ان منصوبوں پر سولہ لاکھ ریال خرچ آئے گا۔ کتابیں فروخت ہونے پر بڑا معقول منافع ہے۔ عموماً ہماری کتب ایک سال میں الحمدللہ! فروخت ہو جاتی ہیں۔ کہنے لگا: کوئی مسئلہ نہیں! آپ ایک مرتبہ قطر آجائیں، میں آپ کے ادارے کو مدتوں سے جانتا ہوں۔ آپ کی شہرت بڑی اچھی ہے۔

قارئین کرام! اب تو سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کو قطر کا ویزا ائرپورٹ پر مل جاتا ہے۔ اس وقت ویزا وہاں سے منگوانا پڑتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے قطری دوست سے کہا: میرا ویزا بھجوا دیں۔ چند دن کے بعد میرا قطر کا ویزا آ گیا۔ میں نے قطر جانے کا پروگرام بنا لیا، غالباً ٹکٹ بھی خرید لیا۔ اگلے روز مجھے قطر جانا تھا۔ رات کو سونے کی لیے بیڈ پر گیا تو نیند کوسوں دور تھی۔ میں بار بار کروٹیں لے رہا تھا اور مسلسل سوچ رہا تھا کہ میں نے آج تک بینکوں سے کبھی قرض نہیں لیا۔ کہیں یہ سود نہ ہو اور سود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ ہے۔ کہیں میں پھنس نہ جاؤں۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا، کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے۔ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ اس ہستی سے مشورہ کروں جس سے مشورہ کر کے انسان کبھی نادم نہیں ہوا۔ میں بستر سے اٹھا، وضو کیا اور مصلے پر کھڑا ہو گیا، نوافل پڑھے، استخارہ کیا اور رو رو کر اللہ سے دعا کی: الٰہی! تو جانتا ہے میں نے ساری زندگی بینکوں سے نہ کبھی قرض لیا ہے اور نہ ان کے ساتھ میرا کوئی تعامل ہے۔ اب میں قطر جا رہا ہوں، بنک والے قرضہ دینے پر رضامند ہیں، اللہ تو میری رہنمائی فرما۔ میں دعائیں کر کے بستر پر لیٹا تو فوراً نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو ہشاش بشاش تھا۔ ذہن پر زور دیا تو جو سمجھ آئی وہ یہ تھی کہ میں شیخ عبداللہ المعتاز کو ساری بات بتا دوں اور ان سے

مشورہ طلب کروں۔ میں نے اس روز سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا اور شیخ عبداللہ کو فون ملانے لگا۔ ان سے عرض کی: میں فوراً آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ اکیلے ہوں، کہنے لگے: دس بجے سے پہلے آجاؤ، ہم دونوں اکیلے ہی ہوں گے۔

شیخ عبداللہ المعتاز کو میں نے قطر بینک والی پوری تفصیل بتائی، ان سے کوئی چیز نہ چھپائی، انھیں بتایا کہ ہمیں سولہ لاکھ ریال درکار ہیں اور ہمیں ان شاءاللہ اس میں اتنا منافع ہوگا۔ انھوں نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور ساتھ ہی شیخ سلیمان الفیز کو فون ملانا شروع کر دیا۔ آپس میں انھوں نے کیا بات کی اس کی تفصیل کا تو مجھے علم نہیں، مگر انھوں نے فون بند کر کے مجھ سے اتنا کہا: ایک معاہدہ لکھ کر لے آؤ، سولہ لاکھ ریال ہم تمھیں دے دیتے ہیں، بینک کو بھول جاؤ، آئندہ کبھی ان کے ساتھ تعامل کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اور دفتر آ گیا۔ ایک ہفتے کے بعد ہمیں مطلوبہ رقم مل گئی، ہم نے یہ مبلغ اٹلی بھجوا دی اور وہاں سے کتابیں چھپوالیں۔ اگلی بات سننے اور پڑھنے والی ہے، وہ یہ کہ عموماً ہمارا ایک ایڈیشن ایک سال میں ختم ہو جاتا ہے۔ بینک والوں سے میرا معاہدہ یہی ہونے جا رہا تھا، مگر یہ کیا؟ میرے تمام تر اندازے ہوا میں اڑ گئے۔ ہماری وہ کتب ایک سال کیا، دو سال تک بھی فروخت نہ ہو سکیں۔ میں کئی مرتبہ سوچتا ہوں اگر یہ معاملہ بینک کے ساتھ ہوتا تو وہ یا تو دارالسلام پر قبضہ کر لیتے یا میں جیل میں چلا جاتا۔ میرے لواحقین سے کہا جاتا کہ مذکورہ مبلغ مع منافع کے لے آؤ اور اپنا بندہ چھڑوا کر لے جاؤ۔ اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ بلاشبہ میں نے مشائخ کو رقوم وقت سے کہیں زیادہ تاخیر کے ساتھ مع منافع ادا کر دیں۔ یہ تاجر لوگ ہیں، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ صرف ایک مرتبہ فون کیا اور پوچھا کہ کتب کی سیل کا کیا حال ہے؟ یہ منصوبہ کیسا جا رہا ہے؟

میں نے انھیں صاف بتا دیا کہ فروخت کا عمل تیز نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے پوچھا نہ فون ہی کیا۔ جیسے ہی میرے پاس رقوم آتی گئیں میں انھیں واپس کرتا چلا گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس واقعے کے بعد میں نے آج تک بینک کے ساتھ تعامل کرنے کا کبھی سوچا تک نہیں۔

میں نے یہ کہانی اپنے کتنے ہی جاننے والوں کو سنائی ہے۔ اپنے بچوں سے یہ تک کہا کہ خدانخواستہ اگر کوئی مجبوری بن جائے تمھیں پیسوں کی شدید ضرورت پڑ جائے تو اپنے باپ کے دوستوں کے پاس چلے جانا۔ رشتہ داروں، عزیزوں اور اقارب سے مدد مانگ لینا، مگر کبھی بینک کے بارے میں نہیں سوچنا۔ اس اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھے اور ''دارالسلام'' کو سود کی لعنت سے محفوظ رکھا۔ میرے نزدیک بینک سے قرضہ لینے کے بجائے آپ اپنے احباب کو شریک کریں۔ خدانخواستہ اگر آپ کی سیل بروقت نہیں ہو سکی تو اس وقت یہ دوست آپ کو معاف کر دیں گے، درگزر کر لیں گے، اگر آپ سچے ہیں تو اللہ آپ کی مدد کرے گا، یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ دیکھیے! تجارت کے اندر برکت ہے بشرطیکہ انسان سچا ہو۔ انسان کی فطرت ہے کہ عموماً اس میں قناعت کی کمی ہے۔ جتنا بھی اسے رزق مل جائے وہ اس سے زیادہ کے چکر میں ہوتا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ اس کی مدد بینک ہی کرتے ہیں۔ ان کے اعلانات انسان کو مغالطے میں ڈالتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو تاجر ایک مرتبہ سود میں پھنس جائے وہ کم ہی اس شیطانی چکر سے نکل پاتا ہے۔ اللہ کی ناراضی الگ ہوتی ہے۔ ایک اور واقعہ قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرتبہ بھی مجھے سودی چکر سے یا اس سے قریب تر کام سے بچا لیا۔

میں اپنے قارئین سے زندگی کے یہ واقعات نہایت سچائی کے ساتھ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ انسان بعض اوقات کسی مجبوری یا ضرورت کے تحت دھوکے میں آ جاتا ہے۔

2001ء سے میں نے چین جانا شروع کیا۔ وہاں ہم نے ''بابا سلام'' نامی کمپیوٹر کھلونے بنانے شروع کیے۔ ایک وقت تھا کہ سعودی عرب کی مارکیٹ میں ان کی بہت زیادہ مانگ تھی۔ قرآن کریم سکھانے والے یہ کھلونے بہت مقبول ہوئے۔ ہمارے پاس کوئی زیادہ سرمایہ نہ تھا، جبکہ اس کے لیے کوئی دس سے پندرہ ملین ریال کیش کی ضرورت تھی۔ خیر ہم نے دوستوں سے انویسٹمنٹ لی، مگر ابھی ہمیں مزید رقم کی ضرورت تھی۔ میں ہانگ کانگ سے ہوکر چین جایا کرتا تھا۔ وہاں ''کولون'' کی مسجد کے امام اور خطیب ہمارے دوست مفتی ارشد صاحب ہیں۔ بڑے ہی پیارے ساتھی ہیں۔ بڑے مخلص ایمان دار اور دعوت کا کام کرنے والے۔ میں نے ایک مدت تک ہانگ کانگ میں Peace Tech کے نام سے دفتر بھی کھولا تھا۔ یہ لمبی سٹوری ہے۔ چین میں جن کمپنیوں کے ساتھ میں نے کام کیا ان میں ایک کمپنی کا مالک گورڈن بھی تھا۔ گورڈن کے ساتھ میرا بابا سلام کا کاروبار تھا جو آج بھی چل رہا ہے، مگر پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ گورڈن غیر مسلم ہونے کے باوجود بڑا امانت دار اور مخلص شخص ہے۔ ہم ہر چیز ایک دوسرے کو ضرور بتاتے اور باہمی مشورہ کرتے تھے۔ گورڈن کو بزنس میں وسیع تجربہ حاصل تھا۔ میں ہر دو ماہ کے بعد چین گیا ہوتا۔ اس دوران ہم خاصا وقت اکٹھے گزارتے۔ شنجن میں اس کی فیکٹری تھی، وہاں بابا سلام بنتا تھا۔

ایک معاہدہ لکھ کر لے آؤ، سولہ لاکھ ریال ہم تمھیں دے دیتے ہیں، بینک کو بھول جاؤ۔

مفتی ارشد صاحب نے ہانگ کانگ میں مجھے اپنے کچھ بڑے تاجر دوستوں سے ملایا۔ ان میں بڑے بڑے بزنس مین بھی تھے۔ ان سے میرے بھی تعلقات قائم ہو گئے۔

انھوں نے مجھے ایک آفر دی کہ چین سے آپ کو مال کی جتنی بھی ضرورت ہو آپ ہمیں بتائیں ہم آپ کے لیے اپنے سرمائے سے خریدیں گے۔ پھر اسے لاکر ہانگ کانگ میں اپنے سٹورز میں رکھ دیں گے، پھر آپ کو وہی چیز سعودی عرب میں کوئی 7 سے 8% منافع لگا کر بھجوا دیا کریں گے۔ آپ ہمیں کوئی پانچ یا چھ ماہ کے بعد پیسے دے دیا کریں۔ اس زمانے میں بعض اشیاء پر 100% تک منافع ملتا تھا۔ (اب نہیں ملتا) بظاہر دیکھا جائے تو آفر بہت عمدہ تھی۔ شرعی لحاظ سے بھی اس میں سود کی کوئی شکل نہیں بنتی، یہ کاروبار تھا۔ میں نے ان سے سوچ بچار کے لیے وقت لے لیا۔ میں نے ان سے صرف ایک سوال کیا جس کا انھوں نے جواب نہ دیا، سوال یہ تھا: اگر میں آپ کو مقررہ مدت میں رقم ادا نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟ ادائیگی میں چھ ماہ کے بجائے آٹھ ماہ یا سال بھر لگ جائے یا فرض کریں کہ میرا مال نہیں بکتا اور میرے پاس پیسے نہیں آتے تو کیا آپ اس منافع کی شرح 8، 9 یا 10% کر دیں گے؟

دیکھیے! اگر وہ اس مدت کے بدلے میں اپنے منافع کی نسبت بڑھا دیتے ہیں، یعنی جو طے شدہ منافع تھا آٹھ فیصد، اب اس کو انھوں نے نو یا دس فیصد کر دیا تو یہاں سے سود شروع ہو جاتا ہے۔ عام آدمی اسے سمجھ نہیں پاتا اور وہ سود کی ایسی دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں بنتی۔

مجھے ان کے جواب کا انتظار تھا وہ بھی میرے جواب کا انتظار کر رہے تھے کہ میں ان کی آفر قبول کرتا ہوں یا نہیں۔ میں نے گورڈن کو ریاض سے فون کیا، اسے ساری صورتحال بتائی۔ اب آپ اس کا جواب سنیں۔ ہر چند کہ وہ غیر مسلم ہے مگر اس نے مجھے کہا: مسٹر مجاہد! میں اور تم گزشتہ پانچ چھ سالوں سے اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے خوب

واقف ہو گئے ہیں۔ میرا تمھیں مشورہ ہے کہ ایسا کام کبھی نہ کرنا، اگر ایک مرتبہ تم نے ان لوگوں کے ساتھ کاروبار شروع کر لیا تو کبھی بھی ان کے چنگل سے نہیں نکل سکو گے۔ اس وقت تم میرے ساتھ کاروبار کر رہے ہو۔ میں تم سے پہلے ایڈوانس مبلغ لیا کرتا تھا، اب یہ شرط واپس لیتا ہوں۔ ہم دونوں آپس میں بزنس پارٹنر ہیں۔ اگر آپ کو نقصان یا منافع ہے تو یہ میرا نفع ونقصان ہے۔ میں آپ کو اب چار پانچ ماہ کی مہلت دے دیا کروں گا، مگر خدارا! ان سے معاملہ نہ کرنا۔ اب قارئین مجھے بتائیں، کیا میں گورڈن کا شکریہ ادا نہ کروں جس نے مجھے ایک مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ میں اس کو بے شمار مرتبہ اسلام لانے کی دعوت دے چکا ہوں۔ وہ وعدہ بھی کرتا ہے، مگر پھر پھسل جاتا ہے۔ میرے ساتھ آپ بھی اللہ سے دعا کریں کہ وہ مسلمان ہو جائے۔

بعض اوقات ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ دیکھیے! فلاں کمپنی نے کتنی ترقی کی ہے۔ ان کا Set-up کتنا بڑا ہے۔ یہ لوگ تو لاکھوں کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ آپ کا اندازہ درست ہو۔ میں نے بیروت کے ان گنت سفر کیے ہیں۔ وہاں پر ہم جس سے جلد بندی کرواتے ہیں وہ بلاشبہ تجلید کا بادشاہ ہے۔ اس کا مالک میرا دوست ہے۔ اس کا کوئی خاص دین ومذہب نہیں، اس لیے اس کے ساتھ تعامل کرنے میں کوئی مشکل نہیں۔ وہ سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں شخصیات کی سیرت پر لکھی گئی کتب کی تجلید کرتا ہے۔ اس کو اپنے کاروبار اور پیسے سے غرض ہے۔ میری اور اس کی مالی ہسٹری ایک جیسی ہے، میں بھی ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے بلکہ ایک غریب باپ کا بیٹا ہوں اور وہ بھی ایک غریب باپ کا بیٹا ہے۔ وہ مجھے بتایا کرتا تھا: آج سے چالیس سال پہلے میری والدہ اور ہمشیرگان راتوں کو کتابوں کی سلائی کیا کرتی

تھیں۔ میں غیر مجلد کتابوں کو اپنے سر پر رکھ کر مجلدین اور پرنٹنگ پریس والوں کے پاس چھوڑتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا، اس نے خوب محنت کی، کوالٹی کا کام دیا، مارکیٹ میں اس کا نام بنا۔ میں نے اس کا پرانا کارخانہ بھی دیکھا ہے۔ پھر اس نے تجلید کی جدید ترین مشین لگائی۔ بیس ملین یورو سے اس نے تجلید کا بہت بڑا کارخانہ قائم کیا۔ جو بلاشبہ مڈل ایسٹ کا سب سے بڑا جلد سازی کا کارخانہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق وہ روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ کتابوں کی تجلید کرسکتا ہے۔ میں جب بھی بیروت جاتا ایک وقت کا کھانا لازماً اس کے ہاں ہوتا۔ وہ بیروت کے سب سے مہنگے ریسٹورنٹ میں میری دعوت کرتا۔ جس کا اندازاً فی کس خرچ دوسو سے ڈھائی سو ڈالرز ہوتا۔ بلاشبہ یہ بڑا خوبصورت ریسٹورنٹ ہے، ساحل سمندر پر واقع ہے۔ آپ کی کرسی اور پانی کے درمیان موٹے شیشے کی دیوار ہے۔ وہ میری بیحد تکریم کرتا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ الحمدللہ ''دارالسلام'' اس کے پانچ ٹاپ کے گاہکوں میں سے ایک ہے۔ میں نے اس سے کتنی بار کہا ہے: بتاؤ تو سہی، کون سا مکتبہ کام کے لحاظ سے سب سے اوپر ہے؟ مگر اس کا کہنا ہے: یہ بزنس سیکرٹ ہے، یہ لمبی باتیں ہیں۔ فروری 2014ء میں ریاض میں کتابوں کی سالانہ عالمی نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ ''دارالسلام'' نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ ہماری اس میں زیادہ سیل تو نہیں ہوئی، کیونکہ دارالسلام کی اکثر کتب عربی زبان کے علاوہ دوسری لغات میں ہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ ایسے مواقع پر مختلف اداروں کے سربراہان سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ اس عالمی شہرت یافتہ مجلد کا بیٹا بھی ریاض آیا۔ اس نے آنے سے پہلے ہمیں ای میل بھجوایا تھا کہ وہ ریاض آرہا ہے اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ ایک دن وہ فون کرکے آگیا۔ میں نے اسے کہا: میں تمھیں کھانے کے لیے کسی بھی بڑے سے بڑے ریسٹورنٹ میں لے جاسکتا

ہوں، مگر ریاض کی سڑکوں پر بے پناہ رش ہوتا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو میرا ڈرائیور یہیں کھانا لے آئے گا۔ کہنے لگا: میں آپ سے باتیں کرنے آیا ہوں۔ آپ کھانا باہر سے منگوالیں، اس طرح ہمیں چار گھنٹے اکٹھے رہنے اور باہمی دل چسپی کے امور پر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ اس قسم کی میٹنگ میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے پاس بے شمار پیسہ بینک میں ہوگا۔ یہ لوگ سٹاک ایکسچینج کو ہلانے والے ہیں، مگر مجھے تعجب ہوا جب اس نے مجھے بتایا کہ مجھے والد کی سیاست کی سمجھ نہیں آتی، اسے شوق ہے کہ ہمارے پاس دنیا کی جدید ترین مشینیں ہوں۔ ہم نے اب اپنے ادارے کی پروڈکشن میں اضافہ کرلیا ہے، ایک اور نئی مشین خریدی ہے۔ اب ہم پہلے سے کہیں زیادہ کتب تجلید کر سکتے ہیں۔ پھر اس نے ایک آہ بھری! کہنے لگا: آپ والد صاحب کو سمجھائیں وہ آپ کے دوست ہیں۔ اس وقت ہم لوگ کئی ملین یورو کے مقروض ہیں۔ یہ ساری رقم ہم نے بینک سے لی ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی معمولی سی گڑبڑ بھی ہوجائے تو بینک ہمارے کارخانے پر قبضہ کرسکتا ہے، کیونکہ جائیداد کے کاغذات اس کے پاس ہیں۔

قارئین کرام! میں نے بے اختیار نعرہ مارا، اللہ اکبر!

«يَا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيمِ سُلْطَانِكَ»

میں نے اسے جب بتایا کہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ہمارے اوپر بینک کا ایک ریال بھی قرض نہیں۔ ہم نے آج تک نہ تو بینک سے قرض لیا ہے نہ بینک میں کسی لمبی مدت کے لیے کوئی کیش ہی رکھوایا ہے۔ ہمارے ہاں صرف کرنٹ اکاؤنٹ ہے۔ میں دنیا کا خوش قسمت انسان ہوں کہ ہمارے ذمے بیروت کے چند اداروں کی رقوم کے علاوہ محض

روٹین کے قرضے ہیں۔ الحمد للہ! ہم نے جتنا لوگوں کا دینا ہے، اس سے کہیں زیادہ لوگوں سے لینا ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سلف صالحین میں سے ایک بزرگ کا قول اسے سنایا:

«لَوْ يَعْلَمُ الْمُلُوكُ وَأَبْنَاءُ الْمُلُوكِ مَا نَحْنُ فِيهِ مِنَ السَّعَادَةِ لَجَالَدُونَا عَلَيْهَا بِالسُّيُوفِ»

''اللہ کی قسم! ہم جس مزے اور عیش میں ہیں اگر حکمرانوں کو اور ان کی اولادوں کو معلوم ہو جائے تو وہ تلواریں لے کر آئیں اور یہ خوشیاں چھیننے کے لیے ہم پر پل پڑیں۔''

یہ شخص متعدد بار اٹلی بھی گیا ہے۔ لیگو پرنٹ سے وہ بھی کام کرواتا ہے۔ میں تو کوئی اٹھارہ سالوں سے اس کمپنی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ یہ پریس باریک کاغذ پر پرنٹنگ کے لیے معروف ہے۔ میں نے اس پریس سے 28 گرام سے لے کر 40 گرام تک کا کام کروایا ہے۔ یہ پریس بلاشبہ یورپ کا سب سے بڑا پریس ہے۔ اس کے مالک کے پاس اپنا ہوائی جہاز تھا۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ اس کے پریس کے ذمہ مختلف پرنٹنگ مشین بنانے والی کمپنیوں کا کتنے ہی ملین یورو کا قرض ہے۔ میں نے پھر اللہ اکبر! کا نعرہ بلند کیا اور کہا: اللہ! تیرا شکر ہے۔

میں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ دور سے ہمیں نظر آتا ہے کہ ان کمپنیوں کے پاس یا ان معروف لوگوں کے پاس بڑے پیسے ہیں، مگر جب قریب جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہیں اور بینکوں کے قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے پاس اچھی کاریں ہیں، اچھی رہائش ہے، مگر یہ کوئی مالداری یا سعادت کا معیار نہیں ہے۔

شیخ محمد بن عبداللہ المعتاز

میں نے ایک مرتبہ شیخ عبداللہ المعتاز سے عرض کی: شیخ! مجھے اپنی اولاد میں سے کوئی ایک بیٹا دے دیں جو دارالسلام کے امور میں میرے ساتھ ہاتھ بٹائے اور دارالسلام کی نگرانی اور اس کی سرپرستی کرے۔ وہ آپ کا نمائندہ ہوگا، اسے مناسب تنخواہ دی جائے گی، چنانچہ انھوں نے کچھ سوچ بچار کے بعد اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد المعتاز کو دارالسلام کے اشراف کے لیے مقرر کردیا۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے 2014ء تک کوئی اٹھارہ بیس سال گزر چکے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آپس میں مثالی پارٹنرشپ ہے۔ اصولی بات ہے کہ یہ لوگ سعودی ہیں، سرمایہ انھوں نے لگایا ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا: دیکھیے! ہمیں مل کر کام کرنا ہے۔ ایک بات میں آپ سے شیئر کرنا چاہوں گا جس پر آج بھی قائم ہوں۔ وہ یہ کہ کام غلط ہو یا صحیح، میں درست فیصلہ کروں یا اس میں میری غلطی ہو، ہر چیز ان کو بتادیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ شروع دن سے ہمارا کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ سارے کام مشورے سے ہوتے ہیں۔ کچھ حدود اور قیود میں نے متعین کر رکھی ہیں جنھیں میں کبھی پار نہیں کرتا۔ شیخ محمد نہایت زیرک اور سمجھ دار انسان ہیں۔ میرے ساتھ مثالی تعلقات ہیں۔ ہم ہر بات ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک دوسرے پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ حکومتی کاموں اور ملکی قوانین سے خوب واقف ہے۔ یہ شخص اتنا سمجھ دار ہے کہ ان کے لیے محض اشارہ کافی ہوتا ہے، باقی معاملہ وہ خود سمجھ جاتے ہیں۔ میری ذمہ داری ادارے کے امور کو دیکھنا اور چلانا ہے۔

برادرِ عزیز محمد عارف بھٹی صاحب

میں اور عارف صاحب 1976ء سے ایک دوسرے کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ ہم پاکستان میں بھی اکٹھے کام کرتے تھے۔ آپس میں اعتماد شروع دن سے چلا آرہا ہے۔ انھوں نے ادارے کے انتظامی معاملات کو سنبھالا ہوا ہے۔ ان کے پاس برسوں کا تجربہ ہے۔ ملازمین کے پرسنل معاملات کو ڈیل کرتے ہیں۔ کتابیں ختم ہو جائیں یا کتابیں بیرون ملک بھجوانے کا مسئلہ ہو عارف صاحب ان مسائل کو بڑے عمدہ طریقے سے حل کرتے ہیں۔ الحمد للہ! ایمان دار ہیں، خوش اخلاق ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ مسئلہ حل نہ ہوتا ہو تو میرے پاس آتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ دارالسلام میں ایسا مضبوط سسٹم بن چکا ہے کہ ہر مؤظف اپنی جگہ کام کرتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔

ہم نے اس وقت سعودی عرب میں کوئی گیارہ، بارہ برانچیں قائم کی ہوئی ہیں۔ ان پر جو مدیر ہیں ان کو مکمل اختیارات دیے گئے ہیں۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق کام اور محنت کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوراً ہیڈ آفس سے رجوع کرتے ہیں۔ میرے لیے اعزاز ہے کہ تادمِ تحریر ہم نے کوئی 1400 کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر کتب کا انتخاب میرا اپنا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں شائع کی جانے والی کتب کے انتخاب میں اللہ تعالی نے مجھے خاصی بصیرت عطا کر رکھی ہے۔ میں کتاب کی تھوڑی سی ورق گردانی کے بعد ہی

اندازہ کر لیتا ہوں کہ یہ کتاب مارکیٹ میں چلے گی یا نہیں۔ سال ہا سال کے تجربات نے دارالسلام کے کام اور شہرت کو خاصا بڑھا دیا ہے۔

میں مشورہ لینے کا قائل ہوں۔ ہر ایک سے مشورہ کرتا ہوں، عام کارکن سے بھی حتی کہ شمس العالم، جو ہمارے لیے چائے بناتا ہے، سے بھی مشورہ کرنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ میرا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات کوئی عام ورکر بھی آپ کو بہت اچھا مشورہ دے دیتا ہے۔ شمس کو میرے پاس بیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ بنگلہ دیش سے تعلق رکھتا ہے، نہایت ذہین اور محنتی ہے۔

ہمارا اکاؤنٹس کا شعبہ جو سب سے اہم شعبہ ہے وہ محمد ظفر بھٹی نے سنبھالا ہوا ہے۔ وہ اکیلے ہی اس سلسلے کو چلا رہے ہیں۔ خاصے محنتی اور ایمان دار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خوبی بھی ان میں پائی جاتی ہے کہ تازہ ترین معلومات ہر وقت آپ کو مہیا کر دیں گے۔ ان کی مدد عارف صاحب بھی کرتے ہیں۔ کمپیوٹر کی مدد سے اب کاموں کو سنبھالنا خاصا آسان ہو گیا ہے۔ سال ہا سال کا تجربہ بھی اس سسٹم کو آگے بڑھانے میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری تنخواہیں عام کمپنیوں کے مقابلہ میں الحمدللہ بہتر ہیں۔

دارالسلام کے مخلص ساتھی

مختلف اداروں سے رابطے کے لیے استاذ شاکر قاضی کا بھی بڑا روشن کردار ہے۔ مصر سے تعلق رکھنے والے شاکر بڑے ہر دل عزیز، محنتی، وفادار ہیں اور ادارے کے خیر خواہ ہیں۔ ان کو بھی ادارے میں آئے ہوئے عرصہ گزر چکا ہے، انھیں عربی میں لیٹر لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ ایڈمن کے بہت سارے معاملات بھی انھوں نے سنبھال رکھے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے عبدالغفار کو ریاض میں خاصے اختیارات دے دیے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ بھی خوب محنت کرتا ہے، سیکھتا ہے، مشورہ کرتا ہے، سوال کرتا ہے، اس لیے مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ میرے ذاتی معاملات کو بھی بڑی حد تک سنبھالتا ہے۔ میرا ذاتی اکاؤنٹ، جو عموماً خالی رہتا ہے، وہی چلاتا ہے۔ اسے میرے پن کوڈ کا بھی علم ہے۔

ریاض میں ہمارے ریسرچ سیکشن کے سربراہ کبھی مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری ہوتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری برادر عزیز قاری محمد اقبال صاحب کے حصے میں آئی۔ قاری صاحب ہمارے سینیئر ساتھیوں میں سے ہیں۔ انھیں اب دارالسلام میں کام کرتے ہوئے بیس برس کے قریب عرصہ گزر چکا ہے۔ دارالسلام کی علمی کمیٹی کے اہم رکن کی حیثیت سے انھوں نے صحیح بخاری، صحیح مسلم، کتب ستہ، المصباح المنیر اور تفسیر السعدی

جیسی کتب کی تصحیح وترتیب کے کام میں حصہ لیا۔ وہ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کے ساتھ قریباً آٹھ برس تک ان کے شاگرد اور معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں، اس دوران انھیں مولانا سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ یہ عالم دین ہیں، قاری قرآن ہیں اور زبردست خطیب ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ترجمہ کرنے کی صلاحیت میں خاصا اضافہ ہو چکا ہے۔ اب وہ بہترین مترجم بھی ہیں۔ میری کتابوں کی فائنل ایڈیٹنگ وہی کرتے ہیں۔ انھیں اردو اور عربی زبانوں میں بھی خاصی مہارت حاصل ہے، فارسی سے بھی شغف ہے، شعروشاعری کا بھی اعلیٰ ذوق ہے۔ دراصل سال ہا سال کے تجربے نے ان ساتھیوں کو کندن بنا دیا ہے۔ ایک زمانے میں قاری صاحب میری تقاریر بھی لکھا کرتے تھے۔ میں اگرچہ سٹیج پر جا کر تقریر اپنی مرضی ہی سے کرتا ہوں، مگر پھر بھی ان کی مشاورت شامل ہو جاتی تھی۔

پروفیسر ذوالفقار صاحب کو ہر چند کہ ادارے میں آئے ہوئے پانچ چھ سال کا عرصہ گزرا ہے، مگر ان کا دارالسلام میں خاصا اہم کردار ہے۔ انھیں عربی، اردو، انگلش تینوں زبانوں پر عبور ہے۔ انھیں مطالعے کا بہت شوق ہے، یہ بے حد پڑھتے ہیں، اس طرح ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ میں نے جس کتاب کا انتخاب کرنا ہوتا ہے ان کے پاس بھجوا دیتا ہوں۔ وہ اس کتاب کو گھنٹے آدھ گھنٹے میں ہی کھنگال لیتے ہیں۔ فوراً نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ کتاب قابل نشر ہے یا نہیں۔ اچھے مقرر اور خطیب ہیں۔ دراصل آپ اچھی ٹیم کے بغیر بے کار ہیں۔ اگر آپ کے پاس تجربہ کار، مخلص لوگ نہیں تو پھر آپ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میں اکثر اوقات اپنے رب سے دعا کرتا ہوں، میرے رب! مجھے اچھی ٹیم اور مخلص ساتھی عطا فرما۔ بیت اللہ شریف جاؤں تو پھر کوشش ہوتی ہے کہ بیت اللہ کے دروازے کو

پکڑ کر اپنے رب سے اچھے افراد کے لیے دعا مانگوں۔

میں نے دارالسلام کے آغاز ہی میں بیت اللہ شریف کے دروازے کو پکڑ کر کچھ دعائیں مانگی تھیں کہ میرے اللہ! میں تیرا کمزور ترین بندہ ہوں، تیرے فضل و کرم سے اس کام کا آغاز کر رہا ہوں۔ مجھے صرف وہی کتاب شائع کرنے کی توفیق عطا فرمانا جس کی اشاعت میں تو راضی ہو، جو کتاب تجھے پسند نہیں اسے شائع کرنے کی توفیق ہی نہ دینا۔ مجھے اچھے ساتھی اور عمدہ ٹیم عطا فرما۔ ہمارے آرٹ سیکشن کے ذمہ دار شہزاد احمد ہیں۔ کسی زمانے میں یہ اردو میگزین جدہ میں تھے۔ وہ بند ہوا تو برادرم رؤف طاہر کی وساطت اور سفارش سے دارالسلام میں آ گئے۔ ان کا لے آؤٹ بنانے کا وسیع تجربہ ہے۔ پاکستان میں نوائے وقت میں بھی رہے۔ اچھے با ذوق انسان ہیں۔ ہماری کتابوں کے ٹائٹل یہی بناتے ہیں۔ ہر چند کہ میں بھی ان کی رہنمائی کرتا ہوں، مگر اصل کام انھی کا ہے۔ کام خاصا تیز کرتے ہیں۔ ان کے آنے سے دارالسلام میں رنگین کتب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا جو نہایت مفید طریقے سے چل رہا ہے۔

نجم المجید صاحب ہمارے بھانجے ہیں۔ میرے داماد عزیزی فیصل کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کا تعلق بڑے خاندان سے ہے۔ ان کے دادا، پردادا بلکہ والد بھی بڑے عالم دین تھے۔ نجم المجید کو بھی دارالسلام ریاض میں کام کرتے بڑی مدت گزر چکی ہے۔ کمپوزنگ سے لے کر کتب کی ڈیزائننگ تک کر لیتے ہیں۔ ہمارے ادارے کے پرانے ساتھی امین ارمان صاحب بھی ہیں۔ یہ کسی زمانے میں اچھے خوش نویس تھے۔ اب تو کتابت کا کام تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ بہر حال ہماری پبلسٹی جیسی بھی ہے ان کی مرہون منت ہے، یہ کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتے ہیں۔ نئی کتاب آئے تو اس کے پوسٹر بنا کر برانچوں کو بھجواتے

رہتے ہیں۔کمپیوٹر سے بھی خطاطی کر لیتے ہیں۔

دارالسلام نے قرآن کریم پر سب سے زیادہ کام کیا ہے۔28 زبانوں میں تراجم کوئی آسان کام نہیں تھا۔تراجم کے بعد ان کے لے آوٹ تیار کرنا اور ترجمے کے سامنے قرآن کریم کی آیات لگانا خاصا دقت طلب کام ہے، یہ کام تجربہ مانگتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ ہم قینچی سے کاٹ کاٹ کر آیات ترجمے کے سامنے لگاتے تھے۔مجھے یہ کام بڑا اچھا آتا ہے۔ برکت کے لیے میں بھی ماضی میں یہ کام کرتا رہا۔مگر اب یہ سارا کام کمپیوٹر کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس کام کو ہمارے ادارے کے ایک سینئر ساتھی اسد اللہ صاحب کرتے ہیں۔ ڈھاکہ سے تعلق رکھنے والے اسد اللہ خاصے مذہبی اور پر جوش ساتھی ہیں۔ یہ ان محدود لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے شوگر جیسی بیماری کو اپنے عزم مصمم سے شکست دی۔میری بنگالی میں کتابوں کی ڈیزائننگ، صحیح بخاری کا بنگالی زبان میں ترجمہ اور دیگر لاتعداد کام ان کے ہاتھوں سے گزرے ہیں۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ یہ بھی اور دیگر تمام ساتھی جن میں عبدالصمد، حیدر علی اور عمران اشرف، جیسے مخلص کارکن شامل ہیں۔ساتھیوں پر مشتمل یہ سارا عملہ دارالسلام کا وفادار ہے۔عبدالصمد کا تعلق ہندوستان سے ہے اور یہ دینی مدرسے سے فارغ التحصیل ہیں اس لیے ان کی عربی زبان بہت اچھی ہے۔ایک مدت تک الجزیرہ میں کام کرتے رہے۔ دارالسلام میں کام کرتے ہوئے انھیں دس برس سے اوپر ہو چکے ہیں۔کمپیوٹر کی پروگرامنگ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں الحمدللہ! ہر ساتھی کے لیے مخلص ہوں۔ ہر ایک کی بھلائی سوچتا ہوں۔اس کے جواب میں دارالسلام کے ساتھی بھی میرا اور دارالسلام کا بھلا ہی سوچتے ہیں۔ دارالسلام کی نمایاں خوبیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ عملے کو تنخواہ بروقت ملتی ہے اور ہماری تنخواہ آج تک الحمدللہ! کبھی لیٹ نہیں ہوئی۔

دارالسلام کا قیام

وزارت الدفاع والطیران کی ملازمت الحمدللہ! اچھی چل رہی تھی، ادارے میں اچھی عزت تھی، آمدنی بھی خاصی معقول تھی۔ پچھلی سطور میں ذکر ہو چکا ہے کہ میں دن رات محنت کر کے کم وبیش 10 ہزار ریال ماہوار کما لیتا تھا۔ اس دوران ہمارے زیر غور منصوبہ یہ تھا کہ ہم حدیث رسول ﷺ کی خدمت کیسے اور کیونکر کریں۔ محترم اقبال کیلانی کے گھر کا دروازہ میرے گھر کے ساتھ ملا ہوا تھا، اکثر نماز میں یا صبح وشام ملاقات ہوتی اور مشورے ہوتے۔ حافظ یوسف سدیدی جو پاکستان کے مایہ ناز خطاط تھے، ان سے میں خطاطی کی مشق لیتا تھا۔ وزارت دفاع میں کبھی تو کام بہت زیادہ ہوتا کبھی کم ہوتا۔ ہم سارا دن بیٹھے رہتے، میرا ذہن ان دنوں منصوبے بناتا رہتا، ہمارے دفتر میں ایک سوڈانی مترجم موسیو ابراہیم تھا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، میں اس سے اکثر اوقات مشورے کرتا رہتا، جن میں ایک بڑے اشاعتی ادارے یا پرنٹنگ پریس کے قیام کی بات ہوتی۔ وزارت دفاع کے پرنٹنگ پریس میں جاتا تو احباب ہاتھوں ہاتھ لیتے، وہاں زیادہ تر ڈیزائنر بھارتی تھے، ان سے گپ شپ لگتی اور میں معلومات جمع کرتا رہتا۔

آخر کار ایک دن ہم نے منصوبہ مکمل کر لیا کہ فی الحال ایک کمپیوٹر خریدا جائے۔ ان

دنوں مارکیٹ میں دو قسم کے کمپیوٹر میسر تھے، ایک شرکہ جفالی کے پاس ''سی آر ٹرونک'' تھا جس کی قیمت کم وبیش ایک لاکھ بیس ہزار ریال تھی۔ ہم نے ایک کمپنی بنائی جس میں ہم چار یا پانچ حصہ دار تھے، میرا حصہ سب سے زیادہ تھا، باقی ارکان میں سے ہر ایک نے دس دس ہزار ریال دیے، ان حصہ داران میں محترم اقبال کیلانی صاحب، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی صاحب اور دو تین میرے ہمسائے تھے۔ ان سب کے ساتھ مل کر میں نے ایک ڈرافٹ تیار کیا، نفع اور نقصان کی بنیاد پر کام ہوگا اور اگر کوئی صاحب اپنی رقم واپس لینا چاہیں گے تو انھیں تین ماہ کے اندر رقم واپس کر دی جائے گی۔

میں نے جفالی کمپنی کے کئی چکر لگائے، وہاں کے مصری نژاد منیجر یونس الشائع نے خوب تعاون کیا اور بتایا: تمھیں ہفتے تک ایک کمپیوٹر پر ٹریننگ لینا ہوگی، چنانچہ میں نے روزانہ 2 سے 3 گھنٹے تک ٹریننگ لینا شروع کر دی۔ ہمارے ٹیچر کا نام فوزی الساعی تھا، ٹریننگ چند روز تک جاری رہی اور میں نے کی بورڈ پر انگلیاں مارنا سیکھ لیں، اس نے کمپیوٹر کے استعمال کی ضروری ٹریننگ دے دی اور میں پوری کامیابی سے کمپیوٹر چلانے لگا، لیجیے جناب! ٹریننگ مکمل ہوگئی، میں نے ایک لاکھ بیس ہزار ریال ان کے حوالے کر دیے، اب اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ کمپیوٹر کس جگہ رکھا جائے اور کہاں سے کام کا آغاز کیا جائے، کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ فی الحال ہم کرائے کے چکر سے بچیں، میرے گھر کا کچن خالی کر کے اسے وہیں رکھ لیا جائے، میں گراؤنڈ فلور پر ایک مکان میں رہتا تھا، اس کے اوپر کئی منزلہ عمارت تھی، تین کمروں پر مشتمل یہ مکان خاصا کھلا تھا، اس کے کچن کا دروازہ باہر صحن میں کھلتا تھا جس کا ایک راستہ باہر کی طرف تھا، یعنی اگر اندر کے دروازے کو بند کر دیا جاتا تو یہ کچن بالکل علیحدہ کمرہ بن جاتا تھا، اہلیہ نے خاصا تعاون کیا اور اپنا کچن

مکان کے اندر ایک ''صالہ'' میں منتقل کر کے وہاں پانی کا بندوبست کیا اور وہیں کھانا پکانا شروع کر دیا۔ ہمارے نئے ادارے کا کمرہ کچھ اس طرح تیار ہوا کہ کچن کی دیواروں کو بڑی بڑی پلائیوں سے ڈھانپ دیا گیا، چھت پر بھی لکڑی کی شیٹیں لگا کر اسے محفوظ اور خوبصورت بنایا گیا۔ بعض دوستوں نے مدد کی اور بڑی سی میز بنائی گئی جس کے اطراف میں تین چار کرسیاں آرام سے رکھی جا سکتی تھیں۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ایک کچن سے شروع ہونے والا یہ ادارہ کبھی اتنی ترقی کر جائے گا۔

کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ ایک کچن سے شروع ہونے والا یہ ادارہ کبھی اتنی ترقی کر جائے گا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس کمپیوٹر کو چلائے گا کون؟ جامعۃ الملک سعود میں ایک بہت بڑا پرنٹنگ پریس تھا جس میں کمپوزنگ سیکشن میں کم وبیش پچاس کے قریب کمپوزر کام کرتے تھے، ان کا سربراہ ایک فلسطینی محمد عوض جربوع تھا، کسی واسطے سے میرا اس کے ساتھ رابطہ ہو گیا، اس سے معاملہ طے ہو گیا کہ وہ شام کے وقت تین سے چار گھنٹے ہمارے پاس کام کیا کرے گا۔ ہمارے پاس کوئی خاص کام نہ تھا، البتہ انھی دنوں جناب عطاء اللہ ثاقب (مرحوم) آ گئے۔ انھوں نے ایک بڑی کتاب کمپوزنگ کے لیے دے دی۔ کچھ اور بھی متفرق کام تھے، اس طرح الحمد للہ! کام شروع ہو گیا۔ میں نے دوسرے سب کام چھوڑ دیے اور اسی پر توجہ دینے لگا، چند ہفتے گزرے ہوں گے ہمیں اس کمپیوٹر کا پروسیسر درکار تھا جس کی قیمت اس دور میں غالباً سولہ ہزار ریال تھی، اس میں برومائیڈ استعمال ہوتا تھا، جس کے لیے خاصی مہنگی ریل آتی تھی۔ اندازاً ایک صفحے کا خرچ

ایک ریال تھا، ہم نے یہ پروسیسر الجزیرہ اخبار میں کام کرنے والے ایک شامی احمد مغربی سے خرید لیا، اس نے بھی آ کر ہمیں ضروری ٹریننگ دی۔ اس کی ریل پہلے ایک مخصوص کیمیکل سے گزرتی پھر فلکسر سے گزرتی اور پھر پانی سے صاف ہو کر آگے ہیٹر سے گزرتی، برومائیڈ یعنی موٹے گلیز کاغذ کی ریل نکل آتی، کوئی پانچ منٹ کے اندر پرنٹنگ شروع ہو جاتی اور آہستہ آہستہ رول باہر آتا جاتا۔ ہم اس کے سامنے کھڑے ہوتے اور اسے لپیٹتے جاتے، اس طرح یہ کئی میٹر لمبا رول ہوتا، جس کو کاٹ کاٹ کر صفحات بناتے اور پھر اسے بڑے کاغذ پر پیسٹ کر دیتے، یہ ٹیکنالوجی نہایت خوبصورت اور پرنٹنگ میں سب سے مہنگی مگر بڑی عمدہ تھی۔ ہم کسی بھی لفظ کا پوائنٹ سائز دے کر اسے نہایت باریک یا نہایت موٹا لکھ سکتے تھے، میں خود بھی کسی حد تک اس کام میں طاق ہو گیا تھا، بلکہ نماز فجر کے بعد اکثر بیٹھ جاتا اور خود بھی کام کرنے کی کوشش کرتا، یہ الگ بات ہے کہ میں کبھی تیز کمپوزر نہ بن سکا، تاہم اس کے پروگرام کو خوب سمجھنے لگا تھا، اس سلسلہ میں محمد عوض جربوع بھی میری ہمت بڑھاتا۔

تھوڑا سا وقت گزرنے کے بعد مجھے سمجھ آ گئی کہ یہ کام نہایت صبر آزما اور محنت طلب ہے، ہمیں عموماً ایک صفحے کا دس ریال معاوضہ ملتا تھا، بعض کم بھی بتاتے، میں مارکیٹ سے کام لاتا، اسے تیار کروانے کے بعد گاہک کو واپس کرتا، بعض پرنٹنگ پریس والوں سے رابطہ ہوا۔ کسی نے ہمیں خوش آمدید کہا، کسی نے انکار کر دیا اور کہا: ہم تو بیروت سے کام کراتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد تجویز سامنے آئی کہ ہمیں پرنٹر خریدنا چاہیے، وہ خاصا مہنگا تو ہے مگر وہ عام کاغذ پرنٹ کر دیتا ہے، چنانچہ 35 ہزار ریال کا پرنٹر خرید لیا گیا۔ چند ماہ اور خیریت سے گزر گئے، ساتھی ایک مرتبہ اکٹھے ہوئے اور اس امر پر سوچ بچار شروع ہوئی

کہ میری تنخواہ کیا ہوگی، صلاح ومشورے کے بعد ڈھائی ہزار ریال ماہانہ تنخواہ مقرر ہوگئی، یہ وہ ایام تھے جب میں واقعی 14 سے 16 گھنٹے کام کرتا تھا۔

میرے سامنے ایک واضح مشن تھا کہ ہم نے حدیث نبوی کی خدمت اور اشاعت کرنی ہے، اس ہدف تک پہنچنے کے لیے یہ کمپیوٹر سب سے پہلا مرحلہ تھا، ہم نے غالباً کچھ عرصے کے بعد اپنے اس ادارے کا منافع بھی تقسیم کیا جو بالکل تھوڑا سا تھا، مگر ساتھیوں کو حوصلہ ضرور ہوا۔ انھی دنوں میری زبان سے ایک جملہ نکلا کرتا تھا: ساتھیو! جس طرح مجھے کل سورج کے نکلنے کا یقین ہے اسی طرح مجھے اس کام کی کامیابی کا بھی یقین ہے، مگر جیسا کہ ہر کام کے شروع میں ہوتا ہے کام کا تجربہ نہیں ہوتا، مسائل خاصے ہوتے ہیں، شرکاء کے ذہن میں ہوتا ہے کہ جلد از جلد بہت زیادہ منافع ہمیں ملنا شروع ہو جائے گا، ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، کام آہستہ آہستہ خسارے کی طرف جانا شروع ہو گیا۔ میں نے کارکنان کی تعداد بڑھا کر تین کر دی، ان میں ایک فلپائنی آرٹسٹ بھی تھا، ادھر ادھر سے کام پکڑتا، مگر جو آمدنی ہوتی وہ اخراجات کی نذر ہو جاتی، تاہم وزارت الدفاع کا کام اور نوکری چل رہی تھی، لہٰذا کچن کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ایک روز نجانے کس کی نظر لگ گئی کہ میرے سب سے قریبی عزیز نے کسی ضرورت کے پیش نظر اپنے حصے کے پیسے واپس مانگ لیے، میں لکھ کر دے چکا تھا کہ تین ماہ کے نوٹس پر میں پیسے دینے کا پابند ہوں، چنانچہ ادھر ادھر سے کر کے ان کے پیسے واپس دے دیے۔ جب دیگر ساتھیوں کو معلوم ہوا کہ اس کے اپنے رشتہ دار پیسے واپس مانگ رہے ہیں تو لازماً کوئی گڑبڑ ہے، میں نے انھیں اطمینان رکھنے اور صبر سے کام لینے کی درخواست کی، مگر ہر ایک نے اپنے پیسے کی واپسی پر اصرار کیا۔

یہ وہ موقع تھا جب اللہ تعالیٰ نے مجھے کمال ہمت سے نوازا، انیسہ نے بھی میرا خوب ساتھ دیا، ہم نے آہستہ آہستہ سب کو پیسے واپس کرنا شروع کر دیے۔ اسی دوران ایک سعودی بزنس مین کو ساتھ ملایا، کچھ رقم اس نے بھی مہیا کر دی۔ میں ساتھیوں سے فارغ تو ہو گیا مگر اس وقت تک خاصا خسارہ ہو چکا تھا، ہم اس کام کو چلا سکتے تھے نہ بند کر سکتے تھے، اسی اثناء میں محترم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی صاحب نے بھی اپنے حصے کے پیسے طلب کر لیے۔ میں نے ان سے عرض کی: یہ کاروبار ہم سب نے مل کر کیا ہے ہم منافع اور خسارے میں شریک ہیں۔ اگر آپ کو فوری پیسہ واپس لینا ہے تو آپ کو خسارہ برداشت کرنا ہو گا، لیکن اگر آپ صبر کریں اور مجھے کچھ مہلت دے دیں تو غالباً پانچ ماہ بعد آپ کو پوری رقم مل جائے گی۔ مجھے خسارہ ہو یا منافع یہ پوری رقم میرے ذمہ رہی۔ اللہ ان کو دنیا و آخرت میں جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے کہا: میں صبر کر لوں گا، مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خسارہ برداشت کروں، اب اس بزنس میں تنہا پاکستانی میں ہی تھا۔ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا، والدہ محترمہ پاس ہی رہتی تھیں، ان سے دعاؤں کی درخواست کرتا اور پھر کام پر جت جاتا۔

انھی دنوں مجھے سعودی بریطانی بینک سے ایک اچھا خاصا کام بڑے اچھے ریٹ پر کرنے کے لیے مل گیا، میں بہت خوش تھا کہ اتنے بڑے ادارے سے کام ملا ہے، کہ اگلے ہی دن میرے ایک سعودی دوست نادر المزینی مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ یہ وزارت دفاع کے شعبہ امور دینیہ میں افسر تھے، انھوں نے منصوبہ دیکھا دوران گفتگو میں نے بڑی خوشی سے بتایا: ہمیں بینک کا کام ملا ہے، فوراً کہنے لگے: عبدالمالک! بینکوں کے ساتھ کام کرتے ہو؟ ایک لمحے میں بات سمجھ آ گئی کہ میں غلط کر رہا ہوں۔

کہنے لگے: رازق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ان کے فارم بنانا بھی ان کے ساتھ تعاون ہے، ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ ''گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔'' میں نے اگلے ہی دن کام واپس کر دیا۔ انھوں نے مزید معاوضے کی پیش کش کی، میں نے کہا: اب مسئلہ پیسے کا نہیں، دین و ایمان کا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے استقامت دی اور میں اس آزمائش سے نکل گیا۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب کے دس ہزار ریال دینے کا وقت آنے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسا بندوبست فرمایا کہ وہ رقم وقت سے پہلے ہی جمع ہو گئی۔ میں نے انھیں فون کر دیا کہ اپنا اکاؤنٹ نمبر بھجوا دیں، آپ کی امانت تیار ہے۔ انھیں اس پر خاصا تعجب ہوا، جس کا انھوں نے بعد میں اظہار بھی کیا، ان کا خیال تھا کہ میں ان سے مزید مہلت مانگوں گا، مگر میرا رب بہت مہربان اور شفقت کرنے والا ہے، بہر حال میرے دل میں ان کے لیے ہمیشہ تشکر کے جذبات رہے کہ انھوں نے مجھے مہلت دی اور اللہ تعالیٰ کا بھی لاکھوں مرتبہ شکر ہے کہ جس نے ہر مرحلے پر مجھے سرخرو کیا۔

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اگر کاروبار میں خسارہ ہو رہا ہو تو ہر کوئی باتیں بناتا ہے اور کہتا ہے: یہ شخص ہے ہی بڑا نا اہل، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میرے بارے میں اس قسم کی باتیں کی گئی ہوں گی، بہر حال یہ مشکل وقت تھا، جو گزر گیا۔ انیسہ فردوس نے اس سلسلے میں میرا بھرپور ساتھ دیا، اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے حاضر کر دیا، اس نے کمیٹی ڈالی ہوئی تھی، خواتین اس کے پاس یکم کو ہی اپنا حصہ دے جاتیں جبکہ اس نے 17 تاریخ کو کمیٹی اکٹھی کر کے دینی ہوتی تھی، وہ مجھ سے کہتی: میرے پاس اتنے ہزار ریال پڑے ہیں، چاہیں تو آپ استعمال کر لیں، اگر ضرورت پڑ جاتی تو اس سے لے لیتا اور اسے 17 تاریخ

سے پہلے واپس کر دیتا۔

ایک بات جو میں اس موقع پر اپنے قارئین کرام کو بتانا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی سے شکوہ نہیں کیا، جنھوں نے عدم اعتماد کیا، ان کے ساتھ بھی تعلقات قابل رشک رہے، الحمدللہ! میں ہر حالت میں مسکراہٹیں بکھیرتا رہا، تنہائی میں اکثر اپنے سابقہ الفاظ کو دہراتا کہ جس طرح مجھے کل کے سورج طلوع ہونے کا یقین ہے اسی طرح دارالسلام کی کامیابی کا یقین ہے۔

والدہ محترمہ کی طرف سے بڑی تسلی ملتی۔ میں بالعموم صبح کے وقت ان کے پاس بیٹھ جاتا، ان کے الفاظ میرے حوصلوں کو بہت بڑھاوا دیتے، وہ فرماتیں: عبدالمالک! تمھاری نیت اچھی ہے، اللہ کبھی تمھیں ضائع نہیں کرے گا۔

«مكتبة العبيكان» اس وقت اپنے تجارتی سفر کے آغاز پر تھا، ان کے ذمہ ہماری کافی رقم تھی، ایک دن میں خود ان کے پاس چلا گیا۔ ''رزقی'' نامی ایک تیونسی شخص ان کا پروڈکشن منیجر تھا، عبیکان کی طرف سے رقم ملنے میں تاخیر ہو رہی تھی، اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے ایک ہی دن میں بل کلیئر کروا کے اچھی خاصی رقم حوالے کر دی، اس سے بھی حوصلہ بڑھا۔ اس دوران اندازہ ہوا کہ ہمیں یہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جانا چاہیے، ہمارا مالک مکان بڑا اچھا آدمی تھا، آج پچیس سال گزر جانے کے بعد بھی میرے اس سے نہایت اچھے تعلقات ہیں، اس نے نوٹس دے دیا کہ ہمیں اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اس مکان کی ضرورت ہے، چنانچہ ہم کمپیوٹر اٹھا کر ایک معاہدے کے تحت دارطیبہ کے دفتر میں لے گئے۔ ان دنوں ان کا دفتر شارع عسیر پر واقع تھا، وہاں پر کام میں کچھ بہتری آئی مگر یہ کام بڑا مشکل اور صبر آزما تھا۔ کمپوزنگ کے کام میں آپ کو اپنی محنت کا معاوضہ تو مل سکتا

ہے،لیکن اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو خاصی بچت ہو جائے گی تو یہ ناممکن ہے،بس باعزت روٹی مل جاتی ہے،وہ بھی صرف ایک دو گھروں کے لیے،اس سے زیادہ مشکل ہے۔

حالات نے پلٹا کھایا اور جناب مولانا محمد شریف چنگوانی کی معرفت جناب عبداللہ المانع سے رابطہ ہوا۔ ہمارا یہی خیال تھا کہ ان کے پاس کافی سرمایہ ہوگا،تصور میں یہی تھا کہ جو بھی سعودی ہے وہ نہایت امیر ہوتا ہے،خیر ہم نے وکالۃ المانع کے نام سے ادارہ بنایا اور شارع الضباب پر دفتر کرائے پر لے کر کام شروع کر دیا،کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ ہمیں اندازہ ہوا کہ ان کے پاس بھی کوئی مبلغ نقد کی صورت میں نہیں ہے،مجھے جناب اکرام الحق خطاط کے الفاظ یاد ہیں،وہ کہا کرتے تھے: تیلی کرنے کے باوجود تیل نہ مل سکا۔

یہ دفتر خاصا بڑا اور خوبصوت تھا،اسی دفتر میں علامہ احسان الٰہی ظہیر بھی تشریف لائے تھے۔ہم نے سفیر پاکستان جناب امیر گلستان جنجوعہ کو بھی اس دفتر میں دعوت دی تھی۔کچھ عرصے کے بعد ہم ایک بنگلے میں منتقل ہو گئے،میں صبح وشام محنت کرتا،چند ویزے نکلے تو اپنے بھائی محمد طارق شاہد صاحب کو بلوالیا،ایک جلد ساز پاکستان سے بلوالیا،سوڈان سے موسیو ابراہیم کا سالا خضر یعقوب بھی ہمارے ویزے پر آ گیا،کام آگے بڑھا مگر اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔

اسی دوران مساعد ابا الخیل ہمارے ساتھ شریک ہو گئے،ان کے پاس معقول سرمایہ تھا۔کچھ عرصہ گزرا تو میں چند ہفتوں کے لیے پاکستان چلا گیا،واپس آیا تو دیکھا کہ مجھے بتائے بغیر ہمارا دفتر شارع جامعہ پر منتقل کر دیا گیا ہے،ایک دو مصری بھی رکھ لیے گئے۔میرے نزدیک یہ فیصلہ درست نہ تھا اور پھر مجھے اعتماد میں بھی نہ لیا گیا تھا،میں خاصا بددل ہوا،مساعد ابا الخیل نے میرا حصہ خرید لیا اور میں پینسٹھ ہزار ریال خسارہ برداشت کر

کے اپنا حصہ ان کو دے کر علیحدہ ہو گیا۔ کچھ رقم میرے حصے میں آئی۔ کچھ پس انداز کی ہوئی تھی، مجھے ادھر ادھر سے پرنٹنگ کے کام ملنے شروع ہو گئے تھے اور میں گھر بیٹھ کر بھی معقول کمانے لگا......اور پھر اسی دوران ایک واقعہ رونما ہوا جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔

کتابت اور پرنٹنگ وغیرہ جیسے کام میرے خون میں رچے بسے ہوئے تھے۔ میں ناشر ہونے کے خواب دیکھا کرتا تھا، مگر اس کے لیے خاصی ہمت اور سرمائے کی ضرورت تھی۔ میں اپنے وزارت والے دفتر میں بیٹھا تھا کہ حسب دستور سعودی سپاہی میرے دفتر میں اخبار رکھ گیا، یہ معمول کی کارروائی تھی کہ ہر روز ظہر کی نماز کے بعد ہمیں ایک عربی اخبار ملا کرتا تھا، میں اس کے اندرونی صفحات دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر سے گزری کہ لبنان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کی مالکہ ایک عیسائی عورت ہے، اس ادارے کا نام مکتبہ لبنان ہے، اس وقت اس کی بڑی شہرت تھی اس مکتبے نے سکولوں کے لیے بے شمار نصابی کتب، اور بچوں کے لیے غیر نصابی کتب بھی بڑی تعداد میں شائع کی تھیں۔ ان کی کتب کی فروخت کئی سو ملین ریال سالانہ تھی۔ خبر کوئی بڑی نہ تھی، مگر چند سطور پر مشتمل اس خبر نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا، ایک عیسائی عورت جس کا دین و مذہب سوائے پیسے کے کچھ نہیں، وہ الحاد پھیلا رہی ہے اور ایک تم ہو کہ تمھیں اللہ تعالیٰ نے کافی صلاحیتوں سے نوازا ہے، تمھارے لیے نشر و اشاعت کا ادارہ بنانا کوئی مشکل یا ناممکن تو نہیں ہے۔ اگر ایک عورت اتنا بڑا ادارہ چلا سکتی ہے تو تم مرد ہو کر کیوں نہیں چلا سکتے؟ تم محمد عربی کے غلام ہو، تم تو اہل حدیث ہو۔ میں سوچتا چلا گیا، میرا دل بھر آیا، میں نے دفتر کا دروازہ بند کر لیا اور ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی، میں رونے لگا اور پھر

میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی کامیابی کی خوب دعا کی اور اس بات کا پختہ عہد کیا کہ حالات جیسے بھی ہوں مجھے نشر واشاعت کے میدان میں آنا ہے اور خدمت کتاب وسنت کا کام کرنا ہے۔ دفتر سے گھر آیا تو ذہن بڑا صاف تھا، دل سے بوجھ اتر چکا تھا اور میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

انھی دنوں مجھے عمرے کے لیے جانے کا اتفاق ہوا، میں نے کعبۃ اللہ کے دروازے کو پکڑ کر اپنے رب سے خوب دعائیں کیں۔ اپنی کامیابی کے لیے، اپنے مشن کی کامیابی اور کامرانی کے لیے دیر تک دعائیں کرتا رہا۔ آخر کار میرے لبوں پر یہ دعا آ گئی: الٰہی! میں کمزور بندہ ہوں، گنہگار ہوں، دنیادار ہوں، مجھے صرف وہ کتاب شائع کرنے کی توفیق دینا جس سے تو راضی ہو، اگر کوئی کتاب تجھے ناپسند ہے تو وہ مجھے شائع کرنے کی ہمت ہی نہ دینا۔

میں یہ الفاظ اور داستان اپنی نوجوان نسل کے لیے لکھ رہا ہوں۔ عزیزو! میں نے مایوسی کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہ دیا، یہ درست ہے کہ اگر آپ کے پاس سرمایہ زیادہ نہ ہو تو آپ کے لیے کاروبار بڑا مشکل ہوتا ہے، مگر اس دوران الحمد للہ! میں نے اپنے معمولات میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔ میں بچپن ہی سے خوش خوراک، خوش لباس اور خوش گفتار ہوں۔ میرے ہاں مہمان آتے تو دل کھول کر ان کی خاطر مدارت کرتا، ہمارے گھر میں خوشیاں تھیں، میری بیٹی امامہ تھی، عکاشہ اور عبدالغفار تھے۔ میرا گھر کوئی بڑا تو نہ تھا مگر بہت چھوٹا بھی نہ تھا، ہم جب بھی کسی سے ملنے کے لیے جاتے تو امامہ کے لیے عموماً نیا فراک خرید کر اسے پہناتے، ہمارے گھر میں شروع ہی سے جمعرات کو درس قرآن ہوتا تھا۔ اس موقع پر شرکائے درس کے لیے انیسہ کھانے کا اہتمام کرتی۔ ہم ایک بوری چاول

لے آتے، انیسہ ایک بڑے برتن میں چاول پکا لیتی اور دوسرے میں سالن، روٹیاں تندور سے آجاتیں اور تمام حاضرین درس کے لیے کھلی دعوت ہوتی کہ کھانا کھا کر جائیں۔ الحمدللہ! کبھی سالن کم پڑا نہ چاول تھوڑے ہوئے، اللہ کا شکر ہے کہ گھر میں اتنی برکت تھی کہ ہر طرف خیر ہی خیر تھی۔ انیسہ نے درس وتدریس کا کام شروع کر رکھا تھا، بچیاں اور خواتین پڑھنے کے لیے آجاتیں، الحمدللہ! آج تک ہم نے کبھی کسی سے اس مقصد کے لیے ایک ریال بھی طلب نہیں کیا۔

حالات مزید بہتری کی طرف بڑھنے لگے، میں نے مختلف اداروں کی کتابیں شائع کروانی شروع کر دی تھیں، اس سے آمدنی بہتر ہوگئی، ان دنوں ڈاکٹر احمد المزید کا کام میں خوب کر رہا تھا، ہر روز شام کو اس کے گھر چلا جاتا، مطابع سفیر سے رابطہ ہوا، میں نے ان سے کہا: میں آپ کو پرنٹنگ کا کام لا کر دے سکتا ہوں، بشرطیکہ آپ مجھے پانچ فیصد کمیشن دیں، انھوں نے موافقت کر دی۔ ادھر میں نے احمد المزید سے کہا کہ میں تمھیں گھر تک کام لا کر دوں گا مگر تمھیں پانچ فیصد مجھے دینا ہوگا، اس نے بھی ہاں کر دی، میں نے اسے واضح طور پر بتا دیا کہ دیکھو میں وہاں سے بھی کمیشن لیتا ہوں، اسے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ یہاں میں نوجوان قارئین کو بطور خاص اور دیگر قارئین کو بالعموم عرض کروں گا کہ امانت داری کا اپنا مزا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ میں نے دونوں کو بتا دیا تھا کہ میں آپ سے بھی اور دوسری پارٹی سے بھی کمیشن لیتا ہوں، یہ میری محنت کا معاوضہ ہے۔ ان دنوں میں عموماً ہر روز ہی سفیر پریس جاتا اور کام کی نگرانی کرتا تھا، ادارے کے مالک اور منیجر استاد صالح الصالح اور اس کے سیکرٹری امین صاحب میری خاصی عزت کرتے، مجھے کام میں مزید تجربہ ہوتا چلا گیا۔

مترجم نوبل قرآن اور صحیح البخاری

ڈاکٹر محمد محسن خان صاحب

دارالسلام کی تاسیس کے بعد میرے سامنے جو سب سے اہم منصوبے تھے ان میں حدیث کی خدمت پہلے نمبر پر تھی۔ میں شب و روز غور کرتا کہ ہم مختلف زبانوں میں کس طرح حدیث کے تراجم شائع کر سکتے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ جب بھی وسائل مہیا ہوئے ہم بخاری شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کریں گے۔ ادھر جیسے ہی میرے پاس پیسہ آیا، میری خواہش نے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں، میں نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنا شروع کیں۔

میرے علم میں تھا کہ ڈاکٹر محمد محسن خان صاحب نے بخاری شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہوا ہے، جسے امریکی، ترکی اور پاکستانی اداروں سمیت مختلف اداروں نے شائع کیا ہے۔ میرے سامنے صحیح بخاری کے ایک نہایت خوبصورت نسخے کی طباعت کی منزل تھی۔

میں نے مدینہ یونیورسٹی کی وساطت سے ان کے گھر کا نمبر حاصل کیا، ان سے تفصیلی

بات ہوئی اور ایک دن ان سے ملاقات کے لیے مدینہ طیبہ پہنچ گیا۔ وہاں فندق الحرم میں قیام کیا۔ ڈاکٹر محسن خان صاحب کو فون کر دیا کہ میں پہنچ گیا ہوں، عصر کی نماز کے بعد ملاقات کا وقت طے پایا اور انھوں نے فرمایا: میں ہوٹل میں آجاؤں گا۔ اس زمانے میں حرم نبوی میں بہت زیادہ رش نہ ہوتا تھا، اس لیے کسی بھی شخص کو ملنا یا اس سے ملاقات کا وقت طے کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔

ڈاکٹر محسن خان صاحب وقت پر تشریف لے آئے، دروازے پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا، سامنے ایک نہایت معزز و محترم شخصیت کھڑی تھی۔ لمبا قد، خوبصورت سفید سرخی مائل رنگ، سفید لباس میں ملبوس ڈاکٹر صاحب کو میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں کو اتنا خوبصورت اور نورانی چہرے والا دیکھا۔ وہ لباس کے بھی اجلے اور دل کے بھی اجلے تھے۔ میں ان کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا۔ مبہوت ہو کر انھیں دیکھتا رہ گیا۔ انھوں نے مجھے گلے لگا لیا، معانقہ کیا اور پھر ہم کمرے میں بیٹھے ایک دوسرے کو اپنی داستان سنا رہے تھے۔ پہلے انھوں نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھایا۔ انھوں نے جو کچھ بیان فرمایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ڈاکٹر محسن خان کا آبائی علاقہ قندھار (افغانستان) ہے۔ ان کا خاندان نہایت معزز اور محترم ہے۔ ان کے آباؤ اجداد غالباً وہاں کی خانہ جنگی کی وجہ سے ہجرت کر کے لاہور کے قریب قصور میں آ کر مقیم ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب 1925ء میں قصور میں ہی پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم، میٹرک، ایف ایس سی کرنے کے بعد انھوں نے لاہور کے مشہور میڈیکل کالج کنگ ایڈورڈ میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم بی بی ایس امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ کچھ عرصہ میڈیکل کالج میں ملازمت کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ روانہ

ہو گئے۔ وہاں ان کے قیام کا عرصہ چار سال کے لگ بھگ تھا اس دوران انھوں نے سینے کے امراض میں اختصاص حاصل کیا اور پھر شاہ عبدالعزیز طیب اللہ ثراہ کے دور میں سعودی عرب میں تشریف لے آئے۔ سعودی عرب اس زمانے میں کوئی ترقی یافتہ ملک نہ تھا، سڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں، طائف میں ائرپورٹ تو تھا مگر رن وے تک مکمل نہ تھا، غالباً چھوٹے طیارے ریت پر اترتے تھے، ان کا سب سے پہلا تقرر طائف کے السداد (AS-SADAD) ہسپتال میں ہوا۔ یہاں پر سینے کے امراض کا علاج ہوتا تھا۔ انھیں اس ہسپتال کا انچارج بنایا گیا، ڈاکٹر صاحب اس وقت کلین شیو تھے۔ انگریزی لباس پہنتے تھے، مگر نیکی تقویٰ الحمد للہ! کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خود مجھے ایک مرتبہ بتایا کہ انگلینڈ میں قیام کے دوران وہاں ہسپتال کی نرسیں اور ڈاکٹر ان کو اینجل یعنی فرشتہ کہا کرتی تھیں۔ جس شخص نے عین جوانی کے عالم میں کبھی ان کی طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھا، اسے فرشتہ ہی کہا جائے گا۔ وہ ابھی طائف ہی میں مقیم تھے کہ ایک دن ان کی قسمت جاگ اٹھی، انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے طویل خواب دیکھا۔ رسالت مآب ﷺ سے ملاقات ہو رہی ہے، آپ ﷺ کو خوب پسینہ آیا ہوا ہے جو آپ کی گردن مبارک پر چمک رہا ہے، ارشاد ہوا: محسن خان! اسے پیو، چنانچہ انھوں نے اسے پینا شروع کیا، ڈاکٹر محسن خان کے الفاظ ہیں:

> دروازے پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا، سامنے ایک نہایت معزز و محترم شخصیت کھڑی تھی۔

”جس طرح ایک پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے میں آپ کا پسینہ مبارک پیتا رہا، پھر

ارشاد ہوا: دائیں چھ قدم چلو، پھر بائیں چھ قدم چلو اور دو رکعت شکرانے کی نماز ادا کرو۔ پھر ارشاد ہوا: ورق لاؤ، میں ایک ورق لے کر آیا تو اس پر لکھ دیا کہ ہمیں ڈاکٹر محسن خان کی ضرورت ہے،اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ خواب کے عالم میں ہی میں اسے لے کر وزیر صحت سعودی عرب کے پاس آتا ہوں اور اسے استعفا پیش کرتا ہوں وہ کہتا ہے: ڈاکٹر محسن ہم تمھارا استعفا کیسے قبول کر لیں۔ تمھیں بڑی مشکلوں سے ہم برطانیہ سے لے کر آئے ہیں۔ میں اس سے کہتا ہوں: دیکھتے نہیں اس پر مہر کس کی لگی ہوئی ہے؟ اور پھر یہ استعفا اس کے سامنے ڈال کر وہاں سے چلا آتا ہوں۔ میں بھاگتا چلا جا رہا ہوں، وادیوں میں سے، جنگلوں، ویرانوں سے گزرتا ہوا، چلتا رہا، چلتا رہا، بھاگتا رہا نجانے کب تک...... سامنے دور اللہ کے رسول ﷺ کرسی پر تشریف فرما ہیں، جس طرح دیہاتوں میں گھروں کے بڑے بڑے صحن ہوتے ہیں، وہاں ایک بہت بڑے صحن میں بے شمار لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں دور سے اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے کہتا ہوں: لبیک یا رسول اللہ! میں حاضر ہو گیا...... اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔"

صبح ہوئی تو میرے دل کی کیفیت بدلی ہوئی تھی، میں نے اپنا خواب اپنی اہلیہ کو سنایا اور پھر علمائے تعبیر کے پاس چلا گیا،ان سے عرض کی کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے، مجھے اس کی تعبیر بتائیں۔

علماء نے کہا: امام بخاری رحمہ اللہ نے خواب میں دیکھا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو کچھ مکھیاں تنگ کر رہی ہیں تو انھوں نے نہایت محنت سے بخاری شریف کا نسخہ تیار کیا۔ ضعیف، موضوع احادیث چھانٹ چھانٹ کر نہایت عرق ریزی سے بخاری شریف میں صرف وہ احادیث جمع کیں جو بالکل صحیح اور درست تھیں۔ اسی طرح اگر کوئی خواب میں

> میں دور سے اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے کہتا ہوں: لبیک یا رسول اللہ! میں حاضر ہو گیا...... اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

اللہ کے رسول ﷺ کا خون پیتا ہے تو وہ شہید ہوگا، آپ نے خواب میں پسینہ پیا ہے، تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ آپ حدیث کی خدمت کریں گے۔

ڈاکٹر محمد محسن خان مجھے بتا رہے تھے: میں نے سوچا اور ان سے کہا:

میں تو ایک ڈاکٹر ہوں، طبیب ہوں، دین کا علم نہیں رکھتا پھر حدیث کی خدمت کیسے کروں گا؟!

مگر اب سوائے اس سوچ اور فکر کے کچھ نہ تھا کہ مجھے حدیث کی خدمت کرنی ہے اور پھر اچانک خیال آیا، میں نے علماء سے پوچھا: حدیث کی کون سی کتاب سب سے زیادہ معتبر ہے؟ جواب ملا: صحیح بخاری۔ پھر میں نے پوچھا: کیا اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے؟ جواب نفی میں ملا۔ معلوم ہوا کہ چند صفحات کا ترجمہ مولانا محمد اسد (جرمنی) نے کیا ہے۔ اچھا! تو پھر مجھے انگریزی زبان آتی ہے، مجھے صحیح بخاری کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہیے، یہ خیال آتے ہی اطمینان ہو گیا کہ میری سوچ اور سمت درست ہے۔

ہم نے دہلی سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ منگوالیا اور اس کا انگریزی ترجمہ شروع کر دیا، میں اس وقت ہسپتال کا ڈائریکٹر جنرل تھا، تمام عملہ میرے ماتحت تھا، اس وقت کمپیوٹر تو دور کی بات ہے ٹائپ رائٹر بھی خال خال ملتا تھا۔ شام کو چھٹی ہوتی تو عملہ کے سینیئر اسٹاف ممبران میرے ساتھ لگ جاتے۔ ہم نے ٹائپ رائٹر خرید لیے اور کام شروع کر دیا۔ ہمارے سامنے ایک ہی ہدف تھا کہ ہمیں جب بھی موقع ملتا جو بھی وقت میسر ہوتا،

اس کام میں لگاتے اور پھر ایک وقت آیا کہ یہ عظیم کام مکمل ہو چکا تھا۔ اسے مکمل ہونے میں چھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ علمائے کرام کو ترجمہ پیش کیا، انھیں ترجمہ کے بارے میں بتایا گیا کہ اردو سے انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے تو علمائے کرام نے اسے مسترد کر دیا، کہنے لگے: کام غلط ہوا ہے۔ ضروری تھا کہ یہ کام عربی سے براہ راست ترجمہ ہوتا کیونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت کچھ نہ کچھ الفاظ چھوٹ جاتے ہیں اور صحیح معنوں میں مفہوم ادا نہیں ہوتا، ہم نے ہمت نہ ہاری اور ایک نئی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے۔

اس وقت تک مدینہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا، یہ شاہ سعود بن عبدالعزیز کا دور تھا، اسی دوران میں نے سعودی شہریت حاصل کر لی۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ اس دور میں مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ میں نے وزارت صحت کو درخواست دی کہ مجھے مدینہ یونیورسٹی کے ہسپتال میں ٹرانسفر کر دیا جائے، طائف میں میرے پندرہ سال گزر چکے تھے۔ (ڈاکٹر محسن اپنے وقت کے چوٹی کے معالج تھے، انھوں نے شاہ سعود، شاہ فیصل اور شاہ خالد کا علاج بھی کیا) درخواست قبول ہوئی اور میں مدینہ طیبہ آ گیا۔ وہاں پر جامعہ اسلامیہ کے ہسپتال میں ڈیوٹی شروع کر دی۔

مدینہ طیبہ کا علمی ماحول طائف کی نسبت بہت بہتر تھا۔ یہاں بڑے بڑے علماء تھے، جن میں مراکش کے ڈاکٹر تقی الدین الہلالی بھی تھے۔ مجھے اپنے مشن کی تکمیل یہاں آسان نظر آئی۔ شیخ ابن باز سے بڑے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے۔ علماء کا ایک گروپ تھا جو ترجمے کے کام میں میری مدد کرتا رہا۔ جن مشکل الفاظ کے معانی اور مطالب مجھے نہ آتے، یہ علماء میری رہنمائی کر دیتے۔ اس زمانے میں حج کے ایام کے علاوہ مسجد نبوی میں

زیادہ رش نہ ہوتا تھا، میں اکثر ریاض الجنہ میں بیٹھ کر ترجمہ کرتا اور پورے چھ سال کے بعد یہ عظیم کام مکمل ہوگیا۔ خواب کی تعبیر سامنے آچکی تھی، پہلے چھ قدم ایک طرف اور پھر چھ قدم دوسری طرف چلنے کا حکم ملا تھا۔ بخاری شریف کے ترجمے کو انگریزی زبان میں ڈھالنے میں بارہ برس صرف ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

یہ کام اب 9 مجلدات میں شائع ہونا تھا، اس کے لیے مالی وسائل کی ضرورت تھی، ہمیں کسی ایسے شخص یا ادارے کی تلاش تھی جو اس کی اشاعت میں سرمایہ خرچ کرے؟ ہم نے رابطۃ العالم الاسلامی کو خط لکھا، مگر وہاں سے مثبت جواب نہ ملا۔ دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اللہ سے دعائیں ہوتی رہیں اور پھر ایک دن میں ریاض الجنہ میں بیٹھا پروف پڑھ رہا تھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے یوسف سیٹھی صاحب کی نظر مجھ پر پڑگئی، کہنے لگے:

قیامت کے روز اس روضے والے کو کیا جواب دوں گا کہ میں نے اس کی حدیث کو بیچ دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب وارفتگی کے عالم میں رو دیے۔

میں تمھیں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں تم انگریزی میں کچھ لکھتے پڑھتے ہو، یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے بتایا: میں نے بخاری شریف کا انگلش میں ترجمہ کیا ہے اور اب اس کی اشاعت مقصود ہے۔ اور جو شخص اسے شائع کردے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اسے جنت دیں گے۔ یوسف سیٹھی صاحب میری گفتگو سنتے رہے، ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے، فرمانے لگے: مجھے جنت چاہیے اور یہ کام میں

کروں گا۔ وہ گوجرانوالہ کے قریب راہوالی شوگر مل جی ٹی روڈ کے مالک تھے۔ اللہ نے دنیا تو دی ہی تھی، مگر ساتھ ہی دین کی اشاعت کا جذبہ بھی دیا تھا۔ وہ خود عالم دین تھے نہ انگریزی کے ماہر، مگر قدرت ان سے ایک بڑا کام لینا چاہتی تھی۔

انھوں نے مسجد نبوی میں اپنے رب سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا اور لاہور میں پرنٹنگ پریس لگایا۔ اس زمانے میں سکے کی دھات سے بنے ہوئے حروف ہوتے تھے۔ ایک ایک حرف کو جوڑ کر لفظ بنایا جاتا، یہ بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہوتا تھا۔ الحمدللہ! پہلی مرتبہ بخاری شریف کا ترجمہ 9 جلدوں میں لاہور سے شائع ہوا، پھر استنبول سے اور پھر شکاگو سے۔ اور اب میں ان کے سامنے بیٹھا اس کے حقوق کی بات کر رہا تھا۔

قارئین کرام! ڈاکٹر محسن خان مجھے ایک گھنٹے سے زائد اپنی داستان سناتے رہے، میں سنتا رہا۔ مجھ پر ان کی گفتگو کا سحر طاری ہو چکا تھا، میں محو حیرت تھا۔ فرمانے لگے: تم میرے بیٹوں کی طرح ہو، چھوٹے بھائی ہو۔ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ اسے شائع کرو، اسے دنیا میں پھیلاؤ، اسے فروخت کرو یا تقسیم کرو، میری طرف سے مکمل اجازت ہے۔

میں ریاض سے جب مدینہ طیبہ جا رہا تھا تو میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو ایک خطیر مبلغ بطور رائلٹی دی جا سکتی ہے، میں نے ڈاکٹر صاحب سے سوال کر دیا: آپ اس کی رائلٹی کیا لیں گے؟ رائلٹی کا نام سن کر وہ چونکے، رائلٹی، کون سی رائلٹی، کیسی رائلٹی، حدیث شریف کی رائلٹی؟! کھڑکی سے روضہ اقدس نظر آ رہا تھا انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: پھر قیامت کے روز اس روضے والے کو کیا جواب دوں گا کہ میں نے اس کی حدیث کو بیچ دیا تھا۔ میں نے یہ کام پیسے کے لیے تو نہیں کیا تھا، ڈاکٹر صاحب وارفتگی کے عالم میں رو دیے۔ میں بھی پتھر دل نہ تھا میری آنکھوں سے بھی ندامت کے آنسو بہہ

نکلے۔

مجھے کچھ نہیں چاہیے، وہ گویا ہوئے، تم جاؤ، اسے شائع کرو، مجھے معلوم ہے کہ تمھارے پاس ادارہ ہے۔ یہ کام کوئی معمولی نہیں ہے۔ اسے نئے سرے سے شائع کرنا ہے تو اس کی ٹائپنگ ہوگی، اس کے لیے عملہ درکار ہے، جنہیں تنخواہیں دینا ہوتی ہیں، میں تمھیں اس بات سے بھی منع نہیں کرتا کہ تم اس میں منافع کما لو، اس لیے کہ جب تک اداروں کے پاس آمدنی کے ذرائع نہ ہوں وہ تھوڑے عرصے بعد بند ہو جاتے ہیں۔

نوبل قرآن کی اشاعت

ڈاکٹر صاحب نے ترجمۂ بخاری کی پوری داستان بیان کرنے کے بعد مجھے یہ حکم دیا: عبدالمالک! بخاری شریف کا یہ ترجمہ بڑی محنت سے تیار ہوا ہے، مگر تم اسے شائع کرنے سے پہلے میرے ترجمہ شدہ نوبل قرآن کو شائع کرو۔ یہ کام میں نے ڈاکٹر تقی الدین الہلالی کے ساتھ مل کر کیا ہے۔

ڈاکٹر تقی الدین الہلالی بہت بڑے سلفی عالم تھے۔ مراکش سے تعلق رکھنے والے یہ مایہ ناز استاذ ایک زمانے میں الجامعۃ السّلفیہ بنارس (بھارت) میں بھی پڑھاتے رہے۔ وہ آنکھوں سے نابینا تھے مگر دل کے بینا تھے۔ عربی کے شاعر تھے کہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ چونکہ وہ کافی عرصہ بھارت میں بھی رہے تھے، اس لیے اردو زبان بھی آتی تھی۔ پھر مدینہ یونیورسٹی میں استاذ بن کر آ گئے تھے۔

ڈاکٹر محمد محسن خان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ایک دن ڈاکٹر تقی الدین مجھ سے کہنے لگے: ڈاکٹر محسن خان! انگریزی زبان میں سلف کے فہم کے مطابق کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ جتنے تراجم ہیں ان میں عقائد کی کئی ایک غلطیاں ہیں۔ سب سے مشہور ترجمہ

جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کا ہے مگر یہ بوہری فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جب ترجمہ کیا تو انگریز کی حکومت تھی اور یہ اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے، زبان بڑی عمدہ ہے، مگر وہ بائبل سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات کی تشریح تو حدیث سے ہونی چاہیے۔ میں ترجمہ کرتے وقت ڈاکٹر تقی الدین کو سنا دیتا، مشکل کلمات میں ان سے رہنمائی لیتا رہا۔ اب یہ طباعت کے لیے تیار ہے، تم پہلے یہ کام کرو پھر بخاری شریف کی باری آئے گی۔

ہلالی صاحب کو انگلش زبان پر عبور تو حاصل نہ تھا، تاہم وہ عربی تفاسیر سے مشکل الفاظ اور مقامات کی شرح اور معانی ڈاکٹر صاحب کو بتا دیتے تھے۔

ڈاکٹر محسن خان صاحب کی عظیم اور باعمل شخصیت کے سامنے میں انکار کیسے کرسکتا تھا؟! میں نے موافقت ظاہر کردی، یہ ڈاکٹر صاحب کے اخلاص اور للّٰہیت کا اثر تھا کہ نوبل قرآن کے منصوبے پر عمل کے ساتھ ہی دارالسلام کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا۔ میں نے مدینہ طیبہ سے واپسی کے فوراً بعد نوبل قرآن پر کام کروانا شروع کردیا، میرے اوپر اللہ رب العزت کے بے شمار انعامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں کتاب کا لے آؤٹ بڑا اچھا ڈیزائن کروالیتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں، سوچتا رہتا ہوں، ذہن میں ایک تخیل بسا لیتا ہوں کہ کتاب کا لے آؤٹ ایسا ہونا چاہیے پھر یا تو خود ایک صفحہ ڈیزائن کرلیتا ہوں یا آرٹسٹ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ اسے بتاتا جاتا ہوں کہ ایسا کرو، یہ کم کرو یہ زیادہ کرو، پوائنٹ سائز ایسا ہونا چاہیے، نوبل قرآن کا ڈیزائن میں نے خود تیار کیا، ابتدائی کچھ صفحات پر حصول برکت کے لیے قرآن کریم کی آیات کو خود اپنے ہاتھوں سے پیسٹ کیا۔

نوبل قرآن کی تیاری کے دوران ہمیں ڈاکٹر محسن خان کی رہنمائی تسلسل سے حاصل

رہی، کمپوزنگ سے بھی بڑا مسئلہ پروف ریڈنگ کا ہوتا ہے، ڈاکٹر محسن خان نے متعدد بار ترجمے میں تبدیلیاں کیں۔ یہ بڑا نازک اور مشکل مرحلہ ہوتا ہے، مگر ناشر کو یہ صبر اور حوصلے سے برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اسی دوران ہمیں پاکستان سے کارکن منگوانے کے لیے دو ویزے مل گئے۔ ہمیں آرٹسٹ کی اشد ضرورت تھی، برادرم عبدالرشید شاہد صاحب کی معرفت ہمیں سعید الدین صاحب مل گئے، یہ روزنامہ مشرق کراچی میں آرٹسٹ تھے۔ پروف ریڈنگ اور کالم نگاری بھی کرتے تھے۔ ہمیں ضرورت تو آرٹسٹ کی تھی، مگر ان دنوں ہمارے پاس کام بھی زیادہ نہ تھا، میرے لیے مسئلہ پروف ریڈنگ کا تھا۔ ایک دن سعید الدین صاحب مجھ سے کہنے لگے: مجاہد صاحب! میری انگریزی بہت اچھی ہے، اگر آپ کے پاس میرے لیے ڈیزائننگ کا کام نہیں ہے تو کوئی بات نہیں، آپ مجھ سے انگریزی پروف ریڈنگ کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ بس میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ میں پروف ریڈر کی تلاش میں تھا۔ نوبل قرآن کا کام مزید تیز ہوگیا، ڈاکٹر محسن خان اس دوران مدینہ منورہ سے کتنی ہی بار تشریف لائے، میں نے اس شخصیت سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ بڑی عظیم شخصیت ہیں۔ وہ میرے مربی اور واقعی محسن ہیں۔ صرف میرے ہی نہیں بلکہ امت اسلامیہ کے ایک ایسے محسن، جن کی سوچ اور فکر صرف اسلام کی برتری ہے۔ وہ ہر وقت اسلام کے حوالے سے سوچتے کہ دنیا میں اس دین کا غلبہ کیسے ہوگا؟ ہم ان کے پاس بیٹھتے تو ان کا سب سے پسندیدہ موضوع توحید ہوتا۔ وہ روایتی معنوں میں عالم تو نہیں مگر ان کے دلائل بڑے سادہ، زبردست اور مؤثر ہوتے ہیں۔ وہ پکے موحد ہیں۔ ان کی ہمیشہ یہ دعا ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اللہ کے رسول ﷺ کے جھنڈے تلے اکٹھا کرے۔ مجھے وہ اکثر اس بات کی تلقین کرتے: عبدالمالک! بالکل متواضع بن جاؤ۔ وہ کہتے: اپنے آپ کو

مت کچھ سمجھو، یہ خیال نہ کرو کہ میں کوئی چیز ہوں۔ دیکھو! تم کچھ بھی نہیں، اگر کوئی کام ہوا ہے تو محض اللہ کے فضل وکرم سے ہوا ہے اور اگر کوئی ہوگا تو وہ بھی محض اللہ کے فضل وکرم سے ہوگا۔ اپنے آپ کو پاؤڈر، ڈسٹ (Dust) بنادو، دیکھو! یہ تمھارے اوپر اللہ رب العزت کا خاص کرم ہے کہ اس نے تمھیں اسلام کی خدمت کے لیے چنا ہے۔ اس نے تمھارے ہاتھ میں چابی پکڑائی کہ عبدالمالک مجاہد! تم یہ دروازہ کھولو، ڈاکٹر محسن خان تم یہ کام کرو، یہ کام وہ کسی اور سے بھی لے سکتا تھا، مگر اس کا خاص فضل ہے کہ اس نے ہمیں دین کا کام کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

ڈاکٹر محسن صاحب کے ساتھ تعلقات میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ہم نے خوب محنت کر کے قرآن کریم کا فائنل پروف تیار کرلیا، اب اس کی طباعت کا مسئلہ تھا۔ ہمارے پاس پیسے نہیں تھے، صبح وشام ہم دعائیں مانگتے: اے اللہ! خزانۂ غیب سے ہماری مدد فرما، پھر واقعی اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کردی۔

جالیات بطحاء کو جب معلوم ہوا کہ ہم انگلش ترجمے کے ساتھ قرآن کریم شائع کررہے ہیں تو انھوں نے پانچ سو نسخوں کا اور پھر بڑھا کر ایک ہزار نسخوں کا آرڈر دے دیا۔ جمعیت اہل حدیث برطانیہ کے امیر جناب عبدالھادی العمری صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے پانچ سو نسخوں کا آرڈر دے دیا اور ساتھ ہی ایڈوانس رقم کی بھی یقین دہانی کرادی۔

ڈاکٹر صاحب جب مدینہ سے تشریف لاتے تو عموماً میں خود ہی ان کے استقبال کے لیے جاتا، ایک مرتبہ میں غیر معمولی طور پر مشغول تھا، اپنے ڈرائیور کو بھجوا دیا کہ انھیں ائرپورٹ سے لے آئے۔ وہ لمحات مجھے کبھی نہیں بھولے جب ڈاکٹر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور فرمانے

لگے: مجاہد صاحب! ان کو گن لیں، آپ قرآن شائع کرنے جا رہے ہیں، مجھے معلوم ہے آپ کو پیسوں کی ضرورت ہوگی، اس کی رسید بنا دیں، یہ پورے تیس ہزار ریال ہیں، جب قرآن چھپ جائے تو بارہ سو نسخے مدینہ یونیورسٹی بھجوا دیجیے گا، وہاں یہ طلبہ اور حجاج میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔

صبح وشام ہم دعائیں مانگتے: اے اللہ! خزانۂ غیب سے ہماری مدد فرما، پھر واقعی اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد کر دی۔۔۔

قارئین کرام! اس 30 ہزار ریال کی رقم میں واقعی بڑی برکت ہوئی، خزانہ غیب سے مدد آ گئی۔ ہم نے قرآن کریم کی پرنٹنگ کروا کر 12 سو نسخے مدینہ یونیورسٹی بھجوا دیے۔ ہمارے لیے خیر و برکت کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ سعید الدین صاحب نے کم و بیش 6 ماہ کی محنت کے بعد اس کا انڈکس تیار کیا۔ ڈاکٹر صاحب ترجمے میں مسلسل تصحیح کرتے رہے، پوری دنیا سے جو بھی ملاحظہ آتا ہم فوراً اس کی تصحیح کی کوشش کرتے۔ یہ بلاشبہ بڑا صبر آزما کام تھا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب کا فون آ گیا، فرمانے لگے: عبدالمالک! تمھیں جنت چاہیے؟ میں نے عرض کی: ڈاکٹر صاحب جنت کسے نہیں چاہیے، اسی کے لیے تو یہ ساری جدوجہد کر رہے ہیں۔ اللہ اپنی رحمت سے ہمیں جنت سے نواز دے، (آمین) فرمانے لگے: تو پھر تم ایسا کرو کہ قرآن کریم کا تمام ڈیٹا مجمع الملک فہد کو مدینہ منورہ بھجوا دو، وہ اسے لاکھوں کی تعداد میں شائع کریں گے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کی: یہ اتنا بڑا فیصلہ ہے! مجھے ذرا سوچنے دیں۔ ہم

نے بلا مبالغہ دو سال تک دن رات اس پر کام کیا تھا۔ ڈاکٹر محسن فرمانے لگے: آپ کو کل تک کی مہلت ہے، آپ سوچ لیں۔ فون بند ہو گیا اور میں سوچتا رہا۔ بلاشبہ اس کام پر ہم نے بہت خرچ کیا اور محنت بھی بہت لگی تھی، مگر جنت کا وعدہ بھی تو ہے۔ الحمدللہ! ہم نے ایک ریال لیے بغیر تمام تر ڈیٹا کچھ ڈسکوں میں محفوظ کر کے مدینہ بھجوا دیا۔ مگر انھوں نے شکریہ تک ادا کیا نہ اس بات کو تسلیم کیا کہ انھیں ایک بڑی ٹیم کا کام مفت میں بغیر کسی محنت کے مل گیا ہے۔ بہر حال ہمیں اس کا اجر اپنے رب سے درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

قرآن کریم کا البانی ترجمہ

ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر محمد محسن خاں صاحب نے حکم دیا: ہمیں فوری طور پر البانی زبان میں ترجمۂ قرآن کروانا اور شائع کرنا ہے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور اس کے لیے مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ کو تلاش کر کے ان کی نگرانی میں کام شروع ہو گیا۔ ایک مدت تک ترجمہ ہوتا رہا۔ طلبہ کو مناسب معاوضہ دے دیا گیا۔ اب مسئلہ اس کی کمپوزنگ اور ٹائپ سیٹنگ کا تھا۔ طلبہ کے پاس وقت تھا نہ وہ کمپیوٹر ہی جانتے تھے۔ بعض مترجمین اپنے ملک واپس چلے گئے تھے اور ہمارے پاس رابطہ نمبر بھی نہ تھا۔ آدمی کسی چیز کو تلاش کرنا چاہے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے بشرطیکہ صدق دل سے کوشش کی جائے۔ ہم نے ریاض میں البانیہ کے سفارت خانے سے رابطہ کیا۔ وہاں کا عملہ تین یا چار افراد پر مشتمل تھا۔ حافظ فرید اس کے ڈپٹی سفیر تھے۔ ان کو ٹائپنگ آتی تھی، ان کی داڑھی تو نہ تھی، مگر ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد البانیہ کے مفتی رہے ہیں۔ برادرم محمد ایوب سپرا صاحب کی ڈیوٹی لگی کہ ان سے

رابطہ رکھیں اور یہ کام کروائیں۔ہم نے ان کو مناسب معاوضہ دیا۔کمپیوٹر خرید کر دیا۔تربیت دی گئی اور کئی برسوں کی جدوجہد کے بعد الحمدللہ! البانی زبان میں قرآن چھپ گیا۔اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس کی مارکیٹنگ کہاں اور کیسے کی جائے۔ہمارا نیٹ ورک البانیہ تک نہ تھا۔

ایک دن متحدہ عرب امارات کے سفارت خانے سے فون آیا: ادارے کے ایک اعلیٰ افسر آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔میں جب وہاں گیا تو انھوں نے بہت عزت دی اور مناسب پروٹوکول دیا۔حال احوال دریافت کرنے کے بعد انھوں نے ملاقات کے مقصد کی طرف آتے ہوئے کہا: مجاہد صاحب! ہماری فوج اقوام متحدہ کے امن مشن کے سلسلے میں البانیہ گئی ہوئی ہے اور ہمیں وہاں کے لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے البانوی زبان میں قرآن کریم کے بیس ہزار نسخے درکار ہیں۔میں نے اسے اللہ کی طرف سے خاص تائید جانا اور یہ نسخے فراہم کرنے کی ہامی بھر لی۔اس طرح ہم نے ایک طویل جدوجہد کے بعد جو ترجمہ تیار کروایا تھا وہ عین وقت پر کام آ گیا اور ہمارے تمام اخراجات جو اس پروجیکٹ پر ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے پورے فرما دیے۔اللہ تعالی کے خاص فضل وکرم سے البانوی زبان میں قرآن پاک کے یہ نسخے البانیہ میں مفت تقسیم ہوئے۔اس منصوبے کی کامیابی نے میری ہمتوں میں مزید اضافہ کیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اگر اللہ کے لیے کام کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نہ تو اپنے بندوں کو ضائع کرتا ہے اور نہ ہی کسی مالی خسارے سے دوچار ہونے دیتا ہے۔وہ انھیں وہاں سے رزق عطا کرتا ہے جہاں سے انھیں توقع تک نہیں ہوتی۔ہم نے البانی زبان میں پاکٹ سائز قرآن کریم بھی بڑی شان وشوکت کے ساتھ اٹلی سے طبع کروا کے شائع کیا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ

یہ مضمون لکھتے وقت میری نگاہیں ایک مردقلندر کو دیکھ رہی ہیں جس کا قد بلند و بالا ہے اور جتنا اس کا قد بلند ہے اتنا ہی اس کا ظرف اعلیٰ ہے اور اسی قدر اس کے ارادے بلند ہیں۔ یقیناً وہ ایسی بلند قامت شخصیت ہے جس نے اعلائے کلمۃ الحق ہی میں اپنی زندگی کا بیشتر وقت صرف کیا۔ میں نے بچپن سے لے کر نومبر 1995ء تک محترم مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کو بارہا دیکھا۔ میرا ان سے تعلق خاندانی طور پر تھا۔ رشتے کے اعتبار سے وہ میرے چچا لگتے تھے، میرے والد کے دادا جان اور مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کے دادا جان آپس میں سگے بھائی تھے۔ ہمارا خاندان کیلیانوالہ میں آباد ہے۔ پہلے سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے، افراد کی تعداد بڑھنے لگی تو علیحدہ علیحدہ گھر آباد ہوتے گئے، لیکن سارے گھرانے ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ رہے۔ ان کے درمیان حد فاصل بس گھر کی چار دیواری ہی تھی۔ غمی، خوشی اور عید کے موقعوں پر برادری کے اکثر افراد اکٹھے ہوتے، آپس میں تبادلۂ خیالات ہوتا، علمی موضوعات چھڑتے، مختلف نکات پر بحث ہوتی اور رات گئے تک مجالس آباد رہتیں۔

محترم چچا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب ایک ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں تو

کئی اعتبار سے لکھا جا سکتا ہے، ایک تو بحیثیت رشتے دار کے، دوسرے بحیثیت مؤلف اور مصنف کے، تیسرے بطور مدبر و مصلح کے اور چوتھے بحیثیت خطاط قرآن پاک کے۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب لاہور میں مقیم تھے۔ برادری کے افراد کو اکثر کتابت کی غرض سے لاہور جانا ہوتا تھا۔ وہ زمانہ عسرت کا تھا، دنیاوی وسائل بہت زیادہ نہ تھے، ایسے میں اکثر افراد کا ٹھکانہ وسن پورہ میں ان کا گھر ہی ہوا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی مرحوم کے دل میں عجیب ایثار، محبت اور خیر خواہی ڈالی ہوئی تھی۔ خود اپنے وقت کے نامور خطاط تھے، مارکیٹ میں بڑا نام تھا، بڑے بڑے ادارے کتابت کے سلسلے میں ان سے مشورے کرتے۔ جب بھی کسی تاجر کتب کو ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے مرحوم کا نام سامنے آتا۔ مختلف تنظیمیں، ادارے یا افراد ان کے پاس کام چھوڑ جاتے۔

> میٹنگ ختم ہوتی تو نگاہیں باہر کسی کی متلاشی ہوتیں اور پھر نجیب کی ویسپا نظر آ جاتی اور ایک ہنستا مسکراتا چہرہ میرے گلے لگ جاتا۔

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی صاحب کے منجھلے بیٹے پروفیسر نجیب الرحمٰن کیلانی صاحب سے میری بچپن کی دوستی ہے اور اس دوستی کو اب کم وبیش 35، 36 سال ہونے کو ہیں۔ یہ دوستیاں بھی عجیب ہوتی ہیں، اگر خیر خواہی، نیکی، تقویٰ اور اسلامی بھائی چارے کے تحت ہوں تو بہت زیادہ مفید اور اگر خدانخواستہ خود غرضی، مطلب پرستی اور دنیاداری کے لیے ہوں تو بہت زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔ وسن پورہ میرا دوسرا گھر تھا۔ بے شمار مرتبہ مجھے لاہور آنا ہوتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے کہ جب راقم الحروف دوآبہ رائس ملز ورکرز یونین کا چیف آرگنائزر اور جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے اپنے

مطالبات کے سلسلے میں انتظامیہ پر کئی مقدمات دائر کر رکھے تھے اور کئی طرح کے ڈیمانڈ نوٹس ان کو دے رکھے تھے، چنانچہ کم وبیش ہر ہفتے لاہور آنا ہوتا تھا۔ میں جہاں بھی ہوتا برادرم نجیب الرحمٰن صاحب پہنچ جاتے، میٹنگ ختم ہوتی تو نگاہیں باہر کسی کی متلاشی ہوتیں اور پھر نجیب کی ویسپا نظر آجاتی اور ایک ہنستا مسکراتا چہرہ میرے گلے لگ جاتا۔ پہلے ہم وسن پورہ آتے۔ چچا جان مرحوم سے ایک لمبی ملاقات ہوتی، جس میں ساری کارکردگی، مشورے، مسائل، حالات حاضرہ، علمی نکات وغیرہ پر گفتگو ہوتی اور ڈھیر سارے معاملات طے ہو جاتے۔ اس کے بعد شاد باغ کا گول چکر ہوتا، اس وقت کی سب سے بڑی عیش پیپسی یا مرنڈا کی بوتل پینا یا کھیر کھانا ہوتی تھی۔ پھر ہمارے سامنے باغات ہوتے اور لاہور کی لمبی سیر ہوتی۔

راقم الحروف نے ہمیشہ بزرگوں کی مجالس سے سیکھنے کی کوشش کی ہے، مختلف سوالات کر کے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی عادت بچپن سے رہی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم ان شخصیات میں سے ہیں جن سے بے شمار نشستیں اور باہمی دلچسپی کے امور پر لمبی بحثیں بھی رہیں۔ ایک بڑی خوبی ان کی زندہ دلی تھی، مسلسل کسی نہ کسی طریقے سے مذاق، شغل اور بات میں مزاح پیدا کرتے رہنا ان کی طبیعت میں شامل تھا۔ ہر چند کہ میرا ان سے عمر کے اعتبار سے رشتہ باپ بیٹے کا تھا، مگر اکثر مجالس میں یہ تعلق ایک دوست کا سا ہو جاتا۔ ایسے عالم میں اس طرح گفتگو ہوتی جیسے ہم بچپن کے دوست ہوں۔ جب انھوں نے دوسری شادی کی تو میرا رشتہ ان سے اور قریب کا ہو گیا کہ ان کی اہلیہ میری اہلیہ کی سگی پھوپھی تھیں۔ کبھی کبھار میں ترنگ میں آجاتا تو ان کو اس رشتے کا حوالہ دیتا اور وہ بھی خوب محظوظ ہوتے اور لطف اٹھاتے۔

یہ دوستیاں بھی عجیب ہوتی ہیں، اگر خیر خواہی کے تحت ہوں تو بہت زیادہ مفید اور اگر خدانخواستہ خود غرضی، مطلب پرستی اور دنیاداری کے لیے ہوں تو بہت زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔

میرے والد گرامی کا انتقال 1982ء میں ہوا۔ اس وقت میں ریاض میں تھا، مجھے اچانک اطلاع ملی، بھاگم بھاگ دو دن میں لاہور پہنچا، تو رات کافی گزر چکی تھی، خیر سیدھا وسن پورہ آیا، یہاں کی گلیاں، بازار اور در و دیوار میرے دیکھے بھالے تھے۔ محترمہ چچی جان حمیدہ صاحبہ کہ وہ میرے لیے ماں کی طرح تھیں، کتنی دیر تک پاس بیٹھی دلاسہ دیتی رہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے تو وہ بھی میرے ساتھ رو رہی تھیں۔ ایک دفعہ محترمہ چچی جان ریاض تشریف لائیں تو از راہ کرم ہمارے ادارے میں بھی تشریف لائیں۔ انھوں نے میری کرسی پر بیٹھ کر خوب دعائیں فرمائی تھیں۔

محترم چچا جان کی زندگی کے آخری پندرہ سولہ سال تالیف و تصنیف میں گزرے، جو کتب بھی انھوں نے لکھیں ان پر تبصرے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس پر سیر حاصل بحث کی اور نہایت مفید تالیفات منظر عام پر آگئیں۔ تراجم کی طرف متوجہ ہوئے تو بہت ساری کتب ترجمہ کر ڈالیں، پھر ان کو دنیا میں بھی انعامات ملے اور یقیناً اللہ کے ہاں تو انعامات ملیں گے ہی۔ وہ پکے اور کھرے مسلمان تھے۔ خود ہی اسلامی کتب تصنیف کیں، خود ہی ان کے ناشر اور خود ہی ان کے ڈسٹری بیوٹر تھے۔

یہ کم و بیش چار سال پہلے کی بات ہے، ان سے تعلق اب رشتے داری کا ہی نہیں بلکہ اس

سے اوپر چلا گیا تھا، جہاں محبت اور عقیدت کے پیمانے بہت عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ میرا ارادہ قرآن پاک کی ایک مختلف تفسیر لکھوانے کا تھا۔ میں اس جستجو میں تھا کہ کسی ایسے عالم سے رابطہ ہو کہ جو ترجمہ بھی کرے اور اس پر مختصر ومفید حواشی بھی لکھے۔ نظر انتخاب بعض لوگوں سے ہوتی ہوئی محترم چچا جان تک جا پہنچی۔ گفتگو کی، اپنا منصوبہ اور ارادہ پیش کیا، طویل بحث ہوئی، جواب مثبت ملا۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب بھی شریک گفتگو تھے۔ طے ہو گیا کہ وہ تفسیر لکھیں گے۔ معاوضے کی بات آئی، میں نے ایک خطیر معاوضے کی بات کی۔ جواب ملا:

معاوضہ اگر طے کر لیا تو اخلاص باقی نہیں رہے گا کیونکہ مقصد پیسہ جمع کرنا نہیں، بلکہ قرآن کریم کی خدمت ہے۔ بدقسمتی سے بوجوہ دارالسلام اسے شائع نہ کر سکا، ورنہ شاید یہ تفسیر مجمع الملک فہد سے بھی شائع ہو جاتی، مگر تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟! وہ بلاشبہ عظیم شخصیت تھے۔ ان کو اللہ کے ہاں ان کے اخلاص نیت کے باعث اجر عظیم مل چکا ہوگا۔ ان کی وفات سجدے کی حالت میں ہوئی، رحمۃ اللہ علیہ۔

ایک اکل کھرے انسان اور نہایت ایمان دار شخص،

حافظ عبدالوحید صاحب

میں ستمبر 1994ء میں پہلی مرتبہ امریکا گیا تھا۔ وہاں اسلامی کتب کی نمائش تھی۔ جس میں دارالسلام نے بھی حصہ لیا۔ نمائش کوئی زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ مگر اس سفر میں جناب منصور احمد اور حافظ عبدالوحید صاحب جیسے دو مخلص ساتھی دارالسلام کو مل گئے۔ حافظ عبدالوحید صاحب میرے ہم زلف مولانا محمد ادریس فاروقی رحمہ اللہ کے چچا ہیں اور مدت دراز سے امریکا میں مقیم ہیں۔ میں جب امریکا جانے لگا تو مجھے امریکا دیکھنے کا شوق تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں دو تین دن کے لیے ہیوسٹن بھی جاؤں گا جہاں حافظ عبدالوحید صاحب اپنی فیملی سمیت برسوں سے مقیم ہیں۔ نیویارک سے ہیوسٹن کا سفر خاصا لمبا ہے۔ جتنا سفر لمبا تھا اتنا ہی ٹکٹ سستا تھا۔ مجھے حافظ صاحب اور ان کی فیملی نے بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں نہ تھا کہ میں انھیں دارالسلام کے لیے کام کرنے کا کہوں گا۔ ایک تو میں اپنے شوق کو پورا کرنے اور دوسرا رشتہ داری کے ناطے ہیوسٹن گیا تھا، تاہم یہ ضرور تھا کہ مجھے ان دنوں کسی ڈسٹری بیوٹر کی تلاش تھی۔ حافظ عبدالوحید صاحب کے ساتھ پاکستان میں میری متعدد ملاقاتیں ہو چکی

تھیں۔ میں جب وہاں گیا تو حافظ صاحب لوگوں کو میرا تعارف کرواتے ہوئے بتاتے: یہ عبدالمالک مجاہد ہیں، دارالسلام کے جنرل منیجر، جنھوں نے انگلش میں کتب شائع کی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے: یہ سعودی عرب سے صرف تین دن کے لیے ہمارے پاس آئے ہیں، یہ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ ہمارے پاس اس وقت نوبل قرآن، مختصر بخاری اور چند ایک دیگر کتب تھیں۔ میں حافظ عبدالوحید صاحب کے اخلاق اور کردار سے خوب واقف تھا۔ ان کا گھرانہ بلاشبہ بہت بڑا گھرانہ ہے۔ ان کے والد گرامی مولانا عبدالمجید سوہدروی اپنے دور میں اہل حدیث جماعت کے صف اول کے علماء میں سے تھے۔ ان کے دادا مولانا عبدالحمید اور پڑدادا محترم مولانا غلام نبی بھی اپنے وقت کے جید عالم دین تھے۔ حافظ عبدالوحید صاحب حافظ قرآن اور عالم دین ہیں۔ انھوں نے جامعہ محمدیہ اوکاڑہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے دنیاوی تعلیم میں ایل ایل بی، یعنی وکالت پاس کر رکھی تھی۔ کسی زمانے میں وزیرآباد میں وکالت بھی کرتے رہے۔ ان کے نانا پاکستان کے مشہور عالم دین مولانا احمد علی لاہوری تھے۔

میں اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اچھے ساتھیوں کے لیے دعا کرتا رہتا ہوں۔ آپ جتنے بھی محنتی، قابل، ذہین اور سخت محنت کرنے والے ہوں، مگر اچھی ٹیم کے بغیر آپ تنہا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس وقت ہم ان ساتھیوں کی تلاش میں تھے جو دارالسلام کے لیے ڈسٹری بیوشن کا کام کر سکیں۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ حافظ صاحب نہایت ایمان دار اور پڑھے لکھے انسان ہیں، کیوں نہ میں ان سے بات کروں؟ چونکہ ہیوسٹن نیویارک سے بہت زیادہ دور ہے، لہٰذا اس علاقے میں کتب کی تقسیم کے لیے ہمیں اپنے نمائندے کی ضرورت ہے۔ میں نے حافظ عبدالوحید صاحب سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا: میں یہاں ایک مسجد میں معقول مشاہرے پر بطور امام کام کر رہا ہوں۔ مختلف مساجد میں خطبہ

جمعہ بھی دیتا ہوں، اس لیے مجھے کسی اور کام کی ضرورت نہیں۔ میں ان کے پاس تین دن رہا، اس دوران ان کو مختلف انداز میں کہتا رہا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا: آپ میرے ساتھ لگ جائیں آپ جتنا ماہوار کما رہے ہیں، اتنا آپ ان شاء اللہ ہفتے میں کما لیں گے، مگر انھوں نے انکار ہی کیا۔

آخری دن جب میں واپس آنے والا تھا تو انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ کہنے لگے: ہمیں کتنے ہی لوگوں نے بزنس کرنے کے لیے کہا ہے، مگر میں نے ہر ایک کو انکار کیا ہے۔ تم واحد شخص ہو جس نے مجھے رضا مند کر لیا ہے۔ دراصل اسلامی کتابوں کا کام صرف بزنس ہی نہیں بلکہ دعوت بھی ہے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا، کہنے لگے: ہمارے پاس ایڈوانس پیسہ ہے نہ تجربہ ہی ہے۔ میرا جواب تھا: آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کو ریاض سے کتب بھجوایا کروں گا۔ جب آپ کی کتب فروخت ہو جائیں تو ہمیں پیسے بھجوا دیا کریں۔ رہا مسئلہ تجربے کا تو اگر روزانہ بھی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو فون کر کے بتا دیا کروں گا کہ بزنس کیسے کرنا ہے۔

الحمد للہ! اس طرح ہمارا ان سے معاملہ طے ہو گیا۔ ان کا گھر خاصا بڑا تھا۔ انھوں نے اس کام کے لیے گھر کے ایک دو کمرے فارغ کر دیے۔ میں نے ان کو ریاض سے کتب بھجوانا شروع کر دیں۔ آہستہ آہستہ کام بڑھتا چلا گیا۔ پھر انھوں نے الگ سے سٹور لے لیا۔ اس کام کو چلانے میں حافظ صاحب کی اہلیہ محترمہ نے بھی ان کے ساتھ بڑا تعاون کیا۔ عزیزان بابر اور عمر ابھی چھوٹے تھے اور سکول جاتے تھے۔ وہ بھی پیکنگ میں والدین کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ابتدائی ایام میں تو میری طرف سے ان کے ساتھ کم وبیش ہر روز فون پر رابطہ ہوتا۔ ان کے مسائل سنتا، ہم دونوں مل کر ان کا حل تلاش کرتے۔ اس فیملی نے

میری توقع سے کہیں زیادہ محنت کی۔ میں شروع کے دنوں میں ہر سال امریکا جاتا۔ وہاں ISNA (اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ) کے سالانہ کنونشن میں ان سے ملاقات ہو جاتی۔ کبھی میں ہیوسٹن چلا جاتا۔ ایک زمانے میں حافظ صاحب پوری فیملی کے ساتھ بڑے جوش وخروش سے ISNA میں دارالسلام کا بوتھ لگاتے تھے، اس سے دارالسلام کو خاصی پبلسٹی ملتی تھی۔ برادر عزیز عمر وحید ہال میں سب سے اونچا بینر لگاتے۔ یہ سلسلہ کتنے ہی سال چلتا رہا۔ بدقسمتی سے ایک مرتبہ ISNA کنونشن سے واپسی پر ان کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بس اللہ تعالی نے اپنے فضل وکرم سے ان سب کو بچا لیا، ورنہ حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ISNA کے پروگرام میں جانا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی ہیوسٹن سے شکاگو تک کا یہ سفر خاصا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔

حافظ عبدالوحید اور ان کی اولاد کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے بیس سال ہو رہے ہیں۔ دارالسلام کی ہیوسٹن اور نیویارک برانچیں فرنچائز ہیں۔ الحمدللہ! شروع دن سے حافظ صاحب کے ساتھ معاملہ کر کے بڑا اچھا لگا۔ نہایت کھرے آدمی ہیں۔ بعض اوقات کھری کھری باتیں منہ پر بھی سنا دیتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کاروباری معاملات بڑے واضح ہیں، اس لیے ہمیں آپس کے معاملات طے کرنے میں کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ کھرے آدمی کی باتیں بعض اوقات اچھی نہیں لگتیں، لیکن جب غور کیا جائے اور معاملے کی گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو پھر صاف گو آدمی ہی بہتر نظر آتا ہے۔ ایسے آدمی میں منافقت اور دوغلا پن نہیں ہوتا۔ اب تو حافظ صاحب نے ہیوسٹن برانچ کو بہت زیادہ ترقی دے لی ہے۔ ان کے دونوں بیٹے بابر وحید اور عمر وحید اپنے والد کے دست وبازو ہیں۔ امریکی جیلوں میں شروع دن سے ہمارا لٹریچر جا رہا ہے۔ یہ جیلوں میں کتب کی

ڈیمانڈ پر خصوصی رعایت دیتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے لوگ دارالسلام کی کتابیں پڑھ کر جیلوں میں مسلمان ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے عقائد اور کردار کی اصلاح کی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے، وہ لوگ جو اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق اور کردار میں بھی نمایاں فرق آتا ہے۔ بلاشبہ امریکن جیلوں میں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ ایک جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا بہت خوبصورت تبصرہ ہے کہ جو شخص مسلمان ہو جاتا ہے وہ دوبارہ کبھی جیل میں نہیں آتا۔ میرے نزدیک آج کے دور میں دعوت کو پھیلانے کا خوبصورت ذریعہ کتابوں کی صورت میں ہے۔ الحمد للہ! دارالسلام اپنے میسر وسائل کے ساتھ اس دعوت کو پھیلانے میں مصروف عمل ہے۔

الحمد للہ! حافظ صاحب دین کے معاملے میں کھل کر خرچ کرتے ہیں۔ اپنی آمدنی کا معقول حصہ دینی کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ جب سے دارالسلام ہیوسٹن اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا ہے انھوں نے تنخواہ لینا چھوڑ دی ہے۔ جمعہ کا خطبہ اور دیگر دعوتی کام مفت کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے ایک اعزاز دیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ایک روز انھیں دارالسلام کے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بریف کیا تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلا:

﴿وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

”جو لوگ ہماری راہ میں محنت وکوشش کرتے ہیں، ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھلا دیں گے، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا ساتھی ہے۔“ [1]

---

① العنکبوت 69:29.

چینی زبان میں قرآن کریم کے ترجمے کی سرگزشت

یہ 2009ء کے ایام ہیں اور میں قرآن کریم کے چینی زبان میں ترجمے کی تیاری اور اشاعت کے سلسلے میں ان دنوں چین میں ہوں۔ اس وقت میں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ڈاکٹر صالح حبیب سے بات چیت کر رہا ہوں۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہیں، آج سے کم وبیش 80 برس قبل اس جگہ ایک مسجد تھی۔ چین میں جب کمیونسٹ انقلاب آیا تو اپنے ساتھ تمام مذہبی اقدار کو بہا کر لے گیا۔ یہ مسجد پاک وہند کے مسلمانوں نے بنائی تھی۔ دراصل یہ پورا علاقہ ایک زمانے میں برطانیہ کی عمل داری میں تھا۔ شنگھائی کوئی چھوٹا شہر تو نہیں۔ برادر عزیز اسماعیل بڑی تفصیل سے بتا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا: آپ اپنے اخوان اور دوستوں میں آئے ہیں۔ میں آپ کو اپنے ریسٹورنٹ میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ ویٹرز نے ٹیکسی سے میرا سامان پلک جھپکتے میں اتار کر ایک کمرے میں رکھ دیا۔ ڈاکٹر صالح حبیب مجھ سے گلے مل رہے تھے اور کہہ رہے تھے: آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے آج سے کئی سال پہلے دارالسلام ریاض میں ملاقات کی تھی۔ میں نے گرم جوشی سے اثبات میں جواب دیا۔

دوپہر کو جب ننگبو سے شنگھائی کے لیے روانہ ہوا تو برادرم یونس یول نے ہوٹل سے

نکلتے وقت مجھ سے ڈاکٹر صالح حبیب کا فون نمبر لیا۔ ان سے ایڈریس پوچھا، پھر اپنی گاڑی سے GPS نکالا اسے Set کیا اور میری گاڑی کے ڈیش بورڈ پر لگا دیا۔ پھر میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا: اب آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اس میں ایڈریس Set کر دیا ہے۔ ڈرائیور بغیر کسی مشکل کے آپ کو منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔

شنگھائی میں بہت بڑی اور بلند و بالا عمارات ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس شہر نے کتنی ترقی کی ہے۔ شہر کے وسط سے دریا اور نہریں گزرتی ہیں اور ان پر قائم کیے گئے پلوں پر ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ ہم جب روانہ ہوئے تو زوردار بارش ہو رہی تھی، جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے بارش کی شدت میں کمی آتی چلی گئی، جو بالآخر رک ہی گئی۔

یہ ایک مسلم ریسٹورنٹ ہے تھوڑی دیر کے بعد میں اور ڈاکٹر صالح کمرے میں بیٹھے اطمینان سے بات چیت کر رہے تھے۔

اس ہوٹل کا منیجر برادر اسماعیل مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہے۔ تھوڑی دیر میں کھانا آ گیا۔ چپاتی کھائے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ گرما گرم چپاتی اور مزے دار کھانا، اس دوران مسلمانوں کے احوال پر گفتگو کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔

قارئین کرام! پہلے آپ سے ڈاکٹر صالح حبیب اللہ کا تعارف کراتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں۔ بیجنگ سے کم و بیش ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر، شمال کی جانب ''لنچو'' نامی شہر ہے جس میں خاصی تعداد میں مسلمان بستے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اسی شہر کے باسی ہیں۔ وہ کراچی کی مشہور درس گاہ جامعہ دراسات اسلامیہ میں تین سال تک علم حاصل کرتے رہے ہیں۔ یہ 1987 کے وسط کی بات ہے۔ اسی دوران انھیں جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ میں داخلہ مل گیا۔ وہاں پر چار سال تک عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ملک

سعود یونیورسٹی ریاض میں داخلہ مل گیا اور وہاں سے دو سال میں ایم اے عربی کی ڈگری حاصل کی۔ اب ان کا رخ اپنے وطن کی طرف تھا، وہ اپنے آبائی شہر لنجو میں امام مسجد مقرر ہوئے۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے بتایا: چین میں امام کا تعین حکومت اور مسجد کے ہمسایوں کی رضامندی سے ہوتا ہے، مگر ان کو حکومت کی طرف سے کوئی مراعات یا تنخواہ نہیں ملتی۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب سے ایک اہم کام لینا تھا اور وہ یہ تھا کہ قرآن کریم کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب بخاری شریف کا ترجمہ اب تک چینی زبان میں نہیں ہوا تھا۔ یہ کام بڑا اہم اور بے حد ضروری تھا۔ اس اہم کام کا تقاضا تھا کہ آدمی ہر قسم کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر محض اسی کام میں لگ جائے، چنانچہ امامت سے استعفا دے کر ڈاکٹر موصوف بخاری شریف کے ترجمے میں لگ گئے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، مگر جن کی نیت خالص اور ارادے نیک ہوں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے راستے آسان فرما دیتا ہے۔ دس سال کے طویل عرصے میں بخاری شریف کا چینی زبان میں ترجمہ مکمل ہو گیا جو چار بڑی جلدوں پر مشتمل تھا۔ اب اس عظیم کام کو شائع کرنے کا مرحلہ درپیش تھا، مگر وسائل پاس نہ تھے، نہ ہی کوئی اشاعتی ادارہ اس کام کے لیے تیار تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی بندوبست کر دیا۔ بیجنگ میں ایک نیم سرکاری اشاعتی ادارہ ہے۔ ان سے بات کی گئی تو وہ تیار ہو گئے، چنانچہ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ صحیح بخاری کا چینی ترجمہ چار جلدوں میں شائع ہوا جو 1700 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز 24×17 سنٹی میٹر ہے۔ یہ صرف ترجمہ چینی زبان میں شائع ہوا ہے اس میں عربی عبارت شامل نہیں کی گئی۔ اس کا ریٹ 200RMB ہے۔ میں نے ان سے پوچھا:

ڈاکٹر صاحب! آپ نے اتنی محنت سے یہ کام کیا ہے تو اس ادارے نے آپ کو کوئی رائلٹی بھی ادا کی ہے؟ کہنے لگے: ہمارے لیے یہی بات بہت اہم ہے کہ انھوں نے اسے شائع کر دیا۔ اب دیکھیے نا! میں اسے مختلف مساجد اور لائبریریوں میں تقسیم بھی کر رہا ہوں اور فروخت بھی کر رہا ہوں۔ دس ہزار کی تعداد میں اگر صحیح بخاری مختلف اداروں میں پہنچ جائے تو یہ معمولی بات تو نہیں۔ ہاں انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں آپ کو بھی کچھ رائلٹی دی جائے گی۔ مگر ہمارا مطمح نظر اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

علم کے متلاشی صالح کو ابھی مسلسل آگے بڑھنا اور مزید علم حاصل کرنا تھا۔ اب انھوں نے شنگھائی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس یونیورسٹی میں طلبہ وطالبات کی تعداد 8 ہزار سے زائد ہے۔ معہد دراسات الشرق الاوسط جو یونیورسٹی کی ایک برانچ ہے، یہاں پر عربی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔ جس میں 200 سے زائد طلبہ وطالبات عربی پڑھ رہے ہیں۔ ان میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اسی ادارے کے شعبہ دراسات اسلامیہ میں 10 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں جن کے پاس پی ایچ ڈی کرنے کا موقع بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر صالح حبیب اللہ نے محض ایک ہفتہ پہلے 22 مئی 2009ء کو اسی یونیورسٹی سے دراسات اسلامیہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ہماری گفتگو جاری تھی کہ اچانک کانوں میں ایک خوبصورت آواز آئی: السلام علیکم! پلٹ کر دیکھا تو ہمارے دوست سلیمان صینی مجھے گلے لگا رہے تھے۔ وہ مجھے بتا رہے تھے: جب مجھے تمھارے آنے کا علم ہوا تو کھچتا چلا آیا۔ یہ دبلے پتلے جسم والا، علم وعمل کا آفتاب شخص میرے گہرے دوستوں میں سے ہے۔ وہ بیٹھے تو میں نے سوال کیا: اچھا تو یہ بتائیں کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے؟ ہماری گفتگو میں برادرم سلیمان بھی شامل ہو چکے

تھے۔

حکومتی اعداد وشمار کے مطابق 20 ملین ہے، مگر رابطہ عالم اسلامی کے نزدیک یہ تعداد 100 ملین ہے۔ ٹھیک ٹھیک اعداد وشمار تو کسی کے پاس نہیں مگر ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے حق میں دلائل ضرور ہیں۔ برادرم سلیمان اس مسئلے پر بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا: رابطہ عالم اسلامی نے 20 سال پیشتر جو اعداد وشمار شائع کیے تھے، ان کے مطابق مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ 70 ملین ہے۔

ہماری ٹیبل پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چینی چائے سے پیالہ بھر دیا جاتا تھا۔ اس ہوٹل کے منیجر اسماعیل پورا تھرماس بھر لائے تھے۔ ابلے ہوئے گرم پانی میں چائے کے تھوڑے سے پتے ڈال کر رکھ دیے جاتے ہیں، بس پانی کا رنگ اور ذائقہ تبدیل ہو گیا تو آپ کی چائے تیار ہے۔ اطباء کے مطابق یہ چائے صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ ڈاکٹر صالح کا کہنا تھا: میرے اندازے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد تیس ملین سے کم نہیں۔

چائنا میں مسلمانوں کو تمام حقوق حاصل ہیں۔ تعلیمی اداروں کے دروازے ان پر کھلے ہیں۔ وہ فوج سمیت کسی بھی ادارے میں ملازمت کا حق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا: اگر آپ کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو کیا حکومت سے اس کی اجازت لینا پڑتی ہے؟ کہنے لگے: ہاں! ایسا ضرور ہے کہ ہم کتاب کو حکومتی ادارے کے حوالے کرتے ہیں اور وہاں سے عموماً اجازت مل جاتی ہے۔ اگر حکومتی پالیسیوں پر تنقید نہ ہو تو پھر حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

ہماری آج کی اس میٹنگ کا سب سے اہم ایجنڈا قرآن کریم کا چینی زبان میں ترجمہ کروانا تھا۔ دارالسلام اپنی پالیسی کے مطابق دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں قرآن کریم کا

ترجمہ اور مختصر تفسیر شائع کر کے منظر عام پر لانا چاہتا ہے۔ چینی زبان کے ترجمے کا قرعہ برادرم ڈاکٹر صالح حبیب کے نام نکلا تھا۔ وہ اصولی طور پر تیار تھے۔ چینی زبان میں قرآن کریم کے متعدد تراجم موجود ہیں۔ مجمع الملک فہد نے بھی چینی زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے، جو کہ بڑا مقبول اور عمدہ ہے، مگر دارالسلام ایک ایسا ترجمہ لانا چاہتا ہے جس کے ساتھ مختصر تفسیر بھی ہو۔ ہماری خواہش تھی کہ تفسیر میں بخاری اور مسلم کی احادیث ڈال دی جائیں۔ انگلش زبان میں ڈاکٹر محسن خان کی محنت اور کوشش اس سلسلہ میں نہایت قابل قدر ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ دارالسلام نے اس ترجمے کو بڑے خوبصورت انداز میں شائع کر دیا ہے۔ ہماری گفتگو اپنے آخری مراحل کو پہنچ رہی تھی کہ نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں جائے نماز بچھے ہوئے تھے۔ برادر اسماعیل نے اذان کہی۔ اقامت کے بعد میزبانوں نے مجھے امامت کے لیے مصلے پر کھڑا کر دیا۔ میں قاری ہوں نہ حافظ اور نہ ہی امامت کرواتا ہوں۔ میں نے معذرت کی اور کہا: میں تو مسافر ہوں۔ آپ مقامی آدمی ہیں، آپ ہی جماعت کروائیں۔ مگر ان سب کا اشارہ میری ہی طرف تھا۔ میں نے جب جماعت شروع کی تو معاً خیال آیا کہ حسن اتفاق سے چین کی سرزمین پر امامت کا موقع ہے، معلوم نہیں پھر ایسا موقع آئے نہ آئے۔ اس کے بعد غیر ارادی طور پر میری آواز بلند ہوتی چلی گئی۔ آواز میں رقت آ گئی۔ خیال آیا کہ ممکن ہے کہ کل اللہ کے حضور یہی سجدے قبول ہو جائیں اور میری نجات کا سبب بن جائیں۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ.

میرا دوست، میرا بھائی محمد سلیمان صینی

محمد سلیمان صینی کا تعلق بھی لنجو سے ہے۔ یہ 1966ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ مدینہ یونیورسٹی کے کلیۃ الحدیث سے 1415ھ میں فارغ ہوئے۔تعلیم کے دوران بھی اور فراغت کے بعد بھی انھوں نے متعدد ادارے بنائے۔کویت کی جمعیۃ إحیاء التراث، نیز قطر، دوبئ اور سعودی عرب کے متعدد مخیّر حضرات کے تعاون سے انھوں بے حد کام کیا۔اس دور میں دعوتی سرگرمیوں پر آج سے کہیں زیادہ سختیاں تھیں،مگر انھوں نے نہایت حکمت سے آہستہ آہستہ کام کیا۔لنجو میں معہد الحرمین کے نام سے مدرسہ بنوایا۔اسی طرح لنجو میں ہی معہد الامام محمد بن اسماعیل بخاری قائم کیا۔ وہ زبردست خطیب ہیں ان کو ''لنشاء'' اور ''لنجو'' کی سب سے بڑی مساجد میں بطور خطیب مقرر کیا گیا۔لنجو شہر میں کم وبیش ایک ملین مسلمان آباد ہیں۔صرف اس شہر میں مساجد کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ اکثر مساجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی ہوتی ہے۔استاذ محمد سلیمان نے دعوتی سرگرمیوں کے لیے 50 سے زائد دعاۃ کا تقرر کر رکھا ہے۔

میرے عزیز اور گہرے دوست محمد سلیمان نے چین میں کم از کم 180 سے 190 مسجدیں بنوائی ہیں۔ڈاکٹر صالح حبیب اللہ ان کو شمس الائمہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

چائنا میں رہنے والے مسلمانوں میں کتاب وسنت کے حاملین کی بھی ایک معقول تعداد ہے۔ محترم سلیمان صینی اس تحریک کے ہراول دستے کے سربراہ ہیں۔ ان کا قد اور وزن اتنا کم ہے کہ آدمی انھیں بڑے آرام سے اٹھا سکتا ہے۔ ریاض میں متعدد بار ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ کھانا بہت کم کھاتے ہیں۔ چین میں جہاں بھی ان کی بنائی ہوئی کوئی مسجد نظر آتی، ہم جذباتی ہو جاتے اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے۔ اتنی خوبصورت مساجد اور پھر اتنی کم قیمت کہ جو 52 ہزار ریال سے شروع ہوتی ہے۔ کہنے لگے: ایک مسجد ایسی بھی ہے جو میں نے ایک فاعل الخیر کے تعاون سے 2 ملین ریال کی لاگت سے بنوائی ہے۔

ہانگ کانگ اور چین کے درمیان چھوٹا سا سمندر پڑتا ہے، جسے بذریعہ ٹرین بھی عبور کیا جا سکتا ہے، بس کے ذریعے بھی سفر کیا جا سکتا ہے اور سمندر کے سینے پر چھوٹے جہازوں پر بیٹھ کر بھی جا سکتے ہیں۔ عموماً ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے درمیان یہ سفر طے ہو جاتا ہے۔ مسافر اگر زیادہ نہ ہوں اور کسٹم آفس پر رش کم رہے تو یہ فاصلہ آدھے گھنٹے میں بھی طے ہو سکتا ہے، ورنہ بعض اوقات دو گھنٹے بھی لگ جاتے ہیں۔ جب میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو اس وقت پاکستانیوں کے لیے چین سے ہانگ کانگ جانے کے لیے ویزا لینا ضروری نہ تھا۔ ائرپورٹ پر ہی انٹری ہو جاتی تھی۔ وہاں سے نکل کر سیدھے بس سٹاپ پر آتے تو ''گنزاؤ'' کے لیے بسیں تیار کھڑی ملتی تھیں۔ دو تین گھنٹوں میں آپ گنزاؤ پہنچ جاتے تھے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب اہل پاکستان کے لیے ہانگ کانگ کے ویزے کا طریق کار نہایت دشوار بنا دیا گیا ہے۔ اب انھیں ویزے کے لیے ایک لمبی مدت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں ان کے پاسپورٹ پر اگر ہانگ کانگ کا ویزا نہ لگا ہو تو

انھیں ہانگ کانگ ائرپورٹ بھی استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔

قرآن کریم کے چینی زبان میں ترجمے کے ہمارے عظیم منصوبے اور اس دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں میرے دوست شیخ محمد سلیمان نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ شیخ محمد سلیمان صینی ایک چلتا پھرتا مدرسہ ہیں۔ چند برس قبل انھیں چینی حکومت نے گرفتار کر لیا تھا۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو سخت پریشانی ہوئی، دعاؤں کا سہارا لیا، ان کے لیے بے شمار ہاتھ بارگاہ الٰہی میں اٹھ گئے۔ بتایا گیا کہ ان کو فون بھی نہ کریں، پھر کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ وہ رہا ہو کر آ گئے ہیں۔ میں جب چین گیا تو پہنچتے ہی ان کو فون کیا، حال احوال پوچھا، کہنے لگے: میں اس وقت ایک عربی ریسٹورنٹ میں موجود ہوں، فوراً آ جائیں، کھانا بھی کھائیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ مجھے کھانے سے کہیں زیادہ ملاقات کی تڑپ تھی، فوراً ٹیکسی میں بیٹھا اور منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیارِ غیر میں جہاں کی زبان آدمی کو نہ آتی ہو ایسی مشکلات کو موبائل فون نے بہت آسان کر دیا ہے۔ آپ ٹیکسی میں سوار ہوں، میزبان کا نمبر ملا کر موبائل فون ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیں، میزبان خود ہی ڈرائیور کو منزل مقصود کا پتہ سمجھا لے گا اور آپ تھوڑی ہی دیر میں خود کو اپنے میزبان کے ہاں پائیں گے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آپ میزبان کا وزٹنگ کارڈ ڈرائیور کو دے دیں وہ آپ کو منزل مقصود پر پہنچا دے گا۔ واپسی کے سفر میں تو اور زیادہ آسانی ہوتی ہے، آپ ٹیکسی ڈرائیور کو ہوٹل کا کارڈ دکھلا دیں، وہ آپ کو ہوٹل تک لے جائے گا۔ یہاں ہر ٹیکسی میں میٹر لگا ہوتا ہے، آپ مسافت کے اعتبار سے کرایہ ادا کرتے ہیں۔ ایک سے دوسرے شہر جائیں تو آپ کو خاصا ٹول ٹیکس بھی دینا ہوتا ہے۔

میں نے بھی یہی کیا، ٹیکسی میں بیٹھ کر محمد سلیمان کا فون ملایا اور ڈرائیور کو دے دیا۔ اس

نے اثبات میں سر ہلا کر ظاہر کیا کہ اسے منزل کا پتہ معلوم ہو گیا ہے۔ ریسٹورنٹ میں پہنچے تو شیخ محمد سلیمان دروازے پر کھڑے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ اپنے اس عزیز دوست پر نگاہ پڑتے ہی میری آنکھیں فرط مسرت سے ڈبڈبانے لگیں۔ میں اکثر اس سے کہا کرتا ہوں: میری آپ کے ساتھ محبت خالصتاً اللہ کے لیے ہے، نہ آپ نے مجھ سے کبھی کوئی مادی فائدہ حاصل کیا، نہ میں نے آپ سے کچھ لیا۔ کوئی دنیاوی لالچ نہیں، اس لیے میں قیامت کے روز اللہ کے ہاں یہ عرض کروں گا:

پروردگار! میں تیرے اس بندے سے صرف تیری ذات کے لیے محبت کرتا تھا، اب تو اپنے وعدے کے مطابق ہم گناہگاروں کو اپنے عرش عظیم کا سایہ نصیب فرما۔

> چین میں مذہبی آگاہی بہت کم ہے، مسلمانوں کی اکثریت محض نام کی مسلمان ہے، ان کو دینی لٹریچر کی بے حد ضرورت ہے۔

جہاں تک چین میں مذہبی آگاہی کا تعلق ہے تو یہ بہت کم ہے، مسلمانوں کی اکثریت محض نام کی مسلمان ہے، ان کو دینی لٹریچر کی بے حد ضرورت ہے۔ گزشتہ کئی سالوں میں متعدد مسلمانوں سے میرا رابطہ ہوا، ان سے ملاقات ہوئی، مگر ان کی دینی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عورتیں یا تو پردہ کرتی ہی نہیں یا صرف جسم ڈھانپنے کی حد تک کرتی ہیں۔ نقاب کا تصور بہت کم ہے۔ ہاں بعض علاقوں میں کچھ خواتین نقاب بھی استعمال کرتی ہیں، البتہ مسلمان علاقوں میں حجاب عام ہے۔ جن علاقوں میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا، وہاں تو مسلمان عورتوں کو میں نے حجاب کے بغیر ہی پایا۔ مسلم ریسٹورنٹس میں بالعموم مسلمان لڑکیاں کام کرتی ہیں، مگر بغیر کسی پردے کے، حتی کہ ان کے اور غیر مسلم خواتین

کے درمیان فرق کرنا بھی مشکل ہے۔ مجھے ایک ریسٹورنٹ پر جانے کا اتفاق ہوا، ایک لڑکی نے مجھے آ کر سلام کیا اور بتایا: میں مسلمان ہوں۔ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ جب کھانا پیش کرنے لگی تو ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی: میرا نام عدیلہ ہے۔ میرا بوائے فرینڈ ایک عرب ملک کا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔ میں نے کہا: اسلام میں تو بوائے فرینڈ کا کوئی تصور نہیں۔ پھر میں نے اس سے پوچھا: بیٹی! یہ بتاؤ کیا تم نماز پڑھتی ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے اسے سمجھایا: تم مسلمان ہو، تمھارا اخلاق و کردار دوسروں سے بہت اعلیٰ اور بہتر ہونا چاہیے۔ میرا اس سے کہنا تھا: تمھارے والدین نے اتنے دور دراز علاقے میں تمھیں پیسہ کمانے کے لیے بھیج رکھا ہے، اسلام میں اس کی اجازت کہاں ہے؟ اس نے میرے موقف سے اتفاق کیا اور اس صورت حال پر ندامت کا اظہار کیا۔ بہت سارے لوگوں کو میں نے کلمۂ توحید پڑھنے کے لیے کہا تو بڑی مشکل سے اس کی ادائیگی کر سکے۔

چین میں جہاں عدیلہ جیسی لڑکیاں ہیں وہیں مریم جیسی لڑکیاں بھی ہیں جو بہت عزم وجرأت سے اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ میں ننگبو کے سوفٹیل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ صبح کا ناشتہ ہوٹل والوں کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ ایک دن ناشتہ کر کے لفٹ کی طرف جا رہا تھا کہ یونس پول کہنے لگا: استقبالیہ پر جو لڑکی کھڑی ہے وہ مسلمان ہے۔ میں نے پوچھا: تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ کہنے لگا: آپ نے غور نہیں کیا، وہ آپ کو السلام علیکم کہہ رہی تھی۔ یہ یہاں کی عام سی روٹین ہے کہ جب آپ ریسٹورنٹ میں داخل ہوں گے تو استقبالیہ پر کھڑی کئی لڑکیاں آپ کو جھک کر سلام پیش کریں گی اور کہیں گی: آپ کی تشریف آوری کا بہت بہت شکریہ، آئندہ بھی تشریف لائیے گا، مگر مسلم لڑکیاں آپ کا

استقبال السلام علیکم کے کلمات سے کرتی ہیں۔

اس روز ہم جلدی میں تھے میں نے کہا: کل اس بچی سے بات کریں گے۔

اگلے روز استقبالیہ پر لڑکی نے ہمیں السلام علیکم کہا، میں تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اس کا کہنا تھا: میرا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے۔ نام پوچھا تو کہنے لگی: میرا نام مریم ہے۔ میں بی اے کر چکی ہوں۔ وہ بڑی اچھی انگلش بول رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا: میں اس ہوٹل میں بطور ٹرینی کام کر رہی ہوں، مگر مجھے یہاں کا ماحول پسند نہیں۔ یہاں ہمیں گاہکوں کو حرام اشیاء بھی مہیا کرنا پڑتی ہیں۔ میرا مذہب ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا۔ میں نے کہا: کلمۂ توحید سناؤ۔ اس نے فوراً کہہ سنایا۔ میں نے اسلام کے بارے میں چند ابتدائی سوالات کیے جن کا اس نے بڑی حد تک صحیح جواب دیا۔ میں نے پوچھا: نماز پڑھتی ہو؟ کہنے لگی: کبھی کبھار۔ میں نے کہا: بیٹی! یہ تو ہر مسلمان پر فرض ہے۔

کہنے لگی: ہماری کمپنی نے جو رہائش دے رکھی ہے اس میں ہم کئی لڑکیاں ایک کمرے میں اکٹھی رہتی ہیں۔ اوپر نیچے بیڈ لگے ہوئے ہیں۔ میرا بیڈ درمیان میں ہے۔ میں صرف سو سکتی ہوں۔ کھڑی ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ میں نے مشورہ دیا: تم بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرو۔ کہنے لگی: میں حتی الامکان نماز پڑھتی ہوں۔ میں نے سوال کیا: آج صبح کی نماز پڑھی تھی؟ کہنے لگی: نہیں۔ اچھا گزرے ہوئے کل؟ کہنے لگی: ہاں، پھر اس نے کہا: آپ میرے لیے کسی جگہ نوکری کا بندوبست کروا دیں۔ میں نے یونس پول کی طرف دیکھا اور اس سے کہا: کیا آپ کے ادارے میں اس بچی کے لیے کوئی جگہ بن سکتی ہے؟ انھوں نے کہا: میں فوری طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا، ہم اپنی صورت حال کا جائزہ لے کر ہی کچھ کہہ سکیں گے۔

بہر حال مریم سے گفتگو کر کے احساس ہوا کہ اس لادین معاشرے میں بھی اکثر

مسلمان بچیاں اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔ میں اس کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کرتا ہوا روانہ ہوا کہ اللہ اس کو اچھا ساتھی عطا فرمائے اور اس کی عزت وعفت کی حفاظت فرمائے۔

چین میں مسلمانوں کے حوالے سے جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ یہاں تعلیم اور روزگار کے شعبوں میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ اس ملک میں مسلمان ڈاکٹرز بھی ہیں، انجینئرز بھی ہیں۔ ان کو کسی بھی جگہ نوکری مل جاتی ہے۔ فوج میں بھی مسلمان موجود ہیں۔ اسی طرح پولیس اور دیگر محکموں میں بھی مسلمان موجود ہیں۔ ڈاکٹر صالح نے یہ انکشاف بھی کیا کہ چائنا کے نائب وزیراعظم مسلمان ہیں۔ مجھے اس بات پر یقین تو نہیں آیا، مگر ان کا اس پر اصرار تھا۔ میں نے نام پوچھا تو انھوں نے جو نام بتایا مجھے اس کی سمجھ نہ آئی۔ میں نے کہا: چلیے مجھے لکھ کر بتا دیں۔ قارئین کرام! جو نام ڈاکٹر صالح نے لکھ کر دیا وہ میں آپ کے لیے اسی طرح لکھے دیتا ہوں۔ وزیر کا نام ''ہوئی لیانگ یوذ'' تھا۔

وہ بتا رہے تھے کہ جب سعودی عرب کے شاہ فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں چینی حکومت کی نمائندگی اسی مسلمان وزیر نے کی تھی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد 2011ء میں ہم نے ویزا بھیج کر ڈاکٹر صالح حبیب اللہ کو ریاض بلوا لیا۔ ان کے ساتھ متعدد مجالس میں ہم نے چینی زبان میں قرآن کریم کے ترجمے کے کام کو فائنل کر لیا۔ اپنے قیام کے دوران انھوں نے میری تالیف ''رسول اللہ ﷺ کے دو سو سنہرے ارشادات'' کا چینی زبان میں ترجمہ بھی کر دیا۔ اس لحاظ سے ان کی ریاض آمد ہمارے لیے بہت مفید رہی۔

مولانا سے کافی باتیں ہوئیں اور پھر ان سے رابطہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ مدینہ یونیورسٹی کے ''مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ'' میں علوم سیرت کمیٹی کے رکن تھے اور دیگر رفقائے کار کے ساتھ ریسرچ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک ملاقات میں میں نے ان سے گزارش کی کہ اسکول کے طلبہ کے لیے سیرت پاک پر ایک متوسط حجم کی کتاب تصنیف کریں جو میٹرک تک کے طلباء کو بطور سلیبس پڑھائی جا سکے۔ انھوں نے میری اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا اور عربی زبان میں "رَوْضَةُ الْأَنْوَارِفِي سِيرَةِ النَّبِيِّ الْمُخْتَارِ" کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ میری خواہش تھی کہ اس کتاب کو اردو زبان میں بھی منتقل ہونا چاہیے۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس دوران مولانا محترم ریاض تشریف لائے۔ دوران ملاقات میں نے اردو ترجمے کی فرمائش کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ کھولا اور اردو ترجمے کا مسودہ یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دیا: مجھے معلوم تھا تم اس کا مطالبہ کرو گے۔ ''تجلیات نبوت'' کے نام سے یہ کتاب دارالسلام نے نہایت محبت سے شائع کی۔ دارالسلام نے ''تجلیات نبوت'' کا انگریزی سمیت دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کروا کے شائع کیا۔

مولانا کو جس کتاب نے دائمی شہرت عطا کی وہ ان کی سیرت نبوی ﷺ پر شہرہ آفاق تصنیف ''الرحیق المختوم'' ہے۔ ربیع الاول 1396ھ (مارچ 1976ء) میں کراچی میں عالمی سیرت کانفرنس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی نے سیرت کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جامعہ سلفیہ کے طلبہ اور بعض اقارب کے بے حد اصرار پر مولانا نے بھی عربی زبان میں مقالہ لکھا جس کا نام الرحیق المختوم رکھا، جس کا اردو میں معنی ''مہر لگی ہوئی مصفا شراب'' بنتا ہے۔

مولانا سے کافی باتیں ہوئیں اور پھر ان سے رابطہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ مدینہ یونیورسٹی کے ''مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ'' میں علوم سیرت کمیٹی کے رکن تھے اور دیگر رفقائے کار کے ساتھ ریسرچ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک ملاقات میں میں نے ان سے گزارش کی کہ اسکول کے طلبہ کے لیے سیرت پاک پر ایک متوسط حجم کی کتاب تصنیف کریں جو میٹرک تک کے طلباء کو بطور سلیبس پڑھائی جا سکے۔ انھوں نے میری اس تجویز کو شرف قبولیت بخشا اور عربی زبان میں «رَوْضَةُ الْأَنْوَارِ فِي سِيرَةِ النَّبِيِّ الْمُخْتَارِ» کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی۔ میری خواہش تھی کہ اس کتاب کو اردو زبان میں بھی منتقل ہونا چاہیے۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس دوران مولانا محترم ریاض تشریف لائے۔ دوران ملاقات میں نے اردو ترجمے کی فرمائش کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنا بیگ کھولا اور اردو ترجمے کا مسودہ یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دیا: مجھے معلوم تھا تم اس کا مطالبہ کرو گے۔ ''تجلیات نبوت'' کے نام سے یہ کتاب دارالسلام نے نہایت محبت سے شائع کی۔ دارالسلام نے ''تجلیات نبوت'' کا انگریزی سمیت دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کروا کے شائع کیا۔

مولانا کو جس کتاب نے دائمی شہرت عطا کی وہ ان کی سیرت نبوی ﷺ پر شہرہ آفاق تصنیف ''الرحیق المختوم'' ہے۔ ربیع الاول 1396ھ (مارچ 1976ء) میں کراچی میں عالمی سیرت کانفرنس کے اختتام پر رابطہ عالم اسلامی نے سیرت کے موضوع پر مقالہ نویسی کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جامعہ سلفیہ کے طلبہ اور بعض اقارب کے بے حد اصرار پر مولانا نے بھی عربی زبان میں مقالہ لکھا جس کا نام الرحیق المختوم رکھا، جس کا اردو میں معنی ''مہر لگی ہوئی مصفا شراب'' بنتا ہے۔

> میں نہایت محبت سے اس عظیم شخصیت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ جن کی کتاب ''الرحیق المختوم'' نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔

الرحیق المختوم کی اشاعت کے بعد مدینہ یونیورسٹی نے انھیں ہندوستان سے مدینہ منورہ بلوایا اور وہ مرکز «خِدْمَةُ السُّنَّةِ وَالسِّيرَةِ النَّبَوِيَّةِ» میں بطور ریسرچ فیلو کام کرتے رہے، اس دوران فارغ اوقات میں انھوں نے کئی کتابوں کی تالیف اور ترجمے کا کام بھی کیا۔ میری درخواست پر صحیح مسلم کی شرح «مِنَّةُ الْمُنْعِمِ فِي شَرْحِ صَحِيحِ مُسْلِمٍ» تالیف فرمائی، جو دارالسلام نے نہایت خوبصورت انداز میں شائع کی۔ انھوں نے حدیث کی مشہور کتاب ''بلوغ المرام'' کی شرح عربی زبان میں لکھی، جس کے مختلف زبانوں میں تراجم شائع ہوئے۔

یہ دسمبر 1998ء کی بات ہے کہ ایک دن مولانا کا مجھے فون آیا، وہ میرے ساتھ خاصے بے تکلف تھے، ہر قسم کا مشورہ و گفتگو کرتے تھے، کہنے لگے: میرا مدینہ یونیورسٹی کے ساتھ معاہدہ ختم ہوا چاہتا ہے، مگر میں بلاد حرمین میں مزید قیام کا متمنی ہوں۔

میں نے ایک لمحہ سوچا اور عرض کی: آپ دارالسلام کی علمی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے ہمارے پاس تشریف لے آئیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میری اس دعوت کو شرف قبولیت بخشیں گے، میں دعائیں مانگتا رہا اور بالآخر میری دعائیں رنگ لائیں۔ مولانا دارالسلام کے ساتھ منسلک ہو گئے اور کم و بیش 8 برس تک منسلک رہے، اس دوران انھوں نے بہت سی کتابوں کا مراجعہ کیا۔

سب سے اہم کاموں میں کتب ستہ: بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو ایک جلد میں لانے کا کام تھا۔ مولانا موصوف کو علمی کمیٹی کا سربراہ بنایا گیا اور ریکارڈ وقت میں ایسا نسخہ اٹلی سے شائع ہوا جس کے 2772 صفحات ہیں، جو کتب ستہ کے اب تک شائع ہونے والے نسخوں میں سب سے زیادہ صحیح نسخہ تھا۔

مولانا نے تاریخ مکہ مکرمہ اور تاریخ مدینہ منورہ پر بھی کام کیا اور پھر تفسیر ابن کثیر کے اختصار پر علمی کام تھا۔ اس پر اصل کام مولانا ابوالاشبال مکی ﷾ نے کیا۔ اس کے مراجعہ پر مولانا موصوف نے خوب محنت کی اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ اسی طرح تفسیر احسن البیان کے تفسیری نوٹس پر بھی مولانا نے مراجعہ فرمایا اور گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ میں نے مولانا کو بیک وقت ایک مفسر، محدث، سیرت نگار، مورخ، مناظر اور فتویٰ نویس کے طور پر دیکھا ہے۔ ان کا علم بڑا پختہ اور دماغ بہت حاضر تھا۔ ہم نے جب بھی کسی مسئلے میں ان سے رجوع کیا، چند لمحات کے اندر مولانا نے اس کا شافی جواب فراہم کر دیا۔ وہ اپنے کام سے غرض رکھتے، عام مؤلفین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیز کام کرتے تھے، ان کا قلم بہت تیز چلتا تھا، مگر اتنا خوبصورت لکھتے کہ بہت کم مصنف اتنا پیارا لکھتے ہوں گے، سیرت کے حوالے سے وہ ایک اتھارٹی تھے، تاریخ اسلام پر اور تاریخی اسلامی مقامات پر ان کی گہری نظر تھی۔

ان کی وفات سے عالم اسلام بلاشبہ ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہوگیا، ہر فرد بشر کے لیے موت کا وقت مقرر ہے، یکم دسمبر 2006ء جمعہ کے روز تین بجے سہ پہر انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح علم وعمل کا یہ آفتاب مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی ہندوستان میں غروب ہوگیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

میرا بہت ہی پیارا دوست...... یاسر طباع

یاسر طباع سے میری پہلی ملاقات 1992ء میں دارالصحراء کے عصام الدین التل کی وساطت سے ہوئی تھی۔

سعودی عرب میں رہتے ہوئے سوریا کے ویزا کا حصول کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہوتا۔ بڑے آرام سے سوریا اور لبنان کا ویزا لگ گیا اور میں دمشق کے سفر کے لیے تیار ہوگیا۔ ہر چند کہ میرے پاس ٹکٹ اور وہاں کے اخراجات کے لیے رقم موجود تھی، مگر پھر بھی میری خواہش تھی کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ سفر کے اخراجات نکل آئیں۔ میں نے مختلف لوگوں کو بتایا ہوا تھا کہ میں دمشق اور بیروت جا رہا ہوں۔ اسی دوران ایک دن شیخ عبداللہ المعتاز سے سفر کا ذکر کیا تو کہنے لگے: ہم قرآن پاک کے آخری تین پارے ایک لاکھ تعداد میں چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں جو کہ دنیا کے مختلف ممالک میں مفت تقسیم کیے جائیں گے۔ یہاں اس کی طباعت خاصی مہنگی ہے۔ بیروت جا رہے ہو، انھوں نے اپنا ٹارگٹ دیتے ہوئے کہا: اگر تم اس ریٹ میں چھپوا دو تو تمھیں پانچ ہزار ریال بطور انعام دیے جائیں گے۔ میں نے کہا: ان شاءاللہ! اس سے کم ریٹ میں ہی چھپ جائیں گے۔ آخری تین پاروں کا ایک لاکھ کی تعداد میں طباعت کا آرڈر میری جیب میں تھا۔

زادِراہ بھی مل گیا، سفر کے لیے اتنے اخراجات کافی تھے۔ میں یہ آرڈر ساتھ لیے خوشی خوشی دمشق روانہ ہو گیا۔ ایک آدھ دن دمشق کی سیاحت میں گزرا۔ نبیل نے بھی گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ اسی دوران کسی نے بتایا کہ بیروت میں پرنٹنگ سستی ہے اور اس کے لیے یاسر طباع کا نام لیا کہ اس سے رابطہ کرو۔

دمشق کوئی زیادہ بڑا شہر نہیں۔ سارے ہی پبلشرز شہر کے وسط میں حلبونی کے علاقے میں ہیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی دکان میں یاسر طباع سے ملاقات ہوگئی۔ خوبصورت گورے رنگ کا یاسر مجھ سے عمر میں پانچ چھ برس چھوٹا تھا۔ قدرے فربہ جسم کا یاسر گزشتہ آٹھ یا دس سال سے طباعت کی مارکیٹ سے منسلک ہے۔ اصل کام بطور ایجنٹ تھا۔

میں نے دو تین دن مزید دمشق میں گزارے۔ یاسر کی چھوٹی سی دکان ایک تنگ سی گلی کے اندر تھی۔ اس میں ایک کرسی، کرسی کے سامنے چھوٹا سا میز اور مہمانوں کے لیے دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز کی دراز کے اندر حسابات کا ایک رجسٹر تھا۔ دکان کی دیواروں پر شیلف بنے ہوئے تھے۔ جن پر نہ بکنے والی کتب بڑی بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ تھا دارالفیحاء جس سے آگے چل کر ہم نے سارا کاروبار کیا۔ اگر میں جائزہ لوں تو دکان کے سارے سامان کی کل مالیت ہزار ڈالر سے زیادہ نہ تھی۔ یاسر ہنس مکھ اور اچھی طبیعت کا آدمی تھا۔ مارکیٹ میں اس کی اچھی شہرت تھی۔ ہر کوئی اس کی تعریف کرتا تھا کہ معاملات میں بالکل کھرا اور صحیح آدمی ہے۔

ہم دونوں اگلے دن صبح سویرے دمشق سے بیروت کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیروت جانے کے لیے تین سے چار گھنٹے درکار تھے۔ بیروت اپنی اٹھارہ سالہ خانہ جنگی سے بمشکل امن کی طرف لوٹا تھا۔ شامی فوج نے بڑی مشکل سے وہاں امن قائم کیا۔ متحارب گروہوں

کے مسلح تصادم کی وجہ سے لاکھوں انسان موت کے منہ میں جا چکے تھے۔لڑائی مسلمانوں ،عیسائیوں ،شیعہ اور مختلف گروپوں کے درمیان ہوتی رہتی تھی۔ نہ مارنے والے کو معلوم ہوتا کہ میں کیوں قتل کر رہا ہوں اور نہ مرنے والے کو پتہ ہوتا کہ اسے کیوں قتل کیا جا رہا ہے۔اس جنگ میں بے تحاشا اسلحہ استعمال ہوا۔بیروت کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔سڑکیں ٹوٹی پھوٹی تھیں، جا بجا چوکیاں قائم کی گئی تھیں جہاں ہر آنے جانے والی گاڑی کی تلاشی لی جاتی تھی۔

شام پر اس وقت حافظ الاسد کی حکومت تھی۔ رشوت کا چلن عام تھا۔ پولیس اور فوج کے ملازمین کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ وہ اپنے اخراجات پورے ہی نہیں کر سکتے تھے۔ہم نے دمشق سے ٹیکسی کروائی اور صبح سویرے چل دیے۔میرے پاکستانی ہونے کی بنا پر سختی سے میری تلاشی لی گئی اور میرے پاسپورٹ کو خوب غور سے دیکھا گیا،مگر ویزا موجود تھا اور میں چند دن دمشق میں ٹھہر بھی چکا تھا۔شامی پاسپورٹ کے حامل کے لیے لبنان کے ویزے کی ضرورت نہیں ہے۔

جب میں بیروت میں داخل ہوا تو اکثر عمارتیں تباہ شدہ نظر آئیں۔ بلڈنگز میں ہزاروں کی تعداد میں گولیوں کے نشانات نظر آئے۔سڑکوں پر جا بجا فوجی اسلحہ لیے پھر رہے تھے، جن میں اکثریت شامی فوجیوں کی تھی۔ چونکہ شامی فوجیوں نے امن قائم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا، اس لیے شامی لوگوں کو لبنان والے نجات دہندہ کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔جگہ جگہ فوجیوں کی چیک پوسٹیں تھیں۔گاڑیوں کی لمبی قطاریں تفتیش کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔وہ سفر جو منٹوں کا تھا گھنٹوں میں طے ہو رہا تھا۔

یاسر مجھے راستے میں بیروت کے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔ مجھے بڑا شوق تھا کہ

میں دارالفکر کے دفاتر کا دورہ کروں۔ میں نے یاسر سے کہا: مجھے دارالفکر لے چلو۔ ہم سارا دن مختلف پریس دیکھتے رہے میرا تصور تھا کہ بیروت میں بہت بڑے بڑے پریس ہوں گے، مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ پاکستان کی طرز پر یہاں پر بھی بعض ادارے صرف فلمیں اور پلیٹیں بناتے ہیں۔ دو تین مشینوں پر مشتمل پریس صرف کتابیں شائع کرتا اور فولڈنگ کرتا ہے اور پھر تجلید کے لیے الگ سے ادارے ہیں۔ بیروت میں بلاشبہ یہ انڈسٹری بہت پرانی ہے۔ عربی کتابوں کا یہ گھر مانا جاتا ہے۔ درجنوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے ادارے ہیں جو سالانہ سیکڑوں نئی کتب شائع کرتے ہیں۔ اس ملک میں کتب کی فروخت تو بہت کم ہے، مگر کتب کی پروڈکشن میں یہ ملک بہت آگے ہے۔ اس دور میں کمپیوٹر اتنا عام نہ تھا۔ کتابوں کی طباعت میں کمپوزنگ، تصحیح اور پھر فائنل پروف کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہہ لیں کہ 50% ویلیو طباعت اور بائنڈنگ کی ہوتی ہے۔ پھر اصل چیز کتاب کی فنشنگ ہوتی ہے اور بیروت میں یہی چیز نمایاں ہے۔ پرنٹنگ کے لیے پیپر یہاں بھی باہر سے آتا ہے۔ چونکہ پیپر کی کھپت بہت زیادہ ہے، اس لیے بڑی بڑی پیپر کمپنیوں کے ایجنٹ یہاں دفتر کھول کر بیٹھے ہیں۔ یہ واقعی بڑے خوبصورت دفاتر ہیں۔ ان کا سٹاف عموماً لڑکیوں پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم ان کے انچارج ہمیشہ مرد ہی نظر آئے۔

میں نے بار بار یاسر سے کہا: دارالفکر چلو، جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے ڈرائیور سے ایک طرف جانے کے لیے کہا۔ یہاں میں یہ واضح کردوں کہ ہم نے صبح سویرے پورے دن کے لیے ٹیکسی لے لی تھی اور وہ ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہا تھا۔ عموماً یہاں ٹیکسیاں مرسیڈیز گاڑیاں تھیں۔ ہم دارالفکر کے مرکزی دفتر پہنچے تو

استقبال پر دو خوبصورت ترین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا: اچھا! تو یہ ہے ان کی فکر کا خلاصہ۔ چند منٹ رکنے کے بعد میں نے یاسر سے کہا: یاسر! چلو واپس چلتے ہیں۔ کہنے لگا: تمھیں تو بڑا شوق تھا۔ میں نے کہا: ان کی فکر دیکھ لی ہے، اب مجھے یہاں مزید رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس دورے میں مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ عربی کتب کی اشاعت میں بعض عیسائی اور شیعہ ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔ سنی اداروں کی کمی ہے، تاہم دار ابن حزم، دار العلمیہ اور المکتب الاسلامی جیسے ادارے بلاشبہ اسلامی لٹریچر کو پھیلانے میں بہت آگے ہیں۔ مختلف اداروں کو وزٹ کرنے کے بعد میرے ارادوں کو جلا ملی کہ اس میدان میں ابھی بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں اکثر اداروں کے قیام کا مقصد صرف پیسہ بنانا ہے اور وہ بلاشبہ بنا رہے ہیں، خوب کما رہے ہیں۔ مڈل ایسٹ اور بطور خاص سعودی عرب بہت بڑی مارکیٹ ہے۔

اس سفر کے دوران میرا بیروت میں قیام دو یا تین روز کا تھا، اس سے پہلے کبھی اتنا طویل قیام نہ ہوا تھا۔ یاسر نے میرا کام ایک پریس کے حوالے کیا۔ میں کچھ مبلغ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس طرح یاسر کے ساتھ کام کا آغاز ہوا۔

ہمارا پہلا ہی کام نہایت خوبصورت بروقت اور اعلیٰ کوالٹی کا حامل تھا۔ جن کا کام تھا وہ بہت خوش ہوئے اور میرا حوصلہ بڑھتا چلا گیا۔ یاسر کی ایک بڑی خوبی اس کی ایمانداری تھی۔ یہ شخص نہایت کریم اور سخی ہے، اس کا ہاتھ بڑا کھلا ہے۔ کھانے کی ٹیبل پر بیٹھتے تو انواع واقسام کے کھانوں کا آرڈر دیتا۔ خود بھی خوش خوراک ہے اور دوسروں کو بھی کھلانے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ بیروت خاصا مہنگا ملک ہے، بطور خاص آپ بڑے ہوٹلوں میں

چلے جائیں تو اس وقت کم از کم 25 ڈالر ایک شخص کے کھانے کا خرچ تھا۔ جب یہ سطور لکھ رہا ہوں تو اب یہ خرچ 100 ڈالر فی آدمی تک پہنچ چکا ہے۔ بیروت میں چونکہ اچھے کھانوں کے ہوٹل عیسائیوں کے تھے، اس لیے میں وہاں صرف فش پر گزارا کرتا تھا۔ لیکن یہاں ہوٹل میں جو پروٹوکول آپ کو دیا جاتا ہے میری ذاتی رائے میں شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں دیا جاتا ہوگا۔ بیروت ایک مدت تک فرنچ کالونی رہا ہے۔ یہاں کے لوگ عموماً فرنچ زبان بولتے ہیں۔ انگلش بولنے کا رواج کم ہے۔ عربی زبان بھی عامیانہ درجے کی بولی جاتی ہے۔ فصیح عربی بولنے کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ مقامی لوگوں کی عربی ہم جیسے لوگوں کے سر سے گزر جاتی ہے، تاہم ائمہ مساجد کے خطبات سننے کا اتفاق ہوا وہ بڑی واضح اور فصیح زبان بولتے ہیں۔

لبنانی قوم بلا کی ذہین اور محنتی ہے۔ ان کی شرح خواندگی سو فی صد ہو چکی ہوگی۔ مجھے بیروت جانے کا اتنی مرتبہ اتفاق ہوا ہے کہ گن نہیں سکتا۔ گزشتہ بیس سالوں میں تقریبا چالیس مرتبہ ضرور بیروت گیا ہوں گا۔

بہت مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ریاض سے دمشق تک تو ہوائی جہاز کے ذریعے گیا وہاں پلیٹ میکرز کے پاس وقت گزارا، کام دیکھا، بطور خاص فلموں کی چیکنگ کی اور پھر بیروت کی طرف بذریعہ ٹیکسی جانا ہوا۔

ہم اپنے کام کی فلمیں شروع میں دمشق سے بنواتے تھے۔ اندرون لاہور کی طرح دمشق کے وسط میں بہت سارے ادارے زینکوگرافی یعنی پلیٹ اور فلم میکنگ کا کام کرتے ہیں۔ ہمارا واسطہ جس زینکوگراف سے تھا۔ یہ نام کا بھی شریف تھا اور کام کا بھی شریف تھا۔ شام کے لوگ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ گورے چٹے رنگ کا شریف اپنے کام

کا بڑا ماہر تھا۔ یہ آرٹسٹ تھا، طباعت سے قبل ہونے والے اس کام کو پری پریس ورک کہا جاتا ہے۔ یعنی پریس جانے سے پہلے کے مراحل یہاں طے ہوتے ہیں۔ یہ کام بڑا اہم اور ذمہ داری کا ہے۔ شریف کا اختصاص قرآن کریم کے کام میں ہے۔ مختلف سائزوں میں قرآن پاک کا کام بڑے خوبصورت انداز میں کرتا ہے۔ دمشق کے دو خطاط بڑے مشہور ہیں۔ کتابوں کے ٹائٹل خط ثلث میں عموماً یہی لکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک محمد کُردی ہے یعنی کردستان (عراق) کا رہنے والا۔ دوسرا محمد سالم نویلاتی ہے۔ ہماری عربی کتابوں کے ٹائٹل انھوں نے ہی لکھے ہیں۔ پاکستان کے مقابلے میں یہ خطاط خاصے مہنگے ہیں، عموماً مشغول تو ہوتے ہیں مگر کام بڑی تیزی سے کرتے ہیں۔

میری ان سے متعدد بار ملاقات ہوئی۔ بڑی عزت سے پیش آتے ہیں۔ ان کے پاس جانے سے پہلے فون کر لیتا ہوں تو عموماً ٹائٹل لکھا ہوا ملتا ہے۔ عربی کتابوں کے ٹائٹلز کی خوبصورتی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ایک تو خوبصورت کیلی گرافی، دوسری اس کی ڈیزائننگ، تیسرا اس کا کلر اور پھر اس کی پرنٹنگ کے مراحل یقیناً کتاب کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یاسر طباع سے ہم نے معاملہ شروع کیا تو اس نے کہا: دیکھو، عبدالمالک! ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تمھارے پاس شائع کرنے کے لیے کتابیں ہیں۔ اب اتنا سرمایہ تو کسی کے پاس نہیں ہوتا کہ وہ سارا مبلغ ایڈوانس دے دے، یا کتاب شائع ہونے کے فوراً بعد ادا کر دے۔ ہم مل کر کام کر سکتے ہیں، مگر اس کے لیے کچھ رہنما اصول متعین کرنے ہوں گے۔ میں نے کہا: بتاؤ! وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا: پہلی بات یہ ہے کہ تم دمشق اور بیروت میں میرے علاوہ کسی اور کے ہاں سے کتب شائع نہیں کراؤ گے۔ میں نے

مسکراتے ہوئے کہا: ٹھیک ہے۔ہم نے بس ایک کے ساتھ تعلق جوڑ لیا، اب دوسرا گھر نہیں دیکھیں گے۔

دوسری شرط یہ کہ تم مجھے ہر ہفتے لازماً کچھ نہ کچھ مبلغ ارسال کرو گے۔ یہ تمھارے اوپر ہے کہ آسانی سے کتنا بھجوا سکتے ہو۔ میرے ساتھ طے کرلو اور جو طے کرلو وہ ہر حال میں پورا کرو گے۔ میں تمھاری کتب نہیں روکوں گا اور مسلسل کام ہوتا رہے گا۔ جیسے جیسے کام بڑھے گا ادائیگی کا مبلغ بھی بڑھتا چلا جائے گا۔

میں نے کہا: میری بھی کچھ شرائط ہیں۔ایک تو یہ کہ فی الحال ہم پانچ ہزار ڈالر فی ہفتہ سے کام کا آغاز کرتے ہیں اور پھر صورت حال کے مطابق آگے بڑھتے رہیں گے۔ میری دوسری شرط یہ ہوگی کہ میری کتابیں چوری نہیں ہوں گی۔ جتنی تعداد میں تمھیں چھاپنے کا کہوں گا اتنی ہی تم شائع کرو گے اس سے زائد شائع کر کے مارکیٹ میں نہیں لاؤ گے۔اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا: بالکل، یہ تمھارا حق ہے۔اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے بھائی عمر کو اشارہ کیا کہ ہمارے لیے عصیر برتقال (مالٹے کا جوس) لے آؤ۔

مجھے شامی قوم کے ساتھ کام کرتے ہوئے کم وبیش 25 برس بیت چکے ہیں۔ یہ قوم حد درجہ مؤدب اور مطیع ہے۔ میرا تجزیہ اس قوم کے بارے میں یہ ہے کہ چونکہ یہ عام طور پر ایک مفتوح قوم رہی ہے اس لیے ان میں اطاعت وفرمانبرداری کے جذبات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ نہایت اعلیٰ اخلاق والے شامی آپ سے تجارتی معاملات میں بہت کم اختلاف اور جھگڑا کریں گے۔ یاسر طباع سے میرا بہت کم اختلاف ہوا اور اگر کبھی ہوا تو اس کا ایک ہی جواب تھا: ''شُوبِدَكْ حَاضِر ''یعنی جو تم چاہتے ہو اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ اب آپ خود ہی دیکھ لیں کہ اگر آپ کا فریق مقابل آپ سے یہ کلمہ کہہ دے تو

کیا آپ اس کے جواب میں جھگڑا کریں گے؟ یاسر طباع کے چار بھائی اور بھی ہیں۔ یاسر سب سے بڑا ہے، پھر خالد، پھر عمر پھر عمار اور اس کے بعد اسامہ ہے۔ خالد کے سوا تینوں بھائی اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ خود زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے، مگر چونکہ زبان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے اس لیے اسے انگلش سیکھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے کچھ عرصے کے بعد اپنے بھائی عمر کو اپنے ساتھ لگا لیا، اب وہ اس کا معتمد خاص ہے۔ وہ بلا کا ذہین ہے تعلیم اس کی بھی واجبی سی ہے، مگر ذہن اچھا اور کاروباری ہے۔ حسابات سارے اسی کے پاس ہیں۔ میں نے شامی اور لبنانی قوم کو معاملات میں بہت آسان پایا۔ مثلاً آپ نے پارٹی سے کہا: میرے پاس ابھی پیسے نہیں ایک ماہ بعد دے دوں گا، یہ چیک لے لو تو وہ فوراً آمادہ ہو جائیں گے۔ ''مافی مشکلے'' یا ''مومشکلے'' کے الفاظ آپ کو سننے کو ملیں گے۔

یاسر طباع کا گھر اپنے والد کے گھر کے قریب ہی ہے۔ اس کا والد محمد خیر و نہایت نفیس آدمی ہے۔ مجھے ان کے گھروں میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں دمشق جاتا تو واقعی ان کے گھرانوں میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ ان کی خواتین کبھی میرے سامنے نہیں آئیں۔ شامی کھانے کتنی ہی بار اور کتنے ہی زیادہ کھائے ہیں مگر ان کی لذت کم نہیں ہوتی۔ دمشق مدتوں اموی خاندان کا دارالخلافہ رہا ہے۔ ان کے اثرات ابھی تک اس شہر پر باقی ہیں۔ یہ دنیا کے قدیم ترین دارالحکومتوں میں سے ایک ہے۔ مغرب کی جانب ''جبل قاسیون'' ہے۔ مشہور ہے کہ قابیل نے ہابیل کو اسی پہاڑ پر قتل کیا تھا۔ شاید اسی لیے یہ نام ''قاسی'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سخت دل یا پتھر دل کے ہیں۔ جبل کے اوپر کافی دور جا کر ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ وہاں پر ایک لمبی قبر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہابیل کی قبر ہے۔ جبل قاسیون کے اوپر آپ کھڑے ہوں تو پورا دمشق آپ کو نظر آتا ہے۔

رات کے وقت کا منظر نہ بھولنے والا ہوتا ہے۔ روشن روشن اور چمکتا دمکتا دمشق یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے آسمان سے ستارے آپ کے استقبال کے لیے اتر آئے ہوں۔ دمشق ایک بڑے پیالے کی صورت نظر آتا ہے۔ بائیں جانب آپ کو اموی مسجد کے مینار نظر آئیں گے۔ دمشق میں میرا سب سے پسندیدہ مشغلہ رات کے وقت جبل قاسیون کے اوپر سے شہر کا نظارہ کرنا ہوتا ہے۔ رات ہوتی ہے تو یاسر یا اس کا بھائی پوچھتا ہے: کھانا کہاں کھائیں گے؟ اکثر اوقات میرا جواب ہوتا ہے: جبل قاسیون پر۔ شامی کھانوں میں سرفہرست ''شوارما'' ہے۔ بکرے یا مرغی کے گوشت کے ٹکڑے جو سیخوں پر بھونے جاتے ہیں ان کو روٹی کے اوپر رکھ کر رول کر کے سینڈوچ بنالیا جاتا ہے۔ یہ سب سے سستی، آسان اور لذیذ ڈش ہے۔ شہر میں آپ کو سیکڑوں ایسے بوفیے مل جائیں گے جو شوارما تیار کرتے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ کباب، جوس، حمص، متبل، ورق عنب اور سلاد وغیرہ لے لیتے اور جبل قاسیون کے اوپر جا بیٹھتے۔ شروع شروع میں وہاں بہت کم رونق ہوتی تھی۔ ہم اس وقت دیوار کے اوپر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ پہاڑ پر گرمیوں میں موسم بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ وہیں کھانا ہوتا اور میں مسلسل دمشق شہر کا نظارہ کرتا رہتا۔ ایسا نظارہ یا تو مجھے جبل قاسیون سے نظر آیا یا پھر ہوائی جہاز سفر کے دوران جب رات کو لینڈ کرتا ہے تو وہ منظر بھی واقعی خوبصورت اور دلفریب ہوتا ہے۔

یاسر کا سب سے پسندیدہ ایریا دمشق سے بیس کلومیٹر باہر ''عین الفیجہ'' کا علاقہ ہے، یہاں نہر کے کنارے درجنوں ریسٹورنٹ ہیں۔ نہر سے مراد ہمارے یہاں کی نہر نہ سمجھیں، یہ ہمارے ہاں کے برساتی نالے کی طرح ہے جس میں صاف پانی بہتا ہے۔ اس کے دونوں طرف درخت ہیں جن کی چھاؤں میں بڑے خوبصورت ریسٹورنٹ بنائے

گئے ہیں۔ آپ کی ٹیبل کے ساتھ ہی پانی بہتا نظر آتا ہے، اوپر درختوں کی ٹہنیاں سایہ فگن رہتی ہیں۔ اس ماحول میں کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یاسر کا کہنا ہے کہ یہاں کا گوشت بڑا مزیدار اور تازہ ہوتا ہے۔ جیسے ہی آپ وہاں بیٹھیں گے، سر پر کھڑے ہوئے ویٹر پلک جھپکتے میں آپ کی خدمت شروع کر دیں گے۔ جس طرح ہمارے ہاں ماضی میں چوپالوں پر حقہ پینے کا رواج تھا، یہاں کے ریسٹورنٹس میں بھی اب شیشہ پینے کا رواج بڑھتا چلا جا رہا ہے، مگر یہ ماڈرن حقہ انتہائی نقصان دہ ہے۔

میرے نزدیک کسی بھی ریسٹورنٹ کی تین خوبیاں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نہایت صاف ستھرا ہو، اس کا کچن صاف ہو، ویٹر صاف ستھرے اور عمدہ پوشاک پہنے ہوئے ہوں۔ دوسرے اس کا کھانا لذیذ ہو اور تیسرے یہ کہ اس کے اخراجات معقول ہوں، آدمی اسے برداشت کر سکے۔ یہ تینوں چیزیں میں نے دمشق کے بہت سے ریسٹورنٹس میں یکجا دیکھی ہیں۔

ایک دن میں دمشق کے فندق دار السلام میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اور یاسر بالعموم صبح، دوپہر اور رات کا کھانا اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ میں نے فجر کی نماز ادا کی اور سیر و تفریح کے لیے باہر نکل گیا، خاصا لمبا چکر لگا کر آیا تو بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بوفیہ میں دیکھا کہ بکرے کی تازہ رانیں لٹک رہی ہیں۔ ساتھ ہی قیمہ بنانے والی مشین لگی ہوئی ہے اور تندور گرم ہے۔ ایک شامی تازہ قیمے کے پراٹھے بنا رہا ہے۔ لوگ وہاں اسٹولوں پر بیٹھ کر لسی کے ساتھ یہ پراٹھے کھا رہے ہیں۔ میری بھوک چمک اٹھی، میں نے فوراً موبائل پر یاسر سے رابطہ کیا، اس نے کہا: تم آرڈر دو، میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے ایک تازہ ران کی طرف اشارہ کیا، اس نے بڑی مہارت سے گوشت کو صاف کیا، ساری چربی الگ

کردی اور صاف گوشت قیمہ بنانے والی مشین میں ڈال دیا۔ یہ چند منٹوں کی بات تھی کہ ہمارے سامنے ویٹر قیمہ والے پراٹھے رکھ رہا تھا۔ یاسر طباع بھی پہنچ چکا تھا اور جوانوں کے لیے صبح سویرے قیمے کے پراٹھے تو بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی لکھ دوں کہ ہمارے ہاں کی طرح یہاں گھی والے پراٹھوں کا کوئی تصور نہیں ہے، یہ اوپر سے خشک ہوتے ہیں۔ یاد آیا کہ ریاض میں بھی ایسے پراٹھے مل جاتے ہیں، مگر اس کے لیے آپ کو ریسٹورنٹ تلاش کرنا ہوگا۔

گرمیوں میں چونکہ دمشق کا موسم اچھا ہوتا ہے اس لیے یہاں بہت زیادہ سیاح آتے ہیں۔ دمشق کا فائیو سٹار ہوٹل کوئی بڑا نہیں ہے، میں یہاں کئی مرتبہ ٹھہرا ہوں بلکہ اب تو اس ہوٹل کے عملے میں یاسر کے کئی دوست بن گئے ہیں اور اس نے ہوٹل کی ممبر شپ بھی لے لی ہے، اس لیے یہیں ٹھہرتا ہے۔ یہ ہوٹل پوش علاقے میں ہے، اس کے ساتھ والی گلی میں ''ست الشام'' نامی ریسٹورنٹ ہے۔ یہ بڑا صاف ستھرا، سستا اور کھانے کے اعتبار سے بڑا مزیدار ہے۔ میں صبح کا ناشتہ یہاں کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ دمشق میں میرے ٹھہرنے کی ایک وجہ یہ ریسٹورنٹ بھی ہے۔ عموماً جب ہوٹل بک کروایا جاتا ہے تو اسی وقت یہ پوچھتے ہیں: ناشتے سمیت یا ناشتے کے بغیر؟ اگر آپ ناشتے سمیت بات کریں گے تو ہوٹل کی انتظامیہ آپ سے بیس ڈالر زائد چارج کرے گی، بصورت دیگر بیس ڈالر کم ہو جائیں گے۔ یاسر کی بدولت اب خاصا ڈسکاؤنٹ مل جاتا ہے پھر بھی ایک رات کا کرایہ عموماً سو ڈالر ہوتا ہے۔

چلیے ہم تھوڑی دیر کے لیے ست الشام میں ناشتے کے لیے چلتے ہیں۔ میں نے اس مشہور نام ''ست الشام'' کے معنی دریافت کیے تو جواب ملا ''شام کی وادی'' واللہ اعلم! یہ

معنی کس حدتک درست ہیں، مگر درمیانے درجے کے ایک ہال پر مشتمل اس ریسٹورنٹ میں خاصا رش ہوتا ہے۔ محکمۂ سیاحت کی جانب سے اسے ٹو سٹار ریسٹورنٹ کا درجہ حاصل ہے۔ دروازے پر دو ستارے اوپر نیچے بنے ہوئے ہیں جو آپ کو اس کی اصلیت بتا رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہاں ایک وقت میں تیس سے پینتیس افراد کھانا کھا سکتے ہیں۔ عموماً آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ویٹرز کی تعداد خاصی ہوتی ہے، اس لیے وہ لمحوں میں ٹیبل صاف کر دیتے ہیں، پھر خوبصورت برتن لگا کر آپ کو اشارہ کرتے ہیں کہ آپ کی ٹیبل تیار ہے۔ زیتون یہاں کی سب سے مرغوب غذا اور اہم ترین پیداوار ہے۔ شام کے علاقے کو قرآن کریم میں برکت والا علاقہ کہا گیا ہے اور یہ برکت آج بھی موجود ہے۔ یہاں کھانے میں، گوشت، سبزیاں اور فروٹ نہایت مزیدار ہیں، کھانوں میں عموماً تیل کا استعمال کم ہے، اس لیے موٹاپا بہت زیادہ نہیں ہے۔ مرچ کا تصور ہی نہیں، اس لیے یہاں کے کھانے چٹ پٹے تو نہیں، مگر لذیذ ہیں۔

میری پسندیدہ غذا زیتون اور اس سے تیار کردہ ایک ڈش ہے۔ روٹی کے ٹکڑے زیتون میں ڈال دیے جاتے ہیں، پھر اس میں کوئی کیمیکل ڈالتے ہیں کہ زیتون کا رنگ دودھ کی طرح سفید ہو جاتا ہے، اس کی کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے۔ اس ڈش میں کابلی چنے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد روٹی کے ٹکڑے نرم ہو جاتے ہیں۔ یہ کھانا بلاشبہ بڑا مزیدار ہوتا ہے، اس کو بڑے پیالے میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں ناشتے کے دیگر لوازمات بھی میسر ہیں جن میں تازہ مکھن، لبنہ، دہی کی لسی اور چائے وغیرہ شامل ہیں۔ حقیقت میں یہ ناشتہ اتنا مزیدار ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لیے لائن لگا کر انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

یاسر طباع اور اس کا بھائی عمر طباع شروع شروع میں بس پر سفر کرتے تھے، مگر جیسے جیسے ان کے حالات بہتر ہوتے چلے گئے وہ دمشق سے بیروت جانے کے لیے اسپیشل ٹیکسی کا استعمال کرنے لگے۔نئی نویلی امریکی گاڑیاں جونہایت آرام دہ ہیں یہاں ٹیکسی کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ان کو دور ہی سے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ پبلک سواری ہے۔ عموماً صبح سویرے فجر کی نماز کے فوراً بعد یاسر میرے ہوٹل پہنچ جاتا، میں پہلے سے سامان وغیرہ تیار کر کے انتظار کر رہا ہوتا، ہم سامان ڈگی میں رکھتے اور بیروت روڈ پر دوڑ رہے ہوتے۔ دمشق سے کم وبیش آدھ گھنٹے کی مسافت پر دونوں شہروں کی حدود ملتی ہیں، وہاں کسٹم اور امیگریشن ہوتا ہے۔ اب یہ ٹیکسی ڈرائیور کی مہارت اور ذاتی تعلقات پر منحصر ہوتا ہے کہ یہاں آپ کو کتنی دیر لگے گی۔ بالعموم وہ مجھے ٹیکسی سے نیچے نہ اترنے دیتا اور کہتا: شیخ! آپ گاڑی میں تشریف رکھیں اور پاسپورٹ مجھے دے دیں۔ اس وقت تک کمپیوٹر نہیں آیا تھا، جب ہم دمشق کے ہوائی اڈے پر اترتے تو ہمیں ایک سبز یا زرد رنگ کا کارڈ مہر لگا کر دے دیا جاتا جس پر آمد کی تاریخ، ویزے کی مدت اور روانگی کی تاریخ درج ہوتی تھی۔ ویزے کی مدت کم از کم دو ہفتے ہوتی ہے جو میں نے آج تک پوری نہیں کی۔ میری یادداشت کے مطابق دمشق میں میرا زیادہ سے زیادہ قیام پانچ دن رہا ہوگا، ورنہ عام طور پر دو تین دن سے زائد نہ رکتا تھا، وہ بھی شریف زینکوگرافر کے پاس فلموں کی چیکنگ کے لیے یا بعض اوقات یاسر کے ساتھ حسابات کے بعض معاملات چیک کرنا ہوتے تھے۔

نئی ٹیکسی کے ڈرائیور بڑے تیز ہوتے تھے اور یہی VIP مسافر کے ساتھ حسن سلوک ہوتا۔ وہ امیگریشن کے ملازم کو پچاس ریال دے دیتے اور مجھے ٹیکسی سے نیچے اترنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ دراصل کثرت سے سفر کرنے کی وجہ سے ڈرائیوران کو جانتے ہیں، اس

لیے دس پندرہ منٹ میں یہ مراحل طے ہو جاتے اور ہم بیروت کی طرف بڑھ جاتے۔

دمشق سے بیروت کا سفر پہاڑی راستے سے ہوتا ہے، پہاڑ بالعموم خشک ہیں، تاہم کہیں کہیں وادیوں میں دور دور تک درخت اور کھیتیاں نظر آتی ہیں۔ گرمیوں میں یہاں کا موسم بڑا معتدل ہو جاتا ہے۔ آج سے تین سال قبل تک یہاں پنکھے کا رواج نہیں تھا، مگر آہستہ آہستہ اب تو اکثر گھروں میں AC لگ چکے ہیں، موسم بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ سردی یہاں پر اچھی خاصی ہوتی ہے، بعض اوقات برف بھی پڑتی ہے، کئی بار ہم دمشق سے نکلتے ہیں تو پہاڑوں پر چمکتی ہوئی برف بہت بھلی لگتی ہے۔

دمشق کے کسٹم سے فارغ ہو کر ہمیں آدھ گھنٹہ بفر زون میں سفر کرتے ہوئے لگ جاتا، جولان کی پہاڑیاں دائیں طرف چھوڑتے ہوئے جب ہم بیروت کی سرحد تک پہنچتے تو ٹیکسی کی لائنیں لگ چکی ہوتیں۔ میں نے بے شمار سفر کیے ہیں، ان میں سب سے آسان کسٹم اور امیگریشن لبنان کا تھا، لبنان کا ویزا مجھے بڑی آسانی سے مل جاتا تھا۔ ریاض میں سفارت خانے کا عملہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اس لیے عموماً ملٹی پل ویزا میرے پاس ہوتا۔ یہاں پر بھی ڈرائیور کہتا: شیخ! آپ گاڑی ہی میں رہیں، تاہم کبھی کبھار کوئی نیا اہلکار ہوتا تو چند منٹ کے لیے چہرہ شناسی کے لیے کمرے میں لے جاتا۔ چونکہ ہر دن ہزاروں کی تعداد میں شامی لیبر اور تاجر بیروت سے دمشق اور دمشق سے بیروت کا سفر کرتے ہیں اس لیے سفر کو بڑی حد تک آسان بنا دیا گیا ہے۔ کوئی بہت زیادہ چھان بین نہیں ہوتی۔

یاسر کا ایک دوست ایلی الدیک ہے۔ اس کا اپنا پرنٹنگ پریس ہے۔ اس کا باپ بہت بوڑھا تھا، اس نے ''الشرکۃ العربیۃ للطباعۃ'' کے نام سے الگ ادارہ بنا رکھا تھا۔ ایک دفعہ میری اس سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا: ہمیں تو بزنس چاہیے، ہم سے خواہ انجیل چھپوا لو یا

قرآن کریم یا کوئی بھی کتاب یا ناول، ہمیں تو پیسہ چاہیے۔ بوڑھے نے جب یہ الفاظ کہے تو مجھے فوراً نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث یاد آ گئی جس میں ''عبدالدرہم والدینار'' کا تذکرہ ہے۔ اسے دیکھ کر میں بے اختیار کہہ اٹھا: یہ تو عبدالدرہم والدینار ہے۔ اس شخص کو صرف پیسے سے پیار ہے، ان کے ہاں منہج والی کوئی بات ہی نہیں۔ پریس کا عملہ عام طور پر مردوں پر مشتمل ہوتا ہے، تاہم لیبر میں عورتیں بھی شامل ہیں جن کی عمر سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اس طرح کی نوکری کرنے پر مجبور ہیں۔ ایلی الدیک کام میں نہایت سمجھ دار تھا، کوالٹی پرنٹنگ تو نہیں کرتا، مگر مناسب سی پرنٹنگ کے کام اس تیزی کے ساتھ کرتا کہ بڑے بڑے کام چند دنوں میں مکمل کر کے مطالبہ کرتا کہ اگر مزید کام ہے تو لایا جائے۔

کوالٹی پرنٹنگ کے اعتبار سے ''الیاس ملکی'' اول نمبر پر ہے۔ اس کے پاس نسبتاً نئی مشینری ہے، چار رنگ کی پرنٹنگ میں اس کا جواب نہیں۔ یہ بھی عیسائی ہے، اس کے بیٹے ''وسیم'' نے حال ہی میں پرنٹنگ فیلڈ جرمنی سے PHD کی ہے۔ عموماً یہ لوگ اخلاق میں بڑے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ان کے دفاتر بڑے خوبصورت ہیں۔ الیاس نے اپنی ٹیبل پر اعلیٰ درجے کی ٹافیاں رکھی ہوئی ہیں جو وہ اپنے مہمانوں کو پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے سگریٹ بھی مہمانوں کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میری طرف الیاس نے سگریٹ بڑھائے تو میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا، اس کے بعد کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ بیروت میں مردوں کی تنخواہیں عورتوں کے مقابلے میں خاصی زیادہ ہیں۔ کم از کم تنخواہ بالعموم چار سو ڈالرز سے شروع ہوتی ہے۔ لڑکیاں اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ فیشن اور نئے نئے لباسوں پر خرچ کر دیتی ہیں۔

ٹونی الدیک

جس دور میں ہم نے کام کا آغاز کیا اس وقت کتابوں کی کمپوزنگ کرنے، ان کی تصحیح کرنے اور لے آؤٹ بنانے کے کام کی زیادہ اہمیت تھی۔ ریاض میں جب میں نے کام کا آغاز کیا تو ہم نے الجفالی سے (C.R.TRONIC) نامی کمپیوٹر لیا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ بیس ہزار ریال تھی۔ بیروت میں ٹونی الدیک نے کمپوزنگ کا ایک بڑا ادارہ کھول رکھا تھا، میرے علم کی حد تک یہ اس میدان میں پہل کرنے والا شخص تھا۔ پہلے یہ ریاض میں تھا، یہاں اس نے ایک سعودی کے ساتھ مل کر "حرف" نامی کمپوزنگ کا ادارہ قائم کیا تھا۔ یہ کام خاصا صبر آزما اور مشکل بھی تھا۔ کمپیوٹر ان دنوں خاصے مہنگے تھے، صرف پرنٹر ہی میں نے پینتیس ہزار ریال کا خریدا تھا، اس میں ٹرٹر کی آواز آتی تھی اور پروف نکلتا تھا۔ سی آر ٹرونک میں سے برومائیڈ پیپر پر رول فلم نکلتی جسے بعد ازاں کاٹ کاٹ کر صفحات میں منتقل کیا جاتا، اس پر خاصا خرچ آتا تھا۔ کم از کم دس ریال فی صفحہ کمپوزنگ پر ہی خرچ ہو جاتا تھا، کئی کئی پروف نکلتے پھر بھی غلطیاں رہ جاتیں، ان کی اصلاح کے بعد پھر اصل صفحے پر غلطیوں کو گوند سے پیسٹ کیا جاتا تھا۔ اس لیے بعض افراد کے ذمہ کام ہی صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ پیسٹنگ کریں یا بعض اوقات قلم سے بعض الفاظ کی تصحیح کریں۔ ٹونی نے اس کام

میں جدت اختیار کی، کثرت کار کی بدولت وہ خود پروگرامر بن گیا اور اس طرح اس نے مڈل ایسٹ میں سب سے پہلا اور بڑا کمپوزنگ کا ادارہ قائم کیا۔

بیروت کے علاقے ''دورہ'' میں ایک بلڈنگ کا آدھا فلور اس نے پہلے وقتوں میں خرید لیا تھا، جس میں تین چار بڑے کمرے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں بیس کے قریب لڑکیاں کمپیوٹرز کے سامنے بیٹھی تیزی سے انگلیاں چلا رہی ہوتیں۔ پبلشرز اس کے پاس کمپوزنگ کے لیے آتے، یہ بہت سستا تو نہیں تھا، مگر اس کے کام کی کوالٹی اچھی ہوتی۔ چونکہ خود کام جانتا تھا اس لیے کام کی نوعیت فوراً سمجھ جاتا اور تیزی سے اس کی تنفیذ کرتا۔ میرا اس سے رابطہ یاسر طباع کی معرفت ہوا، چونکہ میں نے خود بھی اس کمپیوٹر کی ٹریننگ لی ہوئی تھی، اس لیے جلد ہی ہم ایک دوسرے کو سمجھنے لگ گئے۔ دارالسلام ان دنوں اللہ کے فضل وکرم سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا، یہی وہ دور تھا جب ادارے نے بے حد ترقی کی۔

ریاض سے بیروت کے لیے ہوائی سفر میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ بیروت ائرپورٹ اس زمانے تک نیا نہیں بنا تھا۔ ایک پرانی سی عمارت تھی جس کے ہر زاویے سے خانہ جنگی کے آثار ہویدا تھے۔ شامی فوج کی بدولت اب یہاں امن قائم ہو چکا تھا، اس لیے سفر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ میں عموماً بدھ کی شام کو ریاض سے بیروت آجاتا، میرے ہمراہ مسودات، ذاتی استعمال کے کپڑے، چاکلیٹ کے دو تین ڈبے اور کھلونے ہوتے۔ فلائٹ رات کے گیارہ بجے پہنچتی تو آدھ گھنٹے میں امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہو کر میں یاسر طباع سے گلے مل رہا ہوتا۔ ائرپورٹ والوں نے میرا سامان آج تک کبھی نہیں کھلوایا۔ کبھی کبھار کسٹم آفیسر میرے سوٹ کیس کو اٹھا کر دیکھتا اور باہر جانے کا اشارہ کر دیتا۔

میرے جیسے باریش شلوار قمیص پہننے والے پاکستانیوں کو اس دور میں یہی نصیحت کی جاتی تھی کہ اپنے کمرے میں ہی نماز ادا کرو۔

امیگریشن میں بھی زیادہ سے زیادہ یہی سوال ہوتا کہ کس ہوٹل میں قیام ہے یا کتنے دن کے لیے آئے ہو؟ میں بدھ کی رات کو آتا اور ہفتے کی شام کو واپس ریاض چلا جاتا۔ کام کروانے کے لیے مجھے دو سے ڈھائی دن ملتے تھے، سعودی عرب کے سرکاری دفاتر میں جمعرات، جمعہ کو چھٹی ہوتی تھی، دارالسلام جمعرات کو آدھا دن کام کرتا اور جمعہ کو مکمل چھٹی ہوتی، جبکہ بیروت میں گرمیوں میں ہفتہ، اتوار مکمل چھٹی جبکہ عام دنوں میں ہفتے کو آدھا دن کام ہوتا۔ اس دور میں عموماً میں دس سے پندرہ اور بعض اوقات بیس ہزار ڈالر جیب میں لے کر بیروت جاتا۔ اس کیش کا مجھے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ ڈیل کرتے وقت جب ان کو کیش دکھاتا تو خاصا ڈسکاؤنٹ مل جاتا، اس سے میرا کرایہ نکل آتا۔

میرے آنے سے پہلے یاسر کمرہ بک کروا چکا ہوتا۔ ہم عموماً رات کے بارہ بجے تک ہوٹل میں داخل ہو چکے ہوتے۔ قریبی بقالہ سے ہم پانی لیتے اور اپنے کمروں میں سو جاتے۔ بیروت پر اس وقت ہو کا عالم طاری ہو چکا ہوتا۔ مسجد ہوٹل سے زیادہ دور نہ تھی، مگر ایک اجنبی کے لیے اور خصوصاً میرے جیسے باریش شلوار قمیص پہننے والے پاکستانیوں کو اس دور میں یہی نصیحت کی جاتی تھی کہ اپنے کمرے میں ہی نماز ادا کرو۔ فجر کی نماز کے بعد میں ہوٹل کے برآمدے کے اندر ہی پھرتا رہتا، سامنے سمندر نظر آتا تھا جس سے منظر بڑا بھلا لگتا۔ اس چلنے پھرنے کے دوران ذکر، اذکار بھی ہو جاتا اور دن بھر کی

پلاننگ بھی ہو جاتی کہ آج مجھے کیا کیا کرنا ہے۔

فندق امپریل کا ناشتہ بڑا مزیدار ہوتا تھا، عموماً نو بجے ہم تیار ہو کر لابی میں آ جاتے اور ناشتے کا آرڈر دیتے۔ جبنہ، مربہ، زیتون، آملیٹ، کروسنٹ، تازہ خبز اور دودھ والی چائے، ہماری طرف سے ہمیشہ یہی آرڈر ہوتا۔ دس ڈالر کا یہ ناشتہ عموماً ہوٹل کے کرائے میں شامل ہوتا، مگر کبھی مفت بھی ہوتا اور بعض اوقات ہم بل پر دستخط کر دیتے۔ ناشتہ خاصا لمبا ہو جاتا کیونکہ ہم اس دوران دن بھر کے پروگرام ترتیب دیتے، میں ان سے بحثیں کرتا، ریٹ کم کرنے پر اصرار ہوتا، چند ڈالر ان کے حوالے کرتا اور مسودات کو لے کر ٹونی الدیک کے دفتر کی راہ لیتا۔ لبنان کی کرنسی لیرا ہے۔ خانہ جنگی کی بدولت اس کا ستیاناس ہو چکا ہے۔ ایک ڈالر میں سترہ سو لیرے ملتے ہیں جو واقعی پنجابی والے ''لیرے'' ہی ہیں۔ یہاں عموماً کاروبار کرتے وقت امریکی ڈالر ہی سے کام چلتا ہے، ہم نے آج تک لیروں میں معاملہ نہیں کیا، ٹیکسی سے لے کر بقالہ، ریسٹورنٹ، ہوٹل، ہر جگہ ڈالر کا راج ہے۔ اپنی کتب کے تمام اخراجات ہم ڈالر ہی میں ادا کرتے ہیں۔

ٹونی کو میں بیروت آنے سے چند دن پہلے اطلاع دے دیتا، وہ بھی میرے انتظار میں ہوتا۔ وہ میرا ہم عمر ہے، اس کے اندر ایک ہی بڑی برائی اور خرابی ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے بلکہ مسیحی کیتھولک فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ چرچ شاید سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی جاتا ہوگا، مگر اخلاق اور کردار کے اعتبار سے اچھا انسان ہے۔ شراب اور عورت کو اس نے شاید ہی کبھی ہاتھ لگایا ہو، تاہم کبھی کبھار سگریٹ پی لیتا ہے، مگر میرے سامنے نہیں۔ ترکی قہوہ پینا لبنانیوں کی فطرت میں شامل ہے، ہر بڑے دفتر میں قہوہ بنانے والی مشین لگی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ڈسپوزیبل گلاس جنہیں گلاسیاں کہنا زیادہ مناسب ہے مشین کے

خانہ جنگی کی بدولت لبنانی کرنسی کا ستیاناس ہو چکا ہے۔ ایک ڈالر میں سترہ سو لیرے ملتے ہیں جو واقعی پنجابی والے ''لیرے'' ہی ہیں۔

اندر بنی ہوئی جگہ پر پڑے ہوتے ہیں۔ بٹن دبانے پر آٹو میٹک مشین سے نکلنے والا کالا کسیلا قہوہ گلاس کو بھر دیتا ہے اس میں قہوہ کی خاصی مقدار ہوتی ہے۔ چند منٹ انتظار کے بعد ہی آپ اسے پی سکتے ہیں حتی کہ قہوہ نیچے بیٹھ جائے، گرم گرم نوش کیجیے۔ یہ کڑوا کسیلا قہوہ مجھے کبھی پسند نہیں آیا، مگر اس کا کیا کیجیے کہ جیسے ہی آپ کسی بھی آفس میں داخل ہوں تو فوراً آپ کی خدمت میں یہ قہوہ پیش کر دیا جاتا ہے۔ میں بھی جب ٹونی کے دفتر میں جاتا تو اس کی سیکرٹری میرے سامنے پانی کا گلاس اور قہوہ رکھ دیتی، جسے میں نے شاید ہی کبھی پیا ہو۔ اگر کبھی ایک آدھ گھونٹ لیا تو دفتر والوں کو مجھ سے خوب کڑوی کسیلی باتیں سننا پڑیں۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے میرے لیے خشک دودھ کا بندوبست کر لیا اور چائے پیش کرنے لگے، مگر دودھ پتی پینے والے کے لیے یہ بھی کسی دوا سے کم نہیں ہوتی۔ چاکلیٹ کا ایک ڈبہ میں ٹونی کے حوالے کرتا، دوسرا کام کرنے والی لڑکیوں کے لیے ہوتا۔ ہم کچھ دیر گفتگو کرتے، گپ شپ لگاتے، کام کے حوالے سے، سیاست، اسلام، اقتصادیات، بیروت کے احوال، ناشرین کے مشاغل، پرنٹنگ کے کام کو مزید کیسے بہتر اور فعال بنایا جا سکتا ہے، ان موضوعات پر یہ بات چیت کوئی چالیس سے پینتالیس منٹ تک ہوتی۔ بالآخر میں جیب سے ڈالر نکال کر اس کے حوالے کرتا اور ہم کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتے۔

ٹونی بلاشبہ اپنے کام کا ماسٹر ہے۔ میں اپنے ذہن میں منصوبے لے کر آتا کہ اس قسم کا

ڈیزائن ہونا چاہیے، فلاں کتاب کے اتنے صفحات ہوں، اس کا سائز، اس کا ڈیزائن اس قسم کا ہو۔ نیا مسودہ اس کے حوالے کرتا اور یہ فوراً ہی اس پر کام کا آغاز کر دیتا۔

ہماری کتابوں کی فلمیں عموماً مصطفیٰ خازن بناتا۔ یہ شیعہ ہے، میرا بے حد احترام کرتا ہے، بیروت کے نواح میں ساحل سمندر کے قریب اس کا بنگلہ ہے۔ نیچے اس کا کاروبار ہے، اوپر اس کی رہائش ہے، شکار کا شوقین ہے، اس کے لیے اس نے شکاری کتے پال رکھے ہیں۔ ہم جب بھی جاتے ہیں وہ کتوں کو زنجیر میں باندھ کر بڑے بڑے پنجروں میں بند کر دیتا ہے، پھر بھی وہ ہمیں دیکھ کر بھونکتے اور یہ جا کر ان کو چمکارتا۔ مجھے بچپن ہی سے کتوں سے بڑی نفرت ہے، میں اسے عموماً ملامت کرتا، مگر یہ اپنے گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ان کی تعریف کرتا اور کہتا: عبدالمالک! یہ کتے رات کو میرے گھر کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی اجنبی کو گھر کے قریب نہیں آنے دیتے۔ کتوں کے علاوہ اس نے مچھلی پکڑنے والی بوٹ بھی رکھی ہوئی ہے۔ جو گھر کے سامنے گلی میں پڑی رہتی ہے۔ اس کے بقول مہینے میں ایک مرتبہ فیملی کے ساتھ مچھلی کے شکار کے لیے جاتا ہے۔ اس نے مجھے بھی کئی دفعہ دعوت دی جو میں نے ہمیشہ مسترد ہی کی۔ جس علاقے میں یہ رہتا ہے۔ اس میں بڑی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ صابرہ اور شتیلہ نامی مشہور زمانہ فلسطینیوں کے کیمپ اسی علاقے میں ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ یہ خیموں کی بستیاں ہوں گی مگر جب وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ پکی عمارتیں ہیں جن میں بہت زیادہ سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ ان کیمپوں میں یہودی درندوں نے ہزاروں فلسطینیوں کو قتل کیا تھا۔ میں وہاں گیا اور آنسو بہاتا رہا۔ میں امت مسلمہ کی حالت زار، ان بے گناہ بچوں، عورتوں اور مردوں کی بے بسی اور لاچاری پر رویا جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

بیروت کے ریسٹورنٹس

بیروت بڑا خوبصورت شہر ہے، بیروت کے جنوب میں ائرپورٹ ہے جو مسلمان علاقے میں ہے، اب تو وہاں جانے کے لیے ہائی ویز بن گئی ہیں۔ اس شہر کی خوبی یہ ہے کہ آپ ساحل سمندر سے محض آدھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں پر درجۂ حرارت نیچے کے مقابلے میں کہیں کم ہوتا ہے بلکہ گرمیوں میں بھی خوب ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ بیروت سے ملحق ''جونیہ'' کا علاقہ ہے اور یہ سارا ہی عیسائی آبادی پر مشتمل ہے۔ یہاں پر بڑی بڑی عمارتیں ہیں مگر پانچ، چھ منزلوں سے زائد نہیں۔ سڑکیں بہت زیادہ کھلی ہیں اور جو ہائی وے طرابلس کو جاتی ہے اس کے چار ٹریک ہیں۔ سمندر کے کنارے دور تک خوبصورت ہوٹل اور اپارٹمنٹ ہیں، سڑک کے کنارے دنیا کی مشہور کمپنیوں کی دکانیں ہیں جن میں اعلیٰ درجے کے ریڈی میڈ کپڑے اور جوتے ملتے ہیں۔ ان کے ریٹ خاصے مہنگے ہیں۔ یہ علاقہ بڑی حد تک امراء کا ہے۔ بیروت میں بے شمار ریسٹورنٹ ہیں، جہاں انواع واقسام کے کھانے دستیاب ہیں۔ میں دنیا کے بہت سے ممالک میں گیا ہوں، مگر جتنا پروٹوکول بیروت کے ریسٹورنٹ میں ملتا ہے شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ملتا ہو۔ میرے دو تین دن کے قیام میں ہم ایک گرینڈ کھانا کسی بڑے ریسٹورنٹ میں کھاتے ہیں۔ یاسر کا سب سے پسندیدہ ریسٹورنٹ

''مانویلا'' ہے، جونیہ کے علاقے میں سمندر کے کنارے یہ ریسٹورنٹ بڑا مشہور ہے۔ یہاں آپ کو انواع واقسام کی فش کھانے کو ملتی ہے۔ ہم سارا دن کام کر کے خاصے تھک جاتے، دن کو پیزا کھا لیا یا سینڈوچ لے لیا اور پھر شام کو مانویلا کی طرف رخ کرتے۔ صدر دروازے پر آپ سے گاڑی لے لی جاتی ہے، آپ کو پارکنگ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اندر داخل ہوں تو باوردی ملازم سیلوٹ کرتے ہوئے آپ کو خوش آمدید کہیں گے، اگلے مرحلے میں ریسٹورنٹ کا اسسٹنٹ منیجر آپ کو ٹیبل کرسی تک رہنمائی فراہم کرے گا۔ مہمانوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کس قسم کی سیٹ پسند کرتے ہیں، آپ کی ٹیبل سمندر کی طرف ہو یا اندر کمرے میں یا نیچے صحن میں آپ کے ذوق کے مطابق آپ کو سیٹ مہیا کر دی جاتی ہے۔

ریسٹورنٹ میں 150 تا 200 آدمی بیک وقت کھانا کھا سکتے ہیں۔ مہمانوں کے لیے ان کے میزبان عموماً ریزرویشن کروا چکے ہوتے ہیں، جیسے ہی آپ اپنی پسند کی نشست پر بیٹھیں گے آپ کے سامنے ٹھنڈے پانی کا گلاس اور برف میں بھگوئے ہوئے بادام رکھ دیے جائیں گے۔ اتنے میں منیجر بھی آجائے گا اور آپ کو خوش آمدید کہے گا۔ ایک باوردی بیرا آپ سے آرڈر وصول کرے گا اور استفسار کرے گا: سر! آپ کولڈ ڈرنکس میں کیا لیں گے؟ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ انواع واقسام کی سلاد اور مقبلات سے ٹیبل کو بھر دے گا۔ حمص، متبل، ورق عنب اور جبنہ جیسی دسیوں اشیاء ہیں جن کو ہم لوگ سٹارٹرز کہتے ہیں اور عربی میں انھیں مقبلات کہتے ہیں، عموماً میزبان آپ کو دعوت دے گا کہ آپ جا کر اپنی مرضی کی مچھلی منتخب کریں۔ ایک طرف کونے میں نہایت صاف ستھری ٹیبل پر کوٹی ہوئی برف پڑی ہے، اس پر تازہ مچھلی رکھی ہوئی ہے۔ پسند کریں، اشارہ کر کے ویٹر کو بتاتے

چلیں، جتنا مرضی آپ ان سے کہیں کہ زیادہ بھوک نہیں، پھر بھی وہ کوئی دو کلو مچھلی کا آرڈر دے دیں گے۔ کچھ حصہ تلنے کے لیے ہے، کچھ کوئلوں پر بھون کر اور کچھ پانی میں پکا کر دی جائے گی، آرڈر دینے کا مرحلہ مکمل ہوا۔

اب کھانے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ثقیل چیزیں نہیں ہیں، جلد ہی ہضم ہو جاتی ہیں اور کھانا کھانے کی گنجائش ان سے متاثر نہیں ہوتی۔ آپ کی پلیٹ ذرا سی آلودہ ہوئی انھوں نے فوراً اسے تبدیل کر دیا۔ سب سے پہلے روبیان، یعنی جھینگے آپ کی ٹیبل کی زینت بنتے ہیں۔ واقعی یہ لذیذ چیز ہے۔ کھانے کا دورانیہ دو گھنٹے تک چلا جاتا ہے۔ اس دوران بزنس، سیاست، اقتصادیات، عادات، روایات اور ثقافت جیسے مختلف موضوعات پر گفتگو جاری رہتی ہے۔ یہاں لوگ شیشہ بھی پیتے ہیں۔ مجھے حقے سے سخت نفرت ہے لہٰذا ہماری ٹیبل عموماً اس سے خالی ہوتی ہے۔ یاسر بعض اوقات اصرار کرتا ہے تو میں اسے دوسری ٹیبل پر جانے کا مشورہ دیتا ہوں، کبھی مان لیتا ہے اور کبھی انکار کر کے وہیں دو چار کش لگا لیتا ہے۔

قارئین کرام! کھانے کو مزے دار تین چیزیں بناتی ہیں، ایک بھوک، دوسری پکانے والے باورچی کی مہارت اور تیسری پیش کرنے کا طریقہ۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بلاشبہ مانو یلا ریسٹورنٹ کا کھانا بہت مزے دار ہوتا ہے، کھانے کے اختتام پر ایک دوسری ٹیبل پر انواع واقسام کے پھل اور مٹھائیاں چن دی جاتی ہیں۔ بیروت کے فروٹ کا شمار دنیا کے لذیذ ترین اور تازہ ترین پھلوں میں ہوتا ہے، یہ بھی ارض مبارکہ کا حصہ ہے۔ یہ لوگ چن کر نہایت اعلیٰ درجے کا فروٹ لاتے ہیں، جو نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ آپ گزشتہ دو گھنٹوں سے باتیں کر رہے ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں، اس کے باوجود فروٹ کا اپنا مزا ہے، اس کی گنجائش کھانے کے بعد بھی موجود رہتی ہے۔ اس تمام دورانیے میں ایک نہ ایک

ویٹر آپ کی ٹیبل سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہے۔ میزبان یا آپ کے ذرا سے اشارے پر پلک جھپکنے میں آپ کی مطلوبہ چیز حاضر کر دے گا۔ مثلاً کھانے کے دوران تین سے چار مرتبہ آپ کی پلیٹ بدلے گا، ذرا پانی یا جوس کا گلاس خالی نظر آیا تو اسے فوراً بھر دے گا۔ لبنانی قوم کے بارے میں میرا ایک تجزیہ ہے کہ یہ قوم آپ کی جیب سے پیسہ نکالنے کا فن جانتی ہے۔ آپ بھی ان کو پیسہ دے کر خوش ہوتے ہیں۔ بھئی! جو آپ کو اتنا پروٹوکول اور احترام دے رہا ہے اس کا حق بنتا ہے کہ آپ کی جیب کا حصے دار بنے۔

حلال گوشت کا مسئلہ میرے لیے بیروت میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ میں اس معاملے میں خاصا سخت اور شکی مزاج واقع ہوا ہوں۔ یہاں ''بربر'' کے نام سے ایک مشہور ریسٹورنٹ ہے جو حلال فوڈ کے لیے مشہور ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ نہایت صاف ستھرا چھوٹا سا یہ ریسٹورنٹ کئی حصوں میں منقسم ہے۔ بیس پچیس نشستیں ہوں گی جو عموماً بھری رہتی ہیں۔ اس میں ریسٹورنٹ کے علاوہ سینڈوچ کی دوکان، جوس کارنر اور آئس کریم کارنر بھی ہے، یہ چار دوکانیں ہیں جو آپس میں جڑی ہوئی ہیں اور چاروں پر ہر وقت رش ہوتا ہے، نہایت لذیذ کھانا اور کوئیک سروس۔ میں چل پھر کر کھانے کو جائز نہیں سمجھتا، بیٹھ کر کھانا کھانے کو ترجیح دیتا ہوں، اس لیے نشست خالی ہونے کا انتظار گراں نہیں گزرتا۔ یہ سو فی صد حلال فوڈ ہے، گوشت شام سے آتا ہے۔ یہ ریسٹورنٹ اتنا چلتا ہے کہ آپ کے تصور سے بھی بالاتر ہے۔ جو بھی مسلمان سیاح یہاں آتے ہیں وہ ادھر ہی کا رخ کرتے ہیں۔ کھانا بھی اتنا مہنگا نہیں ہے۔ آپ کے آرڈر کی تعمیل بڑی آسانی اور تیزی سے ہوتی ہے۔

عربوں کے لیے اور دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے بیروت میں کشش کا ایک سبب

یہاں کا آزادانہ ماحول بھی ہے۔ ساحل سمندر پر کورنش بڑا خوبصورت ہے، صبح و شام ہزاروں مرد، عورتیں سیر وتفریح کرتے نظر آتے ہیں۔ جب سے میں نے بیروت جانا شروع کیا ہے چند ایک سفر چھوڑ کر میرا قیام ایک ہی ہوٹل میں رہا ہے۔ اس کا نام ''امپریل سویٹس ہوٹل'' ہے، یہ الحمراء کے علاقے میں ہے، اس کے قریب ہی ایک مسجد ہے جس کے امام کا یہ کہنا تھا کہ وہ امام سعود یونیورسٹی ریاض سے فارغ ہے اور سلفی افکار کا حامل ہے۔ اس ہوٹل میں شراب نہیں بکتی، بڑا صاف ستھرا ماحول ہے۔ صبح کا ناشتہ بڑا عمدہ ہوتا ہے، جو کمرے کے کرائے ساٹھ ڈالر یومیہ میں شامل ہوتا ہے۔ ہم لوگ چونکہ اس کے مستقل گاہک ہیں اس لیے عملہ ہمیں خوب پہچانتا ہے۔ یوں بھی یہ ہوٹل کوئی بڑا نہیں، زیادہ سے زیادہ پچاس کمرے ہوں گے، مگر باتھ روم نہایت صاف ستھرے، کمرے کھلے، روشن اور ہوا دار ہیں۔ ہر کمرے میں چھوٹا سا کچن ہے، جہاں آپ چائے بنانا چاہیں تو آپ کو کھلی آزادی حاصل ہے۔ ہم نے آج تک یہاں دو پہر یا رات کا کھانا نہیں کھایا۔ جب ہم دمشق سے آتے تو اپنا سامان رکھ کر ایک دو گھنٹے کے لیے میٹنگ کرتے۔ میں یاسر کے ساتھ معاملات طے کرتا، نئی کتابوں کے ریٹ لیتا، پیپر کہاں سے خریدنا ہے اور آج کل اس کے ریٹ کیا ہیں، کس ملک کے ریٹ سستے ہیں اور پریس مالکان کون سے ورق کی تعریف کرتے ہیں۔ ہر ناشر کے لیے پیپر کا حصول بڑا مسئلہ ہوتا ہے، اہمیت صرف ریٹ اور کوالٹی کی ہوتی ہے، اگر ورق اچھا ہو تو کتاب کی کوالٹی خود بخود اچھی ہو جاتی ہے۔

دارالسلام نے اس سلسلے میں بڑے جرأت مندانہ فیصلے کیے۔ انڈونیشیا سے ہم نے APP کمپنی کا ورق براہ راست منگوانا شروع کیا۔ یادش بخیر! ہندوستان سے تعلق رکھنے والے عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے پیارے ساتھی تھے، وہ سعودی عرب میں اس کمپنی کے

نمائندے تھے، ہم نے ان کی معرفت انڈونیشا سے براہ راست ورق منگوانا شروع کیا۔ کنٹینرز وہاں سے ریاض کم وبیش ساڑھے تین ماہ میں پہنچتا تھا۔ ہم نے اس طرح کا اہتمام کر رکھا تھا کہ ہر ماہ دو سے تین کنٹینرز منگواتے۔ ایک کنٹینر پر تقریباً اٹھارہ ٹن ورق ہوتا ہے، اس طرح ہمیں ہر کنٹینر پر اٹھارہ سو ڈالرز کی بچت ہوتی اور ہم مارکیٹ سے ورق خریدنے کی زحمت سے بھی بچ جاتے، مگر اس کے لیے بہت زیادہ پلاننگ کی ضرورت ہوتی تھی، کیونکہ اگر کوئی بڑا منصوبہ آپ کو مل جائے تو اس کے لیے بازار سے اچانک ورق خریدنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، پھر مختلف کتابوں کے لیے ورق کی مختلف انواع ہوتی ہیں، پھر ہر نوع کے مختلف سائز ہوتے ہیں۔ آدمی کتنی ہی منصوبہ بندی کر لے، بہرصورت وہ مارکیٹ کا محتاج تو رہتا ہی ہے۔

مارکیٹ میں یاسر طباع کی شہرت بڑی اچھی ہے، اس لیے ہر کوئی اس کا کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے کہ دارالسلام کے چیک کبھی باؤنس نہیں ہوئے۔ ہم اسے ہر ہفتے پہلے پانچ ہزار ڈالر ارسال کرتے تھے، پھر دس ہزار، پھر پندرہ، بیس، پچیس، تیس، پینتیس، چالیس اور پچاس ہزار ڈالر ہر ہفتے بھجوانا شروع کیے۔ آج ہمیں الحمدللہ! ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ چند ہفتوں کو چھوڑ کر ہم نے جو مبلغ ان کے ساتھ طے کیا تھا وہ ہر حال میں پورا کیا ہے۔ بزنس ہوا ہے یا نہیں، مارکیٹ تیز ہے یا کاروبار میں مندی ہے، مگر جو میں نے یاسر کے ساتھ طے کیا وہ اللہ کے فضل وکرم سے ہر حالت میں بھجوایا ہے۔ چند مرتبہ نہ بھجوانے کا سبب میرا سفر میں ہونا تھا، مگر اگلے ہفتہ ہم نے انھیں ڈبل پیسے بھجوائے۔ اس کے علاوہ جو کیش میں ساتھ لے جاتا وہ ہم فلمیں اور پلیٹیں بنانے والوں کو یا ٹونی کو ادا کر دیتے۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ

علامہ صاحب بلا شبہ اس دور کی عبقری شخصیت تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اور جتنا کچھ لکھا گیا وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ اہلحدیث مؤرخین نے ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی ہے اور آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔

میں اس مضمون میں اپنی یادداشتوں کے حوالے سے کچھ باتیں قلم بند کروں گا۔ علامہ صاحب کی شہادت 31 مارچ 1987ء کو ہوئی۔ اس حادثہ فاجعہ کو ربع صدی گزر چکی ہے، میں بس اتنا لکھوں گا کہ میں اپنے والد گرامی کی وفات پر غالباً اتنا نہیں رویا جتنے آنسو میں نے علامہ صاحب کی شہادت پر بہائے۔ بہر حال یہ امر ربی تھا، تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ وہ خود تو درجۂ شہادت پر فائز ہو کر مدینہ طیبہ میں بقیع کے قبرستان میں مدفون ہو گئے مگر ہم لوگوں کو اور تمام جماعتی کارکنوں کو غم سے نڈھال کر گئے۔

علامہ شہید سے میری پہلی ملاقات غالباً 1978ء میں لاہور میں ان کے شادمان کالونی والے گھر پر ہوئی تھی۔ میں ان دنوں جمعیت شبان اہل حدیث حافظ آباد کا ناظم تھا۔ ہم حافظ آباد میں کانفرنس کا انعقاد کر رہے تھے، میں ان کو اس میں مدعو کرنے کے لیے گیا تھا۔ یہ غالباً 1985ء کی بات ہے کہ مجھے اطلاع ملی کہ علامہ صاحب ریاض کے منہل ہوٹل میں

مقیم ہیں۔ علامہ صاحب جب بھی ریاض تشریف لاتے اسی ہوٹل میں قیام پذیر ہوتے تھے، آج کل اس ہوٹل کا نام ہولیڈے ان ہے۔ یہ فائیوسٹار ہوٹل میرے گھر سے 15 منٹ کی ڈرائیونگ پر تھا۔ میں نے فون پر ان سے رابطہ کیا اور ملاقات طے پا گئی۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میری ان سے ملاقات ہوئی۔ علامہ صاحب ان دنوں لاہور میں کمپیوٹر لگانے کا عزم کیے ہوئے تھے اور سروے جاری تھا کہ کون سا کمپیوٹر لگائیں۔ میں اس تجربہ سے گزر چکا تھا۔ ہم نے اس زمانے میں ایک لاکھ بیس ہزار ریال کا کمپیوٹر خریدا تھا اور اس کے علاوہ پرنٹر 35 ہزار ریال میں آیا تھا۔ ہم نے ان دنوں اسے مکتبہ دارطیبہ شارع عسیر کے دفتر میں لگایا ہوا تھا۔ میرے پاس اس وقت جو گاڑی تھی وہ کوئی قیمتی نہ تھی۔ میں نے علامہ صاحب کو دعوت دی کہ ریاض میں جمعیت اہل حدیث کے کارکنوں سے خطاب کریں جو انھوں نے قبول کرلی۔ یہ پروگرام میں نے اپنے گھر پر ہی رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں علامہ صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر دارطیبہ لے گیا تھا۔ راستے میں کمپیوٹر کے موضوع پر ان سے خوب بحث ہوئی۔ ان کے پاس بھی بہت معلومات تھیں، جبکہ میں کمپیوٹر خرید چکا تھا اور تجربات سے گزر رہا تھا۔ اس وقت دو بڑے کمپیوٹر مارکیٹ میں موجود تھے: ایک کمپوگرافک اور دوسرا سی آرٹرونک، جو میں نے لگا رکھا تھا۔ ہم دونوں کے پاس اپنے اپنے دلائل تھے، غالبًا وہ میری ملاقات سے پہلے کمپوگرافک خرید چکے تھے۔ علامہ صاحب پروگرام کے لیے میرے گھر تشریف لائے، برادر عزیز حافظ عابد الٰہی بھی ان کے ہمراہ تھے، انھوں نے خطاب کیا اور پھر کارکنوں کے سوالات کے جوابات بھی دیے۔

میں شخصی طور پر علامہ صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھا، وہ نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن اور ہر اہل حدیث کے دل کی آواز تھے۔ ہم ان لوگوں میں سے تھے جو کچھ کر

گزرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ علامہ صاحب کو قدرت نے نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہوا تھا، اس لیے میں ان کو اپنا قائد مانتا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ حافظ عابد الٰہی سے میری گہری دوستی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ہم نے دار طیبہ کو چھوڑا اور شارع الضباب پر ایک خوبصورت دفتر کرائے پر لے لیا، اس بلڈنگ میں اسلامی انشورنس کمپنی کا ایک دفتر بھی تھا۔ ہمارے دفتر میں چار یا پانچ کمرے تھے۔ ایک خوبصورت بلڈنگ میں فرسٹ فلور پر یہ فلور بڑی نمایاں تھی۔ اس وقت قاری محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ علامہ صاحب ریاض تشریف لائے ہوئے ہیں، ہماری خواہش تھی کہ ہم ان کو اپنا دفتر دکھائیں۔ رابطے کے لیے حافظ عابد الٰہی موجود تھے۔ ہم نے انھیں اپنی خواہش پہنچادی تھی، مگر ابھی تک ان کے جواب کا انتظار تھا۔ مجھے آج بھی اپنے الفاظ یاد ہیں، میں نے حافظ عابد الٰہی صاحب کو فون کیا: حافظ صاحب! علامہ صاحب سے پوچھیے وہ ہمارے دفتر تشریف لا رہے ہیں یا نہیں؟

انھوں نے فوراً جواب دیا: کیوں نہیں، کیوں نہیں! ہم لوگ آرہے ہیں، میں نے پوچھا: کب؟ جواب ملا: کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم لوگ آپ کے پاس ہوں گے، یقیناً یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، فون بند کیا تو گویا دفتر میں ایمرجنسی نافذ ہوگئی۔ میں نے تقریباً چیختے ہوئے اسٹاف کو یہ خوش خبری سنائی کہ علامہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ کسی کو صفائی پر لگایا، کسی کو دفتر کی ترتیب پر لگا دیا، اس وقت ریاض میں سموسے اور گلاب جامن جیسی اشیاء صرف شمیسی کے علاقے میں ہی ملتی تھیں۔ ایک آدمی کو وہاں بھجوا دیا اور ہم خود سراپا انتظار ہو کر علامہ صاحب کی راہ تکنے لگے۔ وقت مقررہ سے قدرے پہلے ہی وہ تشریف لے آئے۔ بلڈنگ کے دروازے پر ہم نے ان کا استقبال کیا۔ مغرب کا

وقت ہو چکا تھا، ہم نے دفتر ہی میں جائے نماز بچھا لیے اور علامہ صاحب کی امامت میں نماز مغرب ادا کی۔ نماز کے بعد انھوں نے مصلے پر بیٹھے بیٹھے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ہم نے دستر خوان بچھا دیا، علامہ صاحب مختلف اشیاء کو پسند کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے: یار عبدالمالک! تم نے تو آج یہاں لاہور بنا دیا ہے۔

انھوں نے دفتر کا چکر لگایا، دارالسلام کا عملہ اس وقت بہت تھوڑا سا تھا۔ ہمارے اسی فلور پر اسلامک انشورنس کمپنی کا دفتر تھا، کہنے لگے: یہ کیا بات ہوئی انشورنس کمپنی بھی اور اسلامک بھی، چلو ذرا ان کے ہاں چلتے ہیں۔ اگلے چند لمحات میں ہم اس دفتر میں تھے، وہاں کا انچارج ایک سوڈانی تھا۔ اس سے گفتگو کی، مناظرہ شروع ہو گیا۔ اسے اپنی زبان دانی اور عرب ہونے پر فخر تھا، مگر ادھر علامہ صاحب تھے، وہ عربی زبان بولتے تو ان کے سامنے عرب بھی عجمی محسوس ہونے لگتے، کیا فصیح اللسان تھے!! سوڈانی منیجر نے زچ ہو کر حوالہ دیا: ہمارے پاس شیخ ابن باز کا فتویٰ ہے۔ علامہ صاحب فرمانے لگے: شیخ کا احترام اپنی جگہ، مگر انھیں معاشیات کا علم تو نہیں ہے کہ وہ اس پر فتویٰ صادر کریں۔ اس نے اس مسئلے پر اپنی طرف سے مزید روشنی ڈالی اور بار بار شیخ ابن باز کا حوالہ دیا تو علامہ صاحب جوش میں آ کر کہنے لگے: کیا وہ اللہ کے رسول ہیں کہ ان کی ہر بات حرف آخر ہو؟! یہ سلسلہ کوئی دس پندرہ منٹ چلتا رہا۔ ہم انھیں الوداع کرنے کے لیے نیچے آئے تو علامہ صاحب نے قاری محمد صدیق کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: قاری صاحب! مسلک اہل حدیث اس کا نام ہے کہ ہم دلیل کسی شخصیت کے نام سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے پکڑیں۔ ہمارا مسلک شخصیتوں کے گرد نہیں گھومتا بلکہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے براہ راست رہنمائی لیتے ہیں۔

فروری 1987ء کے وسط کی بات ہوگی کہ علامہ صاحب ایک بار پھر ریاض تشریف لائے۔ میں نے ان کو اپنے گھر کی چھت پر استقبالیہ دیا۔ حاضرین کی تعداد کم وبیش 150 ہوگی۔ اس وقت یہ تعداد خاصی بڑی شمار ہوتی تھی، سبھی لوگ آئے، میں نے بریانی کی ایک بڑی دیگ پکوائی۔ ہمارے چچا زاد بھائی ڈاکٹر حبیب الرحمان کیلانی صاحب ان دنوں طائف میں ہوا کرتے تھے۔ پاکستان جاتے ہوئے وہ از راہ شفقت ومحبت ریاض بھی تشریف لایا کرتے، اس موقع پر وہ بھی موجود تھے۔ علامہ صاحب کی طبیعت خراب تھی۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے علامہ صاحب کو چیک کیا اور پھر برادرم محمد اقبال کیلانی ان کے لیے میڈیکل سٹور سے دوائیں لینے کے لیے بھی گئے تھے۔ اس موقع پر علامہ صاحب نے کم وبیش ایک گھنٹہ بڑا زبردست خطاب فرمایا تھا۔

جب ہم نے ریاض میں جمعیت اہل حدیث کی بنیاد رکھی تو اس کے پہلے امیر محترم ڈاکٹر امیر بخش چنا منتخب ہوئے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے سرکاری مصروفیات کی بنا پر اس ذمہ داری سے معذرت کر لی، تاہم تعلقات حسب معمول عمدہ رہے، میں نے اگلے دن ان کے گھر علامہ صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ رکھوالیا۔ ڈاکٹر چنا اور ان کی اہلیہ دل کے بڑے کھلے اور مخیّر ہیں، مہمان آتے تو خوب اہتمام کرتے۔ ان دنوں ان کا گھر شارع تحلیہ پر تھا۔ اسی روز علامہ صاحب کی واپسی بھی تھی۔

علامہ صاحب ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب اور عابد الٰہی صاحب کے ہمراہ تشریف لائے، ہم پہلے ہی اسٹیج پر بیٹھ چکے تھے۔ مختصر سا سٹیج تھا، میں علامہ صاحب کے بائیں جانب بیٹھا تھا۔ میں نے علامہ صاحب کے اس قدر قریب بیٹھ کر غالباً پہلی اور آخری مرتبہ ان کا خطاب سنا تھا۔

وہ بلاشبہ خطابت کے بادشاہ تھے۔ وہ پوری قوت اور طاقت سے بولتے تھے۔ سٹیج کانپتا تھا، مگر ان کے الفاظ میں لذت ہوتی اور مفہوم بہت واضح ہوتا تھا۔

ڈاکٹر چنا صاحب نے بڑے وسیع پیانے پر کھانے پینے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ چونکہ علامہ صاحب کو ائر پورٹ جانا تھا، اس لیے وہ ڈاکٹر فضل الٰہی اور حافظ عابد الٰہی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی کھڑا ہوا۔ علامہ صاحب نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ مجھے گلے لگایا اور فرمانے لگے: اچھا جی اجازت دیجیے، مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اٹھ کر چلا گیا تو مہمانوں کی اکثریت بغیر کچھ کھائے پیے چلی جائے گی اور میزبان نے جو اہتمام کر رکھا ہے اس کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔ اب کسے معلوم تھا کہ یہ ہمارے درمیان آخری ملاقات ہو رہی ہے۔ مہمان بھی کھڑے ہوئے، مگر سب کے ساتھ ہاتھ ملانے کا وقت نہ تھا اور علامہ صاحب پاکستان تشریف لے گئے۔

قلعہ لچھمن سنگھ لاہور کے جلسے میں ہونے والا بم دھماکہ جمعیت کے ساتھیوں پر بجلی بن کر گرا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ سیاہ ترین دن تھا۔ اس سے قبل پاکستان میں بم دھماکوں کا کوئی تصور نہ تھا، مگر علامہ صاحب کے خون کی سرخ لکیر وجود میں آئی تو بدامنی اور بدقسمتی نے وطن عزیز کو گھیر لیا۔ اس واقعے سے تحریک اہل حدیث کو زبردست دھچکا لگا۔ ہمیں چوٹی کی قیادت سے محروم کر دیا گیا۔

23 مارچ 1987ء کو رات گئے مجھے اس حادثے کی اطلاع مل گئی تھی، مگر معلومات مکمل نہ تھیں۔ پھر خبریں آنا شروع ہوئیں کہ علامہ صاحب علاج کے لیے ریاض تشریف لا رہے ہیں۔ ریاض کے اہل حدیث احباب نے اپنا مثبت رول ادا کرنا شروع کیا۔ زخمیوں اور شہداء کے ورثاء کے لیے غالباً سب سے زیادہ فنڈ ریاض ہی سے روانہ کیے گئے تھے۔

علامہ صاحب کا طیارہ جب ریاض کے ائر پورٹ پر پہنچا تو راقم الحروف، حافظ عابد الٰہی، ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب اور دیگر بہت سے کارکنان ائر پورٹ پر موجود تھے۔ ایک ایک لمحہ ہمارے لیے گھنٹوں کے برابر تھا، ہم سب اپنے قائد کے انتظار میں تھے، ان کو دیکھنا چاہتے تھے، ان سے ملاقات کے لیے بے تاب تھے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے سفیر پاکستان جناب امیر گلستان جنجوعہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ انھوں نے حکومت پاکستان کی طرف سے علامہ صاحب کو خوش آمدید کہا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا، طیارہ جیسے ہی رکا وہ طیارے کے اندر گئے۔ علامہ صاحب اس وقت ہوش میں تھے، انھوں نے سفیر صاحب کو پہچانا اور کہا: سفیر صاحب! آپ کا شکریہ، آپ تشریف لائے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ بات مجھے سفیر صاحب نے خود بتائی تھی۔

ائر پورٹ کے اندر ہی ایمبولینس کھڑی تھی، ہم ہوٹر کی آواز سن رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ باہر تشریف لائیں گے اور ہم ان سے ملاقات کر سکیں گے۔ علامہ صاحب کے ساتھ ان کے والد گرامی، ڈاکٹروں کی غالباً آٹھ یا دس رکنی ٹیم مع ایک نرس کے آئی ہوئی تھی۔ سعودی حکومت کی طرف سے ان کا مخلصانہ استقبال ہوا۔ لہٰذا وہ جلد ہی امیگریشن اور کسٹم کی کارروائیوں سے فارغ ہو کر باہر آ گئے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم کی سربراہی معروف ہارٹ سپیشلسٹ ڈاکٹر راشد رندھاوا کر رہے تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کو یقین دہانی کرائی کہ ان شاء اللہ خیر ہے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ علامہ صاحب کو ریاض کے ملٹری ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ اس زمانے میں ریاض کی سڑکوں پر اتنا زیادہ رش نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے بھی ملٹری ہسپتال کا رخ کیا۔ یہ ہسپتال میرے لیے خوب دیکھا بھالا تھا۔ میں جب وزارت دفاع میں ملازم تھا تو میرا اور میرے بیوی بچوں کا علاج اسی ہسپتال میں ہوتا

تھا۔ہم جلد ہی ہسپتال پہنچ گئے۔سفیرِ پاکستان ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ایک سوڈانی ڈاکٹر کی سربراہی میں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے ان کا فوری علاج شروع کر دیا۔سعودی آرمی کا ایک کیپٹن دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔میں نے اور عابد الٰہی صاحب نے اندر جانے کی کوشش کی،مگر کیپٹن نے روک دیا۔اندر سے علامہ صاحب کی گرجدار آواز ہم سن رہے تھے۔ہم دونوں جذباتی ہوگئے اور کیپٹن سے الجھنے لگے کہ ہمیں اندر جانے دو،مگر اس کی اپنی ذمہ داریاں تھیں۔اتنے میں سفیر صاحب آ گئے۔ہمیں الجھتا ہوا دیکھ کر کہنے لگے:ابھی چند گھنٹوں کی بات ہے،علامہ صاحب صحت یاب ہوں گے تو پھر آپ جتنا جی چاہے ان کے ساتھ ملاقات کر لینا۔میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ علامہ صاحب صحت یاب ہوگئے تو ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا استقبالیہ دوں گا،تمام کمیونٹی کو بلاؤں گا اور ایک یادگار پروگرام کروں گا۔

ہم رات گئے تک ہسپتال میں رہے،باوجود پوری کوشش کے ہمیں علامہ صاحب سے ملنے نہیں دیا گیا۔حافظ عابد الٰہی اور راقم اس دوران اکٹھے مسلسل علامہ صاحب کی صحت کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔

یہ تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ علامہ صاحب شہید بھی ہو سکتے ہیں۔تمام کارکنان ایک دوسرے کو تسلی دیتے تھے کہ بس چند دنوں کی بات ہے۔رات گئے واپس آیا،اگلے روز فجر کی نماز پڑھ کر آیا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی،فون اٹھایا تو برادرم اشرف صاحب لائن پر تھے،وہ کہہ رہے تھے:علامہ صاحب انتقال کر گئے ہیں۔«إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ»!میرے ہاتھ سے فون گر پڑا،میں اس خبر کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ہوش وحواس جواب دے گئے۔زبان پر بس«إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ»کے کلمات تھے۔

اہلیہ بھی دوسرے کمرے سے دوڑتی ہوئی آئیں اور ہم نے ایک بار پھر فون سنبھال لیا۔ اب مختلف لوگوں سے رابطے تھے، پیغامات تھے، تعزیت تھی، احباب میں کہرام برپا تھا۔

میں فوری طور پر سیدھا ملٹری ہسپتال پہنچا۔ سارا منظر ہی بدل چکا تھا۔ کل جو امیدیں قائم تھیں، آج وہ دم توڑ چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ احباب اکٹھے ہونا شروع گئے۔ ہم علامہ صاحب کے والد صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے: یا اللہ! میرے بیٹے کو معاف کر کے اپنی رضا اور جنت کا مستحق بنا دینا۔ وہ بار بار ان کی مغفرت کے لیے دعائیں کر رہے تھے، پھر مشورہ ہوا کہ علامہ صاحب کو کہاں دفن کیا جائے۔ کسی نے پاکستان کی بات کی۔ شیخ ظہور الٰہی فرمانے لگے: نہیں! اگر احسان الٰہی کو لاہور لے جایا گیا تو وہاں لوگ اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ ہمیں پاکستان پیارا ہے، ہم نہیں چاہتے کہ کسی کا نقصان ہو یا کوئی توڑ پھوڑ ہو۔ کسی نے مدینہ طیبہ کا نام لیا، کسی نے ریاض کی بات کی، اچانک شیخ ظہور الٰہی صاحب گویا ہوئے: احسان کو مدینہ بڑا پسند تھا، اسے بقیع میں دفن کریں گے۔ سب لوگوں نے ان کی تائید کی۔ ڈاکٹر فضل الٰہی تو اپنے والد محترم کے اشاروں کے منتظر تھے۔ ہم لوگ اس بلڈنگ کے سامنے کھڑے تھے جہاں علامہ صاحب کو نہلا کر کفن پہنایا جا چکا تھا اور انھیں ایک بڑے کمرے میں منتقل کیا جا چکا تھا۔

ملٹری ہسپتال میں شعبہ جالیات کے انچارج کیپٹن عبداللہ مرسل تھے۔ میں ان سے بخوبی واقف تھا۔ ہمارے شیخ عبداللہ سرور بھی ہسپتال کے اردو جالیات ہی میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں حضرات نے اور اسی طرح برادر عزیز حافظ عبدالرحمٰن کشمیری نے بڑا مثبت رول ادا کیا۔ ہر قسم کی سہولیات مہیا کیں۔ بعد ازاں میرے علم میں یہ بات آئی کہ انھوں نے غسل دینے کی سعادت بھی حاصل کی، نہلانے والی ٹیم میں وہ بھی شامل تھے۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ علامہ صاحب کی میت کو ایک بڑی بلڈنگ میں تیسرے فلور پر منتقل کر دیا گیا تھا، میں بے تاب تھا کہ چہرہ دیکھوں۔ حافظ عابد الٰہی نے بھی ابھی تک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ دروازے پر فوجی پہرہ تھا، اس نے ہمیں روکا مگر اب کی بار ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب ساتھ تھے، انھوں نے اسے اشارہ کیا کہ ان کو اندر جانے دو، ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ علامہ صاحب کو کفن پہنایا جا چکا تھا۔ متعلقہ ملازم نے چہرے سے کفن ہٹایا۔ اللہ کی قسم! وہ تو شیر تھا۔ بہت خوبصورت اور بڑا چہرہ تھا۔ بائیں طرف زخم کا بڑا ہی گہرا نشان تھا جو جسم کے نیچے تک چلا گیا تھا، چہرہ بہت پر سکون تھا۔ چند لمحے تو ہم نے صبر سے کام لیا، مگر پھر عابد الٰہی نے مجھے گلے لگا لیا اور ہم زور زور سے رونے لگے۔ اس طرح ہم نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

اس دوران خبر مل چکی تھی کہ سعودی حکومت نے ریاض سے دو خصوصی جہازوں کا بندوبست کیا ہے جو میت کو اور لواحقین کو لے کر مدینہ طیبہ جائیں گے۔ یہ دونوں طیارے عزت مآب شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز آل سعود ولی عہد حکومت سعودیہ، وزیر دفاع مملکت کے حکم پر دیے گئے تھے۔

علامہ صاحب کی پہلی نماز جنازہ ظہر کے وقت ریاض کی دیرہ والی مرکزی مسجد میں ہونا تھی۔ اس روز سارا شہر اُمڈ آیا تھا۔ میں صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں کو مجھ پر ترس آتا گیا، میری شکل ہی ایسی بنی ہوئی تھی کہ وہ میرے لیے راستہ چھوڑتے چلے گئے اور میں اسی طرح بڑھتے بڑھتے صف اول میں پہنچ گیا۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ، شیخ عبداللہ المعتاز اور دیگر بے شمار چوٹی کے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ میں نے کھڑے ہو کر شرکائے جنازہ کی طرف دیکھا، یہ مسجد ریاض کی بڑی مساجد میں سے ایک ہے، بلاشبہ ہزاروں

چند لمحے تو ہم نے صبر سے کام لیا، مگر پھر عابد الٰہی نے مجھے گلے لگا لیا اور ہم زور زور سے رونے لگے۔

کا مجمع تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آئی۔

ریاض کی اس مرکزی مسجد میں علامہ صاحب کا جنازہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ سمیت ہم لوگوں نے رو رو کر پڑھا۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا، نماز جنازہ کے بعد لوگ کندھا دینے کے لیے آگے بڑھے، ہجوم بہت زیادہ تھا۔ میں نہایت تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف آیا اور ڈاکٹر صاحب کے گھر کی طرف چل دیا، میں نے اہلیہ اور چھوٹے بچوں کو ان کے گھر اتارنا تھا۔ ان دنوں ان کا گھر حی الشفاء میں تھا۔ دس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں ایمبولینس کھڑی تھی۔ علامہ صاحب کی اور ڈاکٹر صاحب کی فیملی، ان کی بیٹیوں اور بیٹوں نے اپنے تایا ابو کا آخری دیدار کرنا تھا۔

میرے لیے یقیناً سنہری موقع تھا۔ میں نے گاڑی وہیں پارک کی اور اسی ایمبولینس میں بیٹھ کر پرانے ائر پورٹ آ گیا۔ نیچے اترے تو وہاں ایک چھوٹی سی دیوار کے اوپر محترم ڈاکٹر عبداللہ تر کی حفظہ اللہ نہایت غم زدہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی غالباً میت کو کندھا دیا، انھوں نے ڈاکٹر فضل الٰہی کو گلے لگایا، تعزیت کی اور اتنی بات میں سن سکا: فضل الٰہی! تم لوگوں نے آنے میں خاصی دیر کر دی۔

یہ C-130 جہاز تھا۔ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ میں بھی ایمبولینس سے اپنے ہاتھوں میت کو اتارنے والوں اور جہاز تک پہنچانے والوں میں شامل تھا۔ جہاز میں غالباً آٹھ یا دس لوگ تھے۔ جن میں ڈاکٹر فضل الٰہی، کیپٹن عبداللہ المرسل، سفیر پاکستان جناب

امیر گلستان جنجوعہ، شیخ عبداللہ سرور، راقم الحروف اور بعض دیگر ساتھی شامل تھے۔

علامہ صاحب کی تدفین کی سعادت کے حصول کے لیے ہم سب مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ریاض سے مدینہ کا سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوگیا تھا۔ مدینہ ائرپورٹ پہنچے تو وہاں مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک انبوہ کثیر تھا۔ مجھے یہ سعادت پھر ملی کہ علامہ صاحب کے جسد خاکی کو اپنے ہاتھوں سے زمین پر اتارا۔ اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت ائرپورٹ کے اندر رن وے تک آئی ہوئی تھی۔ میں اب بھی چشم تصور میں فضیلۃ الشیخ عبدالقادر سندھی رحمہ اللہ کو نہایت غم زدہ دیکھ رہا ہوں۔ ساتھیوں نے آہوں اور سسکیوں کے ساتھ جسد خاکی کا استقبال کیا، وہاں پر ایمبولینس کھڑی تھی، ہم لوگ اسی میں بیٹھ کر مسجد نبوی آ گئے اور ریاض الجنہ میں بیٹھ کر ذکر اذکار اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔

نماز مغرب کے فوراً بعد علامہ صاحب کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ اس روز دیگر جنازے بھی تھے یا نہیں۔ طلبہ میں برادر عزیز فضل الرحمٰن مدنی پیش پیش تھے۔ سب کی خواہش تھی کہ علامہ صاحب کا آخری دیدار کریں۔ میت کو بقیع الغرقد کی طرف لے جایا گیا۔ اتنا زیادہ ہجوم تھا کہ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ ہر شخص کندھا دینے کا خواہش مند تھا۔ بقیع الغرقد کے دروازے پر جا کر علامہ صاحب کے وجیہ چہرے سے کفن ہٹایا گیا تو لوگ زیارت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ نوجوانوں نے اپنے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک مضبوط انسانی دیوار بنا دی تا کہ لوگ آرام سے زیارت کر سکیں۔ چند منٹ آرام سے گزرے ہوں گے، مگر ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ ہماری تمام تر کوششیں ناکام ہوگئیں، مدینہ منورہ یونیورسٹی کے طلبہ نے بے پناہ نظم وضبط کا مظاہرہ کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم آنے والوں لوگوں کے لیے راستہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم اتنے زیادہ ہجوم کو کنٹرول نہیں کر سکتے تھے۔

اگر آپ مسجد نبوی کی جانب سے بقیع میں داخل ہوں تو اندر داخل ہونے کے بعد تھوڑی سی بائیں طرف علامہ شہید کی قبر ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو باوجود سخت ہجوم کے قبر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ نے بھی وہاں تک پہنچنے میں یقیناً میری مدد کی۔ اس وقت علامہ صاحب کے والد گرامی ان کی قبر پر کھڑے تھے۔ میں جب پہنچا تو علامہ صاحب کو لحد میں اتارا جا چکا تھا۔ شیخ ظہور الٰہی صاحب روتے ہوئے اپنے بیٹے کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے اور ان کی مغفرت کے لیے بار بار دعا کر رہے تھے۔ پھر قائد اہل حدیث کو منوں مٹی تلے دفنا دیا گیا۔ وہ زوردار شخصیت جو ہر باطل قوت کے سامنے ایک برہنہ شمشیر تھی، ظالموں کی سازش کا شکار ہو کر اپنے رب کے پاس جا چکی تھی۔ دنیا بھر کی سلفی قوتیں ایک عظیم قائد سے محروم ہو گئی تھیں۔

ہم لوگ عشاء کی نماز کے بعد اسی طیارے کے ذریعے واپس ریاض آ گئے۔ واپسی پر صرف میں نے اور دیگر احباب جماعت نے نشاندہی کی کہ فلاں فلاں شخص ہمارے ساتھ آیا تھا، کوئی چیکنگ نہ سیکورٹی اور نہ کوئی پوچھ گچھ ہی ہوئی۔

مجھے یاد ہے کہ اگلے دن کے عربی اخبارات نے علامہ صاحب کی شہادت کی خبر نمایاں طور پر شائع کی تھی۔ ریاض سے ایک انگلش اخبار ریاض ڈیلی نکلتا تھا اس کے اندرونی صفحے کی سرخی مجھے اب تک یاد ہے: PAK SCHOLAR DIED IN RIYADH

ان کی وفات کے بعد میرے گھر میں کارکنان کے کتنے ہی اجلاس ہوئے، ہم ان کی یاد میں روتے رہے اور انھیں خراج تحسین بھی پیش کرتے رہے۔

میرے قائد...... میرے امیر...... پروفیسر ساجد میر

جناب پروفیسر ساجد میر صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی شہادت کے فوراً بعد ریاض میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کے گھر میں ہوئی۔ میں نے ان کا نام سن رکھا تھا، مگر کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ علامہ صاحب انھیں اپنا جانشین مقرر کر کے گئے ہیں۔ علامہ صاحب کی شہادت کے بعد ایک وفد ریاض میں آیا۔ جس کی قیادت پروفیسر ساجد میر صاحب کر رہے تھے۔

ریاض میں جمعیت کا ہلکا پھلکا ڈھانچہ موجود تھا۔ میں اس کا ناظم اعلیٰ تھا۔ ہمارے امیر قاری محمد صدیق صاحب تھے۔ ہم مختلف مناسبات سے اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ پروفیسر صاحب سے تعارف ہوا، پھر جلد ہی ہم آپس میں گھل مل گئے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو اپنے گھر پر دعوت دی۔ ایک چھوٹی سی تقریب ہوگئی، جس میں اپنے ساتھیوں کو بھی بلوالیا۔ یہ وقت جمعیت اہل حدیث کے لیے بڑا مشکل تھا۔ قلعہ لچھمن سنگھ کا حادثہ کوئی معمولی المیہ نہ تھا۔ ہماری پوری قیادت شہید ہو چکی تھی۔ کارکن غمگین تھے، ناراض تھے، مشتعل تھے، وہ انتقام اور بدلے کی باتیں کرتے تھے۔ ایک طرف انھیں تسلی دینا، شہداء کے وارثوں سے ملاقاتیں کرنا، شہدائے اہل حدیث کیس مختلف تحقیقاتی اداروں میں تھا، اس

کی پیروی کرنا، متعلقہ افسروں سے رابطہ، ساتھیوں کو حوصلہ دینا، اعلیٰ حکام سے ملاقاتیں کرنا اور اس جیسے بے شمار ضروری کام تھے، جنہیں کرنا میر صاحب کی ذمہ داری تھی۔ ادھر جمعیت کے اثاثے نہ ہونے کے برابر تھے۔ جمعیت اہل حدیث کا دفتر 50 لوئر مال روڈ پر واقع تھا۔ یہ بلڈنگ علامہ صاحب کی ذاتی تھی۔ فنڈز بالکل ہی پاس نہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلا ٹائپ رائٹر ریاض کی جماعت نے مرکز کو گفٹ کیا تھا۔ ان گوناں گوں مسائل اور مشکل حالات میں پروفیسر ساجد میر صاحب نے جس طرح جماعت کی قیادت کا فریضہ انجام دیا، جماعت کو مشکلات کے بھنور سے نکالا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ کارکنوں کے پاس گئے، ان کو تسلی دی، ان کی جلی کٹی باتیں بھی سنیں، مگر ماتھے پر شکن نہ آنے دی۔ دوسری طرف جماعت کے زیر اہتمام احتجاج بھی جاری تھا۔ کسی بھی جماعت کی قیادت کے لیے ایسے لمحات بہت مشکل اور کٹھن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر کسی قائد کی قائدانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ میری ذاتی رائے میں پروفیسر صاحب نے جماعت کی قیادت کا حق ادا کیا اور جماعت کو منظّم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ جماعت کے اس وقت دو بڑے دھڑے تھے۔ مرکزی جمعیت کا دفتر 106 راوی روڈ پر تھا جس کا کنٹرول، انتظام اور تمام تر بڑے جماعتی وسائل میاں فضل حق صاحب کے پاس تھے، جو اس وقت جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ دیگر مدارس کے علاوہ جامعہ سلفیہ اور وفاق المدارس السّلفیہ کا انتظام بھی مرکزی جمعیت کے پاس تھا۔ ان حالات میں جماعت کے دھڑوں کو اکٹھا کرنے کی بڑی اشد ضرورت تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کچھ عرصے کے بعد دونوں جماعتیں متحد ہوگئیں، آپس میں صلح ہوئی اور اس کے نتیجے میں پروفیسر ساجد میر صاحب امیر جمعیت اور میاں فضل حق صاحب ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔

قارئین کرام! میں جماعت کی تاریخ لکھنے نہیں بیٹھا، یہ تو جماعت کا مؤرخ ہی لکھے گا کہ دونوں جماعتوں کو بھنور سے نکالنے کا فریضہ کن لوگوں نے اور کیسے انجام دیا، البتہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کچھ حصہ راقم الحروف اور ریاض کی جماعت کا بھی تھا۔ صلح کے حوالے سے اللہ ہی جانتا ہے کہ میرے اپنے گھر میں کتنی بار میٹنگیں ہوئیں۔ جناب میاں فضل حق صاحب بھی میرے گھر میں متعدد بار تشریف لائے، ہماری ان سے یہی گزارش ہوتی تھی کہ جماعت کو متحد ہونا چاہیے۔ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت کے کارکنان کی اس خواہش کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا۔ جب میں اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں اور جناب پروفیسر صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کو یاد کرتا ہوں تو میں نے ہمیشہ پروفیسر صاحب کی شخصیت کو نہایت امین، انتھک محنت کرنے والے، مدبر، حالات حاضرہ پر مکمل عبور رکھنے والے، ا بڑے کھلے دل والے، معاملہ فہم اور صاحب بصیرت پایا ہے۔ ان کی دانش اور انداز فکر بہت عمدہ ہے۔

پروفیسر ساجد میر صاحب سال میں دو تین مرتبہ ریاض تشریف لاتے تو ہمیں ان کی خدمت کرنے کا موقع ملتا۔ میرے لیے یہ باعث سعادت ہے کہ ہمیشہ ان کی میزبانی کی سعادت مجھی کو حاصل ہوتی۔ وہ تشریف لاتے تو ہم ان کے اعزاز میں تقاریب کا اہتمام کرتے۔ یہ تقاریب کسی ریسٹورنٹ یا ہمارے مدرسہ عفراء بنت عبید میں ہوتیں۔ پروفیسر صاحب پہلے دینی حوالے سے گفتگو کرتے گویا درس دے رہے ہیں، پھر وہ ملکی سیاست پر بولتے اور خوب بولتے۔ ہم اس پروگرام میں ریاض شہر کی تمام بڑی بڑی سیاسی اور سماجی شخصیات کو دعوت دیتے۔ ان تقاریب کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ لوگوں کو مسلک اہلِ حدیث کے بارے میں جاننے اور ہمارے قریب آنے کا موقع ملا۔ اللہ کا شکر ہے کہ

ریاض میں اہل حدیث حضرات نہایت معروف ہیں اور بہت معزز سمجھے جاتے ہیں۔انھیں شہر میں ہونے والی تمام تقاریب میں مدعو کیا جاتا ہے اور خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ امیر محترم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ عام مقررین جس بات کو کئی منٹوں میں بیان کرتے ہیں وہ اس بات کو چند سیکنڈ میں سامعین کے دل و دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔بس چند جملے، چند فقرے یا بہت ہی بروقت اور خوبصورت شعر محفل کو چار چاند لگا دیتا۔ پروگرام کا ماحول خوشگوار ہو جاتا۔وہ اپنے مخالفین پر تنقید بھی کرتے،مگر انداز اتنا خوبصورت ہوتا کہ اپنا مدعا بھی بیان ہو جاتا اور کسی کی دل آزاری بھی نہ ہوتی۔

ایسے پروگراموں میں ہم سامعین کو سوال و جواب کا موقع بھی فراہم کرتے۔سامعین کو کاغذ کی پرچیاں دے دی جاتیں،وہ اپنے سوال لکھ کر سٹیج پر بھجوا دیتے اور میر صاحب ان کے جوابات بڑے شگفتہ انداز میں دیتے۔ ہلکے پھلکے انداز کی اس گفتگو سے لوگ محظوظ بھی ہوتے اور انھیں آگہی بھی مل جاتی۔بہرحال ہمیں ان کی آمد کا انتظار رہتا، جب ان کی تشریف آوری کی خبر ملتی تو کارکنان میں خوب جوش پیدا ہو جاتا۔ہم ان کے لیے تقاریب کا بندوبست کرنے لگ جاتے۔عموماً ان کی آمد سے پہلے میری ذمہ داری ہوتی تھی کہ میں ان کے شایانِ شان ان کی رہائش کا بندوبست کروں۔انھیں جن جن سرکاری یا غیر سرکاری شخصیات سے ملاقاتیں کرنی ہوتیں۔ان سے وقت لینا، پھر ان کو اپنی گاڑی پر لے جانا، ملاقات سے پہلے ایجنڈا بنانا، متعلقہ کاغذات تیار کرنا اور یہ کاغذات متعلقہ شخص یا ادارے کے پاس پہنچانا میرے فرائض میں شامل تھا۔وہ بالعموم تو حکومت کے مہمان ہوتے،مگر کبھی کبھار ہمیں بھی خدمت کا موقع مل جاتا۔انھیں فائیو سٹار ہوٹلوں کے کھانے قطعی ناپسند ہیں۔اس لیے میری کوشش ہوتی کہ انھیں گھر کا کھانا مہیا کیا جائے۔کھانے کے

معاملے میں وہ پاکستانی کھانے ہی پسند کرتے ہیں۔ان کی پسندیدہ ڈشیں ثابت مسور کے ساتھ ابلے ہوئے چاول، بھنڈی گوشت، کریلے گوشت اور مٹن کباب ہیں۔ مختلف قسم کے سلاد بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ہماری نوکرانی کو بھی خوب معلوم تھا کہ میر صاحب کو کیا کیا چیزیں پسند ہیں، چنانچہ وہ ان کی مرضی کے مطابق بڑے شوق سے کھانے پکاتی۔ میں اسے اشارہ کر دیتا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں تو وہ ان کی مرضی کے کھانے بنانے کے لیے کمر بستہ ہو جاتی۔ دارالسلام میں ان کی آمد کے موقع پر ہر روز دوپہر کو دستر خوان لگ جاتا اور اس پر انواع واقسام کے کھانے چن دیے جاتے۔ دفتر کے احباب بھی اس میں شامل ہو جاتے، گپ شپ بھی ہوتی اور سوال وجواب بھی ہوتے، نیز حالات حاضرہ پر سیاسی تبصرہ بھی ہو جاتا۔ ہم ان سے کہتے: میر صاحب! یہ رونقیں اور یہ مزے آپ کی آمد ہی کی وجہ سے ہیں۔

الحمدللہ! ہمارے تعلقات کو قائم ہوئے ستائیس سال ہونے کو ہیں اور یہ دن بدن بہتر سے بہتر ہی ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ جب ریاض تشریف لاتے تو پورا دارالسلام ان کے دفتر میں تبدیل ہو جاتا۔ جیسے ہی وہ ہوٹل سے ہمیں فون کرتے ہم ان کو دارالسلام کے دفتر میں لے آتے۔ یہاں ان کو ان کی پسند کی تمام اشیاء میسر ہو جاتیں۔ ادارے کے تمام کارکنان میر صاحب کے کارکن ہیں۔ انھیں دستاویزات کا ترجمہ، ٹیلی فون، فیکس، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹائپنگ، فوٹو کاپی غرضیکہ ہر وہ سہولت جو ایک جماعت کے سربراہ کو درکار رہتی ہے دارالسلام میں مل جاتی۔ ادارے کا ہر فرد ان کے اشارے کا منتظر رہتا۔ خود میری اپنی کیفیت یہ تھی کہ ان کے سعودی عرب آنے سے پہلے پہلے میں اپنے ضروری کاموں کو نمٹا لیتا۔ سب کو بتا دیتا کہ میر صاحب تشریف لا رہے ہیں

ان کے آنے سے پہلے جو کام مجھ سے لینا ہے وہ لے لیں۔ ان کی آمد پر میں مشغول ہو جاؤں گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود ان کے احکامات کا منتظر رہتا۔ کوشش ہوتی کہ انھیں جس قدر راحت اور سکون پہنچایا جا سکے اس میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔

ہمارے ادارے کا مصری کارکن شاکر قاضی تمام خطوط کی ٹائپنگ کرتا۔ ہم ان کی فائلیں مرتب کرتے۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ میں جماعت کا راز دان ہوں۔ ریاض میں اہم شخصیات سے ان کی جتنی بھی ملاقاتیں ہوتیں میں ان کے ساتھ جاتا۔ دعوتیں ہوتیں تو بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ اس طرح مجھے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں کرنے، ان کی باتیں سننے اور میٹنگز اٹینڈ کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ ملاقات سے پہلے یا بعد میں ہم دونوں آپس میں تبادلۂ خیالات کرتے۔ اگر متعلقہ شخصیت کو کوئی لیٹر لکھنا ہوتا تو اس کے مضمون پر غور و فکر کرتے اور کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ جاتے۔

شروع شروع میں تو ہمیں ملاقاتوں کے وقت بعض عربوں کے تیکھے سوالوں کا جواب دینا پڑتا۔ کسی نے فنڈز کیا دینے ہوتے تھے، البتہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ موضوع بڑا دلچسپ تھا کہ جماعت میں دھڑے بندی ہے، وہ ہمیں طعنہ دیتے: آپ لوگوں میں اختلافات ہیں، اس لیے جماعت کا کام آگے نہیں بڑھ رہا۔

خاصی پرانی بات ہے کہ مجھے ایک مرتبہ پروفیسر صاحب نے ایک ادارے میں جانے کے لیے حکم دیا۔ خود وہ پاکستان میں تھے۔ میرے ساتھ محمود شاہ صاحب تھے۔ ہم اس شخص سے ملنے کے لیے گئے۔ ہم نے درخواست پیش کی۔ وہاں ایک سعودی بیٹھا ہوا تھا۔ غالب گمان ہے کہ موصوف پاکستان میں کچھ عرصہ متعین رہے ہوں گے، وہ جماعت کی داخلی کشمکش اور اختلافات سے واقف تھے۔ میں نے کاغذات پیش کیے۔ انھوں نے

ٹال مٹول سے کام لیا اور وہی روایتی ہتھکنڈا کہ جماعت میں اختلافات ہیں، دھڑے بندیاں ہیں۔ آپ لوگ کام کیا کرتے ہیں؟ بس سیاست کرتے ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے، بلکہ ہمیں بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں سنتا رہا، سنتا رہا، مگر کب تک؟ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، وہ ہمیں مسلسل ملامت کر رہے تھے۔ تم لوگ آپس میں اتحاد نہیں کرتے، تم ایسے ہو ویسے ہو۔ اس نے ذرا سانس لیا تو میں نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ آواز اللہ کے فضل سے خاصی بھاری ہے، اس وقت تو جوانی تھی۔ میں نے کہا: باللّٰه عليك يا حبيبي...... میں تمھیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تم کب سے اہلِ حدیث سے واقف ہو۔ اس نے غالباً سات سال کا ذکر کیا تو میں نے پوچھا: تمھیں اللہ کی قسم! بتاؤ، ان سات سالوں میں اہلِ حدیث کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یا کمی ہوئی ہے؟ ہماری مساجد کی تعداد پہلے سے زیادہ ہوئی ہے یا کم ہوئی ہے؟ ہمارے مدارس کی تعداد آج سے سات سال پہلے کتنی تھی اور اب ان کی تعداد کیا ہے؟ اسے اس قسم کے جوابات کی امید نہ تھی۔ میں غصے میں تھا۔ میں نے متعدد بار میز پر مکے مارتے ہوئے اس سے قسم دے دے کر سوال کیے۔ اس نے اعتراف کیا کہ واقعی گزشتہ برسوں میں اہلِ حدیث افراد، مساجد اور مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ میں نے کہا: ہم یہ نہیں کہتے کہ صلح نہیں ہونی چاہیے اور تمام گروپوں کو ایک نہیں ہونا چاہیے، مگر مجھے یہ بتاؤ! کیا ان کے درمیان کوئی منہجی اختلاف ہے؟ کیا آپس میں دینی مسائل پر اختلاف ہے؟ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ذمہ داریوں کی تقسیم پر آپس میں جھگڑا ہے۔ اللہ کا شکر ہے ان میں عقیدے کا کوئی اختلاف نہیں۔ واضح رہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی لشکر طیبہ نیا نیا بنا تھا۔ میں نے زور دے کر کہا: دیکھو ہمارا اختلاف بھی کتنا مبارک اور فائدہ مند ہے کہ

مساجد، مدارس اور اہل حدیث کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جتنے گروپ ہیں وہ تمام کے تمام اپنی اپنی جگہ مساجد اور مدارس بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ جو ادارے بنے ہیں یہ سب کے سب اہل حدیث کے ہیں، کسی اور گروہ یا فرقے کے نہیں ہیں۔ اب اس نے میری ہر بات کے جواب میں کہنا شروع کیا: ''صَدَقْتَ، صَدَقْتَ'' تم درست کہتے ہو۔ الحمد للہ! میری اب بھی ان سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی ہے تو بڑی عزت کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب 1993ء میں پہلی مرتبہ سینیٹر بنے تھے۔ ہمیں ان کے الیکشن جیتنے کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ ہم یہاں بیٹھ کر ان کے لیے دعائیں ہی کر سکتے تھے۔ میں ان کی سیٹ کے حوالے سے خاصا جذباتی تھا۔ ایک معروف عالم دین کے الفاظ مجھے ابھی تک یاد ہیں: عبدالمالک! تم تو اس طرح جذباتی ہو رہے ہو، گویا الیکشن ساجد میر نہیں تم لڑ رہے ہو۔ میں نے انھیں کہا: جناب! درحقیقت یہ الیکشن ساجد میر صاحب نہیں بلکہ یہ مسلک اہل حدیث لڑ رہا ہے۔ یہ ان کی جیت یا ہار نہیں بلکہ یہ ہر اہل حدیث کی عزت کا سوال ہے۔ اس قسم کی خوشیوں پر مٹھائی تقسیم کرنا تو ہمارے لیے عام سی بات تھی۔ دارالسلام میں ایسے موقعوں پر احباب اکٹھے ہو جاتے اور ہم یہ خوشیاں آپس میں شیئر کر لیتے۔ اخبارات سے بھی رابطہ تھا، ہم ان کو خبریں بھجواتے تو وہ انھیں اہمیت دیتے۔

پروفیسر ساجد میر صاحب بنیادی طور پر استاد ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک نائجیریا میں انگلش زبان پڑھاتے رہے۔ ان کی انگلش زبان بڑی عمدہ ہے۔ میں نے جب کبھی کوئی لفظ بولنے میں غلطی کی انھوں نے فوراً اصلاح کر دی۔ اس طرح وہ ایک چلتا پھرتا سکول ہیں۔

دارالسلام ایک وقت میں انگلش میں خوب کتابیں شائع کر رہا تھا۔ ہمارے مترجمین

میں امریکی، برطانوی اور دیگر اقوام کے لوگ شامل تھے۔ اکثر و بیشتر مؤلفین و مترجمین کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو ادیب ثابت کرنے کے لیے مشکل سے مشکل الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں۔ ایک دن پروفیسر صاحب مجھ سے کہنے لگے: مجاہد صاحب! میری سمجھ سے باہر ہے کہ جب دینی کتب کا ترجمہ ہوتا ہے تو مشکل انگلش کیوں لکھی جاتی ہے۔ دینی کتابوں میں ایسی انگلش زبان لکھی جاتی ہے کہ عام آدمی کو اس کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ اس طرح دینی کتب عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہو جاتی ہیں۔ میر صاحب ٹھیک فرما رہے تھے، میں خود بھی اس بات کے خلاف ہوں کہ دینی کتب میں مشکل انگلش استعمال کی جائے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ شیخ عبدالعزیز بن باز نے مجھ سے کہا تھا: ہم لوگوں کو انگلش زبان سکھانے کے لیے کتابیں شائع نہیں کرتے۔ آسان انداز میں لٹریچر پیش کیا کریں۔ خیر اس کے بعد میں نے آرڈر جاری کر دیا کہ جو بھی کتب دارالسلام سے شائع ہوں گی ان کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہو گی۔

جناب پروفیسر صاحب یاروں کے یار ہیں۔ ان میں وفا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا، اس بات کو قریباً پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ پاکستان سے ارکان سینیٹ کا ایک وفد بطور سرکاری مہمان ریاض آیا جس کی قیادت جناب وسیم سجاد کر رہے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم اس وفد کو استقبالیہ دیں۔ کچھ اور بڑے گروپوں نے بھی ان کی دعوت کرنی چاہی۔ معاملہ اس طرح بن گیا کہ یہ ہماری عزت کا مسئلہ بن گیا۔ دونوں طرف سے چیلنج بن گیا کہ کون استقبالیہ دیتا ہے۔ ایسی صورت حال میں پروفیسر صاحب نے اپنا فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ سفیر پاکستان بھی ہمارے خلاف تھے۔ مگر میر صاحب نے دوٹوک بات کی اور وسیم سجاد نے ہماری دعوت قبول کی۔ وسیم سجاد چیئرمین

سینیٹ تھے۔ ان کا مرتبہ نائب صدر پاکستان کے برابر تھا، اس لیے انھیں سرکاری پروٹوکول حاصل تھا۔ الحمدللہ! میر صاحب نے جس طرح ہمارا ساتھ دیا وہ بڑا یادگار تھا۔ اس پروگرام کی بدولت ریاض کے اہل حدیثوں کو بڑی عزت ملی۔ ہم نے مطعم لاثانی میں بڑی خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا۔ ان کے ساتھ سکیورٹی بھی تھی۔ ایک سعودی کرنل صاحب سکیورٹی نقطۂ نظر سے وسیم سجاد صاحب کے عین پیچھے کھڑے تھے۔ طے ہوا کہ تقاریر نہیں ہوں گی۔ صرف سوال و جواب اور کھانا ہوگا۔ وسیم سجاد صاحب کے ایک طرف میر صاحب اور دوسری طرف میں بیٹھا ہوا تھا۔ کھانے کا دور شروع ہوا تو میں نے سعودی سکیورٹی کے ارکان سے کہا کہ وہ بھی کھانے میں شامل ہو جائیں۔ غالباً پروٹوکول قوانین کے مطابق ان کا ہمارے ساتھ کھانا ممنوع تھا۔ اس لیے کرنل صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ ان کا انداز کوئی اچھا نہ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے نہایت محبت بھرے انداز میں ان کو بتایا کہ بلاشبہ یہ نائب صدر پاکستان ہیں مگر آخر انسان ہے۔ یہ سیکورٹی کے بارہ افراد صبح سے بھوکے ہیں، ان کا کیا قصور ہے؟ میں ان سے بحث کرتا رہا، بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور تمام سیکورٹی والوں نے بہت مزے سے کھانا تناول کیا۔ اس عشائیے کی بدولت جماعت کو بڑی عزت ملی۔

جماعت کی عزت اور وقار کے حوالے سے بات آئی ہے تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ خلیج کی جنگ کے دوران سعودی عرب کی حمایت میں جمعیت کا نہایت عمدہ موقف سعودی عرب کے حلقوں میں جماعت کے وقار کو نئی بلندیوں پر لے گیا۔

خلیج کی جنگ کے حوالے سے مختصراً یہ ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین کی قیادت میں عراقی فوجوں نے اچانک حملہ کر کے کویت پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایام ہماری موجودہ تاریخ کے

سیاہ ترین ایام ہیں۔ صدام کے ارادے بڑے خطرناک تھے۔ وہ سعودی عرب پر بھی حملہ کرنا چاہتا تھا۔ سعودی حکومت نے امریکہ اور پاکستان سمیت دوست ممالک سے فوج طلب کر لی۔ اب پورے اسلامی ممالک میں بحث چھڑ گئی کہ کیا غیر مسلم ممالک سے فوجی امداد لینا جائز ہے۔ سعودی عرب کے خلاف پاکستان میں جلوس نکلنا شروع ہوئے۔ اس میں جماعت اسلامی سمیت دینی جماعتوں نے صدام کی حمایت شروع کر دی۔ پاکستان میں سعودی حکومت اور آل سعود کے بارے میں مختلف معاندانہ خیالات پائے جاتے تھے۔ ان حالات میں مرکزی جمعیت اہل حدیث نے تاریخی کردار ادا کیا۔ میں نے محترم ساجد میر صاحب کو لمبا فون کیا۔ انھیں سعودی عرب کی صورت حال سے مطلع کیا کہ یہاں کے عوام مکمل طور پر آل سعود کے ساتھ ہیں۔ وہ شاہ فہد بن عبدالعزیز پر مکمل اعتماد کرتے ہیں۔ اس ملک میں انقلاب کا کوئی خطرہ نہیں۔ لوگ آل سعود کے علاوہ کسی دوسرے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لہٰذا آپ بھی سعودی حکومت کا مکمل ساتھ دیں۔ اور ان کی حمایت میں جلوس نکالیں۔

انھی دنوں رابطۃ العالم الاسلامی ریاض کے مدیر جناب ڈاکٹر عبدالالہ المعید نے ریاض میں دینی اور سماجی جماعتوں کا اجلاس طلب کیا۔ ان کا موقف تھا کہ آپ لوگ سعودی عرب کے حق میں جلوس نکالیں۔ اجلاس میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے بے بسی کا اظہار کیا بلکہ صاف انکار کیا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لوگ سخت بھرے ہوئے ہیں۔ جب میری باری آئی تو میں نے سعودی حکومت کا مکمل ساتھ دینے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہم اہل حدیث دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں اور ہم آپ کے حق میں جلوس نکالیں گے۔ میں نے محترم پروفیسر صاحب کو اس اجلاس کی کارروائی کی مکمل اطلاع دی۔ لاہور میں

پروفیسر صاحب اور میاں فضل حق مرحوم کی قیادت میں سعودی عرب کی حمایت میں بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جسے سعودی ٹی وی تین دن تک دکھاتا رہا۔

مجھے یاد ہے کہ اس موقع پر جامعۃ الامام ریاض کے زیر اہتمام ایک عالمی کانفرنس بھی ہوئی تھی۔ میاں فضل حق اور مولانا معین الدین لکھوی صاحب تشریف لائے تھے۔ جس میں سعودی عرب کی حمایت اور تائید کی گئی۔ اسی زمانے میں راقم الحروف کو بھی سعودی ٹی وی پر اظہار خیال کا موقع ملا۔ میں نے جمعیت اہل حدیث کی پالیسیوں کو واضح کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے میاں جمیل صاحب کو بھی لمبے فون کیے تھے۔ وہ ان دنوں جماعت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ میں جو فون محترم میر صاحب کو کیا کرتا تھا اس کا جماعت کو بڑا فائدہ ہوا۔ دینی جماعتوں میں فقط مرکزی جمعیت اہل حدیث ایسی جماعت تھی جس نے کویت کی حکومت کا کھل کر ساتھ دیا۔ ساجد میر صاحب کے ساتھ محترم قاضی حسین احمد نے نجی ملاقات میں کہا: کویت کی حمایت کا کوئی فائدہ نہیں، یہ ملک ختم ہو چکا ہے، اب یہ دنیا کے نقشے پر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ میر صاحب نے اس کا جواب یوں دیا: ہماری حمایت صرف سعودی عرب اور کویت کے لیے نہیں بلکہ ہمارا ایک اصولی موقف ہے، آج اگر ہم صدام حسین کے کویت پر قبضے کی مخالفت نہیں کرتے تو کل بھارت کے کشمیر پر قبضے کی مخالفت بھی نہیں کر سکیں گے۔

میرے لیے یہ شرف کی بات ہے کہ میں نے اس وقت دو پمفلٹ سعودی عرب کی حمایت میں تحریر کیے۔ انھیں خاصی بڑی تعداد میں شائع کر کے تقسیم کیا گیا۔

میر صاحب نے بعد میں خود مجھے بتایا کہ مجھ سے قاضی حسین احمد صاحب نے پوچھا: کیا آپ کے پاس کوئی اتنی شخصی معلومات بھی ہیں یا کوئی آپ کا نمائندہ ہے جو آپ کو وہاں

کے حالات کی رپورٹ پیش کرتا ہے۔ ساجد میر صاحب نے فرمایا: ہاں! ہمارا مستقل نمائندہ ریاض میں ہے اور وہ ہمیں سعودی عرب کے بارے میں ہر وقت تازہ ترین معلومات فراہم کرتا رہتا ہے۔ ہماری ثقہ معلومات کے مطابق سعودی حکومت کو قطعاً کوئی خطرہ نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ قاضی صاحب کا موقف درست نہ تھا، وہ صدر صدام کی تقریروں سے متاثر نظر آتے تھے۔

2009ء میں میرے اوپر ایک مشکل وقت آیا تو پروفیسر ساجد میر صاحب پاکستان سے خصوصی طور پر تشریف لائے۔ سعودی وزیر داخلہ جناب شہزادہ نائف بن عبدالعزیز آل سعود سے ملاقات کی اور میری بھرپور وکالت کی۔ ان کا ایک ہی سوال تھا کہ ہمارے آدمی کا قصور کیا ہے؟ انھوں نے میری اہلیہ کا پیغام بھی موصوف کو پہنچایا، جس پر وہ بڑے محظوظ ہوئے۔ جس بے باکی سے اور جن کھلے الفاظ میں انھوں نے میری وکالت فرمائی یہ انھی کا خاصہ تھا۔ انھی ایام میں انھوں نے پاکستان کی پارلیمنٹ میں بھی سمندر پار پاکستانیوں کے مسائل کو اٹھایا۔ اس ملاقات کا فوری نتیجہ تو نہ نکلا، تاہم مجھے جیل میں خاصی سہولتیں مل گئیں۔

میں نے ان کی رفاقت میں سعودی عرب کے موجودہ ولی عہد سمو الامیر سلمان بن عبدالعزیز سے متعدد ملاقاتیں کی ہیں۔ کتنی ہی بار شیخ ابن باز سے ملاقات اور ان کے دستر خوان پر کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی دعائیں لی ہیں۔ میرے لیے یہ بھی اعزاز ہے کہ میں کم از کم تین چار مرتبہ میر صاحب کے ہمراہ سمو الامیر نائف بن عبدالعزیز کے ساتھ ملا ہوں۔ ہمیں سعودی عرب کی مجلس شوریٰ کے رئیس ڈاکٹر عبداللہ آل الشیخ سے، رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی، سعودی وزیر مذہبی امور شیخ صالح

بن عبدالعزیز بن محمد آل الشیخ، سعودی وزیر عدل، سعودی وزیر تعلیم، بے شمار امراء، وکلاء الوزارات، سعودی اعلیٰ عہدے داران، شاہی خاندان کے افراد، مفتی عام سعودی عرب، علماء، دعاۃ اور بڑے مسئولین سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں تقریبا ہر میٹنگ میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ اس قسم کی ملاقاتوں میں انسان کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ الحمدللہ! میں ان ملاقاتوں کا امین ہوں۔ میر صاحب کے ساتھ کھانے تو اتنے کھائے ہیں جن کو اگر میں سیکڑوں کی تعداد میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ہمارے ایک دوست انجینئر عبدالعزیز بٹ صاحب تھے، اب مدت دراز ہوئی پاکستان واپس جا چکے ہیں۔ وہ خاندانی اہل حدیث تھے۔ مسلم لیگ ''ن'' سے بھی تعلق تھا۔ جب میر صاحب آتے تو ان کا اصرار ہوتا کہ میر صاحب ان کے گھر کھانے پر ضرور آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے بزرگوں کی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ وہ علمائے اہل حدیث کو اپنے گھر کھانے پر بلوایا کرتے تھے۔ میں بھی اس روایت کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا ہاتھ اور دستر خوان بڑا کھلا تھا۔ ان کی اہلیہ بڑے مزے مزے کے کھانے پکاتیں۔ دستر خوان پر ان گنت ڈشیں سج جاتیں۔ میر صاحب کو کشمیری چائے کا بھی شوق تھا۔ عبدالعزیز بٹ کے گھر کی چائے اور اس کے ساتھ کشمیری بازار لاہور کی باقر خوانی کا مزا اب بھی مجھے یاد ہے۔ ریاض میں ہمارے ایک اور دوست انجینئر عبدالوحید میر صاحب بھی ہیں۔ یہ بھی خاندانی اہل حدیث ہیں۔ ان کا تعلق میر پور آزاد کشمیر سے ہے۔ نہایت شریف النفس انسان ہیں۔ عرصۂ دراز سے سعودی عرب کی بجلی پیدا کرنے والی کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔ عبدالوحید میر صاحب بھی جناب پروفیسر صاحب سے بہت محبت کرتے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی میر صاحب اور ہمارے لیے بڑے اچھے اور عمدہ کھانے

بناتیں۔ جب ساجد میر صاحب آجاتے تو کچھ وقت عبدالوحید میر صاحب بھی ان کے ہمراہ رہتے۔ شام کے وقت ان کو بازار شاپنگ کے لیے لے جاتے۔ عبدالوحید میر صاحب بڑے اصرار سے اپنے گھر ان کی میزبانی کرتے۔ انھیں کشمیری کھانے کھلاتے، مجھے بھی اصرار سے بلواتے۔ اگر میں معذرت کرتا تو پروفیسر صاحب کا حکم آجاتا کہ مجاہد صاحب! آج رات عبدالوحید صاحب کے ہاں کھانے کے لیے چلنا ہے۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ میرے لیے بھی یہ ناممکن تھا کہ میں انکار کرتا۔ پروفیسر صاحب کے ساتھ رہ کر میں بھی کشمیری کھانوں کا شوقین ہوگیا۔ میں بھی رات کو ثابت مسور اور ابلے ہوئے چاول بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔ کالے چنوں کا شوربا اور ابلے ہوئے چاول بڑی عمدہ ڈش ہے۔ میں اس قسم کے کھانے کھاتے ہوئے پروفیسر صاحب کو بہت یاد کرتا ہوں۔ میر صاحب کی محبت میں مجھے کشمیری چائے سے بھی بہت الفت ہوگئی ہے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والی بعض فیملیاں کبھی کبھار میرے لیے کشمیری چائے بنا کر بھجواتی ہیں۔ سردیوں میں کبھی کبھار بازار سے بھی منگوا لیتا ہوں۔

میں نے پروفیسر صاحب کے ساتھ متعدد سفر بھی کیے ہیں۔ ہم دونوں امریکا بھی گئے۔ وہاں ایک سلفی تنظیم التجمع الاسلامی تھی۔ میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات تھے۔ ان کی سالانہ کانفرنس تھی۔ انھوں نے مجھے امریکا آنے کی دعوت دی تو میں نے پروفیسر صاحب کا تعارف کروایا، انھوں نے پروفیسر ساجد میر صاحب کو بھی دعوت نامہ بھجوا دیا۔ ہم نے اکٹھے کانفرنس میں شرکت کی۔ غالباً یہ کانفرنس ڈیٹرائیٹ (Detroit) میں ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے دوران کانفرنس غالباً دو یا تین مرتبہ انگلش میں امریکیوں سے خطاب بھی فرمایا۔ ان کی خوبصورت تقریر سن کر کتنے ہی کالے مسلمان میر صاحب کے

دیوانے ہوگئے۔ وہ ان کو ہر وقت گھیرے میں لے کر سوالات کرتے رہتے تھے۔

میرے لیے یہ بات بھی باعث فخر اور اعزاز ہے کہ میں نے اور میر صاحب نے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سیر اکٹھے کی تھی۔ میں پہلی مرتبہ اس ٹاور کو دیکھ رہا تھا۔ اس روز خوب زور کی آندھی چل رہی تھی، اس لیے چھت پر نہ جاسکے۔ ہم دیگر احباب جماعت کے ساتھ دنیا کی اس سب سے اونچی عمارت کو دیکھنے کے لیے گئے۔ کسے معلوم تھا کہ دو تین برس بعد یہ عمارت زمیں بوس ہو جائے گی۔ مجھے میر صاحب کے ساتھ ایک مرتبہ انگلینڈ جانے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔

سعودی عرب میں تو کتنی ہی بار عمرے کے لیے جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کا سفر اکٹھے کیا ہے۔ ہم دمام بھی اکٹھے گئے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک قول کا مفہوم ہے کہ اگر کسی کو جاننا ہو کہ اس کا اخلاق کیسا ہے تو اس کے ساتھ سفر کیجیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسے بیسیوں اسفار میں انھوں نے اعلیٰ اخلاق کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑا۔ عموماً وہ ہنستے مسکراتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم ایک سعودی شخصیت سے ملنے گئے تو انھوں نے واپسی پر جمعیت کے لیے چار ہزار ریال کا عطیہ دیا۔ ہم باہر نکلے تو فرمانے لگے: مجاہد صاحب! اس سفر میں ہم لوگوں نے جتنی ملاقاتیں کی ہیں ان میں سب سے کامیاب میٹنگ یہ تھی، جس میں ہماری جماعت کو چار ہزار ریال مل گئے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم ریاض سے مدینہ طیبہ جا رہے تھے۔ ائر پورٹ پر ذرا لیٹ پہنچے۔ اگلے دن صبح سویرے مدینہ طیبہ میں ایک بڑی شخصیت سے ملاقات تھی۔ فلائٹ فل تھی۔ مسافر خاصے تھے۔ بس چند منٹ کی تاخیر ہوئی تھی کہ سعودی ایرلائن والوں نے ہماری سیٹیں کسی اور کو دے دیں۔ میں نے ائر لائن والوں کو بہت سمجھایا کہ دیکھیں! ہمارا مدینہ منورہ جانا بڑا

ضروری ہے، مگر وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہمارے علاوہ کئی اور سعودی بھی سیٹیں نہ ملنے کی وجہ سے پریشان کھڑے تھے۔ میں میر صاحب کا سرکاری پاسپورٹ لے کر بڑے آفیسر کے پاس چلا گیا، اسے میر صاحب کا یہ سرکاری پاسپورٹ دکھایا اور کہا کہ ہمارا سفر کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہم نے ایک بڑی شخصیت سے ملنا ہے۔ خیر اس روز جتنی مجھے انگلش آتی تھی وہ میں نے بول دی۔ عملے کے دوسرے افراد بھی اکٹھے ہو گئے۔ میں اونچی اونچی آواز میں انگلش بول رہا ہوں اور ان سے کہہ رہا ہوں کہ ہمارا اس فلائٹ پر جانا بڑا ضروری ہے۔ انتظار کی گھڑیاں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ خیر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری دعائیں کام آ گئیں۔ کچھ اثر میری انگلش نے بھی دکھایا۔ متعلقہ افسر کو ہماری اہمیت کا احساس ہو گیا۔ ائر پورٹ پر متعین ایک پولیس مین بھی اپنے آدمی کے لیے بورڈنگ پاس کے حصول کے لیے کوشاں تھا، مگر اسے سیٹ نہ مل سکی۔ ہم اسی کیفیت میں وہاں کھڑے تھے کہ عملے کا ایک رکن فرسٹ کلاس کے دو بورڈنگ پاس لے کر آ گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں اس نے بورڈنگ پاس تھماتے ہوئے کہا: آپ کے ٹکٹ تو اکانومی کلاس کے ہیں، وہاں سیٹیں ختم ہو گئی ہیں، مگر آپ کا احترام کرتے ہوئے ہم آپ کو فرسٹ کلاس میں بٹھا رہے ہیں۔ ہمارے ہاتھ میں فرسٹ کلاس کے بورڈنگ پاس دیکھ کر وہ پولیس مین ایرلائن کے عملے سے لڑنے لگا کہ تم نے میرے آدمی کو تو سوار نہیں کیا اور ان کو فرسٹ کلاس دے دی ہے۔ اتنے میں ان کا آفیسر بھی آ گیا۔ اس نے کہا: دیکھو بھئی! یہ کوئی عام لوگ نہیں، ہمیں ان کی خدمت کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ ہمیں اس سے لڑتے جھگڑتے، مطالبہ کرتے اور کامیاب ہوتے ہوئے پون گھنٹہ تو لگ ہی گیا ہوگا۔ ہم جب فرسٹ کلاس میں اپنی سیٹوں پر بیٹھے تو میر صاحب نے بلند آواز میں پڑھا: «سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا

هٰـذَا» یہ سن کر میں بہت محظوظ ہوا اور مسکرا دیا، واقعی وہ ذات پاک ہے جس نے ہمارے لیے ان سیٹوں کو مسخر کر دیا تھا۔

پروفیسر صاحب کے بارے میں اگر میں چاہوں تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ میں ان کے سفر اور حضر کا ساتھی رہا ہوں۔ وہ معاملات کے نہایت کھرے انسان ہیں۔ میرے لیے یہ باعث فخر ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھے سعودی عرب کی جمعیت کا امیر مقرر فرمایا۔ پھر مجھے جمعیت کا مدیر علاقات خارجیہ مقرر کیا۔ یہ دونوں ذمہ داریاں میرے لیے بے حد شرف وسعادت کا باعث ہیں۔

میں بلاشبہ ان دونوں اعزازات کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ یہ ان کا بڑا پن اور مجھ سے محبت ہے کہ انھوں نے بغیر میری کسی خواہش اور طلب کے مجھے یہ دونوں ذمہ داریاں تفویض کیں۔ میں نے ان سے متعدد بار یہ عرض کی ہے کہ میں ان عہدوں کی ذمہ داریاں کما حقہ پوری نہیں کر رہا، اس لیے آپ جب چاہیں تبدیلی لا سکتے ہیں، ان شاء اللہ مجھے قطعاً ملال نہ ہوگا۔ میرے نزدیک یہ عہدے جماعت کی امانت ہیں۔ جب تک جماعت یا پروفیسر صاحب اعتماد کرتے یا سمجھتے ہیں کہ یہ شخص ان ڈیوٹیوں کو ٹھیک ادا کر رہا ہے، تب تک مجھے کام کرتے رہنا چاہیے۔ اور جب جماعت کو کوئی بہتر متبادل مل جائے اور وہ استعفی طلب کریں تو اس پر کوئی ملال نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنے آپ سے اور جماعتی کارکنان سے گزارش کروں گا کہ جماعت کے اعلیٰ عہدے داران بعض اوقات حالات کو ہماری نسبت کہیں زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر بلاشبہ ایک کارکن کی نظر سے زیادہ بلند ہوتی ہے، اسی چیز کو دور اندیشی کہا جاتا ہے۔ ضروری نہیں

کہ آپ کا قائد آپ کو ہر بات بتائے۔ ایک کارکن کی خوبی یہ ہے کہ اسے جہاں اور جس جگہ جماعت نے مقرر کیا وہ اس ذمہ داری کو بسر و چشم قبول کرے۔ میرے نزدیک پروفیسر ساجد میر، حافظ عبدالکریم صاحب اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ایک نمایاں کارنامہ پیغام ٹی وی کا اجرا بھی ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو اللہ کے فضل سے عصر حاضر میں انجام پذیر ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ نومبر 2008ء میں مینار پاکستان کے زیر سایہ آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے میں نے جماعت کے اکابرین سے مطالبہ کیا تھا کہ ہمیں اپنا سیٹلائٹ چینل فوراً قائم کرنا چاہیے۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ توحید کی دعوت کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ہمیں فوری طور پر اس منصوبے پر دن رات کام کرنا ہو گا۔ جب بھی پروفیسر ساجد میر صاحب یا حافظ عبدالکریم صاحب ریاض تشریف لاتے اور ہم کسی میٹنگ میں اکٹھے ہوتے تو سیٹلائٹ چینل کی بات ضرور ہوتی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ متعدد بار میرے گھر پر اس اہم موضوع پر مشورے ہوتے رہے۔ مجھے وہ مضمون کبھی نہیں بھولتا، جو میرے دستخطوں سے اہل حدیث جرائد اور جماعتی پرچوں میں شائع ہوا تھا، جس میں سیٹلائٹ چینل کی اہمیت واضح کی گئی تھی۔ ''پیغام'' ٹی وی کا نام اگرچہ میرا دیا ہوا نہیں ہے مگر مجھے فخر ہے کہ یہ نام میرے ذہن میں بھی تھا۔ میں جن دنوں سعودی عرب میں زیر حراست تھا تو گھنٹوں سوچتا رہتا تھا کہ اگر ہم اہل حدیث سیٹلائٹ چینل بنائیں تو اس کا کیا نام ہو گا؟ جواب میں دو نام میرے ذہن میں آتے تھے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ان میں ایک نام ''پیغام'' بھی تھا۔ جب میں نے ''پیغام'' کا نام سنا تو اللہ ہی جانتا ہے کہ مجھے کس قدر آسودگی ملی۔ میرے لیے یہ باعث فخر ہے کہ پیغام ٹی

وی کی مجلس اُمناء، یعنی ٹرسٹیز کے چودہ افراد میں ایک نام میرا بھی ہے۔ واضح رہے کہ مجلس امناء کے رئیس امام کعبہ فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن السدیس حفظہ اللہ ہیں۔ چیرمین جناب پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ ہیں۔ اس کے روح رواں جناب حافظ عبدالکریم، سعودی عرب میں مدیر تنفیذی جناب علی محمد ابوتراب ہیں۔ میرے لیے یہ باعث اطمینان ہے کہ میری قیادت اور خصوصاً پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ میری کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ میں پھر کہوں گا کہ میں نے ان ذمہ داریوں کا اپنے آپ کو کبھی اہل نہیں سمجھا۔

پیغام ٹی وی کے حوالے سے ایک مرتبہ میرے گھر میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ اور حافظ عبدالکریم حفظہ اللہ بھی موجود تھے۔ چینل کے فنڈز کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ میں نے پوچھا: آپ کو کتنے فنڈز درکار ہیں۔ ان دنوں پیغام کا آغاز تھا۔ عملہ ابھی زیادہ نہ تھا۔ اخراجات کم تھے، پھر بھی اس وقت ماہانہ پچاس ہزار ڈالرز کی ضرورت تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ دنیا بھر سے پچاس ایسے افراد تلاش کریں جو ہر ماہ آپ کو صرف ایک ایک ہزار ڈالرز ادا کریں۔ آپ کا چینل کبھی مالی مشکلات کا شکار نہ ہوگا۔ میں بھی اس میں تعاون کے لیے تیار ہوں۔ اس تجویز کو امیر محترم نے بھی سراہا اور فنڈز کی حصولی کے لیے اندرون و بیرون ملک کوششیں کیں۔

راقم الحروف نے لاہور میں دارالسلام قرآن پرنٹنگ کمپلکس کا پروگرام بنایا۔ یہ ایک وقف منصوبہ ہے۔ لاہور میں موٹروے کوٹ عبدالمالک انٹرچینج کے ساتھ اس منصوبے پر الحمدللہ کام شروع ہو چکا ہے۔ اس پریس سے جو منافع ملے گا اس سے سادہ قرآن کریم، تراجم قرآن کریم، حدیث وسیرت کی کتب اور دیگر اہم کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کی جائیں گی۔ میرے لیے یہ بات نہایت خوشی کی ہے کہ جن لوگوں نے مجھے سب سے پہلے

اس منصوبہ میں مالی اعانت فراہم کی، ان میں پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ بھی شامل ہیں۔ انھوں نے ایک معقول رقم اپنی ذاتی جیب سے مجھے عطا فرمائی کہ میں اسے پرنٹنگ پریس میں لگاؤں۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ مسئلہ یہ نہیں کہ وہ کتنی تھی۔ میں اس مرد درویش کی مالی حالت کو خوب جانتا ہوں۔ بس ان کا جذبہ انفاق فی سبیل اللہ میرے لیے باعث مسرت تھا۔

ویسے ذات کے اعتبار سے پروفیسر صاحب میر ہیں۔ میری معلومات کی حد تک میر کے معنی سردار کے ہیں۔ یہ ایک بڑے مالدار دادا کے پوتے ہیں، جس کے کبھی انگریز دور میں درجنوں مکانات سیالکوٹ میں تھے۔ میر صاحب کے ہر قدم سے اس کے باوجود سادگی ٹپکتی ہے۔ میر صاحب مجھے کہا کرتے تھے: میرے بیٹے کہتے ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے والد تو زیادہ مالدار نہیں مگر ہمارے آباء واجداد کروڑ پتی تھے۔

راقم الحروف کے پروفیسر صاحب سے تعلقات گزشتہ تیس سالوں سے قائم و دائم ہیں۔ میں ان کے گھر سیالکوٹ میں صرف ایک گھنٹے کے لیے گیا ہوں، وہ بھی رات کا وقت تھا۔ دراصل میری زندگی اتنی مصروف گزری ہے کہ میں گزشتہ تیس سالوں میں کبھی سیالکوٹ جا ہی نہیں سکا۔ کوئی آٹھ سال پہلے کی بات ہے میری ایک بھانجی کی سیالکوٹ میں شادی تھی۔ ہم رات کے دس بجے وہاں سے فارغ ہوئے۔ اس روز سیالکوٹ میں سخت بارش ہو رہی تھی۔ پروفیسر صاحب بھی شادی میں تشریف لائے تھے۔ شادی کے بعد وہ مجھے اور انیسہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ ان کا گھر کوئی بڑا شاہانہ نہیں۔ مگر یہاں شرافت، عزت اور وقار نظر آیا۔ ہم نے ان کے ہاں گرین ٹی پی اور واپس آ گئے۔

پروفیسر صاحب کی بدولت مجھے میاں نواز شریف صاحب کے ساتھ متعدد بار ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے پارلیمنٹ کی عمارت کو اندر سے دیکھا۔ اس کی کارروائی بھی سنی، اس روز قاضی حسین احمد پارلیمنٹ میں خطاب کر رہے تھے۔ میں اسلام آباد ان کے سرکاری گھر میں گیا۔ میں نے سینٹ کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ سابق صدر محترم محمد رفیق تارڑ صاحب سے بھی ان کے ہمراہ ملاقات کی۔ ایک چھوٹے گاؤں سے اٹھ کر ایک نوجوان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہو سکتی ہے کہ اس کی جماعت کے اکابر اور قائدین اس سے محبت کرتے ہیں۔

الحمدللہ! میں ایک ایسا شخص ہوں جو بڑی حد تک غیر متنازع ہے۔ مجھے کسی سے حسد ہے نہ ہی میں کسی کے راستے میں کبھی رکاوٹ بنتا ہوں۔ میں نے اپنی اس کتاب میں کسی جگہ ذکر کیا ہے کہ مجھے صحافی بننے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ہم ایک مرتبہ مرکزی جمعیت اہل حدیث انگلینڈ کی سالانہ کانفرنس میں برمنگھم گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے انگلش میں تقریر فرمائی۔ میں کانفرنس کے دوران نوٹس لیتا رہا۔ اگلے دن ہوٹل میں بیٹھا اور کانفرنس کی رپورٹ لکھ ڈالی۔ کسی نے میری انگلش کے حوالے سے بات کی تو پروفیسر صاحب نے فرمایا: آپ نے بڑی عمدہ رپورٹنگ کی ہے۔ میری تقریر تو انگلش زبان میں تھی، مگر آپ نے میری تقریر کی صحیح اور بالکل درست ترجمانی کی ہے۔ اگر آپ کو انگلش نہ آتی ہوتی تو پھر آپ رپورٹنگ کیسے کر سکتے تھے۔

اللہ کے فضل و کرم سے اس وقت تک اردو میں میری بائیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کافی کتابوں کا دیگر زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ مجھے تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں نے تاریخی واقعات کو اپنی

کتب میں جگہ دی ہے۔ میں ان واقعات کو مختلف مواقع پر مزے لے لے کر میر صاحب کو سناتا، وہ بھی بڑے محظوظ ہوتے۔ کئی دفعہ وہ خود بھی واقعات سناتے اور میری غلطیوں کی تصحیح بھی کرتے۔ ایک مرتبہ تو کمال ہو گیا۔ میں نے تاریخ کے کچھ واقعات کو خاصی محنت کر کے بلکہ ریسرچ کر کے لکھا۔ جب اخبار میں شائع ہوئے تو میر صاحب مجھے فرمانے لگے: مجاہد صاحب! آپ تو ''مؤرخ'' ہیں۔ میں نے سمجھا شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے اور میر صاحب مجھے مزاحاً مؤرخ کا خطاب دے رہے ہیں۔ میں نے اپنی علمی کمزوری کا اظہار کیا تو فرمانے لگے: نہیں! نہیں! میں واقعی سنجیدہ ہوں، آپ تو واقعی مؤرخ ہیں، آج سے آپ کو یہ خطاب دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرا یہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بہت سے مواقع پر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ جب جماعت کا قائد اپنے ایک ادنی سے کارکن کی اس طرح حوصلہ افزائی کرتا ہے تو اس میں کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی خفیہ صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے اور وہ مزید محنت اور جدوجہد سے آگے بڑھتا ہے۔

قائد محترم نے بہت مرتبہ میری کتب یا مضامین کو پڑھا اور اسے سراہا۔ گزشتہ برس ہم پیغام ٹی وی کے مجلس اُمناء کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور شیخ عبدالرحمٰن السدیس حفظہ اللہ کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی، ان کے ساتھ پروگرام اور پھر کھانا تھا۔ میں نے اس کی مکمل رپورٹ لکھی جو مجلّہ اہل حدیث میں شائع ہوئی۔ اس موقع پر پاکستان سے قائد محترم کا فون آیا کہ میں آپ کو اتنی اچھی رپورٹ لکھنے پر مبارک باد کا فون کر رہا ہوں۔ قارئین کرام تصور کر سکتے ہیں کہ اگر اتنا بڑا آدمی آپ کی حوصلہ افزائی کرے تو لکھنے والے کو کس قدر خوشی ہوتی ہے، اس کا قلم خود بخود چلنا شروع ہو جاتا ہے۔

مجھے یہ سطور لکھتے وقت سعودی عرب میں رہتے ہوئے 35 برس گزر چکے ہیں۔ میں

نے دنیا بھر کے سفر کیے۔ بے شمار لوگوں سے ملا، ان سے کچھ اچھی عادات بھی سیکھیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میں کھانا کھانے کا شوقین ضرور ہوں، مگر جب تک اعلیٰ درجے کا ریسٹورنٹ نہ ہو یا صاف ستھرا کھانا نہ ہو میں نہیں کھاتا۔ اسی طرح کھانے کے دوران اگر پلیٹ ذرا سی میلی ہوتو فوراً اسے تبدیل کر دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخصیت میرے ہاں مہمان ہوتو ان کی پلیٹ بھی بدل دیتا ہوں۔ اگر ریسٹورنٹ میں ہوں تو وہاں بیرا خود ہی تبدیل کر دیتا ہے۔ اب میر صاحب کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ کھانا کھا رہے ہوتے تو میں اس دوران دو مرتبہ ان کی پلیٹ بدل دیتا۔ شروع میں وہ احتجاج کرتے اور کہتے: مجاہد صاحب! کیا فرق پڑتا ہے...... اسی پلیٹ میں کھالیں گے۔ میں مسکراتا، میر صاحب! مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ ''نئی پلیٹ لے کر آؤ'' میں کسی ملازم سے کہتا، پلیٹ آ جاتی۔ شروع شروع میں تو وہ کبھی مانتے کبھی نہ مانتے، فرماتے: کیا مشکل ہے، اس پلیٹ میں دوسری چیزیں رکھ کر کھائی جا سکتی ہیں۔ ادھر میں ٹھہرا قدرے Etiquette کا لحاظ کرنے والا۔ اب کھانے کے دوران وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پلیٹ بدل کر کہتے ہیں: مجاہد صاحب! لو جی، دیکھ لیں، میں نے آپ کی بات پر عمل کیا ہے۔

قارئین کرام! میر صاحب کے حوالے سے اتنی زیادہ سنہری یادیں ہیں کہ ان کو لکھتا چلا جاؤں تو شاید یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہ آئے۔ بہر حال میں اپنے اس مضمون کا اختتام ان دعائیہ کلمات سے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مرد درویش کو صحت و تندرستی سے نوازے۔ انھیں دین اسلام کی مزید خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ انھیں تادیر ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ہمیں ان کے احکامات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

برادرم سیٹھ منصور احمد صاحب

برادر گرامی جناب منصور احمد صاحب سے میرا پہلا تعارف برادر عزیز نجیب الرحمٰن کیلانی صاحب کی معرفت ہوا۔ لاہور کے اردو بازار میں اسلامی اکادمی کے نام سے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے، جس نے آج سے 30، 35 برس پہلے بڑی شاندار اور عمدہ کتابیں شائع کی تھیں۔ درمیانے قد کے منصور احمد کی شہرت بہت اچھی تھی۔

میں روزگار کے سلسلہ میں سعودی عرب آ گیا اور پھر دارالسلام کی بنیاد رکھی تو ہم نے سب سے پہلے نوبل قرآن کے نام سے قرآن کریم کا انگلش ترجمہ، مختصر صحیح بخاری اور دیگر چھوٹی چھوٹی کتب شائع کیں۔ ہمارے موصوف منصور احمد صاحب اس زمانے میں نیویارک تشریف لے گئے۔

میں ایک مرتبہ ریاض سے لاہور گیا ہوا تھا کہ راہ چلتے منصور صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان کی اچھی شہرت تو پہلے ہی سے سن رکھی تھی، انھوں نے بتایا: میں امریکہ میں ہوتا ہوں۔ ایک دوسرے کو فون نمبرز دیے اور یہ طے ہوا کہ رابطہ بھی رہے گا اور اگر کبھی میں امریکہ گیا تو منصور صاحب کے ہاں ضرور جاؤں گا۔ انھوں نے ہم سے تھوڑی تھوڑی کتابیں لینا شروع کر دیں۔ اس زمانے میں ان کتب کی خاصی ڈیمانڈ تھی۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امریکہ کی مشہور ریاست ''فلاڈلفیا'' میں اسلامی کتابوں کی نمائش لگی، جس کا بندوبست ایک عرب نے کیا تھا، معلوم نہیں اسے کیسے دارالسلام کے بارے میں معلوم ہو گیا، اس نے ہمیں اس نمائش میں شرکت کی دعوت دے دی۔ میں نے امریکا جانے کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا، مگر اس مناسبت سے پروگرام بن گیا۔

امریکی ویزا بغیر کسی رکاوٹ کے مل گیا، ریاض میں امریکی سفارت خانے کے قونصلر نے کافی تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات کیے، مگر میرے مسکت جوابات سننے کے بعد کہنے لگا: کل آ کر اپنا ویزا لے جانا۔

نیویارک ائرپورٹ پر منصور صاحب میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ میں نے ہوٹل میں جانے کے لیے اصرار کیا، مگر انھوں نے مجھے اپنے گھر ہی ٹھہرایا۔ میں اپنے ساتھ کچھ کتب لے گیا تھا۔ انھی کی گاڑی پر ہم فلاڈلفیا کی نمائش میں گئے، چند دن کی نمائش کوئی زیادہ کامیاب نہ تھی۔

> امریکی سفارت خانے کے قونصلر نے کافی تیکھے اور چبھتے ہوئے سوالات کیے۔۔۔

اس زمانے میں منصور احمد صاحب ''مین ہیٹن'' کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کے روز کتابوں کا اسٹال لگاتے، ان کے گھر والے بھی ان کی مدد کرتے۔ میں نے بھی ایک جمعہ یہاں پڑھا تھا۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد نمازیوں کا ایک ہجوم سڑک کے کنارے لگے ہوئے اسلامی اشیاء کے ان اسٹالوں کا رخ کرتا اور کتابیں خرید کر لے جاتا۔ کتب کے علاوہ دیگر اشیاء بھی کافی تعداد میں فروخت ہوتیں۔ منصور صاحب سے جو کوئی بھی کتاب مانگتا اگر پاس ہوتی تو اسے

دے دیتے ورنہ اگلے جمعے کا وعدہ کرتے اور کئی صورتوں میں اسے گھر کا ایڈریس دے دیتے کہ وہاں سے آ کر لے لینا۔

یہ زمانہ بڑا پرامن تھا، امریکا میں کوئی خاص پابندیاں نہ تھیں، سلفی دعوت پھیل رہی تھی۔ امریکہ میں اگرچہ مختلف دینی اور سیاسی جماعتوں نے کام شروع کر رکھا تھا، ان کے بک سٹورز بھی تھے، مگر ضرورت اس امر کی تھی کہ کسی بڑی شارع پر کوئی باقاعدہ بک سٹور ہو جہاں سے لوگ اپنی علمی پیاس بجھا سکیں۔ صبح وشام ان سے میری بحث ہوتی کہ آپ دارالسلام کی برانچ کھولیں۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، میں نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی، بہرحال آہستہ آہستہ انھوں نے ہامی بھرنا شروع کر دی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے: میں نے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا بک سٹور دکھانا ہے، اس کا نام The largest book center in the world ہے۔

ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اپنے دعوی کے مطابق یہ سٹور کوئی بہت بڑا تو نہ تھا، تاہم کافی بڑا تھا۔ اس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کی کتابیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ میں سیدھا مذہبی کتب کے شعبہ میں گیا، میں کتنی دیر وہاں گم سم کھڑا سوچتا رہا، وہاں پر موجود کتابوں کو دیکھتا رہا۔ سلفی نقطہ نظر کی تو شاید ہی کوئی کتاب ہو، پھر اچانک میرے دل ودماغ میں ایک بات سما گئی...... وہ بات کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ ہمیں ایک نئے جذبے، مضبوط حوصلہ اور پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے عقیدے کے مطابق کتب کو شائع کرنا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں اسلام کو عام کرنا ہے۔ ہمارا ہدف وہ نوجوان طبقہ ہے جو روشنی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہے اور وہ سچائی کا متلاشی ہے۔ ہمیں اس کام اور اس مشن کو تجارت نہیں بلکہ عبادت اور فرض سمجھ کر کرنا ہے اور

اس راہ پر آگے بڑھنا ہے۔

میں منصور صاحب کو بک شاپ کھولنے پر قائل کرتا رہا اور مجبور کرتا رہا کہ آپ یہ کام ضرور کریں، اللہ ہماری مدد کرے گا۔ آخرکار انھوں نے اللہ پر توکل اور بھروسا کرتے ہوئے دار السلام نیویارک برانچ کی بنیاد رکھ دی۔ ماشاءاللہ! یہ برانچ دیکھتے ہی دیکھتے بہت آگے بڑھ گئی۔

منصور صاحب کی والدہ محترمہ بھی انھیں کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ وہ اپنی والدہ کے بے حد مطیع اور فرمانبردار تھے۔ والدہ محترمہ بیٹے کے لیے ہر وقت دعا گو رہتیں، ان کی دعائیں رنگ لاتی چلی گئیں اور کام مسلسل ترقی کی جانب بڑھنے لگا۔ منصور صاحب کی اہلیہ بڑے لذیذ کھانے پکاتیں، ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ میرے اکثر جاننے والے بھی ان کے مزیدار کھانوں سے لطف اندوز ہوتے۔ منصور صاحب معاملات میں نہایت کھرے، سچے اور صاف گو آدمی ہیں۔ وہ دعوت کے لیے ہروقت بے چین اور بے قرار رہتے ہیں۔ ان کی دکان امریکا میں کتابوں کا سب سے بڑا اسلامی مرکز بن گئی۔ میں نے متعدد بار امریکا کا سفر کیا۔ ہمیشہ انھوں نے مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، ان کا بیٹا مؤمن مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے: مجاہد صاحب! میرے گھر میں بیٹیاں ہیں، میں نے کبھی کسی کو اپنے گھر نہیں سلایا، لیکن آپ کا معاملہ دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ بلاشبہ جب میں ان کے گھر جاتا ان کے بچوں میں خوشیوں کی لہر دوڑ جاتی۔ میں بھی ایک ایک کے لیے گفٹ

> میں کتنی دیر تک وہاں گم سم کھڑا سوچتا رہا، وہاں پر موجود کتابوں کو دیکھتا رہا۔

لے کر جاتا۔ ہماری بھابھی اتنے زیادہ کھانے بناتیں کہ مجھے خجالت محسوس ہونے لگتی۔ ان کا ہاتھ بڑا کھلا ہے، جتنا ان کا ہاتھ کھلا ہے اتنی ہی ان کے گھر میں برکت زیادہ ہے۔

ایک مرتبہ جب میں نیویارک میں تھا، پاکستان سے ایک بڑی شخصیت تشریف لائی ہوئی تھی۔ منصور صاحب نے ان کو بھی کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس روز برف باری ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے برف نظر آ رہی تھی۔ درختوں کے پتوں پر برف گر رہی تھی اور وہ روئی کے گالوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ اندر ہیٹر کی بدولت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میرا خوبصورت بستر ڈرائنگ روم کے ایک طرف لگا ہوا، سفید رنگ کی چادر اوپر گاؤ تکیہ، اتنے میں وہ بڑی شخصیت تشریف لے آئیں۔ انھوں نے بڑی حیرت سے پوچھا: یہ بستر کس کا لگا رکھا ہے؟ جواب ملا: حضرت صاحب کا۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ شاید ان کے لیے ہے، اس لیے پوچھا: کون سے حضرت صاحب کا؟ منصور بھائی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا: دیکھیے! ہمارے حضرت صاحب یہ بیٹھے ہیں۔

میرے لیے یہ الفاظ باعث حیرت بھی تھے اور انکی محبتوں کے عروج کی طرف اشارہ بھی تھے۔ میں نے شرم وحیا اور خوشی سے اپنا سر نیچے کر لیا۔ میں اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔ یہ محض ان کی محبت اور میرے اوپر اعتماد کا اظہار تھا۔

میں دارالسلام کے کئی منصوبوں میں ان سے مشورہ کرتا، بعض اوقات وہ لمبے لمبے فون کر کے بعض کتابوں کی اشاعت کی طرف میری توجہ دلاتے کہ فلاں کتاب کی مارکیٹ میں طلب ہے۔ لوگ اس کتاب یا اس موضوع کی تلاش میں ہیں۔

میں جب بھی نیویارک جاتا تو ناشتہ کرنے کے بعد یہ مقررہ وقت پر دکان پر آ جاتے اور میں بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا۔ یہاں فروخت کے لیے رکھے ہوئے جائے نمازوں

کے بیچ میرے لیے بیٹھنے کی جگہ بنا دی جاتی۔ پاکستان سے یہ اخروٹ کے درخت کا چھلکا جسے ہم پنجابی میں داتن یا سک کہتے ہیں اور سرمہ وغیرہ لائے ہوئے تھے۔ صبح سویرے امریکی جوڑے آتے اور کتابوں کا انتخاب کرتے۔ امریکن سسٹم اس چیز کا نام ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا بل ادا کرے گا، حتی کہ میاں اور بیوی کی پاکٹ بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ میاں بڑی فراخ دلی سے اپنی اہلیہ کو ایک چھوٹی سی کتاب ہدیہ کر رہے ہیں۔ ادھر بیگم صاحبہ بھی ایک مسواک خرید کر اپنے میاں کو تحفہ میں پیش کر رہی ہیں۔ منصور صاحب نے داتن یا سک کو اسلامی مسواک کا نام دے رکھا ہے۔ امریکی عورتیں اسے بڑے شوق سے خرید کر لے جاتی ہیں۔ دکان کی پچھلی جانب عورتوں کے لیے اسلامی ڈریس اور حجاب لٹکے ہوئے تھے۔ میں منصور صاحب سے ہنس کر کہتا: جناب! منیاری کے اس سامان کو باہر نکالیں ماڈرن طریقے پر دکان کھولیں اور چلائیں، مگر وہ پرانی وضع کے آدمی ہیں، اپنے خاص طریقے اور انداز میں اپنا کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میں نے انھیں بلا کا محنتی پایا ہے، حافظہ بے حد تیز ہے۔ ہر چند کہ شروع شروع میں انھیں انگلش میں بہت زیادہ مہارت نہ تھی، مگر ایک ایک کتاب کا نام، اس کا ریٹ اور کس جگہ رکھی ہوئی ہے۔ یہ کتنی تعداد میں ہے اور اس کا موضوع کیا ہے۔ یہ ساری باتیں ان کے دماغ میں کمپیوٹر کی طرح محفوظ ہیں۔ ادھر گاہک نے پوچھا، ادھر ایک لمحہ میں اس کتاب کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں۔ سیلز مین نے ذرا سی تاخیر کی تو خود بھاگ کر جاتے ہیں اور کتاب لا کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ہم اسے ماڈرن زبان میں کسٹمر سروس کہہ سکتے ہیں، اگر کوئی کامیاب بزنس مین بننا چاہتا ہے تو ان سے سیکھے۔

میں نے ان کے ساتھ متعدد اسلامی بک سٹورز کا دورہ کیا۔ ہر کوئی ان کے تعامل کی

تعریف کرتا ہے۔ اللہ کے اس بندے نے نجانے کتنے خیر کے کام کیے ہونگے اور کتنے مزید کریں گے۔ نیو یارک میں مسجد ام القری کے بانی اور روح رواں ہمارے دوست حافظ عبدالرحمٰن کشمیری ہیں۔ انھوں نے مسجد کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس کو خریدنے کا مسئلہ درپیش تھا اور پھر وقتِ مقررہ پر رقم کی ادائیگی ضروری تھی۔ مسجد کے پاس اتنے فنڈز نہیں تھے۔ فیصلہ ہوا کہ قرض حسنہ لیا جائے اور پھر منصور صاحب نے یہ فنڈز مہیا کر دیے۔ الحمد للہ! مسجد خرید لی گئی۔ قرض حسنہ دیے ہوئے ایک مدت گزر گئی۔ اسلامی اداروں کے لیے اس قسم کے قرض واپس کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک دن میں نے ریاض سے فون کیا، کافی لمبی بات ہوگئی۔ بات کا رخ مسجد کو دیے ہوئے قرض کی طرف مڑ گیا۔ کہنے لگے: انھوں نے کہاں سے دینا ہے! میں نے موقع غنیمت جانا اور کہا: منصور صاحب! اسے پھر معاف ہی کر دیں۔ یہ ایک کثیر رقم تھی، عام آدمی ہوتا یا کوئی دنیا دار شخص ہوتا تو مشورہ دینے والے کو خوب جلی کٹی سناتا، مگر یہ منصور صاحب تھے جو اللہ کی رضا اور اس کی جنت کے طلب گار تھے۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد کہنے لگے: مجاہد صاحب! گواہ رہنا میں نے یہ ساری رقم معاف کر دی ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں جو اچھے کام کیے ہیں، ان میں سے ایک یہ فون کال بھی ہے۔ مسجد کو قرض حسنہ معاف کرنے کا مشورہ دینا، ان کو اس عظیم کار خیر پر قائل کرنا اور پھر منصور صاحب کا یہ قرض معاف کر دینا میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ یہ واقعہ بھول چکے ہوں گے، مگر مجھے وہ مقام اور وقت خوب یاد ہے جہاں ان سے بات ہوئی تھی اور پھر انھوں نے یہ خوبصورت اور تاریخ ساز فیصلہ کیا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ اس مشورہ دینے والے اور اس پر عمل کرنے والے کو روز قیامت

بہتر اور احسن بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!

برادرم عبدالخالق صاحب اس وقت نیو یارک میں جمعیت اہل حدیث کے روح رواں ہیں، ان سے پہلی ملاقات ان کے گھر پر ہوئی تھی۔ میں جب پہلی مرتبہ امریکا گیا تو محترم ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے اپنی تقاریر کی کیسٹوں کے دو ڈبے عطا کیے کہ انھیں وہاں تقسیم کر دوں۔

عبدالخالق صاحب خاندانی اہل حدیث ہیں۔ وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے خاصے متاثر تھے، ان کی کیسٹیں تقسیم کرتے، ان کی دعوت کا اعلان کرتے اور ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ منصور صاحب کے گھر ان سے کھانے پر ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے ذہین ہیں مگر ہم نے بھی سال ہا سال ڈاکٹر فضل الٰہی کی شاگردی کی ہے۔ ان کے دروس میں شرکت کی اور ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ وقت چلا گیا جب ہم ذرا ذرا سی بات پر جذباتی ہو جاتے تھے۔ آہستہ آہستہ گفتگو ہوتی رہی، کھانا بھی چلتا رہا۔ یہ میرے مبارک بھائی منصور احمد کا بہت مبارک گھر تھا۔ عبدالخالق صاحب نے ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی کیسٹیں سننے کا وعدہ کیا اور کتاب وسنت کی اصل روح کے مطابق زندگی گزارنے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے وقت نکالنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ پھر کتاب وسنت کے شیدائی اس نوجوان سے اللہ رب العزت نے اپنے دین کا خوب خوب کام لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین!

منصور صاحب ایک چھوٹے بھائی کی طرح مجھ سے محبت کرتے اور مجھے بڑے بھائیوں والا احترام دیتے تھے۔ 2001ء میں انھوں نے اپنے بیٹے مؤمن کی شادی کی اور اپنی بہو کو امریکہ بلوایا۔ انھوں نے جلد ہی گرین کارڈ اور امریکی شہریت حاصل کر لی۔ مجھے

یاد ہے کہ وہ ستمبر کی صبح تھی، میں قرآن وسنت سوسائٹی کی کانفرنس میں شرکت کر کے صبح سویرے نیویارک پہنچا۔ ائرپورٹ پر عزیزی مؤمن اپنی اہلیہ کے ہمراہ موجود تھا۔ کہنے لگا: انکل! ہم لوگ آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ آئیں تو سیر کے لیے جائیں، ساتھ ہی اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ کہنے لگا: ابو کا احترام اور ڈر بھی ہے لیکن اگر آپ ابو سے کہیں تو وہ ہمیں آپ کے ساتھ سیر پر جانے سے نہیں روکیں گے۔ میں جیسے ہی دارالسلام میں داخل ہوا، منصور صاحب کو گلے لگاتے ہوئے کہنے لگا: آج میں شادی کی مناسبت سے مؤمن کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ لوگ میرے ساتھ جائیں گے۔ منصور صاحب نے اپنے بھائی کا مان رکھ لیا اور اجازت بخشی۔ ہم نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی سیر کی۔ وہاں کے ریسٹورنٹ پر ہم نے خوب فاسٹ فوڈ کھایا۔ وتجیٹیرین پیزا، فش برگر، چپس، کولڈ ڈرنکس اور غباروں کا مزا لیا۔

میرے اس بھائی نے بچپن کا کچھ حصہ جھوک دادو میں میاں باقر طور رحمہ اللہ کے زیرِ سایہ گزارا ہے، وہاں یہ پڑھا کرتے تھے۔ ان کو حدیث کے ساتھ بے حد محبت ہے۔ میری جب بھی ان سے بات ہوتی یہ باصرار کہتے: مجاہد صاحب! ہم نے کتب ستہ کو انگلش میں ضرور لانا ہے۔ یہ منصوبہ کوئی آسان نہ تھا حکومتیں اس کام کو انجام دینے سے اب تک قاصر رہی تھیں۔ اس کے لیے ایک باقاعدہ ٹیم کی ضرورت تھی۔ سرمایہ درکار تھا اور مصمم عزم وارادے کی ضرورت تھی۔ مجھے یہ لکھتے ہوئی خوشی ہو رہی ہے کہ اس عظیم کام کا آغاز اور تکمیل کروانے میں منصور صاحب کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ ان کا اصرار بڑھتا چلا گیا کہ اگر ہم حدیث کی ان چھ مشہور ترین کتب پر کام نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟ ہم تو اہل حدیث ہیں اور حدیث کی خدمت ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔ پھر انھوں نے دارالسلام کی

> منصور صاحب نے داتن یا سک کو اسلامی مسواک کا نام دے رکھا ہے۔ امریکی عورتیں اسے بڑے شوق سے خریدتی ہیں۔

ہر طرح سے مدد کی، اسے قرض حسنہ دیا، مشورے دیے اور آخر کار ایک دن ایسا آیا کہ 38 جلدوں پر مشتمل کتب ستہ کا انگلش زبان میں ترجمہ مارکیٹ میں آ گیا۔ اگر یہ خود نمائی نہ ہوتی تو میں اس ترجمہ کا انتساب منصور احمد کے نام کرتا، مگر یہ حدیث کی کتابیں ہیں ان کا انتساب کسی شخصیت کی طرف کرنے کی بجائے ہم اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتے ہیں کہ قیامت کے روز ہمیں خدام قرآن وحدیث میں شمار کر لے۔ آمین!

امریکہ میں انگلش کے بعد فرنچ زبان دوسری بڑی زبان ہے۔ امریکی ریاستوں کے درمیان ہوائی جہاز کے سفر کے دوران اندرون امریکہ جہاں انگلش میں اعلانات ہوتے ہیں وہاں سیکنڈ لینگوئج یا ثانوی زبان کے طور پر سپینش میں اعلان کیا جاتا ہے۔ بہت سارے لوگ یہ زبان بولتے، سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ مجھے منصور صاحب نے کئی مرتبہ مشورہ دیا کہ میں اس زبان میں کتابیں شائع کروں۔ ان کی بیٹی عزیزہ شاکرہ سے جب بھی بات ہوتی وہ کہتی: انکل آپ سپینش زبان میں کتب ضرور شائع کریں، ان کی یہاں شدید ضرورت ہے۔ میں نے ایک دن منصور صاحب سے کہہ دیا: جناب اس کے لیے مترجم بھی درکار ہے اور فروخت کرنے کے لیے مارکیٹ بھی چاہیے۔ ہم نے اگر اس زبان میں اسلامی لٹریچر شائع بھی کر دیا تو اس کو خریدے گا کون؟ چند دن گزرے ان کا فون آیا، کہا: آپ امریکہ آ جائیں میں نے ڈاکٹر عبدالخبیر کا انتخاب کر لیا ہے۔ ان کی مادری زبان اسپینش ہے، عقیدہ اور منہج درست ہے۔

کتب کی مارکیٹنگ کے لیے دارالسلام کا پلیٹ فارم موجود ہے۔

میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ میں صرف اس مقصد کے لیے امریکہ گیا، مگر اس سفر میں پہلی ترجیح اس زبان کی مارکیٹ تلاش کرنا اور ڈاکٹر عبدالخبیر سے ملاقات کرنا تھا۔ میں جب بھی نیویارک جاتا تو وہاں کا دارالسلام میرے ہیڈکوارٹر میں تبدیل ہو جاتا۔ جائے نماز کے سٹاک کو سلیقے سے جوڑ کر ساتھیوں سے ملاقاتوں کے لیے جگہ بن جاتی۔ کافی، چائے بسکٹ وغیرہ سے مہمانوں کی خاطر تواضع جاری رہتی اور بہت سارے کام آگے بڑھ جاتے۔ پانامہ سے تعلق رکھنے والا دو بیویوں کا خاوند، اونچے لمبے قد کا ڈاکٹر عبدالخبیر جب دارالسلام میں داخل ہوا تو دروازے میں داخل ہونے کے لیے اسے سر کو تھوڑا سا جھکانا پڑا اور میں نے بھی گردن کو اونچا اور لمبا کر کے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے ہاتھ ملایا اور بغیر کسی تمہید کے امریکہ میں سپینش کتابوں کی اہمیت، مستقبل اور ہماری ذمہ داریوں کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ ڈاکٹر عبدالخبیر نے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ ان کے دو دفاتر ہیں: ایک واشنگٹن ڈی سی میں اور دوسرا پانامہ میں ہے۔ اللہ کا یہ بندہ ہر وقت ادھر سے ادھر گھومتا رہتا ہے، کچھ کتابوں کے اس نے تراجم کر رکھے تھے کچھ اس کی اپنی تالیفات تھیں، مگر چل نہ سکی تھیں۔ اس کے پاس گرین کارڈ ہے، اپنی قوم کی زبان میں اسلامی کتابوں کے نہ ہونے پر بڑا دل گرفتہ ہے۔

ہم نے کوئی دو تین گھنٹے میٹنگ کی، جس کے نتیجے میں ہم نے ڈاکٹر عبدالخبیر کو ریاض بلوا لیا۔ انھوں نے چند ماہ ریاض میں قیام کیا، کچھ کتابوں کے تراجم وہ پہلے کر چکے تھے۔ ان کی رہنمائی میں ہم نے کوئی اٹھارہ کتابوں کا ترجمہ سپینش زبان میں کیا چنانچہ اس زبان میں بھی دعوت کا کام پھیلتا چلا گیا۔

پاکٹ سائز قرآن کریم کی اشاعت کے مراحل

1990ء کی خلیجی جنگ میں عراق کے کویت پر اچانک قبضہ سے اسلامی دنیا میں ایک ہلچل مچ گئی۔ کویت کو دوبارہ آزادی دلانے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک سے فوجیں سعودی عرب آئیں۔ ان میں نمایاں تعداد امریکی فوجیوں کی تھی۔ کتنے ہی ادارے اور مبلغین ایسے تھے جنھوں نے امریکی فوجیوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے مسلسل کام کیا۔ دعوت کے اس کام کا بہت عظیم فائدہ ہوا اور اس کے نتیجے میں بہت سے امریکی فوجی مسلمان ہو گئے۔

ایک دن ایک سعودی میرے پاس آیا اور کہنے لگا: عبدالمالک! اگر ان نومسلم فوجیوں کی جیب میں قرآن کریم کا انگلش ترجمے والا ایک ایک نسخہ ہو تو یہ بڑا عظیم کام ہوگا، مگر ہمارے پاس انگریزی ترجمے کے کم و بیش ایک ہزار صفحات ہیں ان کو اگر پاکٹ سائز میں لایا جائے تو صفحات بہت بڑھ جائیں گے۔ میں سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ میری ایک عادت ہے۔ اگر کوئی مجھے کوئی مشورہ دے تو میں اسے اپنے دل و دماغ میں جگہ ضرور دیتا ہوں چاہے اس پر عمل کر سکوں یا نہ کر سکوں۔

جرمنی کے شہر ''ڈوزل ڈورف'' (Dusseldorf) میں ہر 6 سال کے بعد پرنٹنگ

مشینری کی ایک بڑی نمائش ''دروپا'' لگتی ہے۔جس میں اس شعبہ سے متعلق پوری دنیا سے لوگ آتے ہیں اور اس نمائش سے مستفید ہوتے ہیں۔سال ہا سال اس نمائش کی تیاری میں صرف ہوتے ہیں اور لوگ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔اس نمائش سے آپ کی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔مجھے دو مرتبہ یہ نمائش دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے اس نمائش سے بہت کچھ سیکھا۔درجنوں بڑے بڑے ہال ہیں۔جن میں آدمی چلتے چلتے تھک جاتا ہے،حتی کہ تھکاوٹ دور کرنے کے لیے آدمی کو فریش جوس یا چاکلیٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔میں عموماً صبح وہاں پہنچ جاتا اور جب تک نمائش ختم نہ ہو جاتی وہیں پر رہتا۔وہاں پرنٹنگ مشینری کے علاوہ اس فیلڈ سے متعلق ہر چیز کے اسٹال لگے ہوتے ہیں۔پیپر تو اس شعبے کا اہم ترین حصہ ہے۔بولرے (Bolaray) کمپنی کے اسٹال کے سامنے سے گزر رہا تھا۔اس کے اوپر درج تھا کہ ہم دنیا کا سب سے ہلکا پیپر تیار کرتے ہیں۔میں ان کے پاس چلا گیا،معلومات حاصل کیں۔یہ فرانس کی کمپنی تھی اور وہیں ان کی فیکٹری بھی تھی۔یہ 25 گرام سے لیکر 60 گرام تک پیپر بناتے ہیں۔دنیا کا سب سے اعلیٰ اور مہنگا پیپر انھی کے پاس ملتا ہے۔اعلیٰ کوالٹی کے اس ورق کی خوبی یہ ہے کہ باریک ہونے کے باوجود اس پر دوسری طرف سے پرنٹنگ نظر نہیں آتی۔اگر نظر آ بھی جائے تو بہت معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوگی اور آپ باآسانی دونوں طرف سے صحیح طور پر پڑھ سکتے ہیں۔اس کوالٹی کا پیپر تیار کرنا آسان کام نہیں ہے،اس کے لیے اعلیٰ درجے کی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوتی ہے۔میں نے 25 گرام پر بائبل کا چھپا ہوا نسخہ دیکھا،انھوں نے بتایا: ورق تو فرانس کا ہے مگر اس کی پرنٹنگ ہالینڈ میں ہوئی ہے۔اس کے لیے خصوصی پرنٹنگ پریس ہوتے ہیں۔کسی عام پریس میں یہ کاغذ چل ہی نہیں سکتا۔

میں نے ان سے ایڈریس لیا اور خود امریکہ روانہ ہو گیا۔ وہاں پر برادرم منصور احمد سے بھی مشورہ ہوا کہ اگر 25 گرام ورق پر ہم پاکٹ سائز قرآن کریم شائع کریں تو کیسا رہے گا؟ انھوں نے بھرپور تائید کی۔ واپس آیا تو آتے ہی ہالینڈ کی Young Blood کمپنی سے رابطہ کیا۔

اس دوران ہم نے پاکٹ سائز قرآن کریم تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے حصول برکت کے لیے اپنے ہاتھوں سے کئی صفحات کی پیسٹنگ کی۔ دائیں طرف عربی عبارت اور اس کے مقابل انگلش ترجمہ لگا کر قرآن کریم تیار کرنا خاصا صبر آزما کام تھا مگر ایک دو ماہ کی محنت شاقہ کے بعد ہم نے مکمل قرآن کریم تیار کر لیا۔ پھر اس کی فلمیں تیار کی گئیں۔ ادھر ہالینڈ کی کمپنی سے رابطہ کر کے پرنٹنگ کے اخراجات کی کوٹیشن حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان سے ریٹ طے کیا۔ پہلے تو انھوں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایسے ہی ریٹ پوچھ رہے ہیں لیکن جب ہم نے دس ہزار ڈالرز ایڈوانس ارسال کر دیے تو ان کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی کہ فوراً مجھے ویزا بھجوا دیا اور ریاض میں ان کی ایمبیسی نے بغیر کسی تاخیر یا تردد کے ویزا اسٹیمپ کر دیا۔

میں پہلی مرتبہ ہالینڈ جا رہا تھا مجھے یاد آیا کہ جرمنی میں نمائش کے دوران ایک مغل صاحب سے راہ چلتے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی داڑھی رکھی ہوئی اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ان کا بیٹا ان کے ساتھ تھا۔ چونکہ میں نے بھی شلوار پہن رکھی تھی اس طرح یہ لباس ہی ہمارے درمیان پہچان اور سلام دعا کا سبب بن گیا۔ وہ غالباً راولپنڈی کے تھے اور قرآن کریم کے پارے چھاپتے تھے۔ جیسا کہ ان مواقع پر اکثر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا تعارفی کارڈ مجھے دیا اور میں نے اپنا کارڈ ان کو دیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے پاس

آنے کی دعوت بھی دی اور یہ عزم بھی کیا کہ ایک دوسرے کے پاس جائیں گے۔ وہ ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم میں مدتوں سے مقیم تھے۔ جب میں نے ہالینڈ جانے کا ارادہ کیا تو اچانک مغل صاحب کی یاد آگئی۔ ان کو تلاش کیا اور ان سے فون پر رابطہ ہوگیا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ آپ جب بھی تشریف لائیں تو میں یا میرا بیٹا آپ کو ائرپورٹ پر مل جائیں گے۔

میں پہلی بار ہالینڈ گیا تو جب ہالینڈ کا ایریا شروع ہوا، میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھنا شروع کردیا۔ میں نے زندگی میں اتنے خوبصورت پھول کبھی نہیں دیکھے۔ سینکڑوں مربع میٹر پر مشتمل پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ مختلف اقسام کے پھول اتنے بھلے لگ رہے تھے کہ آج قریباً 18 سال کے بعد جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو یہ دل کش منظر ابھی تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ جیسے جیسے ایمسٹرڈم شہر قریب آیا ان پھولوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سمندر کے کنارے واقع اس شہر کی اپنی ایک تاریخ ہے۔

جب میں ایمسٹرڈم ائرپورٹ پر اترا تو رات کا وقت تھا۔ مغل صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ موجود تھے۔ وہ سیدھے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ شہر کے وسط میں ان کا بہت خوبصورت مکان تھا۔ ہم نے رات وہاں گزاری۔ اگلی صبح میں نے ان سے کہا: اگر آپ بھی میرے ساتھ چلیں تو مزا آجائے گا۔

مغل صاحب کو میں اپنے ارادے سے پہلے ہی آگاہ کرچکا تھا۔ قرآن کریم کی فلمیں میرے ساتھ تھیں۔ پریس والے ہمیں ریٹ تقریباً دے ہی چکے تھے۔ اس وقت تک فلیکس کا رواج اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ چند بڑی بڑی کمپنیاں ہی اس سے فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ ہالینڈ واقعی بڑا خوبصورت ملک ہے۔ یہاں پر گائے کا دودھ بکثرت پیدا ہوتا ہے جو پوری

دنیا میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ فارم بنے ہوئے ہیں اور پن چکیاں گھومتی رہتی ہیں۔ مغل صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے وہ بغیر کسی تردّد کے جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ ہم صبح سویرے ہی بغیر ناشتہ کیے ''نامی'' شہر کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہمارا رخ مرکزی ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا وہاں سے ہمیں نامی شہر کو جانا تھا، ہم ٹرین میں بیٹھ گئے۔ خیال یہ تھا کہ ہم راستے میں ناشتہ کرلیں گے۔ ٹرین روانہ ہونے میں چند منٹ باقی تھے کہ مغل صاحب کا بیٹا ہمیں تلاش کرتا ہوا آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتہ تھا۔ ابو جان! ہمیں تھوڑی سی دیر ہوگئی، آپ نکل آئے، میں آپ کے لیے سینڈوچ لایا ہوں۔ ہم نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سینڈوچ کھانا شروع کردیا۔ مغل صاحب کہنے لگے: مجاہد صاحب! انھیں کھائیے، ان میں میرے بیٹے کی خوشبو آرہی ہے۔ یورپی ممالک میں اگر آپ کو حلال طعام مل جائے تو یہ بلاشبہ بڑی نعمت ہے۔ گاڑی چلی تو تھوڑی دور جاکر کھیتوں کے درمیان اچانک رک گئی۔ پٹڑی کے دونوں طرف بڑا خوبصورت منظر تھا۔ میں تو ان مناظر میں کھوسا گیا۔ اچانک گاڑی سے کچھ لوگ نیچے اتر گئے، معلوم ہوا کہ گاڑی کا انجن فیل ہوگیا ہے۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی وطن عزیز میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اعلان ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور انجن آرہا ہے۔ نیا انجن آنے کے بعد ہم نے سفر کا دوبارہ آغاز کیا کوئی چالیس پچاس کلومیٹر چلے ہونگے کہ نیا انجن بھی فیل ہوگیا اور ٹرین جھٹکے سے رک گئی۔ ٹرین میں لگے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا: ہمیں افسوس ہے کہ گاڑی کا نیا انجن بھی فیل ہوگیا

ٹرین میں لگے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا: ہمیں افسوس ہے کہ گاڑی کا نیا انجن بھی فیل ہوگیا ہے

ہے۔آپ انتظار کریں تھوڑی دیر بعد نیا انجن آئے گا۔مسافروں کی اکثریت نے زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی زبان میں حکومت کو کوسنے لگے۔

بالآخر ہم ''ینگ بلڈ'' کمپنی پہنچ گئے۔ ہمارا استقبال اس کے منیجر ''ہوگو'' نے کیا۔ قدرے لمبے قد کا گورا چٹا ہوگو بہت با اخلاق تھا۔اس نے ہمیں چائے پلائی، بسکٹ پیش کیے اور پھر ہمیں پریس دکھانے لے گیا۔اس کا کہنا تھا: اس پریس کی عمر 120 سال سے زائد ہے۔ ہم صرف باریک پیپر پر ایک ہی کلر میں پرنٹنگ کرتے ہیں۔ مارکیٹوں میں ہمیں بعض لوگ بلیک پرنٹر بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ ہم صرف ایک کلر میں پرنٹنگ کرتے ہیں۔ یہ پریس بائبل چھاپنے کے لیے قائم ہوا تھا۔ دنیا میں سب سے باریک ورق 23 گرام کا ہے۔اور یہ سگریٹ کو لپیٹنے کے کام آتا ہے۔اس کے کونے پر سگریٹ کے برانڈ کا نام ہوتا ہے۔ اس کے بعد 25 گرام پیپر ہے جو فرانس میں تیار ہوتا ہے جس پر بائبل چھاپتے ہیں۔ میری توقع کے برعکس یہ کوئی بہت بڑا پریس نہ تھا۔صدر دروازے سے داخل ہوئے تو استقبالیہ کے ایک کونے میں ایک پرانی مشین پڑی ہوئی تھی۔ ہوگو کہنے لگا: اس مشین سے ہمارے پریس نے آغاز کیا تھا۔اس کی عمر پریس کی عمر کے برابر ہے۔

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ چینی زبان میں بائبل کو چھپتے اور بائنڈ ہوتے دیکھا۔دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش مسلمانوں کو بھی ایسا ادارہ نصیب ہوجائے جو مختلف زبانوں میں قرآن کریم کو شائع کرے۔اگر میں بھولا نہیں تو اس وقت تک مجمع الملک فہد مدینہ طیبہ میں قائم نہیں ہوا تھا۔خود دارالسلام نے بھی صرف نوبل قرآن یا ایک آدھ دیگر ترجمہ شائع کیا تھا۔الحمدللہ! آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو چینی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ دارالسلام سے چھپنے کے مراحل میں ہے۔28 زبانوں میں تراجم مکمل ہوچکے ہیں یا چند ماہ

تک ان شاء اللہ ہو جائیں گے۔ یہ محض رب کا فضل و کرم ہے۔ ینگ بلڈ کے پریس کو دیکھتے ہوئے میرا سب سے بڑا فوکس اس بات پر تھا کہ کیا اس کے لیے خصوصی مشینیں بنائی گئی ہیں۔

الحمدللہ میری قوت مشاہدہ عام لوگوں کی نسبت تیز ہے، میں نے دیکھا: وہی ہیڈل برگ کی مشینری ہے جو جرمنی کی تیار شدہ ہے، یہ مشہور زمانہ پرنٹنگ مشینری دنیا کے ہر حصہ میں موجود ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کمپنی کی پرنٹنگ مشینری سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ وہ بالکل نئے ماڈل کی تھی تو یہ درست نہ ہوگا۔ میں نے ہوگو پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس نے مجھے پریس کے ٹیکنیکل منیجر سے ملوایا، اس نے میرے بعض سوالات کے جوابات دیے اور بعض پر شانے اچکا دیے۔ میں نے عام ورکرز کو دیکھا کہ جس طرح ہمارے ہاں زمین پر بیٹھ کر آلتی پالتی مار کر کام کرتے ہیں وہاں بھی یہی منظر نظر آیا۔ بس میرا تجزیہ یہ تھا کہ ایک تو مشینوں کو خصوصی طور پر بنوایا گیا ہے کہ اس پر باریک کاغذ چھاپا جا سکے۔ اور دوسرے بلاشبہ اس کمپنی کا سو سال سے زیادہ کا تجربہ بھی تھا۔ ہوگو نے مجھے اپنے سب سے ضعیف ورکر سے ملوایا جو اب پروڈکشن سیکشن کا انچارج تھا۔ اس کا باپ بھی یہاں ملازم تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ 25 گرام پر چھاپنا اور پھر اس کی فولڈنگ کرنا کوئی معمولی کام نہیں کیونکہ اس میں ورق پھٹنے کا زیادہ امکان رہتا ہے یا پرنٹنگ دوسری طرف سے نظر آتی ہے، ورق تہ بہ تہ ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے نہایت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک کام پوری لگن، محنت اور توجہ سے نہ کیا جائے اس میں نقص کا احتمال بڑھتا چلا جاتا ہے، آخر میں بائنڈنگ کسی بھی کتاب کو یا تو نہایت دیدہ زیب بنا دیتی ہے یا اس کے برعکس بدصورت بنا دیتی ہے۔ اصل کردار اس

میں فنشنگ کا ہوتا ہے۔

مغل صاحب تو چند گھنٹوں کے بعد واپس چلے گئے، مگر میرا پروگرام ایک رات رکنے کا تھا۔ اب ہمارے باقاعدہ مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مجھے اپنے بارے میں اس بات کا ادراک ہے کہ میں بزنس گفتگو اچھی کر لیتا ہوں۔ ایک کامیاب بزنس مین خرید وفروخت کے دوران ہی کماتا ہے۔ اگر آپ نے کوئی چیز نہایت مہنگی خرید لی تو پھر آپ اس کو یقیناً مہنگی فروخت کریں گے۔ یہیں سے آپ کی کمپنی یا ادارے کا نقصان شروع ہو جاتا ہے۔ مسٹر ہوگو نے جو ریٹ دیے تھے وہ خاصے زیادہ تھے، مگر میں مصمم ارادہ کیے ہوا تھا کہ مجھے قرآن کریم شائع کرنا ہے۔ پاکٹ سائز قرآن کریم کل 1248 صفحات پر مشتمل تھا۔ ہم نے 30 ہزار نسخہ چھپوانا تھا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ اس کی کیا قیمت تھی، البتہ ہمارے مذاکرات کافی حد تک کامیاب رہے اور میں ریٹ کم کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ میٹنگ کے اختتام پر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا کچھ ڈالرز کیش کی صورت میں ساتھ لایا تھا وہ ادا کیے اور یوں کام کا آغاز ہو گیا۔ ہم نے معاہدے پر دستخط کیے اور یہ طے پایا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اس کے چند نسخے بذریعہ DHL ہمیں ارسال کریں گے۔

رات میرا قیام ہوٹل میں ہوا۔ طے پایا کہ میں اور مسٹر ہوگو ڈنر اکٹھے کریں گے۔ رات کے وقت مسٹر ہوگو ہوٹل پہنچ گیا۔ اس نے ہوٹل کے کونے میں پڑی ہوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور مجھ سے پوچھا: مسٹر مجاہد! ہمارا شہر چھوٹا سا ہے، یہ بتاؤ کہ تم کس طرح کا کھانا پسند کرو گے۔ ہمارے ہاں انڈین ریسٹورنٹ بھی ہے۔ میں ایک مرتبہ وہاں جا چکا ہوں ان کا کھانا مزیدار ہے۔ بلا ارادہ ہی میرے منہ سے انڈین ریسٹورنٹ نکل گیا کہ وہاں ویجیٹیرین فوڈ مل جاتا ہے اور چپاتی بھی ہوتی ہے۔

ہم آدھ پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد ہوٹل کی لابی میں بیٹھے پاپڑ کھا رہے تھے۔ کھانا طلب کرنے اور شروع کرنے کے درمیان ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ ہم نے گفتگو موسم اور بچوں سے شروع کی اور اچانک میں نے ایک سوال داغ دیا۔

مسٹر ہوگو! میں نے ابھی آپ کے پریس کو دیکھا، آپ کے پاس بے حد کام ہے۔ بائبل کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے اسے مختلف ممالک میں پہنچانا کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس کے لیے بے حد پیسہ درکار ہے، یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ اس نے مجھے اپنے کام کی تفصیل بتانا شروع کی کہ وہ ترجمہ سے لے کر اس کی اشاعت اور تقسیم تک کن کن مراحل سے گزرتے ہیں۔ اس قسم کے کھانوں کا جو ہم کھا رہے ہیں نہ تو کوئی بھوکا ہوتا ہے اور نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہی ہوتا ہے، مگر کھانے کی ٹیبل پر آپ بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ اگر آپ ہوشیار ہیں آپ کو سوالات کرنے کا سلیقہ آتا ہے تو پھر آپ یہاں سے بہت کچھ سیکھ کر جاتے ہیں اور اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر جاتے ہیں۔ دوران بزنس کھانے بعض اوقات دو دو گھنٹے چلتے رہتے ہیں۔ آپ کا مد مقابل آپ کے سامنے اپنی زندگی کا نچوڑ رکھ دیتا ہے۔ یہاں آپ ایسے سوالات بھی کر لیتے ہیں جن کو دفتر میں بیٹھ کر آداب بزنس کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

مسٹر مجاہد! وہ مجھ سے مخاطب تھا: ہمارا تعلق کیتھولک فرقے سے ہے، ہمارے چرچ کا صدر دفتر روم میں ہے۔ ہمارا پوپ اور چرچ نہایت امیر ہے۔ ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی دولت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ یہ تو بعض حکومتوں کو خرید سکتے ہیں، وہ گویا ہوا: آپ کو علم ہے کہ ہمارے بہت سارے جوڑے ایسے ہیں جن کی کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی ساری جائیداد چرچ

کے نام کر جاتے ہیں۔اسی طرح بہت سارے بڑے بڑے تاجر اور امراء اپنی جائیداد کا ایک حصہ چرچ کے نام وقف کردیتے ہیں۔اسی طرح حکومتوں کی طرف سے بڑے بڑے عطیات بھی چرچ کو وصول ہوتے ہیں۔چرچ خود اپنا کاروبار بھی کرتا ہے۔وہ میری معلومات میں اضافہ کررہا تھا اور میں محو حیرت اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

بلاشبہ مسلمانوں نے بھی بہت اوقاف چھوڑے ہیں۔ہر جگہ ہر شہر ہر بستی میں مسلمان حکمرانوں اور امراء نے مساجد، ہسپتال، دینی مدارس، یتیموں اور بیواؤں کے لیے اوقاف چھوڑے، مگر عیسائیوں نے اس سلسلہ میں جو بجٹ اکٹھا کیا وہ بہت زیادہ ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس ساری دولت کے باوجود یورپ اور امریکہ میں کئی چرچ برائے فروخت میسر ہیں، عموماً مسلمانوں نے انھیں خرید کر مساجد میں تبدیل کردیا ہے۔کم از کم میرے ذاتی علم کی حد تک آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی جگہ مسلمانوں نے مسجد کو فروخت کے لیے پیش کیا ہو۔یہاں تو یہ عالم ہے کہ مسلمان مسجد کو اگر کوئی چیز عطیہ کردیں تو اسے واپس لینا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔بہر حال یہاں دین وایمان اور کلیسا کا مقابلہ ہے۔بلاشبہ ان کے پاس بے حد دولت ہے، اقتدار ہے مگر مسلمانوں کے پاس اخلاص، جذبہ ایثار، ایمان باللہ ،تقوی اور جنت کی طلب کا سرمایہ ہے۔

قرآن پاک کا پاکٹ ایڈیشن چند ماہ میں مکمل ہوگیا۔یہ نہایت خوبصورت چھپا تھا۔ اس کی فنشنگ بڑی دیدہ زیب تھی۔اس کا کور (Cover) ہالینڈ کی ایک کمپنی " کا لیڈر" جیسا تھا۔جس پر Hot stampimg تھی۔اس کی قیمت ہم نے چالیس ریال رکھی ہمارے ایک دوست جاوید حسن جو عرب نیوز کے نمایندے تھے۔انھوں نے میرا انٹرویو کیا اور اخبار میں بہت خوب صورت خبر لگائی۔

جاوید حسن صاحب کی رپورٹ کا ترجمہ

ریاض کے ایک اشاعتی ادارے نے ایسا قرآن کریم شائع کیا ہے جسے دنیا کا سب سے ہلکا اور چھوٹا قرآن کریم قرار دیا جارہا ہے۔

دارالسلام کے مینیجنگ ڈائریکٹر عبدالمالک مجاہد نے عرب نیوز کو بتایا کہ قرآن کریم کا یہ پاکٹ سائز ایڈیشن 1224 صفحات پر مشتمل ہے، اس کی موٹائی محض 2.1 سینٹی میٹر اور وزن صرف 200 گرام ہے۔ اسے ہالینڈ کے ایک خصوصی پریس پر پرنٹ کیا گیا ہے جو باریک اور نفیس پیپر پر پرنٹنگ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

گہرے سرخ رنگ کے بیرونی غلاف اور اندرونی صفحات کی سلائی کمپیوٹرائزڈ مشینوں کے ذریعے کی گئی ہے، جس سے اس کی بائنڈنگ بہت مضبوط ہوگئی ہے۔ قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ اور شرح کا کام اسلامیہ یونیورسٹی مدینہ منورہ کے ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی اور ڈاکٹر محمد محسن خان نے کیا ہے۔

مجاہد صاحب نے بتایا کہ اس نہایت کم وزن کے قرآن کریم کی طباعت اعلیٰ معیار کے 25 گرام کے باریک کاغذ پر کی گئی ہے جو بولرے کمپنی فرانس نے تیار کیا ہے۔ ابتدائی ایڈیشن کے لیے تیس ہزار نسخوں کی طباعت کا آرڈر دیا گیا ہے۔

مجاہد صاحب بتارہے تھے کہ ہم نے قرآن کریم کے اس پاکٹ سائز ایڈیشن کا منصوبہ

اس لیے شروع کیا کہ ایسے نسخۂ قرآن کی ڈیمانڈ بڑی شدت سے سامنے آ رہی تھی ، لوگ چاہتے تھے کہ قرآن کریم کا ایسا نسخہ شائع کیا جائے جو وزن میں ہلکا ، سائز میں چھوٹا ہو اور آسانی سے ایک شخص کی جیب میں آسکے۔

ہمارے پاس اس سے پہلے ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مختلف تنظیموں کی جانب سے پاکٹ سائز قرآن کریم کے آرڈر موصول ہو چکے تھے۔ وہ تنظیمیں اس قرآن کریم کو امریکی فوج میں شامل مسلم فوجیوں کو گفٹ کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ ان قیدیوں کو بھی یہ قرآن کریم دینا چاہتی تھیں جو امریکی جیلوں میں تھے۔

اس ایڈیشن کی تیاری میں کتنی محنت اور سرمایہ صرف ہوا ، اس کی تفصیل بتاتے ہوئے مجاہد صاحب نے کہا: اس منصوبے کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں تیس ہزار سعودی ریال خرچ کرنا پڑے۔

ہالینڈ کا پریس بھی پہلے پہل اس قدر باریک کاغذ پر چھپائی کرنے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا ، مگر جب انھیں اس پروگرام کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا اور ایڈوانس رقم دی گئی تو وہ تیار ہو گئے۔ دارالسلام پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز اب تک عربی ، انگلش اور اردو میں 180 کتابیں شائع کر چکا ہے ، جبکہ پچاس مزید کتب زیر اشاعت ہیں۔ قرآن کریم کے مختلف ایڈیشن شائع کرنے کے علاوہ ہماری دوسری مطبوعات میں انگلش زبان میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حدیث کی مختلف کتب کے علاوہ بچوں کے لیے اسلامی کتب اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی کتب شامل ہیں۔

دارالسلام کے پاس تربیت یافتہ ملازمین کا عمدہ گروپ موجود ہے ، ان میں صحافی ، خطاط اور ڈیزائننگ کرنے والے آرٹسٹ شامل ہیں۔ انھوں نے ایک پروگرام کا

سافٹ ویئر بھی انسٹال کیا ہے، جس میں کسی بھی سورت اور آیت کا نمبر لکھ دینے سے وہ آیت کمپیوٹر سکرین پر آجاتی ہے۔

مجاہد صاحب جو ایک اسلامی سکالر ہیں اور ایک ممتاز خطاط فیملی سے تعلق رکھتے ہیں، کہنے لگے: امریکہ میں اس قرآن کریم کی بہت مانگ ہوگی۔ بعض تحقیقی رپورٹس کے مطابق امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد جلد ہی پچاس لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس طرح اسلام امریکہ کا دوسرا بڑا مذہب بن جائے گا۔

قارئین کرام! جاوید حسن صاحب کی رپورٹ ختم ہوئی۔ ان کا عرب نیوز میں یہ تبصرہ نوبل قرآن کی شہرت اور مقبولیت میں اضافے کے لیے مددگار ثابت ہوا۔

قرآن کریم کا یہ ایڈیشن ختم ہونے سے پہلے ہم نے بیس ہزار نسخہ کی طباعت کا پھر آرڈر دیا۔ پوری دنیا سے لوگوں نے ہمیں مبارک باد دینے کے لیے خطوط ارسال کیے اور بہت سی فون کالز بھی آئیں۔ لوگوں نے قرآن کریم کی اس اشاعت کو معجزہ قرار دیا۔ دارالسلام کو اس سے بڑی عزت اور شہرت ملی، ہماری مالی پوزیشن بھی مستحکم ہوئی اور ہم نے بہتر مستقبل کی منصوبہ بندی شروع کردی۔

چونکہ ایک مرتبہ قرآن کریم شائع ہو چکا تھا اس لیے مجھے دوبارہ ہالینڈ جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ تاہم ریاض آنے سے ایک دن قبل میں نے ایمسٹرڈم شہر کی سیر کی اور کشتی میں بھی بیٹھا۔ اس شہر میں جگہ جگہ نہریں بھی بنی ہوئی ہیں جو گھروں کے سامنے سے گزرتی ہیں، جو چیز یاد رہ گئی ہے وہ یہ کہ بوٹ کے کپتان نے کشتی کی شکل کا ایک بڑا جوتا رکھا ہوا تھا۔ جس میں وہ ہم سے ٹپ کا امیدوار تھا، حسب توفیق سبھی نے اس میں حصہ لیا۔

کچھ باتیں ''لیگو پرنٹ'' کے بارے میں

نوبل قرآن کا دوسرا ایڈیشن بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔ ہم نے تیسرے ایڈیشن کے لیے دس ہزار نسخوں کا آرڈر دیا۔ یہ ایڈیشن بھی مارکیٹ میں پہنچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جن علاقوں میں ہم نے پہلے نہیں بھجوایا تھا اب اسے وہاں بھجوانا تھا۔ میں چوتھے ایڈیشن کا آرڈر دینے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک ''ینگ بلڈ'' سے ایک فیکس موصول ہوا، جس میں مسٹر ہوگو نے نوبل قرآن کے مزید نسخے چھاپنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ اس نے جو لیٹر بھیجا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

افسوس کہ یہ لیٹر بے شمار فائلوں میں دب گیا ہے۔ خواہش کے باوجود میں اسے تلاش نہ کر سکا۔ اس خط میں لکھا تھا کہ ڈیر مجاہد! تم بہت اچھے گاہک ہو۔ مگر میں تمھیں نہایت افسوس سے اطلاع دے رہا ہوں کہ ہمارے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں اس بات پر خاصا جھگڑا ہوا ہے کہ اب ہم نے بائبل کو چھوڑ کر قرآن چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ لوگوں کو عرب ممالک سے ڈالر آئے ہیں۔ اس لیے آپ نے قرآن شائع کرنا شروع کیا ہے، لہٰذا میں آیندہ آپ کے ساتھ کام کرنے سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا خیر خواہ: مسٹر ہوگو۔

ہمارے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں اس بات پر خاصا جھگڑا ہوا ہے کہ اب ہم نے بائبل کو چھوڑ کر قرآن چھاپنا شروع کردیا ہے

میں نے جیسے ہی فیکس پڑھا اپنے سر کو جھکا لیا اور زیرلب مسکرا دیا۔ کیا یہ لوگ دین اسلام کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں؟

میں نے فوراً ہی فرانس کی مشہور پیپر ساز کمپنی ''بولرے'' کو ایک فیکس بھیجا، جس میں لکھا: ہم سعودی عرب میں ایک پبلشنگ کمپنی ہیں جو آپ کا ورق استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ آپ کے اس 25 گرام پیپر پر ہر پریس طباعت نہیں کرسکتا، اس لیے دنیا بھر میں جہاں جہاں آپ کے اس پیپر کے خریدار ہیں ان کے ایڈریس، فیکس اور فون نمبر درکار ہیں تاکہ ہم آپ کا ورق خرید کر ان سے پرنٹنگ کرواسکیں۔

میری توقع سے کہیں پہلے ان کا جواب آ گیا کہ ہمارے خریدار امریکا، ہالینڈ، اٹلی، جرمنی اور کوریا میں ہیں اور ان کے ایڈریس، فون اور فیکس نمبر درج ذیل ہیں۔ اٹلی میں ان کے دو خریدار تھے۔ میں نے اسی وقت ان تمام کمپنیوں کو ایک فیکس بھیجا کہ ہمارے پاس 1224 صفحات کی کتاب جس کا سائز 8X12 سم ہے۔ 25 گرام ورق ''بولرے'' پر شائع کرنا چاہتے ہیں، دس ہزار کی تعداد میں چھپوانا مطلوب ہے اس کی کوٹیشن درکار ہے۔

چند دنوں بعد اٹلی کی مشہور زمانہ کمپنی لیگو پرنٹ کا جواب آ گیا کہ وہ بزنس کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے ہم نے نمونے مانگ لیے جو فوراً DHL کے ذریعے مل گئے۔ ان کی کوالٹی ہالینڈ کی کوالٹی سے معمولی سی کم تھی، محض انیس بیس کا فرق تھا جسے عام آدمی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ صرف پروفیشنلز ہی بتا سکتے تھے۔ میں نے ان سے کہا: میں خود آ کر آپ کے پریس کو

دیکھنا چاہتا ہوں، لہٰذا آپ ویزا ارسال کر دیں۔ چند ہفتوں بعد میں روم سے ہوتا ہوا میلان ائرپورٹ پر اترا۔ اس زمانہ میں سعودی ائرلائن اور اٹالین ائرلائن کی پروازیں جدہ سے جاتی تھیں۔ 6 گھنٹے کی پرواز سے روم اور پھر ایک گھنٹہ کی مزید پرواز سے میلان پہنچ جاتے تھے۔ میلان ائرپورٹ پر مسٹر مارو مجھے لینے کے لیے پہنچ چکے تھے۔ چھوٹے قد اور سفید رنگ کا مارو کافی نحیف سا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں عزم و ہمت کی چمک تھی۔ ہم جلد ہی گاڑی میں بیٹھ کر ''ٹرینٹو'' (Trento) کی طرف چل دیے۔ میرے خیال میں یہ نام کینیڈا کے کسی شہر کا تھا، مگر اس نے بتایا کہ یہ تو اٹلی کا بڑا مشہور شہر ہے۔ ''ٹورنٹو'' کینیڈا میں بھی ہے، مگر دونوں کے سپیلنگ میں معمولی سا فرق ہے۔ مارو بڑا قابل اور ذہین آدمی ہے۔ اس کی تعلیم پی ایچ ڈی کے برابر ہے اور یہ لیگو پرنٹ میں بحیثیت سیلز ایگزیکٹو کام کرتا ہے۔ ہمیں ٹرینٹو اور اس کے متصل گاؤں تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ راستے میں ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔ مارو کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسے پرنٹنگ کی دنیا کا خاصا تجربہ ہے۔ ہم پریس میں گئے۔ واقعی یہ کافی بڑا پریس ہے۔ ان دنوں CTP کا بڑا چرچا تھا، یہ کہ اب فلمیں نہیں بنا کریں گی بلکہ کمپیوٹر سے براہ راست پلیٹ بنا کرے گی، اسی لیے اس مشین کو CTP یعنی Computer to plate کا نام دیا گیا۔ انھوں نے یہ مشین نئی نئی خریدی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے دور دور سے وفود آ رہے تھے۔ کسی بھی پریس کے بارے میں جاننا ہو کہ وہ کتنا بڑا ہے تو پوچھا جاتا ہے کہ آپ کے پاس کون سی مشین ہے؟ کتنے کلر والی مشینیں ہیں؟ آپ کے پریس میں کون سی سہولتیں ہیں؟ بائنڈنگ مشین آٹو ہے، سیمی آٹو ہے یا ہاتھ سے تجلید کرتے ہیں؟ ورکرز کی تعداد کتنی ہے؟

میں نے ان کا پریس دیکھا ان کے پاس متعدد ویب مشینیں تھیں۔ جدید ترین مشینری بلاشبہ نہایت برق رفتاری سے طباعت کرتی تھی۔ شہر سے کئی کلو میٹر دور یہ ایک نیا انڈسٹریل سٹی بن رہا تھا۔

اس گروپ کا شمار یورپ کے دوسرے بڑے پرنٹرز میں ہوتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ مارو سے پوچھا: تم روزانہ کتنا ورق شائع کر سکتے ہو؟ اس نے کہا: 80 ٹن روزانہ، گویا چار سے پانچ کنٹینرز روزانہ یہاں سے طباعت ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ یہ پریس حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کا مالک یا اس کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا چیئرمین مسٹر ''اولوواٹو'' تھا۔ اس کی کئی کمپنیاں ہیں۔ سال میں یہ دو تین مرتبہ پریس کا دورہ کرتا ہے۔ اس کا اپنا چھوٹا سا ہوائی جہاز ہے جس کا یہ خود ہی پائلٹ ہے، اس لیے جب اس کا جی چاہتا ہے اپنے اداروں کا وزٹ کر لیتا ہے۔ مارو کے بقول یہ بے حد محنتی اور مصروف انسان ہے۔

وہ جو محاورہ مشہور ہے کہ آپ کسی شخص کے آنے پر اپنی گھڑیاں درست کر سکتے ہیں مارو اسی کا مصداق تھا۔

''مارو'' بلا کا پھرتیلا اور بہت تیز بزنس مین ہے۔ یہ صبح ایک ملک میں اور شام دوسرے ملک میں ہوتا ہے۔ جرمنی یہاں سے قریب ہی ہے۔ یہ بہت تیز رفتاری سے کار چلاتا ہے۔ میں جب اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تو قرآنی آیات اور دعائیں پڑھتا اور اس کو روکتا ٹوکتا رہا کہ گاڑی آہستہ چلاؤ، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

یہ کہانی جو میں نے بیان کی ہے متعدد سالوں کے تجربات اور درجنوں بار اٹلی کے سفر کا

خلاصہ ہے۔ میں نے یہاں سے بہت کچھ سیکھا، مارو طباعت کے حوالے سے میرے ہر سوال کا فوراً جواب دیتا ہے۔ اسے عام اٹالینز کے مقابلے میں انگلش پر اچھا خاصا عبور حاصل ہے۔ بزنس میں انگلش کا بہت اہم رول ہے، کسی بھی بزنس مین کے لیے ضروری ہے کہ وہ انگلش سے واقف ہو، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ نے انگلش میں ماسٹرز ہی کر رکھا ہو۔ اگر آپ گفتگو کا فن جانتے ہیں تو پھر تھوڑی سی انگلش ویکیبلری کے ساتھ بھی آپ بزنس گفتگو کر سکتے ہیں۔

ہم نے لیگو پرنٹ سے کام کروانا شروع کیا تو الحمدللہ! یہ کام بڑھتا ہی چلا گیا۔ مارو کی بڑی بہن ڈنیالا بھی اس کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کی انگلش بھی اچھی ہے مگر مارو اس سے کہیں بہتر ہے۔ ویسے بھی یہ محض سینئر کلرک ہے۔ خاصی عمر ہونے کے باوجود غیر شادی شدہ ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کا واجبی سی شکل کا ہونا ہے، تاہم میں نے ان بہن بھائیوں میں بے حد محبت دیکھی۔ ڈنیالا تو مارو پر جان چھڑکتی ہے اور جذباتی حد تک اپنے بھائی کو چاہتی ہے۔

میرا قیام ایک تھری سٹار ہوٹل میں ہوا کیونکہ اس علاقے میں قریب ترین صرف یہی ایک ہوٹل ہے۔ اس کا نام ''فیلا مزدور'' تھا، یہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں یہ کسی نواب کی رہائش گاہ تھی جو اس نے فروخت کر دی تو اسے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا۔

مارو کو میں نے وقت کا بے حد پابند پایا، وہ جو محاورہ مشہور ہے کہ آپ کسی شخص کے آنے پر اپنی گھڑیاں درست کر سکتے ہیں مارو اسی کا مصداق تھا۔ میں صبح سویرے ہوٹل کے باغیچہ میں چہل قدمی کرتا، اس کے چاروں طرف باغ تھے۔ سامنے دور پہاڑیاں تھیں۔ یہ قصبہ ٹرینٹو سے ذرا ہٹ کر ہے، تاہم خاصا پرانا ہے۔ پرانی گلیاں، چھوٹی سڑکیں۔ اس علاقے

کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں برف خوب پڑتی ہے۔ سردیوں میں خوب سردی اور گرمیوں میں موسم معتدل رہتا ہے۔ بارشیں بے تحاشا ہوتی ہیں۔ ہر طرف ہریالی اور سرسبز وشاداب سڑکیں، سڑکوں کے کنارے خوبصورت پھولوں کی لڑیاں شہر کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ صبح سویرے راہ چلتے ہم دیکھتے کہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت بچے اپنی ماؤں کی انگلیاں تھامے سکول جا رہے ہوتے۔ ڈنیالا کو عربی زبان بالکل نہیں آتی تھی۔ میں نے عربی اور انگلش کے ہندسے آمنے سامنے لکھ کرا سے دیے۔ شروع میں اس کو پریشانی ہوئی پھر وہ سیکھ گئی۔

یہ وہ دور تھا جب مجھے بے حد نئے نئے آئیڈیاز سوجھتے تھے۔ میرے پاس اٹلی کا ملٹی پل ویزا تھا۔ سفارت خانے کے لوگ مجھے خوب جانتے تھے۔ شروع شروع میں ماروپا اس کی بہن سفارت خانے کے عملے کو فون کر دیتے یا لیٹر بھجوا دیتے اور دو دن میں ویزا لگ جاتا۔ میرا جب بھی موڈ بنتا میں اٹلی پہنچ جاتا۔ میرا ٹریول ایجنٹ بڑا سمجھ دار اور میرے مزاج کو سمجھنے والا تھا۔ میں اس کو فون پر بتاتا کہ فلاں تاریخ کو جانا چاہتا ہوں میرا روٹ یہ ہے کہ مجھے فرانس بھی جانا ہے یا انگلینڈ بھی جانا ہے اور مجھے ہر صورت میں ٹکٹ چاہیے۔ اس کا جواب 99 فیصد ہاں ہی میں ہوتا، وہ کہتا: آپ ڈرائیور کو بھیج دیں وہ آ کر ٹکٹ لے جائے۔ جدہ سے چلنے والی سعودیہ کی فلائٹ میں بہت سی نشستیں عموماً خالی ہوتی تھیں۔ میں شلوار قمیص اور اچکن میں ملبوس ہوتا۔ فلائٹ رات کو دو بجے چلتی تھی، میں صبح سویرے روم پہنچ جاتا۔ جیسے ہی فلائٹ ہموار ہوتی میں پچھلی نشستوں پر لیٹ جاتا، نیند تو ان دنوں مجھے بہت محبوب تھی۔ جوانی کا دور تھا، میں فوراً خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگتا۔ سونے سے پہلے ائر ہوسٹس کو بتا دیتا: مجھے کھانا نہیں چاہیے، آپ براہ کرم ڈسٹرب نہیں کریں گی۔

روم ائرپورٹ پر عموماً یہ سوالات ہوتے: کتنے دن کے لیے آئے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام کرتے ہو؟ واپسی کا ٹکٹ ہے یا نہیں؟ کس کمپنی سے آپ کا لنک ہے؟ ان تمام سوالات کے جوابات رٹے رٹائے ہوتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ پاسپورٹ پر محض سابقہ اسفار کی مہریں دیکھ کر امیگریشن آفیسر مہر لگا دیتا۔ آج تک انھوں نے میرا سامان کھول کر نہیں دیکھا۔ میں ہمیشہ اپنے ساتھ دو بیگ رکھتا ہوں۔ ایک ہینڈ کیری اور ایک بڑا سوٹ کیس۔ دونوں میں پہیے لگے ہوتے ہیں، اس لیے اگر کوئی ٹرالی وغیرہ نہ بھی ملے تو میں اپنے ہاتھوں سے ان کو با آسانی لے جاتا ہوں۔

> جیسے ہی فلائٹ ہموار ہوتی میں پچھلی نشستوں پر لیٹ جاتا، جوانی کا دور تھا، میں فوراً خواب خرگوش کے مزے لینے لگتا۔

میں سفر میں ہمیشہ ضروریات کا بہت اہتمام کر کے جاتا ہوں۔ ہمیشہ واپسی کی سیٹ بک کروا کے جاتا ہوں۔ مجھے ائر پورٹ پر کون لینے آئے گا، میں کس ہوٹل میں قیام کروں گا، کھانا کہاں سے کھاؤں گا، یہ تمام امور پہلے سے طے شدہ ہوتے تھے، میں سیکورٹی کا بطور خاص اہتمام کرتا تھا۔

دوران سفر میں اپنے ساتھ وافر مقدار میں رقم لے کر جاتا۔ دارالسلام سے مجھے بہت معقول رقم روزانہ کے خرچے کے لیے ملتی تھی۔ میں دوران سفر ہمیشہ اپنے ہاتھ کھلے رکھتا۔ کیونکہ اگر آپ مسافر ہیں تو آپ کے اخراجات دوگنا بلکہ تین گنا ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ عزت چاہتے ہیں تو پھر کنجوسی کو بھول جائیں۔ الحمد للہ! میں ہمیشہ کھلے دل سے خرچ کرتا۔ کوشش ہوتی کہ میزبان پر بوجھ نہ بنوں۔ اگر کوئی مجھے کھانا کھلاتا تو لازماً میری اولین

کوشش ہوتی کہ اس کو بدلے میں اس سے بہتر کھانا کھلاؤں یا اسے کوئی گفٹ پیش کروں۔

میرا ایک مستقل طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ ہمیشہ اپنے ساتھ کچھ چیزیں بطور گفٹ لے جاتا ہوں اور جن لوگوں کو مناسب سمجھتا ہوں پیش کر دیتا ہوں۔ یہ گفٹ کوئی زیادہ قیمتی نہ ہوتے لیکن وہاں ان کی بڑی قیمت بن جاتی کیونکہ حدیث رسول ﷺ ہے: «تَهَادَوا تَحَابُّوا» ''لوگوں کو تحائف دیا کریں، اس سے محبت بڑھتی ہے۔''

اٹلی کے سفر شروع ہوئے تو میں نے فوراً وہاں کے اسلامک سنٹر سے رابطہ کیا۔ میری خواہش تھی کہ میں وہاں مسجد تلاش کروں، چنانچہ اگلے ہی دن ٹرینٹو اسلامک سنٹر کے نائب جناب ڈاکٹر ابوالخیر صاحب ملنے کے لیے آ گئے۔ شام سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر ابوالخیر میرے ہم عمر تھے۔ فوراً ہی ہم دونوں میں دوستی ہوگئی۔ یہ دانتوں کے ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر صاحب کو ایک مدت ہوئی شام کو خیر باد کہہ کر اٹلی میں بس گئے تھے۔ ان کو اطالوی زبان پر عبور تھا، انھوں نے یہاں پر ہی تعلیم حاصل کی، اب ان کا اپنا کلینک ہے۔ یہاں کے اخبارات میں مسئلہ فلسطین پر اکثر وبیشتر ان کے آرٹیکل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بڑے پر جوش انسان ہیں۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پر جوش خطیب ہیں۔ اسلامک سنٹر میں خطبہ جمعہ دو زبانوں میں ہوتا ہے، ایک عربی میں اور دوسرا اطالوی زبان میں اور ان کو دونوں زبانوں میں مہارت حاصل ہے۔

مجھے نماز باجماعت سے غرض ہوتی تھی کہ ہم دونوں مل کر نماز کے لیے جماعت بنا لیتے۔ اسلامک سنٹر خاصا دور تھا۔ شام کا وقت ڈاکٹر ابوالخیر کے لیے وقف ہوتا۔ ان کے پاس مرسیڈیز کار تھی، وہ مجھے گھنٹوں اس میں بٹھا کر سیر کراتے رہتے، ٹرینٹو شہر اتنا بڑا نہیں۔ دو پہاڑوں کے درمیان ایک کھلی وادی ہے جس کے درمیان یہ شہر اور دیگر

انڈسٹریل شہر آباد ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں چھوٹا سا دریا بہتا ہے۔

ہماری گاڑی پہاڑ کی ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر پہنچتی تو ہم وہاں سے شہر کا نظارہ کرتے اور پھر تیسری چوٹی کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اس دوران وہ دنیا جہان کی باتیں کرتے، مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے۔ وہ فلسطین کے بارے میں بڑے دردمند اور پرجوش تھے۔ میرا ان سے اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہ تھا، میں بھی ان کا مؤید تھا، اس لیے ہماری آپس میں خوب بنتی تھی۔ مالی اعتبار سے خاصے کھاتے پیتے تھے۔ جس کا یورپ میں ذاتی کلینک ہو وہ غریب کیسے ہوسکتا ہے۔ ہماری میٹنگ کا اختتام عموماً کسی اطالوی پیزا ہٹ میں ہوتا، جہاں ہم فش پیزا یا ویجیٹیرین پیزا کھاتے۔

لیگو پرنٹ والے عموماً مجھے خالی کمرہ فون سمیت دے دیتے تھے۔ نماز کے لیے وہ بڑے بڑے پیپر منگوا کر رکھ دیتے۔ میرا یہاں پر سب سے اہم کام ریٹ لینا، معاہدوں پر دستخط کرنا، پروف دیکھنا اور ان کو OK کرنا ہوتا تھا۔ میں دنیا میں کہیں بھی ہوتا تو فون پر دارالسلام ریاض سے اور دنیا بھر میں دارالسلام کی برانچوں سے رابطہ رہتا تھا۔ ریٹ طے کرنے کی باری آتی تو میں اور مارو خوب بحث کرتے، میں ایک ایک سینٹ کے لیے جھگڑا کرتا۔ وہ بھی بازو لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا: مسٹر مجاہد! میں تم سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ عموماً میں جیت جاتا اور مطلوبہ ریٹ لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ دراصل ان کو بھی کام مطلوب تھا اور ڈالرز بھی درکار تھے۔ دارالسلام اس معاملے میں بہت اچھا کسٹمر تھا۔

لیگو پرنٹ کے سٹاف میں ایک ادھیڑ عمر شخص مسٹر جلیانو تھا۔ یہ فلموں کی پیسٹنگ کرتا تھا اور اپنے کام میں نہایت ماہر اور پھرتیلا تھا، ہر وقت مصروف کار رہنے والا جلیانو نجانے مجھے کیوں اچھا لگتا تھا۔ ایک دن مارو مجھ سے کہنے لگا: مسٹر جلیانو تمھیں کھانے پر اپنے گھر

میں مدعو کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ لنچ بریک میں تم اس کے گھر چلو۔ مسٹر جلیانو انگلش کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا ادھر مجھے بھی اطالوی زبان کا ایک حرف نہیں آتا تھا۔ مارو نے مجھے بتایا: لگتا ہے کہ اس کی بیوی عرب ہے اور دراصل اس کی بیوی ہی نے تمھیں دعوت دی ہے۔ میں نے ہاں کر دی۔

میں نے اپنے بریف کیس میں دیکھا کہ ایک لیڈیز واچ پڑی ہوئی تھی۔ اگلے دن میں اور جلیانو پروگرام کے مطابق لنچ بریک میں اس کے گھر چل دیے۔ ہم دونوں اشاروں کی زبان بول رہے تھے۔ دوسری منزل پر واقع اس کا فلیٹ بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی بیوی نے السلام علیکم، مَرحَبًا، اَهْلًا وَّ سَهْلًا ! سے میرا استقبال کیا۔ مغربی تہذیب میں رہنے کے باوجود وہ مکمل لہجے میں بڑی روانی سے عربی بول رہی تھی، جس کی مجھے 80% سمجھ آرہی تھی۔ اس نے بتایا: میرا تعلق مراکش سے ہے، ہم تین بہنیں یہاں رہتی ہیں۔ اس ملک میں ہم خادمائیں بن کر آئی تھیں۔ میں نے جلیانو سے دوسال پہلے شادی کی تھی، اب میری ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ اسی اثنا میں جلیانو اپنی بچی کو گود میں لیے جھومتا ہوا داخل ہوا۔ میں نے پوچھا: کیا تمھارا خاوند مسلمان ہے؟ کہنے لگی: ہاں! اس نے میری خاطر اسلام قبول کیا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ شادی پر اصرار کیا تو میں نے اسے اسلام کی دعوت پیش کی جسے اس نے میری خاطر قبول کر لیا۔ میرے ذہن میں ام سلیم رضی اللہ عنہا والی بات گھوم گئی، جب انھوں نے ابوطلحہ انصاری سے شادی کرنے کے لیے اسلام ہی کو اپنا حق مہر قرار دے دیا تھا۔ میں

> وہ بھی بازو لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا: مسٹر مجاہد! میں تم سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔

نے پوچھا: کیا تم نماز ادا کرتی ہو؟ اس نے نفی میں جواب دیا، کہنے لگی: کیوں جھوٹ بولوں، ہمارا والد بڑا غریب آدمی ہے، ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ ہم تینوں بہنیں یہاں سے اسے کچھ نہ کچھ ماہوار بھجوا دیتی ہیں۔ میں نے آج اپنی بہنوں کو بھی کھانے پر بلوایا ہے۔ وہ ابھی آنے والی ہیں۔ میرا نام شریفہ ہے۔ وہ بولتی چلی گئی۔

اسی دوران وہ کھانا لگانے چل دی اور میں مسٹر جلیانو کی بیٹی کے ساتھ کھیلتا رہا، تھوڑی دیر بعد وہ بڑی سی پلیٹ میں ''کسکس'' لے آئی۔ یہ مراکش کی بڑی مشہور ڈش ہے، اس میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے سجے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ تو بتاؤ کہ تم نے مجھے دعوت کیوں دی؟ نہ ہماری جان پہچان، نہ کوئی رابطہ۔ کہنے لگی: گزشتہ کئی دنوں سے ہمارے گھر میں تمھارے ہی حوالے سے بات چیت ہو رہی تھی۔ میرا خاوند تم سے بڑا متاثر ہے۔ میں نے سوچا: میرا ایک اسلامی بھائی سعودی عرب سے آیا ہے، کیوں نہ میں اسے اپنے گھر دعوت دوں۔ اسی دوران اس کی دونوں بہنیں بھی آ گئیں۔ دونوں اپنی بہن کی طرح خوبصورت اور فیشن ایبل تھیں۔ ایک نے کہا: میرا نام لطیفہ ہے۔ دوسری نے اپنا نام نعیمہ بتایا۔ ان کی تعلیم تو واجبی سی تھی، تاہم گھروں میں کام کرنے کی وجہ سے وہ اطالوی زبان سیکھ گئی تھیں۔ جب میں کھانا کھانے لگا تو خیال آیا کہ یہ گوشت حلال بھی ہے یا نہیں۔ میں نے ہاتھ روک لیا تو شریفہ کہنے لگی: یا اخی! پورے اطمینان سے تناول فرمائیے، یہ حلال گوشت ہے، میں خاص طور پر اسلامک سنٹر کی دکان سے لائی ہوں۔ میں اس معاملے میں نہایت محتاط ہوں۔ ہمارے گھر میں صرف حلال گوشت پکتا ہے۔ مجھے اچانک ایک خیال آیا اور وہاں سے اُٹھنے کے بعد میں نے اسلامک سنٹر میں فون کیا۔ اب وہ مجھے جاننے لگے تھے، کچھ تعارف ڈاکٹر ابوالخیر نے بھی کروا دیا تھا۔ دراصل انھوں نے

مجھ سے سنٹر کے لیے اسلامی کتب مانگی تھیں جو میں مہیا کر چکا تھا۔ مارو کو میں نے کہہ دیا: جتنی بھی کتب ہم نے آپ سے شائع کروائی ہیں ان کے دو دو تین تین نسخے ان کو مفت دیے جائیں۔ اسلامک سنٹر والوں سے لمبی بات ہوئی۔ میں نے ان سے ان تینوں بہنوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ انھیں جانتے تھے، ان کے نام ان کے پاس بطور مسلم درج تھے۔ مسٹر جلیانو اور اس کی شادی کا بھی ان کو علم تھا۔ میں نے کہا: تم انھیں نماز کی اہمیت کے بارے میں کتب کیوں نہیں دیتے؟! میں تینوں بہنوں کو اسلام کے بارے میں جو کچھ بتا سکتا تھا بتاتا رہا۔ کھانا توقع سے زیادہ مزیدار تھا۔ جلیانو کو کام پر واپس جانا تھا لیکن آج اسے میری وجہ سے چھٹی مل گئی۔ اس نے مجھے ہوٹل بھی چھوڑنا تھا۔

اچانک میں نے تینوں بہنوں سے سوال کر دیا: تمھاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟ مجھے اس جواب کی توقع نہ تھی جو انھوں نے دیا۔ تینوں یک زبان ہو کر کہنے لگیں کہ ہماری زندگی کی سب سے بڑی آرزو بیت اللہ شریف کا حج کرنا ہے۔ ہم اللہ سے دعا کرتی ہیں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم اس کا گھر دیکھیں۔

ہمارا آپ سے ملنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہمارا ایک اسلامی بھائی مقدس سرزمین سے یہاں آیا ہے۔ ہم آپ سے اللہ کی رضا کی خاطر ملنا چاہتی تھیں۔ میں نے ان سے نماز کی پابندی کا اقرار لیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ اگر ان کے لباس اور فیشن کو دیکھا جائے تو شاید ان کو مسلمان بھی تسلیم نہ کیا جائے، مگر اس مغربی ماحول میں رہنے کے باوجود ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت موجود ہے۔

اگلے سال جب میں اٹلی گیا تو مسٹر جلیانو نے اشاروں سے لطیفہ اور نعیمہ کے بارے میں بتایا کہ ان کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اب اپنے گھروں میں آباد ہیں۔

تفسیر احسن البیان کی اشاعت کی کہانی

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہم سے بعض کام ایسے لیے جن کے بارے میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس کی خاص عنایت تھی کہ اس نے ہمیں اس عظیم مقصد کے لیے پسند فرما لیا۔ اردو زبان میں قرآن کریم کی متعدد تفاسیر موجود ہیں۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ سلفی منہج کے مطابق ایک مختصر مگر جامع تفسیر ہو جسے عامۃ الناس کے لیے طبع کروایا جائے اور اگر ممکن ہو تو مجمع الملک فہد مدینہ طیبہ سے بھی اس کی طباعت ہو جائے۔

میرے نزدیک سنجیدہ مسائل پر مجالس میں بیٹھ کر محض گفتگو کرنا، ہوائی منصوبے بنانا، مختلف شخصیات کو کوسنا اور خود کچھ نہ کرنا قابل قبول نقطہ نظر نہیں ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ ان دنوں مجمع الملک فہد سے سلفی منہج کی کوئی اردو تفسیر نہیں چھپ رہی تھی، حالانکہ یہ ملک اللہ کے فضل و کرم سے سلفی مسلک کا داعی اور کتاب و سنت پر چلنے والے لوگوں کا ملک ہے۔ احباب جب بھی کسی مجلس میں اکٹھے ہوتے تو اس موضوع کو ضرور زیر بحث لاتے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں، لیکن میں نے کئی دفعہ سوچا کہ کب تک ہم ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالتے رہیں گے، کیوں نہ اس سلسلے میں ہم کوئی عملی اقدام کریں۔

میں نے سوچا کہ آج اگر ہمیں کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ یہ کہتا ہے: تمھارے

پاس کوئی ایسی تفسیر ہے جسے ہم فوری طور پر شائع کر سکیں؟ تو شاید ہمارے پاس اس کا جواب اثبات میں نہیں ہوگا۔ میں نے سوچا، غور و فکر کیا، استخارے کیے، احباب سے مشورے کیے، بطور خاص محترم پروفیسر ساجد میر صاحب اور اپنے عزیز مولانا محمد ادریس فاروقی صاحب سے مشورے کے بعد میں نے پختہ عزم کر لیا کہ اردو زبان میں ایک مختصر مگر جامع تفسیر کی تیاری اور اشاعت وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ اس تفسیر میں استعمال ہونے والے ترجمہ قرآن کریم کے لیے میری نظر مولانا محمد جونا گڑھی رحمہ اللہ کے ترجمے پر پڑی جو بڑا ہی عمدہ اور مفید معلوم ہوا، سبھی نے اس فیصلے کو سراہا اور اس کی تعریف کی۔ اب ضرورت تھی اس بات کی کہ اس پر مختصر حاشیے لکھے جائیں تو اس کے لیے میری نگاہ انتخاب حافظ صلاح الدین یوسف صاحب پر پڑی۔ وہ ایک مدت سے 'الاعتصام' کے ایڈیٹر چلے آرہے تھے اور متعدد کتب کے مؤلف بھی تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کیا، انھوں نے موافقت ظاہر کی تو میں نے ویزا اور ٹکٹ بھیج کر انھیں سعودی عرب بلوا لیا۔ یہ فروری 1994ء کی بات ہے کہ وہ میرے چچا زاد بھائی محمد یعقوب کیلانی کے ہمراہ ریاض پہنچ گئے۔ آتے ہی انھوں نے ترجمے پر حاشیے کا کام شروع کر دیا۔ مولانا صلاح الدین یوسف جتنا کام کرتے اس کی یعقوب کیلانی صاحب ساتھ ہی ساتھ کتابت کرتے چلے جا رہے تھے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو میری خواہش اور گزارش پر عالم اسلام کے معروف سکالر مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری صاحب نے بھی اس پر نظر ثانی فرمائی۔ علاوہ ازیں پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے بھی طباعت سے پہلے اس کام کو دیکھا اور اس کی تحسین فرمائی۔

مولانا محمد جونا گڑھی کے ترجمہ میں بعض اصلاحات کے لیے دارالسلام کے رفیق کار حافظ محمد طاہر اور بعض دیگر علماء نے بھی اس پر نظر ثانی کی، کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ زبان

وبیان میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، جس کو عصر حاضر کی زبان سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے 1995ء کے وسط تک اس کام کو مکمل کرلیا اور ہم نے اسے بڑی شان وشوکت سے بیروت سے طبع کروا کے شائع کیا۔ اس زمانے میں سعودی عرب میں جتنے بھی علمائے اہل حدیث تھے ان سب کی خواہش تھی کہ یہ ترجمہ وتفسیر جس کا نام ہم نے احسن البیان رکھا تھا، مجمع الملک فہد سے بھی شائع ہو، تاکہ یہ حجاج کرام کے درمیان مفت تقسیم کیا جائے اور کرہ ارض کے طول وعرض تک اللہ کا پیغام اردو زبان میں بھی پہنچ جائے۔ اس سلسلے میں مکہ مکرمہ میں ڈاکٹر محمد وصی اللہ عباس، ڈاکٹر محمد اختر لقمان، ڈاکٹر لیث محمد اور دیگر بہت سے اہل حدیث علماء نے گراں قدر کوششیں کیں۔ انھوں نے مجمع کے مسئولین سے ملاقاتیں کیں اور اپنا اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا۔ علاوہ ازیں سعودی عرب کے طول وعرض میں قائم مکاتب جالیات میں کام کرنے والے مبلغین نے بھی اپنا مثبت کردار ادا کیا۔ بہت سے سعودی اور غیر سعودی علمائے کرام نے احسن البیان کا مراجعہ بھی کیا اور ہمیں اپنی قیمتی آراء سے بھی نوازا۔ اس تفسیر کو مجمع الملک فہد سے شائع کروانے میں بہت سے لوگوں کا تعاون شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، جن کی کوششوں سے یہ تفسیر مجمع الملک فہد سے شائع ہو کر دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گئی۔

اس نعمت کبریٰ پر میں اللہ تعالی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کام کے لیے مجھے پسند فرمایا، لیکن اگر میں یہ کہوں کہ یہ مجھ اکیلے کا کام تھا تو یہ درست نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ بے شمار علمائے کرام جن میں ڈاکٹر فا عبدالرحیم، ڈاکٹر ناصر فقیہہ سعودی اور شیخ عبداللہ

المعتاز شامل ہیں، ان سب نے بھی اس کام میں بہت تعاون کیا۔ مولانا عبدالغفار حسن نے اپنے دونوں بیٹوں ڈاکٹر صہیب حسن اور سہیل حسن کو مکلّف کیا کہ وہ اس کام کا مراجعہ کریں اور آخر میں خود بھی انھوں نے مراجعہ فرمایا اور اس پر بے حد قیمتی ملاحظات تحریر فرمائے۔

جب تفسیر مکمل ہوگئی تو اس کی فوٹو کاپی ہم نے مجمع الملک فہد کو پیش کی۔ انھوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے اس کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ کمیٹی میں زیادہ تر وہی علمائے کرام تھے جن کے نام اوپر آچکے ہیں۔ کمیٹی نے اس کام کو پسند کیا اور اسے شائع کرنے کی سفارش کر دی۔ اب میری خواہش یہ تھی کہ اس کا لے آؤٹ اور ڈیزائننگ میری نگرانی میں ہو۔ سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے میری خواہش کی لاج رکھی، مجمع والوں نے دارالسلام کو یہ کام سونپ دیا۔ پاکستان میں اس کی کمپوزنگ کروائی گئی۔ اس زمانے میں کمپیوٹر اس طرح عام نہیں تھا جس طرح آج ہے۔ ہاتھ سے پیسٹنگ کی جاتی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میرے برادر گرامی محمد ایوب سپرا صاحب ان دنوں دارالسلام ریاض میں تھے۔ انھوں نے بھی اس کام کو آگے بڑھانے میں بڑا خوبصورت کردار ادا کیا، بہت محنت کی، کئی مہینوں کی جدوجہد کے بعد بالآخر تفسیر چھپنے کے قابل ہوگئی۔ مجھے یاد ہے کہ برادر محمد ایوب اور ادارے کے ایک اور رفیق کار حیدر علی کتنی ہی دیر تک مدینہ طیبہ میں مجمع کے دفتر میں بیٹھ کر اس کی اغلاط درست کرتے رہے۔

پھر وہ دن بھی آیا جب یہ تفسیر بہت شان و شوکت کے ساتھ مجمع الملک فہد سے شائع ہوئی۔ ہر سال حجاج کرام کو لاکھوں کی تعداد میں یہ تفسیر مفت تقسیم کی جاتی ہے۔ وہ اسے اپنے اپنے ملک لے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

قصہ صحیح بخاری شریف کی طباعت کا

میں ایک مرتبہ ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی حفظہ اللہ سے ملنے ان کے گھر گیا۔ انھوں نے فرمایا: کاش! کوئی ناشر بخاری شریف کو ایک ہی جلد میں شائع کر دے۔ میں دفتر واپس آیا تو فوراً اس منصوبہ پر غور وفکر شروع کر دیا۔ میرے دفتر کی لائبریری میں صحیح بخاری کے جتنے عربی نسخے تھے ان کو اپنی ٹیبل پر رکھا اور ان کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ کے مجھ پر بے پناہ احسانات ہیں۔ ان میں ایک کا ذکر کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ جو منصوبہ مجھے شروع کرنا ہوتا ہے اسے فوراً شروع کرتا ہوں۔ اس کے لیے میرے ہاں کل کا لفظ نہیں ہے، بلکہ میں اس پر فوراً ہی سوچنا شروع کر دیتا ہوں، اس کے خدوخال بناتا ہوں۔ اگر اسٹاف سے مشورہ ضروری سمجھتا ہوں تو فوراً میٹنگ بلوا لیتا ہوں۔ اپنے دلائل دیتا اور ان کے سنتا ہوں۔ اگر ان کے مشورے قابل قدر ہوتے ہیں تو یقیناً ان کو پذیرائی بخشتا ہوں۔ مگر سچ پوچھیے تو عموماً میں اکیلا ہی تمام منصوبوں پر غور وفکر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہوں۔ میرے نزدیک منصوبہ وہی کامیاب ہوتا ہے جو قابل تنفیذ ہو۔ تصوراتی دنیا میں رہنا اور خیالی پلاؤ پکانا میرے نزدیک حماقت سے کم نہیں۔ میں نے کبھی ہوا میں اڑتی چڑیا پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ جس وقت صحیح بخاری کو شائع کرنے کا منصوبہ سامنے آیا شاید

اس کی منصوبہ بندی کرنے میں صرف ایک دن لگا تھا۔ خطاطی میری رگوں میں رچی بسی ہے۔ میرے آباء واجداد خطاط تھے، میں خود بھی معمولی درجے کا خطاط سہی، بہر حال خطاطی کے زیر وبم ضرور جانتا ہوں۔ ایک صفحہ پر کتنی سطریں اور ایک سطر میں کتنے الفاظ ہوں گے، ہماری یہ کتاب کتنے الفاظ پر مشتمل ہے اور اس کے کتنے صفحات ہوں گے، کتاب کا Layout کیسا ہوگا، اس کی طباعت کے اخراجات کیا ہوں گے اور مارکیٹ میں یہ کتنی قیمت میں فروخت ہوسکتی ہے۔ ان مراحل میں ہمارا وقت کتنا صرف ہوگا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات چند منٹوں میں میرے سامنے آجاتے ہیں۔ کسی بھی میٹنگ کے دوران نئے آئیڈیا کو اختیار کر لینا الحمدللہ! میرے لیے نہایت آسان ہے۔ میں کسی بھی منصوبے پر گھنٹوں غور کرتا رہتا، جب تک میں اس کا واضح رخ نہ دیکھ لیتا مجھے چین نہ آتا۔ راتوں کو نیند نہ آتی اور جب میں اس منصوبہ کو درست سمت میں شروع کر لیتا تو پھر مجھے وہ چین اور سکون ملتا کہ دنیا جہاں کی دولت اس کے سامنے ہیچ ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ نشر واشاعت کا مجھے جنون کی حد تک شوق ہے۔ جب ہماری کوئی نئی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے تو میں اسے نئے مولود سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں نے دنیا کی بہت ساری کتب کی نمائشوں میں حصہ لیا ہے۔ میں گھنٹوں کتابوں کو دیکھتا اور ان کے لے آوٹ، پوائنٹ، سائز اور ڈیزائننگ کو دل ودماغ پر نقش کر لیتا۔ صحیح بخاری کو ایک جلد میں لانا میرے لیے بفضل اللہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بیروت میرے لیے دوسرے گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑے سے بڑا منصوبہ ٹونی اور میں بیٹھ کر فوراً تیار کر لیتے تھے۔ ٹونی کے اندر ایک ہی خامی تھی اور ابھی تک ہے کہ وہ اسلام کی نعمت سے محروم ہے، مگر اخلاقی اعتبار سے وہ بڑا بھروسے کا آدمی تھا۔ ہماری تمام کتب کا ڈیٹا اس کے پاس محفوظ تھا۔ مالی

اعتبار سے اس کی قیمت لاکھوں ڈالر بنتی ہے، مگر اس بات کا ٹونی کے ہاں کوئی تصور نہ تھا کہ وہ ہمارا یہ ڈیٹا کسی کو فروخت کر دے یا ہدیہ کر دے۔

بخاری شریف شائع ہونے کے لیے تیار تھی، ہم نے اسے اٹلی سے چھپوانا تھا۔ اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ میں قدرے پریشان بھی تھا کہ اس کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ میں اسی کشمکش میں تھا کہ حرم مکی میں جناب میاں الطاف حسین سے ملاقات ہوگئی۔ آگے کی داستان کہنے سے پہلے میں میاں صاحب کا مختصر سا تعارف آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ہم اٹلی سے نوبل قرآن پاکٹ سائز طبع کروا چکے تھے۔ الحمد للہ! اس کو بہت شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ کراچی سے ایک فون آیا۔ بڑی کھنکتی اور خوبصورت آواز میں وہ اپنا تعارف کروا رہے تھے: میرا نام الطاف حسین برخوردار یہ ہے، چنیوٹی برادری سے تعلق ہے، صدیقی ٹرسٹ کراچی کا نائب صدر ہوں۔ ہمیں نوبل قرآن مفت تقسیم کے لیے درکار ہیں۔ میں نے کہا: لے لیں۔ فرمانے لگے: ہمیں ادھار چاہئیں۔ میں نے لمحہ بھر سوچا اور کہا: ٹھیک ہے، آپ ادھار لے لیں، پھر وہ پوری سنجیدگی سے کہنے لگے: اگر میں آپ کے پیسے کھا جاؤں تو میں نے بھی اسی ٹون میں جواب دیا: کھا جائیں۔

اس پر انھوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے: ہماری آپس میں جان نہ پہچان اور آپ کو میرے فون پر اتنا بھروسہ کہ میں ادھار بھی کھا جاؤں .... میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا: میاں صاحب! آپ کاروباری آدمی ہیں۔ اوّلاً تو آپ کو انگلش نہیں آتی ہوگی۔ اگر آتی بھی ہے تو آپ کو پڑھنے کے لیے صرف ایک نسخہ چاہیے ہوگا۔ باقی آپ

اسے مفت تقسیم کریں گے۔ اگر آپ مجھے پیسے نہیں دیں گے تو میں فقیر نہیں ہو جاؤں گا، مجھے ثواب تو ملے گا۔

اس فون کے بعد ہمارے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ میں ان کی باپ کی طرح عزت کرتا، وہ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے۔ ہمارا ایک دوسرے پر بے حد اعتماد تھا۔ وہ ان دنوں انگلش کتابیں خرید کر یورپ اور امریکا میں تقسیم کرتے یا ان کو فروخت کرتے تھے۔ معاملے کے بے حد کھرے تھے۔ جب بھی مجھے رقم کی ضرورت ہوتی میں بلا تکلف ان کو فون کر دیتا اور وہ فوراً ادائیگی کا بندوبست کر دیتے۔ ان کا اس وقت طریق کار یہ تھا کہ وہ ہم سے جس قیمت پر کتب خریدتے اس پر 10 فی صد ڈسکاؤنٹ کر کے فروخت کر دیتے۔ وہ پکے بزنس مین تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ مجھ سے لڑ لڑ کر ریٹ کم کرواتے۔ خوبی ان کی یہ تھی کہ پیسے ایڈوانس دے دیتے۔ ہمیں بھی اس پر اعتراض اس لیے نہ ہوتا کہ قیمت اگرچہ کم ہے یا منافع کم ہے مگر رقم تو کیش میں مل رہی ہے، ڈلیوری بعد میں ہوتی رہے گی۔

> ۔۔۔ٹھیک ہے، آپ ادھار لے لیں، پھر وہ پوری سنجیدگی سے کہنے لگے: اگر میں آپ کے پیسے کھا جاؤں تو؟

یقیناً میاں صاحب کے ساتھ بزنس بڑا شاندار رہا۔ میں آج بھی ان سے محبت کرتا ہوں۔ ان کی اولاد ان کی بڑی فرمانبردار تھی۔ میری ان سے پہلی ملاقات حرم مکی میں ہوئی تھی۔

باب ملک فہد کے اندرونی حصے میں عصر کی نماز کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔

قدرے لمبا قد، خوبصورت سفید داڑھی، سفید رنگت، اجلا لباس، سر پر کپڑے کی ٹوپی، ماتھے پر محراب...... یہ تھے میاں الطاف حسین برخوردار یہ۔ فون پر تو ان سے درجنوں بار گفتگو ہو چکی تھی، مگر آج ملاقات بھی ہوگئی۔ ہم حرم ہی میں بیٹھ گئے، ان کی باتیں بڑی خوبصورت اور مزیدار تھیں، آدمی ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے کہا: میاں صاحب! اس سے پہلے کہ ہم بات کا آغاز کریں، میں ایک چیز کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا: میں مسلکاً اہل حدیث ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کو کسی اور سے آپ کو میرے متعلق علم ہو اور آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس پر نہایت مثبت ردعمل ظاہر کیا۔ میری تحسین فرمائی، اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا اور ہم مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ اپنے نئے منصوبوں میں سے میں نے ان کو جب صحیح بخاری ایک جلد میں لانے کے عزم کا بتایا تو انھوں نے فوراً دو ہزار نسخوں کا آرڈر دے دیا۔ میں نے نہایت کم قیمت بتائی تاکہ یہ کام ہو جائے۔ یقیناً ان کی موافقت سے مجھے بے حد خوشی ہوئی، میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: میاں صاحب! اس کی قیمت کب تک مل جائے گی؟ فرمانے لگے: ان شاء اللہ بہت جلد، جب میں پاکستان واپس جاؤں گا تو آپ کو قیمت مل جائیگی۔ پھر میری توقع سے بہت پہلے انھوں نے مطلوبہ رقم ہمیں ارسال کردی۔ ہم نے غالباً پانچ ہزار کی تعداد میں صحیح بخاری اٹلی سے طبع کروائی، لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دارالسلام کی ترقی کا ایک اور باب کھل گیا۔

ریاض میں علمی وادبی سرگرمیاں

مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان ایک طویل مدت سے مسلم لیگ ن کی حلیف چلی آرہی ہے، اس کے اسباب اور وجوہات کی تلاش میں جاؤں تو بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہوگی، میں مختصر طور پر یوں کہہ سکتا ہوں کہ جمعیت کی مرکزی مجلس شوریٰ کا یہی فیصلہ ہے، مگر میں ذاتی طور پر بعض تحفظات کے باوجود میاں نواز شریف اور ان کی پالیسیوں کو پسند کرتا ہوں۔ کسی بھی سیاسی جماعت کی تمام پالیسیوں سے اتفاق ممکن نہیں، اسلام سے بھی ہمیں یہی رہنمائی ملتی ہے کہ اگر پارٹی سربراہ مخالف اسلام ہے یا پارٹی پالیسی عوام یا اسلام کیخلاف ہے تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

مسلم لیگ بہرحال ایک نظریاتی جماعت ہے، میری نواز شریف سے پہلی ملاقات ان کے گھر میں ہوئی تھی۔ یہ ملاقات ایک وفد کے ہمراہ تھی جس کی سربراہی پروفیسر ساجد میر صاحب کررہے تھے۔ وفد میں میاں فضل حق (مرحوم) اور ایک سعودی عالم دین شیخ سعد المطرفی رحمہ اللہ بھی شامل تھے۔ ملاقات میاں صاحب کے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں ہوئی، اگلے دن انھوں نے ہمیں رات کے کھانے پر مدعو کیا، اس کھانے کی اہم بات مشروبات کی ٹرالی تھی جس پر انواع واقسام کے مشروبات سجے تھے، حتیٰ کہ گنے کا رس بھی

تھا۔ مہمان جس مشروب کی طرف اشارہ کرتا نوکر جلدی سے گلاس میں وہ مشروب پیش کر دیتا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا، میاں صاحب کے پہلی مرتبہ وزیر اعظم بننے کے بعد انھیں صدر غلام اسحاق خان نے برطرف کیا تھا اور غالباً وہ خاصے ناراض تھے۔ جب سیاسی لوگ ملاقات کریں تو اس میں سیاست کی بات ہوتی ہے۔ کھانے کے اختتام پر گاجر کا حلوہ پیش کیا گیا جو واقعی بڑا مزیدار تھا۔ میں نے ذرا تعریف کر دی تو کہنے لگے: اور کھائیں اور خوب کھائیں۔ بلکہ اپنے نوکر کو آواز دے کر پنجابی میں کہنے لگے: اوئے اوس امریکی صحافی نوں حلوہ ضرور کھلائیں جیہڑا باہر بیٹھا ہویا اے۔

میاں نواز شریف سے میری اگلی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی، وہ انھی دنوں پاکستان بدر ہو کر مکہ مکرمہ پہنچے تھے بلکہ جنرل پرویز مشرف کی قید سے آزاد ہوئے تھے۔ باب صفا کے باہر سرکاری پیلس ہے۔ وہ ان دنوں اسی میں مقیم تھے۔ ہم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس وقت ان کے خاندان کے تمام افراد یعنی ان کے والد میاں شریف صاحب، میاں شہباز شریف، ان کی اہلیہ اور بیٹے سمیت گھر کی تمام خواتین وہاں موجود تھیں۔ ہماری ملاقات ایک بڑے اور خوبصورت کمرے میں ہوئی۔ نواز شریف صاحب مضطرب تھے۔ کہنے لگے: مجاہد صاحب! آخر لوگ کب جنرل مشرف کے خلاف سڑکوں پر نکلیں گے؟ میں نے تسلی دی۔ جیل سے رہائی پر مبارک باد پیش کی۔ کھڑکی سے بیت اللہ کا خوبصورت منظر آنکھوں کے سامنے تھا، وہ بار بار کہتے تھے: مجاہد صاحب! میں تو جنت میں آ گیا ہوں۔ میں نے ان کے والد محترم سے بھی مصافحہ کیا اور پھر باتیں کرتے ہوئے ہم کھانے کے لیے ایک وسیع کمرے میں آ گئے۔ یہ شاہی مہمان خانہ تھا۔ میاں شہباز شریف صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا، مسلک اہل حدیث کے خلاف ان کے اس وقت

کے نظریات کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ میں نے ان کو رہائی پر مبارک باد دیتے ہوئے کہا: میاں صاحب! یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے آپ کو جیل سے نکالا اور مکہ مکرمہ میں توحید کی سرزمین پر لے آیا۔ یہ شہر توحید کا مرکز، منبع اور مہبطِ وحی ہے۔ اب آپ کے لیے مناسب وقت ہے کہ آپ مسلک اہلحدیث کو سمجھیں۔ ان کا جواب تھا: مجاہد صاحب! کتاب وسنت کے بغیر تو کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ اس موقع پر میاں حسین نواز بھی موجود تھے۔ ان کے نظریات بھی بڑے عمدہ تھے۔ خصوصاً عقیدہ توحید کے بارے میں انھوں نے نہایت پختہ اور عمدہ باتیں کیں۔

اس کے علاوہ میاں نواز شریف صاحب سے جدہ میں سرور پیلس میں کم از کم تین یا چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں جمعیت اہلحدیث جدہ کے احباب خصوصاً مختار عثمانی صاحب شامل رہے۔ دو ملاقاتیں پروفیسر ساجد میر صاحب کے ساتھ ہوئی تھیں۔

ریاض کے علمی وادبی حلقوں میں میرا اکثر اٹھنا بیٹھنا رہا۔ ریاض کی مسلم لیگ کے ساتھ تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے۔ ان لوگوں نے مجھے ہمیشہ بڑی عزت دی۔ میں جمعیت اہلحدیث کے نمائندے کی حیثیت سے پروگراموں میں شریک ہوتا۔ خطابت میری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ میں اعلیٰ درجے کا خطیب ہوں، مگر ریاض میں کوئی بہت اعلیٰ درجے کے خطباء اور سیاسی لوگ بھی نہیں ہیں۔ چند ایک شخصیات چھوڑ کر کوئی خاص خطیب نہیں ہیں۔ بہر حال تقاریب ہوتی رہتی ہیں، ان میں مجھے بھی شرکت کرنے اور گفتگو کا موقع ملتا ہے۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ میں پروگراموں میں شرکت کے لیے جاؤں تو خوب تیاری کے ساتھ جاؤں۔

ریاض کے سفارت خانہ پاکستان میں سال میں دو مرتبہ یوم کشمیر کے موضوع پر پروگرام

ہوتے ہیں۔ان میں اکثر میں ہی جمعیت اہلحدیث کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرتا۔تقریر کے لیے میں خوب تیاری کر کے مواد اکٹھا کرتا، الحمدللہ! تیاری اور محنت کے نتائج ہمیشہ اچھے ہی رہے۔

مسلم لیگ ریاض کے احباب ہمیشہ پروگراموں میں مجھے عزت بخشتے۔عموماً اسٹیج پر بٹھاتے۔ کتنی ہی مرتبہ ایسے ہوا کہ میں پروگرام میں تاخیر سے پہنچا تو انھوں نے اسٹیج پر علیحدہ کرسی لگوا کر مجھے خصوصی دعوت خطاب دی۔ ہر اہم پروگرام میں میری تقریر ہوتی ہے۔ میں اس کے لیے بطور خاص طارق چیمہ، قدرت اللہ چوہدری، نورالحسن تنویر، خالد چیمہ، چوہدری عاشق، رانا خادم حسین، رانا اکرم اور دیگر بہت سے اکابر کا نہایت شکرگزار ہوں۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں عبدالعزیز انجینئر کا نام نہ لکھوں کہ انھوں نے بھی مجھے ہمیشہ محبتوں سے نوازا۔ اگر میں ان پروگراموں کی تفصیل میں جاؤں تو یقیناً کئی صفحات درکار ہوں گے۔مگر یہ بات ضرور لکھوں گا کہ ریاض میں سیاسی، ادبی، علمی اور دینی جماعتوں کا ماحول بڑا عمدہ ہے۔سب لوگ نظریات کے اختلافات کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کرتے اور احترام سے پیش آتے ہیں۔

میرے جماعت اسلامی کے ساتھیوں سے بھی اچھے تعلقات ہیں۔ان کے اکابر ڈاکٹر آصف قریشی، رانا عبدالرؤف اور حافظ عبدالوحید فتح محمد کے ساتھ مجھے درجنوں پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا۔ اکٹھے تقاریر بھی کیں۔ ہمارا ماحول بہت اچھا اور دوستانہ ہے۔ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی ہے۔سبھی ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔

میرے مزاج میں سختی نہیں ہے۔میں اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے دیگر فرقوں اور

گروپوں کا احترام کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اسلام اور پاکستان سب سے اہم ہیں۔ میں بلاشبہ اپنے وطن سے بہت محبت کرتا ہوں، بلکہ میرے نزدیک 19 ویں صدی میں عالم اسلام کا سب سے بڑا کام پاکستان کا قیام ہے۔ میں پاکستان کے مخالفین کا واقعی سخت دشمن ہوں، مگر گفتگو کے دوران حتی الامکان دوسروں پر تنقید سے پرہیز کرتا ہوں۔ بعض اوقات کچھ الفاظ نکل بھی جاتے ہیں، مگر سب کا احترام کرتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ پیپلز پارٹی والوں نے ایک مرتبہ مجھے اپنے ایک پروگرام میں مدعو کیا۔ انھوں نے میری بڑی عزت کی۔ پروگرام میں کچھ دیر بعد ایک ذمہ دار میرے پاس آئے اور کہنے لگے: مجاہد صاحب! آج ہم نے پروگرام کے اختتام پر محفل موسیقی کا انتظام کیا تھا۔ اب آپ تشریف لائے ہیں تو آپ کے احترام میں اسے منسوخ کر دیا ہے۔ میں جلد ہی پروگرام سے چلا آیا۔ اللہ جانے انھوں نے اسے واقعی منسوخ کیا تھا یا محض مجھے خوش کیا تھا۔ بہر حال میرا حسن ظن یہی ہے کہ پیپلز پارٹی میں بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔

دارالسلام میں محترم سعید الدین مرحوم ایم کیو ایم کے زبردست کارکن تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کام میں بھی بے حد ایماندار تھے۔ وہ اہل حدیث تو نہ تھے، مگر جب بھی کوئی ایسی عبارت یا لفظ دیکھتے جو کتاب وسنت کے برعکس ہوتا تو فوراً مجھ سے رجوع کرتے اور میری رائے لیتے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو تصحیح کر دیتا۔ بصورت دیگر اسے علماء کے حوالے کر دیتا اور وہ ان کی رہنمائی میں اس کی تصحیح کر لیتے۔

سعید الدین صاحب سے ملکی حالات پر نوک جھونک چلتی رہتی۔ جناب الطاف بھائی کے حوالے سے بھی کھٹی میٹھی باتیں ہوتی رہتیں۔ کبھی میں ان سے موافقت کرتا اور کبھی مخالفت۔ اس دوران الطاف بھائی کی شادی ہوگئی۔ ریاض میں ان کا بہت بڑا ولیمہ ہوا،

جس میں ایم کیو ایم کے بہت سے کارکنوں نے شرکت کی۔ سعید الدین صاحب نے مجھ سے کہا: ہم لوگ گفٹ بھی لے کر جا رہے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ دارالسلام کی طرف سے بھی کوئی تحفہ جانا چاہیے۔ انھی دنوں اٹلی سے چار رنگوں میں بڑے خوبصورت قرآن کریم چھپ کر آئے تھے۔ میں نے ایک نسخہ لے کر اس پر اپنے ہاتھوں سے تحفہ من جانب دارالسلام لکھا اور سعید صاحب کے سپرد کر دیا کہ وہ میری طرف سے منتظمین سے کہیں کہ اسے الطاف حسین صاحب تک پہنچا دیں۔

دو تین دنوں کے بعد رپورٹ ملی کہ ولیمہ کی تقریب رات گئے تک جاری رہی اور اس میں بے شمار تحائف پیش کیے گئے۔ منتظمین نے الطاف بھائی کو رپورٹ دی کہ بے شمار تحائف ہیں ان میں ایک قرآن کریم کا تحفہ بھی ہے۔ انھوں نے کہا: جتنے بھی تحفے ہیں سب کو فقراء اور کارکنان میں تقسیم کر دیا جائے، البتہ قرآن کریم کا تحفہ لندن بھجوا دیا جائے۔

ایم کیو ایم کے رؤف صدیقی صاحب ایک عام سے کارکن تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ صوبائی وزیر داخلہ بنے پھر وہ صوبائی وزیر صنعت و تجارت سمیت دیگر اہم مناصب پر فائز رہے۔ میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات رہے۔ ان کے ساتھ کئی قومی پروگراموں میں اکٹھے تقاریر کا بھی موقع ملا۔ جب انھوں نے اپنی کتاب ''تاریخ بیت اللہ'' کی تقریب رونمائی کی تو باصرار مجھے کراچی آنے کی دعوت دی۔ جمعیت اہلحدیث سندھ کے اکابر کے ساتھ رابطے کے بعد میں نے بھی اس تقریب میں شرکت کی اور خطاب بھی کیا۔ یہ کتاب دارالسلام میں ڈیزائن ہوئی تھی۔

جب دارالسلام کراچی برانچ کا افتتاح ہوا تو رؤف صدیقی صاحب نے بھی اس میں شرکت کی۔ وہ اس وقت وزیر داخلہ تھے۔ پورے پروٹوکول کے ساتھ تشریف لائے۔ اس

پروگرام میں ہمارے سابقہ سفیر جناب شاہد امین صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ شاہد امین صاحب کا نام آیا ہے تو ان کے حوالے سے ایک واقعہ ذہن میں آ گیا ہے۔ یہ نہایت قابل اور زیرک سفیر تھے۔ صحیح طور پر ایک پروفیشنل سفیر، جس پر قوم کو فخر ہونا چاہیے۔

سعودی عرب میں جو بھی سفیر آتا ہے، میں ایک وفد کے ہمراہ اس سے ملاقات کرتا ہوں۔ اس سے جمعیت اہلحدیث اور دارالسلام کا تعارف کرواتا ہوں۔ شاہد امین صاحب نے ہمارے متعدد پروگراموں میں شرکت کی تھی۔ اس دور میں ہم نے انگریزی ترجمے کے ساتھ پاکٹ سائز نوبل قرآن ہالینڈ سے شائع کیا تھا۔ اس کی بڑی شہرت تھی، انھوں نے ہم سے متعدد نسخے خرید کر مختلف شخصیات کو ارسال کیے، جن میں مرحومہ بے نظیر بھٹو صاحبہ بھی شامل تھیں۔ ایک دن میں کسی کام سے شاہد امین صاحب سے ملنے گیا۔ ان کے ساتھ اس وقت صرف میں ہی بیٹھا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہ تھا۔ اچانک مجھ سے کہنے لگے: مجاہد صاحب! آپ دوست اور بھائی ہیں۔ میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ ہر چند کہ اسے عام نہیں کرنا چاہیے، مگر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کو دکھا دی جائے۔ وہ دوسرے کمرے میں گئے اور ایک فائل دراز سے نکال لائے اور اس میں سے ایک خط نکال کر مجھے پڑھ کر سنانے لگے۔

یہ خط محترمہ بے نظیر صاحبہ نے سفیر پاکستان کے نام لکھا تھا جس میں انھوں نے نوبل قرآن کی بے حد تعریف کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پاکٹ سائز قرآن اس لیے بھی مفید ہے کہ میں اسے سفر کے دوران پرس میں رکھتی ہوں اور اس کو پڑھ سکتی ہوں۔ انھوں نے آصف زرداری اور اپنے حوالے سے لکھا: یہ بیش قیمت تحفہ ہے جو آپ نے مجھے ارسال کیا ہے۔ میں نے انگلش میں لکھے ہوئے اس خط کو خود بھی پڑھا۔ اس کے مندرجات سے

بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محترمہ نے خود لکھا تھا۔ یہ سیکرٹری کا ڈرافٹ کردہ نہیں تھا بہر حال یہ بات میرے لیے باعث اطمینان ہے کہ دارالسلام کی کتب مقتدر حلقوں تک پہنچی ہیں اور پہنچ رہی ہیں۔

آخرت کے حوالے سے سب لوگوں کے معاملات اللہ کے پاس ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے یہ اس کی مرضی ہے۔ ایک دن نجانے مجھے ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے خیال آیا کہ اس شخص کے ساتھ ہماری زندگی مخالفت میں گزری ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا، مگر اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک چھنا کا ہوا کہ تم کسی کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو؟! قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت بھی تو بھٹو صاحب ہی نے قرار دیا تھا۔ بعد میں مجھے ایک ثقہ شخص نے بتایا کہ بھٹو صاحب نے اپنے دور میں قرآن کریم کا نہایت خوبصورت نسخہ چھپوایا تھا، اس میں کاغذ کی عمر ایک سو سال سے زیادہ تھی اور یہ 4 کلر میں تھا۔

ریاض میں پیپلز پارٹی کے عام وخاص کارکنان سے میرے ذاتی تعلقات ہیں۔ ہم مختلف مجالس میں ملتے اور اکٹھے بیٹھتے ہیں، باہم اختلاف بھی کرتے ہیں، ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے ہیں، مگر اس سب کچھ کے باوجود دل آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ جناب اصغر قریشی صاحب اور جناب ریاض راٹھور کے ساتھ ذاتی تعلقات ہیں۔ شمشاد علی صدیقی صاحب بھی ریاض کی جانی پہچانی شخصیت اور مجالس کی جان ہیں۔ ایک زمانے میں وہ روزنامہ جنگ کے لیے رپورٹنگ کرتے تھے۔ اب بہت بڑے بزنس مین ہیں، روشن خیال ہیں مگر مذہبی بھی بہت ہیں۔ عقیدہ اچھا ہے، سیاسی طور پر ایم کیو ایم کے ذمہ دار ہیں، نہایت ہی فہمیدہ انسان ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک دن ہم لوگ ان کے گھر میں

عشائیہ پر مدعو تھے، پاکستان کی ایک اہم شخصیت اور میں ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ دیگر میزوں پر بھی معززین شہر کھانا تناول فرما رہے تھے۔ یہاں دوران گفتگو بھٹو صاحب کا ذکر چل نکلا، قادیانیت کے حوالے سے بہرحال ان کا یہ فیصلہ خواہ علماء اور دینی جماعتوں کی طرف سے شدید ردعمل اور احتجاج کے بعد ہوا، تاہم یہ ایک کارنامہ ہے جس کا کریڈٹ انھیں ملنا چاہیے۔

شرکائے محفل میں سے ایک صاحب نے اس موقع پر ایک مختصر سا واقعہ سنایا، کہنے لگے: جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا تو بھٹو صاحب نے اس وقت کے قادیانیوں کے سربراہ مسٹر ناصر احمد کو اسلام آباد طلب کیا، ملاقات میں وہ ناصر احمد سے کہنے لگے: دیکھو مرزا! میں کوئی مذہبی اسکالر نہیں ہوں، میں نے ان مولویوں کے بے حد اصرار اور احتجاج پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے، مگر یار ناصر احمد ایک بات تو بتاؤ؟ یہ باسٹرڈ Bastard (حرام زادہ) غلام احمد کیا واقعی اللہ کا نبی تھا؟ ان کا یہ کہنا تھا کہ ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔

میرے لیے یہ باعث فخر ہے کہ دارالسلام میں مختلف جماعتوں کے قائدین اور زعماء تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو مہمانان گرامی تشریف لائے، انھوں نے بڑی محبت سے دارالسلام کے کام کو دیکھا اور مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات بھی درج کیے، جماعت اسلامی کے سابق امیر محترم قاضی حسین احمد صاحب، مولانا فتح محمد، حافظ محمد ادریس، نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ اور دیگر بڑی بڑی شخصیات دارالسلام کے صدر دفتر ریاض میں تشریف لائیں، ہم نے بھی ان کی خوب عزت افزائی کی اور انھوں نے بھی اپنی محبتوں سے نوازا، پاکستان کا دل کہلانے والے لاہور شہر میں موجود دارالسلام کے دفتر میں

بھی جماعت اسلامی کے رہنما محترم لیاقت بلوچ سمیت بڑی بڑی شخصیات تشریف لا چکی ہیں، ریاض کے احباب جماعت تو متعدد مرتبہ تشریف لائے اور لاتے رہتے ہیں۔

جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہنما جناب حافظ حسین احمد صاحب ریاض میں دارالسلام کے مرکزی دفتر تشریف لا چکے ہیں، یہ بڑے مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک ہیں، بات بات پر ہنستے ہنساتے اور چٹکلے چھوڑتے رہتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ ریاض تشریف لائے اس وقت ایم ایم اے کا پلیٹ فارم موجود تھا، صوبہ سرحد میں ان کی حکومت تھی۔ میرے لیے یہ بات باعث شرف ہے کہ انھوں نے مجھے پیش کش کی کہ ریاض میں ہم آپ کو ایم ایم اے کا ذمہ دار بنانا چاہتے ہیں اور ان کے بقول آپ کی قیادت میں ہم کام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے عرض کی: آپ کی محبت اور پیش کش کا میں شکر گزار ہوں اور یہ میرے لیے اعزاز ہے کہ آپ نے مجھے سعودی عرب میں ایم ایم اے کے صدر کے عہدے کی پیش کش کی ہے، مگر چونکہ اس ملک کے قوانین اس قسم کی تنظیم سازی کی اجازت نہیں دیتے اس لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے کہنے لگے: ہم تو مجاہد صاحب کی مہمان نوازی سے بھی لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ میں نے ان کے اعزاز میں لاثانی ریسٹورنٹ میں ایک خوبصورت عشائیہ کا اہتمام کیا، جس میں مختلف جماعتوں کے 80 سے زائد افراد نے شرکت کی، آپ اسے ریاض میں مختلف جماعتوں کے آپس میں تعلق اور قربت کی ایک مثال قرار دے سکتے ہیں۔

میں اگر اس قسم کے واقعات کو لکھنا شروع کر دوں تو اس کے لیے بیسیوں صفحات درکار ہیں، بہر حال میرا ایک طریقہ کار ہے کہ میرے پاس کسی بھی قوم کا زعیم آ جاتا ہے تو اس کی عزت اور احترام کرتا ہوں۔ انھیں کتابیں تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں، ان کے ساتھ بیٹھتا

ہوں، ان کی سنتا اور اپنی سناتا ہوں، اس تبادلہ خیالات میں کسی قسم کا تعصب شامل نہیں ہوتا۔ میرے نزدیک مذہبی تعصب اور غیر ضروری تشدد نے اسلام اور پاکستان کو بے حد نقصان پہنچایا ہے، مگر میرے اس لچک دار اور مثبت رویے نے مجھے مختلف پلیٹ فارمز پر اپنی بات کہنے کا موقع دیا ہے۔

مسلم لیگ (ن) کے ایک نہایت سرگرم کارکن نورالحسن تنویر ہمارے بڑے پیارے دوست ہیں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت انس اور محبت ہے۔ جب ڈنمارک کے اخبار نے اللہ کے رسول ﷺ کے خاکے شائع کرنے کی ناپاک جسارت کی تو ریاض میں سب سے پہلے جمعیت اہل حدیث نے احتجاجی پروگرام کیا۔ اس کے بعد ہر مکتبہ فکر نے احتجاجی پروگرام ترتیب دیے، جن میں الحمد للہ! راقم الحروف کو بھی اپنے خیالات پیش کرنے کا بھرپور موقع ملا، جب مسلم لیگ (ن) نے پروگرام کیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر مفصل خطاب کیا۔ پروگرام کے اختتام پر نورالحسن تنویر نے مجھے گلے لگا لیا اور کہنے لگے: مجاہد صاحب! ہم آپ لوگوں کے بارے میں غلط فہمی ہی میں رہے، آپ نے جو تقریر یہاں کی ہے میں یہی تقریر آپ سے دبئی میں سننا چاہتا ہوں، پھر انھوں نے دارالسلام سے خاصی کتب خریدیں اور ان کے گھر والوں نے ان کتب کا بغور مطالعہ کیا۔

ریاض کی ایک اور معروف شخصیت جن سے مجھے اور ان کو مجھ سے بہت پیار ہے، وہ ڈاکٹر محمود احمد باجوہ ہیں، وہ ریاض کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ایک زمانے میں بڑے پکے بریلوی تھے، سعودی عرب کا دینی علمی ماحول بڑا اعمدہ ہے۔ باجوہ صاحب ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب اور راقم کے بعض پروگراموں میں شرکت کرتے رہے، الحمد للہ! ان کا عقیدہ

یکسر تبدیل ہوگیا اور وہ متبع قرآن وسنت بن گئے۔ ریاض کے ہر بڑے پروگرام میں شرکت کرتے ہیں، اپنے تبصرے کا حق بھی محفوظ رکھتے ہیں، میرے نزدیک ان کی بہت بڑی خوبی اسلام اور پاکستان کے ساتھ شدید محبت ہے۔ میں ان سے سیاسی اور ادبی تقاریب میں سیاست کے حوالے سے تبادلہ خیال کرتا رہتا ہوں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں جناب ڈاکٹر ریاض خواجہ اور ان کے صاحبزادوں جناب کاشف خواجہ اور عاطف خواجہ کا ذکر نہ کروں، ریاض خواجہ صاحب پاکستان ڈاکٹرز گروپ ریاض کے روح رواں ہیں۔ کوئی بھی علمی، سیاسی، سماجی یا دینی تقریب ہو اس میں ان کی شرکت اس تقریب کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے۔ ہمارے پورے گھرانے سے ان کے تعلقات قابل رشک ہیں، یہ عرف عام میں میرے مفت کے معالج بھی ہیں، کوئی بھی عارضہ ہو ڈاکٹر صاحب کو فون کرتے ہیں: جی ڈاکٹر صاحب! فلاں مرض ہے، کون سا ڈاکٹر اس کے علاج کے لیے اچھا رہے گا؟ وہ چند لمحات میں مجھے نہ صرف ڈاکٹر کا نام بتا دیں گے، بلکہ اس کا نمبر اور بڑی حد تک اس سے اپوائنٹ منٹ بھی لے دیں گے۔

جہاں تک کاشف خواجہ صاحب کا تعلق ہے، وہ ہمارے ساتھ دارالسلام قرآن پرنٹنگ کمپلیکس کے منصوبہ میں شریک ہیں۔ ایک خطیر مبلغ انھوں نے اس کے لیے ادا کیا ہے۔ ان شاء اللہ! یہ منصوبہ ان کی باقیات صالحات میں سے ہے۔ کاشف صاحب نہایت خوبصورت، سمجھ دار، ذہین وفطین اور معاملہ فہم ہیں۔ بہت عمدہ اور قیمتی مشورے دیتے ہیں۔

ایک دو شخصیتوں کا ذکر کر کے میں مضمون کو ختم کروں گا کہ جن کا نام آجائے گا یا جن کے بارے میں لکھوں گا وہ تو مجھ سے خوش ہو جائیں گے اور جن کا ذکر نہ آئے گا وہ یہ سمجھیں

گے کہ مجاہد صاحب نے ہمیں درخور اعتنا نہیں سمجھا، حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ریاض میں رہتے ہوئے مجھے 33 سال ہو چکے ہیں، ایک عمر ہے جو بیت چکی ہے، بہت کم لوگوں سے میرا کبھی الجھاؤ ہوا، اگر کسی سے اختلاف کیا بھی تو اس میں حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں کسی کے بارے میں ریمارکس دینے لگتا ہوں تو میری زبان رک جاتی ہے، میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: عبدالمالک! تمھاری زبان سے نکلی ہوئی بات کسی عام شخص کی بات نہیں ہے، تمھیں سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگی۔ یہ سوچ لو کہ تمھاری اچھی بات تو دوسروں تک نہیں پہنچائی جائے گی مگر غلط یا نامناسب بات ضرور پہنچائی جائے گی، بلکہ مرچ مصالحہ لگا کر پہنچائی جائے گی، اس لیے واقعی میں نہایت مناسب انداز میں تبصرہ کرتا ہوں۔ دارالسلام کے موظفین کے بارے میں بھی مجھے اندازہ ہوا کہ بعض اوقات مذاق میں کوئی بات زبان سے نکال دیتا تو وہ ضابطہ اخلاق بن جاتا، ایک قانون بن جاتا۔ ساتھی اس کو بڑی اہمیت دیتے کہ مجاہد صاحب نے یوں کہا ہے، یا فلاں جگہ ان کا یہ کہنا تھا۔ اب میں کوشش کرتا ہوں کہ پہلے تو لو پھر بولو، شاید یہی وجہ ہے کہ میرے مخالفین بہت کم ہیں، میں نے اپنے مخالفین کو اپنے اچھے اخلاق سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے، میرا ایک مقولہ ہے: ''اپنے کم سے کم مخالفین پیدا کرو۔''

الحمد للہ! مجھے کسی کے ساتھ کوئی حسد یا بغض نہیں ہے، میں اپنے کام سے غرض رکھتا ہوں، مجھے کسی کے بارے میں سوچنے کا وقت کم ہی ملتا ہے۔ الحمد للہ! میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ ریاض میں میرا سب سے اچھا دوست کون ہے؟ تو میرا جواب ہوگا: عابد الٰہی کے علاوہ کوئی خاص نہیں، مگر سب لوگوں کے ساتھ میرے تعلقات اچھے ہیں، میں سب سے دلی محبت اور سب کا

احترام کرتا ہوں، جو میرے نظریات کے مخالف لوگ ہیں ان کے ساتھ بھی محض ایک حد تک ہی مخالفت کا قائل ہوں۔

جناب حافظ عابد الٰہی صاحب اب تو میرے سمدھی ہیں۔ مگر مجھے نجانے اس شخص سے کیوں شروع دن سے پیار ہے۔ مجھے علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ سے شدید محبت تھی۔ ہم انھیں عصر حاضر کے قائدین میں رول ماڈل سمجھتے تھے۔ ان کی تقاریر سنتے تو ان کے سحر میں ڈوب جاتے۔ علامہ صاحب کی وجہ سے عابد الٰہی صاحب سے رابطہ ہوا، ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں انھیں کھینچ کھینچ کر پروگراموں میں لے جاتا، انھیں دعوتی کاموں کے لیے تیار کرتا رہتا، تاہم جب ہم کسی پروگرام میں شریک ہوتے تو بڑی شان سے شریک ہوتے۔ عابد الٰہی بہت زبردست مقرر ہیں، حافظ قرآن ہیں، انھیں قرآن کریم سے خوب محبت ہے۔ ہر سال بڑے اہتمام سے تراویح کی نماز پڑھاتے ہیں۔ کاروبار کرتے ہیں تو وہ بھی بہت خوب کرتے ہیں۔

بولتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ علامہ صاحب کا بھائی بول رہا ہے۔ ہماری اکثر ملاقاتیں ریاض کے طلیلطہ ریسٹورنٹ میں ہوتیں، ہم دونوں وہاں تکے کباب کھاتے اوران کی دال کے مزے لیتے، تبادلہ خیال کرتے۔ ان ملاقاتوں کے بعد محبتوں میں اور اضافہ ہو جاتا۔ بڑے دیندار اور پکے اکل کھرے اہل حدیث ہیں۔ مسلک کے معاملہ میں کسی مداہنت سے کام نہیں لیتے۔ اپنے والد گرامی کی بہت ساری عادات اور خصائل کے امین ہیں۔ لمبی لمبی دعائیں مانگتے ہیں۔ میں اکثر ان سے کہتا ہوں: حافظ صاحب! میں آپ کی دعاؤں جیسی لمبی دعاؤں کا تصور نہیں کرسکتا۔

■ مسجد کے دروازوں سے طلبا یوں کشاں کشاں
داخل ہو رہے ہیں گویا پروانے شمع کی تلاش میں آ رہے ہیں۔
■ شیخ نے فوراً سر اوپر اٹھایا،
طالب علم نے حدیث پڑھنا بند کر دی

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ

یہ دسمبر 1994ء کی ایک جمعرات کی صبح تھی، مجھے فجر کی نماز ریاض کی سب سے بڑی مسجد جامع الامام ترکی بن عبداللہ، جو دیرہ والی مسجد کے طور پر مشہور ہے، میں ادا کرنا تھی۔ فجر کی نماز ادا ہوئی تو عالم اسلام کی نامور شخصیت سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ نے درس دینا شروع کیا۔ دلوں میں اترنے والا درس ہے، حاضرین ہمہ تن گوش ہیں، شیخ قرآن پاک کی آیات پڑھ رہے ہیں، حدیث شریف سے استدلال ہو رہا ہے، حاضری دم بدم بڑھ رہی ہے، میری نگاہیں دروازوں کی طرف اٹھ رہی ہیں، طلبا گروہ در گروہ کتابیں اٹھائے مسجد میں داخل ہو رہے ہیں۔

پندرہ بیس منٹ کا یہ درس ختم ہوا ہے، اب طلبا کے ہجوم میں کافی اضافہ ہو چکا ہے۔ دس منٹ کے وقفے میں شیخ کے اردگرد بے شمار طلبا کا ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ مسجد کے دروازوں سے طلبا یوں کشاں کشاں داخل ہو رہے ہیں گویا پروانے شمع کی تلاش میں آ رہے ہیں۔ اچانک شیخ ابن باز رحمہ اللہ اپنی مسند پر تشریف لاتے ہیں۔ حاضرین پر سناٹا طاری ہو جاتا

ہے، طلبا نے صحیح بخاری کھول لی ہے۔ ایک طالب علم نے حدیث پڑھنا شروع کی۔ شیخ سماعت فرما رہے ہیں، حاضرین کی نگاہیں بدستور کتب پر ہیں۔ کہیں زیر زبر کی غلطی ہوگئی۔ شیخ نے فوراً سر اوپر اٹھایا، طالب علم نے حدیث پڑھنا بند کر دی، شیخ نے اصلاح کی اور پھر اس حدیث کی شرح بیان ہونا شروع ہوگئی۔

شیخ علم کے دریا بہا رہے ہیں، اب طلبا کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ شرکائے درس میں بڑے بڑے علماء، مدرس، پروفیسرز اور یونیورسٹی کے اساتذہ شامل ہیں، ان کے ہاتھوں میں قلم، سامنے صحیح بخاری کا نسخہ اور لکھنے کے لیے کاغذ ہیں۔ دھڑا دھڑ نوٹ لیے جا رہے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک درس جاری رہتا ہے اور شیخ فرماتے ہیں: حَسْبُكَ! یعنی بس کافی ہے۔ اب دوسرا شاگرد مائیک سنبھال لیتا ہے۔ اب صحیح مسلم کا درس شروع ہوگیا، احادیث پڑھی جا رہی ہیں، شیخ ابن باز رحمہ اللہ جہاں ضروری ہو تشریح فرما رہے ہیں۔

اب تفسیر ابن کثیر کی باری ہے۔ عبارت پڑھنے والا شاگرد بدل گیا ہے، مگر استاذ وہی ہے۔ وہ اپنی جگہ پر، اپنی مسند پر براجمان ہیں۔ میں ورطۂ حیرت میں ڈوبا ہوا ہوں، میں نے تاریخ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگردوں کا حال پڑھا تھا، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی تاریخ پڑھی تھی، ان کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں: حد نگاہ تک چاروں طرف ہجوم، طالبان حق مسجد میں پھیلے ہوئے ہیں جو ریاض کے کونے کونے سے تشریف لائے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر کا دور بھی ختم ہوتا ہے۔ اب امام ابن القیم رحمہ اللہ کی کتاب 'زاد المعاد' سامنے ہے، پڑھنے والا جہاں کہیں غلطی کرتا ہے شیخ فوراً ٹوکتے ہیں۔

میں دوڑتا ہوا گیا، ڈاکٹر محسن خان نے مجھے اشارہ کیا کہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ میں شیخ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

اب باری جامع ترمذی کی ہے، احادیث کا دور ہو رہا ہے، سننے والے علم وعرفان کے موتی اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد سنن ابی داود کی باری ہے، پھر صرف و نحو کا دور چلنے والا ہے، علم کی بارش ہو رہی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ سلسلہ بارہ برس سے جاری ہے، ہر جمعرات کو یہ سلسلہ ہوتا ہے، لوگ دور دور سے بطور خاص درس میں شرکت کے لیے آتے ہیں، یقیناً علمائے سلف کا یہی طریق رہا ہے، وہ علم کی مجالس میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں اور ان کا سارا سارا دن حدیث پڑھنے پڑھانے میں گزر جاتا ہے۔

اب میں تصور کی آنکھ سے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کو دیکھ رہا ہوں، بڑے بڑے علماء دیکھے، مگر قارئین کرام! عصر حاضر میں ان جیسا عالم دین، محقق، محدث اور مفتی دیکھا نہ سنا، میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں جتنا فائدہ اسلام کو شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے پہنچا، شاید ہی کسی اور سے پہنچا ہو۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا قیام اور اس کے فاضلین کا دنیا بھر میں توحید کی دعوت لے کر پھیل جانا شیخ کے بڑے کارناموں میں سے ایک ہے۔ بلاشبہ شیخ اس دور میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں، شیخ کی عمر 85 سال سے تجاوز کر چکی تھی، مگر اس عمر میں بھی وہ خلق خدا کو اپنے علم اور اخلاق سے مسلسل فائدہ پہنچا رہے تھے۔

شیخ صاحب سے ملنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ذرا دل میں آیا اور شیخ صاحب کی مسجد کے امام قاری حافظ محمد الیاس صاحب کو فون کر دیا۔ بس ملاقات ہی نہیں کھانے کی دعوت بھی

مل گئی۔ الحمدللہ! نجانے کتنی بار اس ناچیز کو شیخ کے دستر خوان پر طعام سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا ہے، مگر کبھی کبھی ذات باری تعالیٰ زیادہ ہی مہربان ہو جاتی ہے۔

جب میں یہ مضمون لکھ رہا تھا اس سے دو سال قبل 1413 ہجری کی بات ہے، میں نے ''دی نوبل قرآن'' کے نام سے انگلش زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ شائع کیا تو اس کے مترجم فضیلۃ الدکتور محمد محسن خان صاحب کے ساتھ جا کر سماحۃ الشیخ کی خدمت میں ایک نسخہ پیش کیا۔ شیخ صاحب نے تحسین فرمائی اور ارشاد ہوا: کل دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہوگا۔ میری خوش قسمتی کہ نام لے کر فرمایا: ''عبدالمالک بھی آئے۔'' اگلے دن حسب پروگرام دو بجے ہم ان کے گھر پہنچے، ان کے ہاں عموماً بیرون ملک سے وفود آئے ہوتے ہیں، مگر یہ حسن اتفاق تھا کہ اس روز مہمان کچھ زیادہ نہ تھے۔

دستر خوان پر بیٹھے، کھانا شروع ہوا تو اچانک شیخ نے مجھ سے نشر و اشاعت سے متعلق سوالات شروع کر دیے۔ اب کھانا کس کو سوجھے! عصر حاضر کے سب سے بڑے امام، مفتی، عالم دین اور ولی کامل مجھ جیسے عام شخص سے سوال کر رہے ہیں۔ مجھے حیرت انگیز خوشی ہو رہی ہے کہ شیخ کو نشر و اشاعت کی تمام تر جزئیات کا علم ہے۔ میں آہستہ آہستہ جواب دے رہا ہوں۔ کون کون سی کتب شائع کی ہیں؟ کہاں کہاں پہنچ گئی ہیں؟ تصحیح کا کیا انتظام ہے؟ کاغذ کیسا لگایا ہے؟ تجلید کیسی ہے؟ کون کون سی کتب ہیں جن کا ترجمہ ہو چکا ہے؟ کھانے کا بیشتر وقت مجھ سے سوال و جواب میں گزر گیا۔ شیخ خود بے حد کم کھانا کھاتے ہیں، ڈاکٹر محسن خان صاحب سوالات کے جوابات میں حسب ضرورت میری مدد فرما رہے ہیں۔ شیخ نے کھانا مکمل کیا اور ہمیں حکم دیا کہ تم لوگ کھانا کھا لو، یہ ان کی عادت ہے۔ میں نے ابھی کھانا شروع ہی کیا تھا کہ شیخ کا خادم خاص دوڑتا ہوا آیا، وہ آواز لگا رہا ہے:

یاعبدالما لک! یاعبدالما لک!

میں نے اس کی طرف دیکھا، کہنے لگا: شیخ تمھیں یاد فرما رہے ہیں۔

میں دوڑتا ہوا گیا، ڈاکٹر محسن خان نے مجھے اشارہ کیا کہ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔ میں شیخ کے قدموں میں بیٹھ گیا، اب شیخ نے بہت محبت اور شفقت سے مجھے نصیحتیں کرنا شروع کیں۔ فلاں فلاں کتب چھاپنا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا۔ شرح عقیدہ واسطیہ کے بارے میں فرمایا: یہ نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اب دست شفقت میرے سر پر ہے، میں التجا کرتا ہوں کہ شیخ میرے لیے دعا فرمائیں، ڈاکٹر محسن خان میری سفارش کر رہے ہیں اور پھر اس ولی کامل نے اس گناہ گار کو بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ میں اخلاص فی العمل کی توفیق کے لیے التجا کرتا ہوں، وہ بار بار فرما رہے ہیں: «نَفَعَ اللّٰهُ بِكَ الْمُسْلِمِينَ» ''اللہ تمھیں صحیح کتب شائع کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ تجھ سے عالم اسلام کو فائدہ پہنچائے۔'' میری آنکھوں میں آنسو ہیں، تشکر کے آنسو، آج واقعی میرا رب مجھ پر بڑا مہربان ہے کہ اس کے خاص بندے نے میرے لیے بہت دعائیں فرمائی ہیں اور آج جب میں اپنے کام کی طرف نظر ڈالتا ہوں تو اس ولی کامل کی دعاؤں کی استجابت کے آثار نظر آتے ہیں۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ نابینا تھے، مگر ہزاروں لاکھوں بینا ان کے جوتے اٹھانے میں اپنے لیے فخر محسوس کرتے تھے۔

ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ کا درس بخاری

محترم ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ سے تعلقات اور واقفیت سعودی عرب آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوگئی تھی، میں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کی وجہ سے اس گھرانے سے خاصا متاثر تھا۔ ان کے ہاں آنا جانا اور میل ملاقات جاری رہی، مگر اصل اور حقیقی تعلقات کے سنہرے ایام وہ تھے جب انھوں نے ریاض میں حی الوزارات کی مسجد شلوی میں درس بخاری دینا شروع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی اپنی ایک منفرد شخصیت ہے۔ ان میں وجاہت، علم، تقویٰ اور صداقت ہے، اس لیے بہت جلد ان کے درس کا چرچا ہوگیا، درس جمعرات کو مغرب کی نماز کے فوراً بعد شروع ہوتا اور عشاء کی اذان بلکہ بعض اوقات عشاء کی جماعت کھڑی ہونے تک جاری رہتا۔ گیلری میں خواتین کے لیے بھی درس سننے کا انتظام ہوتا تھا۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ میں ان کے قریبی شاگردوں میں سے ایک تھا، انھی دنوں میں نے عربی زبان میں دار ابن کثیر دمشق کی شائع شدہ صحیح بخاری کا ایک نسخہ خریدا تھا۔ بلاشبہ یہ نسخہ بڑا خوبصورت چھپا ہوا تھا، اس میں سند اور متن پر اعراب لگے ہوئے تھے، موٹے موٹے حروف تھے، نماز مغرب جیسے ہی ختم ہوتی ہم ساتھی مائیک کی طرف بھاگتے، اسے سیدھا کرتے، ساتھی دائرے میں بیٹھتے جاتے، اکثر ساتھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ

آیا کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب درس شروع کرتے، خطبہ مسنونہ پڑھتے اور پھر عموماً مجھے یا محترم ڈاکٹر امیر بخش چنا صاحب کو حکم ہوتا کہ پڑھیے۔ہم دونوں اس کے لیے تیار ہوتے، بالکل محدثین کی طرز پر یہ درس ہوتا، ڈاکٹر صاحب پھر اس حدیث کو دہراتے، ان کا رعب بہت زیادہ تھا، کبھی ان سے ڈرتے بھی تھے، مگر اس کے ساتھ وہ ہم سے اور ہم ان سے شدید محبت بھی کیا کرتے تھے۔اگر زیر زبر میں غلطی ہو جاتی تو اس کی اصلاح فرماتے، کبھی کبھار فرماتے کہ مطالعہ کر کے آیا کریں، جس کسی کو عبارت پڑھنے کا حکم ملتا وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا، اگرچہ میں نے دینی تعلیم پڑھ رکھی تھی، پھر بھی عبارت پڑھتے ہوئے گھبراہٹ ہوتی کہ کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔جس روز غلطی نہ ہوتی دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا، ڈاکٹر صاحب دوبارہ اس حدیث کو پڑھتے، مشکل الفاظ کے معانی بتاتے، پھر ترجمہ بیان کرتے اور اس کے بعد مختصر مگر جامع تشریح بیان کرتے، شاگردوں کی تعداد بعض اوقات دو سو سے اڑھائی سو تک بھی ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب علم کے موتی رولتے، قرآن وحدیث سے استدلال کرتے، علمی نکات بیان ہوتے، سند اور متن کے علاوہ راوی حدیث پر خوب تبصرہ کرتے، بعض اوقات راوی حدیث کے تفصیلی حالات زندگی بیان کرتے۔دونوں نمازوں کے درمیان وقفہ کم وبیش سوا سے ڈیڑھ گھنٹے کا ہوتا تھا، وقت کا پتا ہی نہ چلتا اور عشاء کا وقت ہو جاتا۔الحمدللہ! جتنے بھی حاضرین ہوتے وہ درس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، ہمیں اس بات کا قلق ہوتا کہ وقت کتنی جلدی ختم ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ اس درس کی خوب تیاری کر کے آتے تھے، آہستہ آہستہ درس کی خوشبو ریاض شہر میں پھیلتی چلی گئی اور شہر کے مختلف حصوں سے ساتھی کشاں کشاں درس میں شرکت کے لیے آنے لگے۔

میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں نے شروع دن سے تہیہ کر لیا تھا کہ درس میں کسی صورت ناغہ نہیں ہونے دوں گا، ہمارا پروگرام ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہوتا تھا، ہم نے عمرہ پر مکہ مکرمہ جانا ہو یا مدینہ منورہ کی زیارت کی خواہش ہو تو ان دنوں میں جاتے جب ڈاکٹر صاحب پاکستان گئے ہوتے، یا خود عمرہ پر تشریف لے جاتے۔اس کے علاوہ ایک صورت یہ ہوتی کہ ہم جمعرات یا جمعہ کے علاوہ دوسرے دنوں میں عمرہ پر چلے جایا کرتے۔

مسجد میں چونکہ خواتین کے لیے بھی پردہ میں درس کا انتظام ہوتا اس لیے میری اہلیہ انیسہ بھی باقاعدگی سے دروس میں شرکت کرتی تھیں۔ میں اگر یہ دعویٰ کروں کہ غالباً اس درس سے سب سے زیادہ فائدہ ہم دونوں میاں بیوی نے اٹھایا ہے تو اس میں شاید مبالغہ نہ ہو، ہم دونوں درس سے واپس آتے تو درس کے نکات پر تبادلہ خیال کرتے۔

ان دروس میں ہم نے صحیح بخاری کا جہاں بہت سا حصہ پڑھا اور احادیث رسول ﷺ کو سمجھا، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور ابھی تک ان کے بعض نکات یاد ہیں مگر اس دوران ہماری تربیت بہت زیادہ ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اپنے گھر کی قریبی مسجد میں قرآن کریم کے ترجمہ کا بھی سبق پڑھانا شروع کیا، میں اس درس میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ جاتا، یہاں حاضری زیادہ نہ تھی، بہر حال کچھ عرصہ یہ درس چلا مگر بوجوہ بند ہو گیا اور اسے جالیات بطحا میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں انھوں نے عام درس دینا شروع کیا، یہاں بھی حاضری بہت زیادہ ہوتی تھی، درس کے بعد سوال وجواب کا دور ہوتا، ان دروس کو ہمارے دوست اور بھائی نسیم خان صاحب نے ریکارڈ بھی کیا اور یہ کیسٹیں عام بھی ہوئیں۔ بلاشبہ ان میں بہت زیادہ علمی مواد ہے۔

ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ بلاشبہ بہت بڑے مفکر ہیں، ان کی سوچ بڑی گہری ہے، امت کا درد لیے ہوئے، دوستوں کے دوست، بہت زیادہ مہمان نواز اور بلند کردار شخصیت کے مالک ہیں۔ہمیں اگر کوئی مشکل پیش آتی یا مشورہ درکار ہوتا تو سیدھے ان کے پاس چلے جاتے۔ میں جب بھی ان سے ملا ہمیشہ وقت لے کر ملا، عموماً وہ فجر کی نماز کے بعد لمبی سیر کرتے، جس دن ملاقات کرنا ہوتی میں ان سے وقت لے کر فجر کی نماز ان کے ساتھ مسجد میں پڑھتا، وہ کچھ دیر تک ذکر واذکار کرتے، قرآن کی تلاوت کرتے، وہ پہلے ہی بتا دیتے تھے کہ ملاقات ضرور ہوگی، مگر آپ کو کچھ دیر تک مسجد میں انتظار کرنا ہوگا۔ ہمیں پہلے سے علم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مسجد میں بیٹھنا ہے اس لیے ہم بھی قرآن کریم کھول کر بیٹھ جاتے اور تلاوت کرتے رہتے۔ سیر کے دوران ان سے کھل کر گفتگو ہوتی، ان کی ایک خوبصورت عادت تھی کہ وہ پہلے مدعا بڑی تفصیل اور صبر وتحمل سے سنتے، عام طور پر بڑے لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ ان سے بات شروع کریں تو وہ کہتے ہیں: میں بات سمجھ گیا ہوں آپ آگے چلیں، پھر آپ کو بات ہی نہیں کرنے دیں گے اور اپنے جوابات یا تبصروں سے نوازیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ اس کے برعکس تھا وہ بڑی خاموشی سے ہماری باتیں یا مسائل سنتے اور پھر ان کے جوابات دیتے، عموماً وہ قرآن کریم، حدیث شریف اور سیرت پاک سے استدلال کرتے اور مخاطب کی تسلی کراتے۔

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا رعب بہت زیادہ تھا، سبھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے، میں ڈرنے کا لفظ استعمال نہیں کروں گا، مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان میں تقویٰ اتنا زیادہ تھا کہ مخاطب ان سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا، حالانکہ وہ درس کے دوران ہنساتے بھی تھے اور خود بھی مسکراتے تھے۔ مجھے اس بات کا بھی

ادراک ہے کہ میں ان کا قدرے چہیتا شاگرد تھا۔ میں درس کے دوران کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے ان سمیت سبھی مسکرانے لگتے، میں اور دلیر ہو جاتا اور مجلس مزید خوشگوار ہو جاتی۔ دراصل قرآن وحدیث کی مجلس اتنی مبارک اور مزیدار ہوتی ہے کہ اس میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا، اس میں علم کی مٹھاس اور چاشنی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ میں ریاض سے باہر تھا، واپس آیا تو ساتھیوں سے پوچھا: درس کیسا رہا؟ ایک صاحب کہنے لگے: اس مرتبہ آپ نہیں تھے، اس لیے مجلس میں ہم سہمے سہمے سے رہے۔ مجھے اس پر بڑا مزا آیا اور اندازہ ہوا کہ میری ہنسنے مسکرانے والی طبیعت ہی اچھی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنا مشورہ دیتے اور ساتھ ہی فرماتے: یہ میرا مشورہ ہے، میں نے اپنی نیک نیتی اور سمجھ بوجھ کے مطابق دے دیا ہے، یہ ضروری نہیں کہ آپ اس پر ضرور عمل کریں یا اس کو ضرور تسلیم کریں، گویا وہ مخاطب کو اختیار دیتے تھے کہ وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک کھرے مسلمان ہیں، وہ دل کے بڑے اور فیاض انسان ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ مختلف منصوبوں میں انھوں نے دل کھول کر ہاتھ آگے بڑھایا، جب استاد آگے بڑھے تو شاگرد بھی استاد کی پیروی کرتے ہیں، وہ دعوتیں کھلاتے بھی تھے اور دعوت قبول بھی کر لیتے تھے۔ دروس کے علاوہ جب بھی ان کے گھر گئے کم ہی ایسا ہوا کہ انھوں نے بغیر ناشتہ یا کھانے کے آنے دیا ہو، بہر حال یہ میرے لیے سعادت ہے کہ وہ متعدد بار میرے گھر تشریف لائے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت اعلیٰ درجے کے مؤلف بھی ہیں۔ ان کی عربی کتابیں بلاشبہ

مارکیٹ میں بڑی مقبول ہوتی ہیں۔ جب بھی ان کی کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی، عموماً اپنے دستخطوں سے مجھے بھی کتاب عنایت فرماتے، بعد میں ضرور پوچھتے: عبدالمالک صاحب! کہیے، کتاب پسند آئی یا نہیں؟

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ برطانیہ میں بھی ملاقات رہی جب ایڈنبرا میں سعودی حکومت نے بڑی شاندار مسجد اور اسلامک سنٹر بنایا تو بہت ساری شخصیات کو بھی وہاں جانے کی

ڈاکٹر صاحب میں تقویٰ اتنا زیادہ تھا کہ مخاطب ان سے بات کرتے ہوئے جھجک محسوس کرتا تھا۔

عوت دی، ایک بڑا شاندار سیمینار رہا، جس کے مقررین میں ڈاکٹر صاحب شامل تھے، میں نے اگلی صف میں بیٹھ کر ان کی تقریر سنی۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا، ڈاکٹر صاحب سے تعلقات اس زمانے سے شروع ہوئے جب وہ امام محمد بن سعود یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے طالب علم تھے، پھر وہ اسی جامعہ میں لیکچرار بنے اور ترقی کرتے کرتے ایسوسی ایٹ پروفیسر بنے۔ یونیورسٹی میں ان کا بے حد احترام تھا، تمام طالب علم، اساتذہ، کیا مدیر جامعہ، سبھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ اسلام آباد منتقل ہو گئے، دروس کی مجالس میں وہ بہار نہ رہی، مگر ان کا آنا جانا لگا رہا، میری خواہش تھی کہ اس خاندان سے ہمارا رشتہ قائم ہو جائے کیونکہ اس خاندان میں نیکی اور تقویٰ کے آثار بہت ہیں۔

ان کے والد محترم حاجی ظہور الٰہی رحمہ اللہ بلاشبہ اپنے وقت کے ولی کامل تھے، یہ مسلک اہل حدیث کے شیدائی تھے اور مسلک کے فروغ کے لیے ان کی کاوشیں نہایت قابل قدر

ہیں۔ حالات نے کروٹ بدلی، میرے حافظ عابد الٰہی صاحب سے بڑے دیرینہ تعلقات تھے، ہم گہرے دوست تھے، پھر یہ دوستی رشتہ داری میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے اپنے بیٹے عبدالغفار کے لیے ان کی بیٹی کا رشتہ طلب کر لیا، جو ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب ہی سے طلب کیا گیا۔ یہ ان کی خاص محبت وشفقت تھی کہ انھوں نے اس طلب کو شرف قبولیت بخشا، حرم مکی میں نکاح ہوا، میں نے ڈاکٹر صاحب سے خصوصی درخواست کی تھی کہ وہ نکاح پڑھائیں گے۔ انھوں نے میری خواہش کا احترام کیا اور حرم مکی میں بذات خود نکاح پڑھایا، پھر وہ رخصتی کے وقت بھی تشریف لائے، یہ ان کا بڑا پن اور ان کی محبت ہے، ہمارے تعلقات وقت گزرنے کے ساتھ مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔ الحمد للہ! میں اب دادا بن چکا ہوں اور پوتیوں کے ساتھ کھیلتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزرا ہوا وقت بڑا سنہرا ہے، ہم نے ان سے بہت کچھ سیکھا، میں مجالس میں بڑے فخر سے کہتا ہوں کہ آخر میں ڈاکٹر صاحب کا شاگرد ہوں۔

خدمت حدیث کا ایک نیا انداز

محترم محمد اقبال کیلانی صاحب علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اپنے دین کی خدمت کے حوالے سے مختلف نوعیت کے کام لیتا ہے۔ میرے سامنے سلسلہ تفہیم السنہ کی مطبوعات کے سلسلہ کی پچیسویں کتاب ''مساجد کا بیان'' ہے، جس میں کم وبیش 75 صفحات پر مشتمل مقدمہ ایک مکمل کتاب ہے۔ یہ ایک دستاویز ہے، یہ ایک عہد کی کہانی ہے۔ یہ کتاب وسنت سے محبت کرنے والے ایک شخص کے دل کی آواز ہے۔ یہ مقدمہ ان روشن خیال اور خودساختہ اعتدال پسند لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو اسلام کو اپنی خواہش کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں دل دہلا دینے والے اعداد وشمار ہیں جن کو پڑھ کر آدمی ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ ایسا بھی ممکن ہے؟ میں کتاب پڑھتا چلا گیا اور میرے دل ودماغ کے بند دریچے کھلتے چلے گئے۔ سلسلہ تفہیم السنہ کا آغاز تو 20 سال قبل ہوا تھا۔ دارالسلام اور تفہیم السنہ کی تاریخ میلاد ایک ہی ہے۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب ہم دونوں بھائی گھنٹوں بیٹھ کر حدیث کی اشاعت کے حوالے سے منصوبہ بندی کیا کرتے تھے۔ اقبال کیلانی صاحب مجھ سے کہیں زیادہ جذباتی

نظر آتے تھے۔ ان کا کہنا تھا: ہمیں احادیث صحیحہ کو اتنا عام کرنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا پیغام عام ہو جائے اور گھر گھر پہنچ جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ امت میں اتحاد پیدا ہو تو اس کا واحد حل سنت نبوی کا احیاء اور اس کی تعلیمات کو عام کرنا ہے۔ کائنات کے اندر ایک ہی ایسی ہستی گزری ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب ہم نے حدیث نبوی کی اشاعت کے لیے سنجیدہ کوشش شروع کر دی۔ انھوں نے ''کتاب الصیام'' کا مسودہ لکھنا شروع کیا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت ساتھ دیا، مگر اقبال کیلانی صاحب کی مہارت علمی میدان میں تھی اور مجھے طباعت سے دلچسپی تھی۔ اس وقت دارالسلام کا آغاز نہ ہوا تھا۔ بس ہم تجرباتی دور سے گزر رہے تھے، مجھے یاد ہے کہ پہلی کتاب ہم نے دارالہدیٰ نامی ادارے کے نام سے شائع کی تھی کہ اس ادارے کے سربراہ احمد نے وزارۃ الاعلام کی شرائط پوری کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔ شروع میں خیال تھا کہ ہم کتاب کو مفت تقسیم کریں گے۔ کتاب شائع ہوئی تو میں اپنے گھر کے ساتھ والی مسجد میں کچھ کتابیں ایک کارٹن میں رکھ کر لے گیا۔ عصر کی نماز ختم ہوئی، میں نے پچھلی صفوں پر کھڑے ہو کر کارٹن کھولا۔ لوگوں کو اشارہ کیا کہ یہ کتاب برائے مفت تقسیم ہے۔ بس پھر کیا تھا، لوگ لپکتے ہوئے آئے ایک ایک آدمی نے دو دو کتابیں پکڑ لیں۔ دو تین منٹوں میں کارٹن خالی ہو گیا۔ میں کبیدہ خاطر تھا۔ دل میں خیال آیا کہ اگر اس کتاب کی قیمت ایک ریال بھی ہوتی تو چوتھائی حصہ بھی خالی نہ ہوتا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب کتابیں حتی الامکان مفت تقسیم نہیں کی جائیں گی۔

اس کتاب کے بعد اقبال کیلانی صاحب کی کتب کو عوام الناس میں پذیرائی ملتی چلی گئی۔ روزمرہ کے مسائل پر مشتمل ان کی تمام کتب تقریباً ایک سائز اور ایک جیسے صفحات پر

نہایت آسان اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہیں۔

میں کتاب پڑھ رہا تھا تو میری آنکھوں کے سامنے اپنے استاذ محترم چچا محمد ادریس رحمہ اللہ کا نقشہ آ گیا۔ محترم اقبال کیلانی کے والد گرامی رشتہ میں میرے چچا لگتے ہیں۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں انھی کا شاگرد ہوں۔ میں ان کا بہت ہی چہیتا شاگرد تھا۔ میں ان سے حدیث پڑھتے ہوئے اس سلسلہ ذہبیہ کا ذکر کرتا۔ وہ بڑے فخر سے مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے کہ میں ان کا شاگرد ہوں۔ میں قدرے شوخی سے کہتا: میں آپ کا شاگرد ہوں اور آپ سے حدیث پڑھ رہا ہوں تو پھر میں بھی اس سلسلہ کا ایک فرد ہوں۔ فرمانے لگتے: بلاشبہ تم بھی اس سلسلہ ذہبیہ میں اپنے آپ کو شمار کر سکتے ہو۔ برصغیر کے اہل حدیث عموماً اپنے آپ کو شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا شاگرد کہتے ہیں، جنھوں نے کم و بیش ستر سال تک دہلی میں لوگوں کو حدیث کا درس دیا اور پھر ان کے شاگرد عرب و عجم میں پھیل گئے۔ جناب برادرم محمد اقبال کیلانی صاحب اسی سلسلہ ذہبیہ کی ایک کڑی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے شہر میں ایک یادگار کانفرنس

2 دسمبر 2011ء جمعۃ المبارک کو ریاض میں درجہ حرارت کوئی پندرہ سولہ سنٹی گریڈ ہوگا۔ نماز جمعہ کے بعد مدینہ طیبہ کی جالیات کے زیر اہتمام سیرۃ النبی ﷺ کے مبارک موضوع پر مسجد نبوی کے پہلو میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ برادرم ابوتراب نور پوری بڑے اصرار سے جناب امیر محترم پروفیسر ساجد میر اور راقم الحروف کو اس پروگرام میں شرکت اور حاضرین سے خطاب کی دعوت دے رہے تھے۔ ادھر میرے دل کی کیفیت یہ تھی کہ جب مدینہ منورہ حاضری کا موقع مل رہا ہے تو پھر کیوں نہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مسجد نبوی کے مشرقی جانب حال ہی میں توسیع ہوئی ہے۔ بہت ساری عمارتوں کو منہدم کر کے حرم مدنی میں شامل کر دیا گیا ہے۔ پارکنگ کے لیے بھی خاصی جگہ بنائی گئی ہے۔ جب بھی مسجد نبوی کی زیارت کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو میرا قیام عموماً مسجد کے شمالی حصہ میں ہوتا ہے، مگر اس مرتبہ عزیزان گرامی قدر نے مسجد کے قریب ہی واقع ایک ہوٹل «اَلْبَذْرُ الْمُحَمَّدِيَّة» میں کمرے بک کروا رکھے تھے۔ اسی ہوٹل کے وسیع ہال میں کانفرنس کا انعقاد ہو رہا تھا۔ امیر محترم پروفیسر ساجد میر صاحب نے سیرۃ النبی ﷺ کے موضوع پر بڑا پُر مغز خطاب فرمایا۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں حجاج کرام، مملکت

میں مقیم اردو جاننے والے احباب اور مدینہ یونیورسٹی کے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے سیرت النبی ﷺ کے مختلف گوشوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا: کسی بھی شخص سے محبت کرنے کی کچھ وجوہات ہوتی ہیں جن میں اس کی شکل وصورت، اس کا کردار، ساتھیوں کے ساتھ تعلق، اس کا ذاتی اخلاق اور معاشرے کے مختلف لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات، تمام چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ تمام تر خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ اتنے خوبصورت تھے کہ حسان بن ثابت جیسا شاعر پکارا ٹھا:

وَأَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي

وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

بہت سی آیات، احادیث اور اشعار کے ساتھ مزین یہ تقریر بلا شبہ ان کی زندگی کی اہم تقاریر میں سے ایک ہوگی۔

تنظیم، ترتیب، حاضری اور دیگر انتظامات کے اعتبار سے یہ کانفرنس خاصی کامیاب رہی۔ کانفرنس میں مدینہ یونیورسٹی کے طلبا کی تقاریر سننے کا بھی موقع ملا۔ انھی طلبہ میں سے بعض نے اس کانفرنس کی خوبصورت کمپیئرنگ بھی کی جس سے میرے سمیت سب شرکائے کانفرنس بہت متاثر ہوئے۔ راقم الحروف نے اس کانفرنس میں مختصراً اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: اب اہل حدیث پورے کرۂ ارض پر خاصے بیدار اور منظّم ہیں، پرانا دور گیا، اب سلفیت کا نیا انداز ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے طلبا کی گفتگو بڑی پر مغز تھی۔ ڈاکٹر عبدالباسط نے مدیر جالیات ڈاکٹر سلیمان الثنیان کی تقریر کا اتنا خوبصورت ترجمہ کیا کہ میں نے ڈاکٹر سلیمان سے کہا: میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آپ کی تقریر زیادہ اچھی اور عمدہ تھی یا برادرم عبدالباسط کا ترجمہ زیادہ خوبصورت تھا۔ رات گئے تک کانفرنس جاری

رہی۔جس کے اثرات ان شاء اللہ بڑی دیر تک رہیں گے۔

پروگرام کے دوران مجھے مدینہ یونیورسٹی کے طلبا کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا۔اندازہ ہوا کہ ان کے عزائم بہت بلند ہیں اور وہ اپنے اذہان میں اسلام،عقیدہ توحید اور کتاب وسنت کی خدمت کے لیے بہت کچھ کرنے کے منصوبے بھی رکھتے ہیں۔

آج محرم الحرام کی 7 تاریخ تھی،اس کے باوجود حجاج کرام کی خاصی تعداد مدینہ طیبہ میں موجود تھی۔ایک طرف مسجد نبوی اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ دامنی کا منظر پیش کررہی تھی تو دوسری طرف مسجد قبا بھی حجاج کرام سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔میری توقع سے کہیں زیادہ حجاج مسجد قباء میں نوافل ادا کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔سبحان اللہ! حجاج ومعتمرین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہورہا ہے۔ایک وقت تھا کہ صرف حج اور رمضان کے دنوں میں رش ہوتا تھا،مگر اب الحمد للہ! عام دنوں میں بھی رش میں اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔محبت بھی کیا چیز ہے،مسلمانوں نے اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کی اور بے حد کی ہے۔آپ کی زبان اقدس سے نکلے ہوئے مقدس ارشادات کی مسلمانوں نے دل وجان سے قدر کی ہے۔

مدینہ شریف کی اس کانفرنس میں شرکت اور وہاں کا قیام ہمیشہ یادر ہے گا۔

امام کعبہ ڈاکٹر صالح بن حمید
کے ہاں یادگار عشائیہ

یہ 2011ء کا ماہ نومبر ہے۔ گزشتہ دو ہفتوں سے مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کی قیادت ریاض میں موجود ہے۔ امیر محترم جناب پروفیسر ساجد میر صاحب، ڈاکٹر حافظ عبدالکریم صاحب اور جناب علی محمد ابوتراب صاحب تینوں ہی جمعیت کے انتہائی اہم ذمہ داران ہیں۔ پاکستان میں تو یقیناً یہ تینوں شخصیات بہت مصروف رہتی ہیں۔ انھیں اتنا وقت کہاں ملتا ہوگا کہ ان کے ساتھ لمبی نشستیں ہوسکیں۔ یہاں آسانی سے ان کے ساتھ میٹنگز ہوجاتی ہیں، راقم الحروف بھی ان کے ساتھ میٹنگز میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہاں قیام کے دوران سعودی عرب کی مقتدر شخصیات سے ان کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ سعودی ولی عہد شہزادہ نائف بن عبدالعزیز سے پروفیسر ساجد میر صاحب کی ملاقات بھی ہوئی جس میں انھوں نے سعودی ولی عہد جناب شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز کی وفات پر تعزیت بھی کی اور دیگر باہمی دلچسپی کے امور پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ 21 نومبر 2011ء کی صبح جب میں واپس ریاض پہنچا تو امیر محترم پروفیسر ساجد میر صاحب دو دن پہلے ہی ریاض

تشریف لا چکے تھے۔ امام کعبہ، رئیس مجلس القضاء الاعلیٰ اور مجلس شوریٰ کے سابق چیئرمین جناب ڈاکٹر صالح بن حمید سے ان کی ملاقات ہو چکی تھی۔ شیخ نے انھیں رات کے کھانے کی دعوت دی، مگر وفا بھی عجیب چیز ہے، فرمانے لگے: عبدالمالک مجاہد ان دنوں پاکستان میں ہیں، وہ 21 نومبر پیر کی صبح تک ان شاء اللہ پہنچ جائیں گے۔ میری خواہش ہے کہ وہ اور حافظ عبدالکریم بھی دعوت میں شرکت کریں۔ شیخ صالح بن حمید نہایت ہی متواضع شخصیت ہیں۔ راقم کی بھی ان سے متعدد ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ دارالسلام نے ان کے والد گرامی شیخ عبداللہ بن محمد حمید کی ایک کتاب کا انگلش ترجمہ کر کے آج سے کوئی اٹھارہ برس قبل شائع کیا تھا۔ اسی وقت سے ان سے تعلقات ہیں۔ ان دونوں زعماء میں طے پایا کہ 21 نومبر کو رات کا کھانا شیخ صالح بن حمید کے گھر پر ہو گا۔

پہلے شیخ صالح بن حمید کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ شیخ صالح بن حمید بیت اللہ شریف کے امام اور خطیب ہیں۔ ان کے والد گرامی جناب الشیخ عبداللہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم دین اور مفتی تھے۔ شیخ صالح بن حمید کو اگر میں سعودی عرب کی دس اہم ترین شخصیات میں سے ایک شمار کروں تو شاید مبالغہ نہ ہو گا۔ وہ بیک وقت عالم دین، سعودی مجلس شوریٰ کے سابق رئیس اور سعودی عرب کی عدلیہ کے چیف جسٹس ہیں۔ وہ نہایت اعلیٰ مفکر، ادیب، صحافی، بہت سی کتابوں کے مؤلف اور عالمی حالات پر گہری نظر رکھنے والی شخصیت ہیں۔ ان کا تعلق سعودی عرب کے مشہور قبیلہ بنو خالد سے ہے۔ وہ 1949ء میں سعودی عرب کے مردم خیز علاقے قصیم کے مشہور شہر بریدہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن زیادہ تر مکہ مکرمہ اور طائف میں گزرا۔ ان کی میٹرک سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی ساری تعلیم مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ بچپن ہی میں قرآن کریم حفظ کر لیا تھا۔ تعلیم کے دوران وہ

میں نے اسی شرط پر یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ امامت حرم شریف کے اعزاز سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گا۔

جامعہ ام القریٰ میں بھی مختلف ذمہ داریوں کے حامل رہے۔ آخر میں اقتصاد اسلامی کالج کے رئیس مقرر ہوئے۔ 1983ء میں انھیں بیت اللہ شریف کا امام وخطیب مقرر کیا گیا اور ابھی تک وہ یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ انھیں بارہ سال پہلے سعودی عرب کے سربرآوردہ علماء کے بورڈ کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کے اہم ادارہ «المجلسُ الأعلَى العَالَمِيُّ لِلمَسَاجِد» کے بھی ممبر ہیں۔ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ بیت اللہ شریف میں نہ صرف درس دیتے ہیں بلکہ مفتی کے اہم منصب پر بھی فائز ہیں۔

راقم کی ان سے متعدد ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ایک یادگار ملاقات مکہ مکرمہ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ دارالسلام نے تفسیر ابن کثیر کا انگریزی زبان میں ترجمہ دس جلدوں میں شائع کیا تھا۔ میرے علم کی حد تک اس وقت تک انگریزی زبان میں یہ قرآن کریم کی پہلی تفسیر تھی۔ انھوں نے اس کام کو بہت سراہا۔

جب وہ رئیس مجلس شوریٰ بنے تو میرا خیال تھا کہ یہ سعودی عرب کا بہت بڑا عہدہ ہے، اس لیے ممکن ہے انھیں امام کعبہ کی ذمہ داری سے فارغ کر دیا گیا ہو۔ میں نے ان کو مبارکباد کا خط بھیجا جس کا انھوں نے جوابی شکریہ بھی ادا کیا۔ جلد ہی مجھے ڈاکٹر محسن خان صاحب کی معرفت ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ اب بھی امام کعبہ ہیں۔ موقع پا کر عرض کیا: سوچتا ہوں کہ آپ کو مبارکباد پیش کروں کیونکہ آپ نے ایک بڑا عہدہ حاصل کر لیا ہے، مگر امام کعبہ والا عہدہ اس سے بھی

بڑا تھا۔ مسکرا کر فرمانے لگے: میں نے اسی شرط پر یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ امامت حرم شریف کے اعزاز سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گا۔ الحمدللہ! میں یہ دونوں ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں۔ بدھ کی شام کو مکہ چلا جاتا ہوں۔ اسی طرح پورا رمضان اور ایام حج وہیں پر رہتا ہوں۔

ایک دفعہ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو انھوں نے تفسیر ابن کثیر کے اختصار کا نسخہ اپنے دستخطوں سے مرحمت فرمایا۔ ان کا بڑا پن تھا کہ انھوں نے خود کو "أخوکم" کے الفاظ سے ذکر فرمایا۔ سعودی مجلس شوریٰ کا صدر دفتر بہت بڑا اور نہایت ہی خوبصورت ہے۔ ان کی اجازت سے متعدد بار اس کی وسیع و عریض دل کش عمارت دیکھنے کا موقع ملا۔ اس بلڈنگ میں بڑی حد تک اندلس کے اسلامی طرز تعمیر کا رنگ نمایاں ہے۔ شیخ صالح بن حمید نہایت متواضع شخصیت کے مالک ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن ان کے گھر میں عام مجلس ہوتی ہے جس میں بلاتفریق ہر شخص بغیر کسی رکاوٹ کے ملاقات کر سکتا ہے۔ نہ ہٹو بچو، نہ سکیورٹی نہ ہی کوئی پروٹوکول ہوتا ہے۔

اتنی بڑی شخصیت کے ہاں دعوت ایک بڑا اعزاز تھا۔ ہر چند کہ میں پہلے بھی کتنی ہی مرتبہ ان کے گھر آچکا تھا، مگر آج خصوصی طور پر اندرونی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شیخ صالح کا گھر بہت بڑا محل ہے۔ ریاض کے پوش علاقے میں واقع یہ گھر پہلی مرتبہ اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سفید رنگ کا یہ عالیشان محل بہت بڑا اور نہایت خوبصورت ہے۔ عمارت کو جدید طرز تعمیر اور عربی سٹائل میں اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ جدید اور قدیم کا بہت خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو محترم شیخ صالح بن حمید نے گلے لگا لیا۔ وہ نہایت نفیس اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک ہیں۔ ان سے گفتگو

کریں تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کے مالک اور اتنے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ سردیوں میں عربوں کے ہاں زنجبیل کی چائے کا رواج ہے۔ ادرک کے پاؤڈر کو عربی میں زنجبیل کہتے ہیں۔ سردیوں کا یہ خاص تحفہ ہے کہ اس کے استعمال سے آدمی نزلہ و زکام سے محفوظ رہتا ہے۔

محترم قارئین! راقم الحروف نے ہمیشہ بڑے لوگوں کی مجالس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو میں نے بہت سا علم اور تجربات بڑی بڑی شخصیات کے پاس بیٹھ کر حاصل کیے ہیں۔ اس مجلس میں بھی کتنی ہی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ ان میں سے ایک اہم نکتہ یہ تھا: دیکھیے! ہمیں زندگی میں ہمیشہ حق اور سچ بولنا چاہیے اور ہمیشہ صداقت کے راستے ہی کو اختیار کرنا چاہیے، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ تمام حق اور سارا سچ ایک ہی میٹنگ یا محفل میں بیان کر دیں۔ بعض اوقات انسان اپنے طور پر یہ سمجھتا ہے کہ اسے ضرور حق بیان کرنا ہے اور وہ ایسا انداز اختیار کرتا ہے جو مصلحت کے خلاف ہوتا ہے اور اس کے نتائج دعوت کے میدان میں بڑے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔

قارئین کرام! اگر آپ اس نکتے پر غور کریں کہ بہت سی سچی باتیں اور حقائق اگر ایک ہی دن اور ایک ہی جگہ بیان کر دیے جائیں تو یقیناً اس کے نتائج بعض اوقات بہت منفی بھی نکلتے ہیں۔ بطور خاص ہمارے داعی حضرات کو دعوت کے میدان میں مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں مختلف خیالات ونظریات اور عقائد رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جن سے گفتگو کرتے وقت موقع محل کی مناسبت کے اعتبار سے درست الفاظ کا چناؤ نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بطور خاص نوجوان نسل سے بات کرتے وقت بہت حکمت ودانش سے کام لینا چاہیے۔

انھوں نے ڈاکٹر محمد محسن خان کا ذکر بڑی محبت سے کیا۔ انھوں نے راقم سے ان کی صحت اور سلامتی کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر محسن خان صاحب کا ذکر آیا تو ان کے دونوں بھائی بھی چونک گئے۔ پھر انھوں نے بتایا: وہ طائف میں ہمارے ہمسائے تھے۔ ہم ان کو بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ متعدد بار پاکستان جا چکے ہیں۔ عقیدۂ توحید کے حوالے سے وہ خاصے محتاط ہیں۔ فرمانے لگے: بیرونی ممالک کے دوروں میں وہ اس بات کی شدید احتیاط کرتے ہیں کہ کہیں ہماری وجہ سے اہل بدعت کو کوئی تعاون نہ مل جائے۔ اس بارے میں انھوں نے سری لنکا کا ایک واقعہ سنایا۔ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں سری لنکا کے دورے پر تھا۔ جمعہ کے دن مجھے ایک مسجد میں جمعہ پڑھانے کے لیے کہا گیا۔ عین وقت پر مجھے اطلاع ملی کہ اس مسجد میں قبر ہے۔ اگر میں وہاں نماز ادا کر لیتا تو اہل بدعت وخرافات کو اس سے خاصی مدد مل جاتی اور وہ اسے اپنے حق میں دلیل بنا لیتے۔ چنانچہ میں نے منتظمین سے کہہ دیا: میں اس مسجد میں نماز ادا نہیں کروں گا۔ انھوں نے ایک اور مسجد کا انتخاب کیا، مگر جب ہم وہاں پہنچے تو جمعہ ختم ہو چکا تھا اور جماعت کھڑی تھی۔ ہم نے وہاں پر صرف نماز ادا کی۔ اس کے بعد شیخ محترم نے وہاں کی سلفی جماعت انصار السنۃ المحمدیہ اور ان کے رئیس شیخ ابوبکر صدیق کا ذکر کیا اور ان کی قابل قدر جہود سے ہمیں مطلع کیا جو وہاں سلفی دعوت پھیلانے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں۔

شیخ صالح بن حمید کے ہاں کھانے کی یہ ٹیبل بلاشبہ بہت بڑی تھی۔ عربوں کی عادت کے مطابق ''مندی'' کے دو بڑے بڑے تھال تھے جو چاول اور سالم بکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ کھانے کا آغاز قرصان سے ہوا۔ یہ ڈش روٹی کے ٹکڑوں کو سبزی اور گوشت میں پکا کر تیار کی جاتی ہے۔ یہ عربوں کے مقبول ترین کھانوں میں سے ایک ہے۔ آپ

اسے ثرید سے ملتا جلتا کھانا کہہ سکتے ہیں۔ شیخ صاحب کے دو ملازم مہمانوں کو کھانا کھلانے میں مدد کر رہے تھے۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کھانا نہایت مزیدار تھا۔ بڑے اہتمام سے متعدد ڈشیں تیار کی گئی تھیں۔ باسمتی کا خوشبودار چاول استعمال کیا گیا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق انھوں نے بتایا کہ اس چاول کا انتخاب انھوں نے خود کیا ہے۔ کھانے کے دوران بھی دعوت کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو عام کرنے اور علمائے کرام کی ذمہ داریوں کے حوالے سے گفتگو جاری رہی۔ میں سوچتا رہا کہ علمائے کرام کی مجالس کتنی بابرکت ہوتی ہیں کہ ہر موقع پر قرآن وحدیث، سیرت اور دعوت کے حوالے ہی سے گفتگو ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ بڑی یادگار دعوت تھی۔ ہم نے یہاں کھانا ہی نہیں کھایا بلکہ بہت ساری معلومات اور علمی باتیں بھی اس مجلس سے حاصل کیں۔

شیخ صالح بن حمید نے متعدد بار اس مجلس میں فرمایا: میری بڑی دیر سے خواہش تھی کہ میں شیخ ساجد میر کو اپنے گھر کھانے پر بلواؤں۔ ان کا بار بار یہ اظہار جمعیت اہلحدیث کے ساتھ ان کی محبت پر دلالت کر رہا تھا۔ اس دعوت کے ذریعے انھوں نے پروفیسر ساجد میر صاحب ہی کی عزت نہیں کی بلکہ دنیا بھر کے تمام اہلحدیثوں کو پیغام دیا کہ ائمہ حرمین شریفین آپ لوگوں سے دلی محبت، پیار، عزت اور احترام کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس کا سبب وہ عظیم مشن ہے، وہ خوبصورت کام اور عظیم جدوجہد ہے جس کے لیے آپ لوگ دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔

شہزادہ خالد بن طلال آل سعود سے ملاقات

یہ 2003ء کی بات ہے۔ ایک دن مجھے دارالسلام لندن برانچ کے منیجر کا فون آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج ہماری شاپ پر کون آیا ہے؟! وہ بڑے پر جوش انداز میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے کہا: بھئی! مجھے کیا معلوم کون کون ہماری شاپ پر آتا ہے؟ جناب! آج ہمارے پاس پرنس خالد بن طلال بن عبدالعزیز آل سعود تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ہماری انگلش کتابوں میں بہت زیادہ دلچسپی لی، خاصا وقت گزارا۔ پھر انھوں نے پوچھا: اتنی خوبصورت کتابیں کہاں سے چھپتی ہیں؟ میں نے ان کو بتایا کہ جناب! یہ تو آپ کے ملک سعودی عرب سے آتی ہیں۔ دارالسلام کا ہیڈ کوارٹر ریاض میں ہے۔ انھوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا اور آج انھوں نے مجھے اپنے پیلس میں کھانے پر مدعو کیا ہے۔ یہ دارالسلام کا پرنس خالد بن طلال سے پہلا باضابطہ رابطہ تھا۔ حافظ عبدالوحید جب لندن میں پرنس کے ہاں عشائیہ پر گئے تو انھوں نے دارالسلام کا مزید تعارف کروایا۔ راقم کے بارے میں بتایا تو انھوں نے کہا: میں جیسے ہی ریاض جاؤں گا، عبدالمالک مجاہد سے ملاقات کروں گا۔ کچھ عرصہ بعد پرنس کے پیلس سے فون آیا کہ وہ ملاقات کے خواہاں ہیں۔ میں نے کچھ نئی طبع شدہ کتابیں لیں اور اپنے مصری اسٹاف کے ہمراہ پیلس میں جا

پہنچا۔ سکیورٹی اور اسٹاف کو پہلے سے خبر تھی، لہٰذا بغیر کسی ردوقدح کے ہمیں مجلس میں پہنچا دیا گیا۔

یہ پیر کا دن تھا، ہمارے علاوہ بھی کافی مہمان تھے۔ نشست گاہ میں پانی، کھجور کے پیکٹ اور لبن (لسّی) کی بوتلیں رکھی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پرنس خالد کی آمد ہوئی، بڑے تپاک سے ملے۔ آخر ملاقات ہو ہی گئی۔ وہ گویا ہوئے: ہم مغرب کے بعد تفصیل سے بات کریں گے۔ اتنی دیر میں اذان ہوئی تو انکشاف ہوا کہ پرنس اور ان کے کئی ساتھیوں نے پیر کے دن کا روزہ رکھا ہوا تھا، چنانچہ وہیں افطاری ہوئی۔ اب اس نشست میں پانی، کھجوروں اور لسی کی موجودگی کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ نماز مغرب پیلس کے سامنے والی چھوٹی مسجد میں ادا ہوئی۔ وہ خاصی دیر تک دعا مانگتے رہے، نماز کے بعد دوبارہ مجلس میں آئے تو اپنے ساتھ جگہ دی، میں نے کتابیں پیش کیں۔ انھوں نے حاضرین کو تفصیل سے دارالسلام کے بارے میں بتایا کہ کس طرح لندن برانچ کی معرفت ہمیں کتب کا پتا چلا ہے۔ پھر مستقبل کے منصوبوں کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔

چار سال کے بعد ایک مرتبہ پھر اتفاقاً پرنس خالد بن طلال سے ایک تقریب میں ملاقات ہوگئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب رمضان المبارک کی گیارہ تاریخ تھی، مجھے پرنس کے سیکرٹری کا فون آیا کہ حج کے بعد الحرس الوطنی کی جانب سے ریاض میں ایک میلہ لگتا ہے، آپ بھی اس میں شرکت کریں۔ اس میلے میں عالم اسلام کے بعض معروف اسکالرز بھی تشریف لاتے ہیں۔ اس بار پروگرام میں شرکت کے لیے ہندوستان کے مشہور مبلغ ڈاکٹر ذاکر نائیک بھی تشریف لا رہے تھے۔ کنگ فہد کلچرل سنٹر میں ان کا خطاب تھا۔ دارالسلام نے ان کی مشہور کتاب ''قرآن اور ماڈرن سائنس'' اپنے روایتی انداز میں

شائع کی تھی۔اس پروگرام میں لیکچر کے دوران اس کتاب کی رونمائی کی گئی۔حاضرین میں پرنس خالد بن طلال بھی موجود تھے۔ جو اگلی نشستوں پر تشریف فرما تھے۔ پروگرام کے اختتام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ وہ اس پروگرام میں نہ صرف تشریف لائے، بلکہ انگلش میں حاضرین سے خطاب بھی کیا۔ چار سال کے عرصہ میں ہم کتب ستہ کے ترجمہ کو کسی حد تک مکمل کر چکے تھے۔انھوں نے مجھ سے پوچھا: نئے منصوبے کون کون سے ہیں؟ میں نے کتب ستہ کا ذکر کیا اور بتلایا کہ بلاشبہ اس پر لاکھوں ڈالرز خرچ ہو چکے ہیں اور ریسرچ کا کام تا حال جاری وساری ہے، انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس رمضان کے شروع میں الحمدللہ! ابن ماجہ پانچ جلدوں میں شائع ہو کر ریاض پہنچ گئی تو میں نے سوچا کہ یہ شخص علم دوست ہے، کتب ستہ کے انگریزی ترجمہ کا یہ کام تاریخ میں پہلی بار ہو رہا ہے، کیوں نہ انھیں اس کا ایک نسخہ پیش کیا جائے۔

دارالسلام سے ایک لیٹر بھیجا گیا کہ کب ملاقات ممکن ہے؟ دو دن کے بعد جواب آ گیا کہ آج رات گیارہ بجے آ جائیں۔ معلوم ہوا کہ پرنس خالد ان دنوں مستشفی تخصصی میں زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ ان کا بیٹا حادثے میں زخمی ہو کر ہسپتال میں ہے۔ (اللہ ان کو صحت دے۔ آمین!) ہسپتال میں پرنس سے ملنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں درخواستیں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پرنس خالد آئے۔ لوگوں نے درخواستیں پیش کیں۔ کچھ امداد کے خواہاں تھے، اپنے اپنے مسائل لیے لوگ ملاقات کے منتظر تھے، آہستہ آہستہ لوگ کم ہوتے گئے۔ وقت خاصا ہو رہا تھا، میں نے موقع پا کر اپنے وفد کا تعارف کروایا۔ کہنے لگے: عبدالعزیز کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ ہم تو آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ کتابیں...... میری بات درمیان ہی میں رہ گئی۔ آپ لوگ

جائیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ آج شام ہی کو تو ان کے سیکرٹری نے فون کیا تھا۔ اب دو منٹ بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، خیر ہم لوگ اٹھے۔ ادھر عبدالعزیز دروازے پر کھڑا تھا، اس نے ہاتھ پکڑ لیا، میں قدرے برہم تھا۔ شاید عبدالعزیز نے معاملے کو بھانپ لیا تھا۔ کہنے لگا: دراصل امیر اس وقت لوگوں میں مشغول ہیں، آپ لوگوں کو کمرۂ خاص میں بلوایا ہے، تھوڑی دیر تک آ جائیں گے، آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہسپتال کے ICU میں جہاں ان کا بیٹا تھا وہاں ایک کمرے میں پرنس نے اپنا عارضی دفتر یا آرام گاہ بنا رکھی تھی۔ کمرے میں دو کرسیاں، کچھ کتابیں، قرآن پاک اور دیگر ضروری اشیاء موجود تھیں۔ ہم کافی دیر تک انتظار کرتے رہے۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا کہ اطلاع آئی: پرنس تشریف لا رہے ہیں۔ ہم کافی لوگ تھے، کمرے کے قالین پر بیٹھ گئے، وہ سیدھے ہمارے پاس آئے اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ کچھ اور لوگ بھی تھے ان سے معذرت کی کہ پہلے دارالسلام والوں سے بات کرلوں۔ میں نے کتب ستہ پیش کیں، انھوں نے سنن ابن ماجہ کی ایک جلد کو کھولا، اسے مختلف مقامات سے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ کچھ ضمنی سوالات ہوئے۔ ان لوگوں نے بہت بڑا کام کر ڈالا ہے۔ وہ حاضرین سے مخاطب تھے۔ ان کے لیے تو بہت وقت چاہیے۔ اس وقت کم از کم آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا وہ حدیث کے ترجمہ پر مسلسل گفتگو اور بحث کر رہے تھے، مختلف جلدوں کو مختلف مقامات سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے دارالسلام

> **ہم کافی لوگ تھے، کمرے کے قالین پر بیٹھ گئے، پرنس سیدھے ہمارے پاس آئے اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔**

کے ہیڈکوارٹر کے دورے کی دعوت دی جو فوراً قبول کر لی گئی۔ اچھا تو ان شاء اللہ تین دن کے بعد میں افطاری کے بعد آؤں گا۔ میں نے عرض کی: سموالامیر! آپ اس روز افطاری دارالسلام کے اسٹاف کے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟ جواب ملا: کیوں نہیں! بس افطاری ہلکی پھلکی ہو، کھانا نہیں ہوگا۔ آپ میرے سیکرٹری سے رابطہ کریں۔ اس دوران انھوں نے اپنے اسٹاف کو کہہ دیا: ہم جمعہ کو دارالسلام میں افطاری کریں گے۔ رات خاصی ہو چکی تھی، ہم باہر نکلے تو بے حد خوش تھے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد دعوت قبول کر لیں گے۔ پرنس خالد بن طلال جمعہ کے روز افطاری کے وقت دارالسلام کے ہیڈکوارٹر میں تشریف لائے۔ انھوں نے عشاء کی اذان تک کا وقت دارالسلام میں گزارا۔ راقم نے ان کو دارالسلام کے بارے میں بریف کیا۔

سموالامیر! آپ اس روز افطاری دارالسلام کے اسٹاف کے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟ جواب ملا: کیوں نہیں!

انھوں نے دارالسلام کی بعض اہم کتب کو دیکھا اور اپنے تأثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

دنیا میں اسلام ہی امن اور آشتی کا مذہب ہے۔ اس کی تعلیمات کو دنیا کی مختلف زبانوں میں عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ یہ آفاقی مذہب ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابیں دنیا کی تمام لائبریریوں میں ہونی چاہییں۔ دارالسلام اس سلسلے میں بڑا عمدہ اور قابل رشک کردار ادا کر رہا ہے۔

انھوں نے تمام شعبوں کا تفصیلی وزٹ کیا۔ کارکنان سے کام کے بارے میں سوال وجواب کیے۔ ان سے مزید معلومات حاصل کیں۔ ادارہ دارالسلام نے ادارے کے سربراہ محمد بن عبداللہ المعتاز اور راقم کی جانب سے شہزادہ کو یادگاری شیلڈ پیش کی۔ ان کا کہنا تھا: اس اسلامی ادارے میں آ کر انھیں نہایت درجہ خوشی ہوئی ہے۔ ہمارے لیے یہ اعزاز ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق عالمی معیار کی کتابیں شائع کرنے والا ادارہ سعودی عرب ہی میں واقع ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ گھڑیاں بتا رہی تھیں کہ عشاء کی اذان ہونے والی ہے۔ اردو نیوز کے نمایندہ جاوید اقبال انٹرویو کے خواہشمند تھے، وہ اپنا مائیک سنبھالے بیٹھے تھے۔ ان کے خوبصورت اور ذہانت پر مبنی سوالات اور پرنس کے خوبصورت جوابات ان کے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ ہو گئے، جو یقیناً سعودی ریڈیو سے نشر ہو چکے ہوں گے۔ یوں ایک یادگار اور خوبصورت دورے کے بعد وہ واپس تشریف لے گئے۔ اس دوران نماز عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ یقیناً ان کا دورہ سعودی حکمرانوں کی اسلام سے، قرآن وسنت سے اور اسلامی لٹریچر سے بھرپور محبت کا غماز ہے۔ ادارے میں گو کہ جمعہ کے روز چھٹی تھی، مگر تمام کارکنان دلوں میں محبت کے جذبات لیے پرنس کے استقبال کے لیے دارالسلام میں موجود تھے۔ پرنس خالد حفظہ اللہ اپنے وعدے کے مطابق قریباً دو ماہ بعد دوسری بار دارالسلام میں تشریف لائے تھے، انھوں نے ادارے کی انتظامیہ اور کارکنان کے ساتھ کافی وقت گزارا۔

- کسے معلوم ہے کہ یہ آخری نماز ہی ہو، مسجد چلتے ہیں۔
- اب میرے دل میں خطرے کی گھنٹی بجی کہ کہیں یہ ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو۔

چند ایامِ گزشتہ کی آپ بیتی

3 اپریل 2012ء کو منگل کا دن تھا۔ دارالسلام میں ہر روز کوئی نہ کوئی اہم مہمان یا وفد دنیا کے مختلف ممالک سے آتے رہتے ہیں، مگر آج دارالسلام میں دو اہم وفود کی تشریف آوری ہوئی۔ ان میں ایک تو مالدیپ کے سفیر عزت مآب آدم حسن تھے، دوسرے پاکستان سے الہدیٰ انٹرنیشنل کی چیئر پرسن محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ، اپنی شاگردہ خاص محترمہ قدسیہ، اپنے بیٹے ہاشم اور بیٹی کے ہمراہ دارالسلام کے صدر دفتر میں تشریف لائیں۔ محترمہ ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ نے عصر حاضر میں جس طرح خواتین اور بطور خاص بچیوں میں دینی بیداری کی لہر پیدا کی ہے وہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ انھوں نے اپنے نہایت لائق و فائق خاوند محترم ڈاکٹر ادریس زبیر صاحب کے ساتھ مل کر دنیا کے مختلف ممالک میں ''الہدیٰ انٹرنیشنل'' کا نیٹ ورک بنایا ہے۔ دونوں میاں بیوی نہایت فعال، انتھک محنت کرنے والے اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اسلام آباد میں ان کے سکول کو دیکھنے کا دو بار اتفاق ہوا ہے۔ محترمہ کے دروس کا انداز بڑا سادہ مگر دلوں میں اتر جانے والا ہے۔ انھوں نے وطن عزیز کے خوشحال طبقہ کی خواتین کو بطور خاص اپنا ہدف

نایا۔ اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط بیانیوں کی وضاحت کی۔ کالج اور یونیورسٹی کی
طالبات کے حلقوں میں جا جا کر ان کے اندر اسلامی بیداری پیدا کی۔ اور آج وہ
ہزاروں نہیں لاکھوں خواتین کے دلوں کی دھڑکن بن چکی ہیں۔ کوئی ایک ماہ قبل ہم نے ان
کو اوران کے بیٹے کو ویزا ارسال کیا تھا۔ جب وہ دارالسلام میں تشریف لائیں تو میں نے
محسوس کیا کہ ہمارے اوران کے سوچنے کا انداز اور ہمارا اوران کا مشن ایک جیسا ہے۔

انھوں نے دارالسلام کی کتب کے حوالے سے بتایا کہ ہمیں آپ کی کتابیں اپنی بچیوں
میں متعارف کرواتے ہوئے مکمل اطمینان ہوتا ہے کہ ان کا مواد نہایت معتبر، صحیح اور محقق
ہوتا ہے۔ مجھے اس وقت یقیناً حیرت انگیز خوشی ہوئی جب وہ کہہ رہی تھیں: میں نے آپ کی
کتابیں مختلف اوقات میں دوران سفر ہی پڑھ ڈالی ہیں۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ میں نے اپنے سینے میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ میں ان خوش
قسمت لوگوں میں سے ہوں جو عام بیماری کو درخور اعتنا نہیں
سمجھتے۔ میں نے کوشش کی کہ ان پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دوں
کہ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اسی دوران نماز ظہر کا
وقت ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا: کسے معلوم ہے کہ یہ آخری
نماز ہی ہو، مسجد چلتے ہیں۔ وضو کیا اور مسجد آ گیا۔ نماز کے
دوران بھی طبیعت کچھ خراب سی رہی۔ دفتر واپس آیا تو محترمہ
ڈاکٹر فرحت ہاشمی تو واپس تشریف لے جا چکی تھیں۔ سیٹ پر
بیٹھا تو گرمی سی محسوس ہوئی، میں نے جیکٹ اتار دی۔ اے سی
کو ذرا تیز کرنے کے لیے کہا۔ پیشانی پر ہلکا سا پسینہ محسوس

وہ کہہ رہی تھیں: میں نے آپ کی کتابیں مختلف اوقات میں دوران سفر ہی پڑھ ڈالی ہیں۔

کیا۔اب میرے دل میں خطرے کی گھنٹی بجی کہ کہیں یہ ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو۔

عکاشہ بیٹے کو گھر سے بلوایا۔ دفتر ہی کے ایک ساتھی ضیاء اللہ نے بلڈ پریشر چیک کیا۔ کہنے لگا: بالکل ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں 120/80 ہے۔ میں مطمئن ہو گیا۔ مالدیپ کے سفیر اپنے رفیق کار کے ہمراہ موجود تھے۔ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ادھر میں نے اپنے خاص دوست اور ریاض کے مشہور ڈاکٹر جناب ریاض خواجہ کو فون کیا۔ کیفیت سن کر کہنے لگے: آپ میرے پاس آجائیں، میں دیکھ لیتا ہوں۔مگر آپ کو ''ای سی جی'' کروانی چاہیے۔تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے بیٹے مجھے عبید ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے گئے۔ چند ہی منٹوں میں ڈاکٹر آ گئے۔ میرا معاینہ شروع ہوا۔شام سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نوری صاحب نے کہا: آج ہم آپ کو گھر نہیں جانے دیں گے۔ آپ کو ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑے گا۔تھوڑی دیر بعد بلڈ ٹیسٹ اور ای سی جی رپورٹس آ گئیں۔ اب فیصلہ ہوا کہ مجھے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رہنا ہوگا۔ ڈاکٹرز نے میرے چلنے پھرنے پر پابندی لگا دی۔عکاشہ سے کہنے لگے: آپ کے ابو نہایت مصروف رہنے والے شخص ہیں،مگر اب ان کو دو دن یہیں رہنا ہوگا۔ اگر جانے کے لیے اصرار بھی کریں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔

میری 56 سالہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ہسپتال میں داخل ہو کر رات گزاری۔ دنیا کی بے ثباتی کا ٹھیک اندازہ آدمی کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک مریض کے طور پر ہسپتال میں داخل ہوتا ہے۔حکم ہوا: آپ کو یہاں ہسپتال کا مخصوص لباس پہننا ہوگا۔ جسے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر میں تھا، مشینیں تھیں اور مختلف ٹیسٹ تھے۔ ملاقات پر پابندی لگ گئی۔ ہسپتال میں چونکہ مریض کو تنہائی میسر ہوتی ہے اور دنیاوی

تفکرات سے نجات مل جاتی ہے، لہٰذا اسے محاسبہ نفس کا بھی موقع ملتا ہے۔ کچھ میری بھی الحمد للہ! حالت ایسی ہی تھی۔ کنگ خالد ہسپتال کے پروفیسر محترم ڈاکٹر امیر بخش چنّا صاحب سے میرے کوئی تیس سالہ پرانے تعلقات ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر نوری سے میرے بارے میں مکمل معلومات لے کر آئے تھے۔ فرمانے لگے: فکر کی بات نہیں ہے۔ اگر ''انجیو گرافی'' کی نوبت آتی ہے تو بہتر ہوگا کہ ہم ڈاکٹر محمد عرفہ سے کروائیں۔ وہ میرے معالج بھی ہیں اور پرانے دوست بھی ہیں۔

ڈاکٹر چنّا صاحب نے بار بار ڈاکٹر عرفہ سے رابطہ کیا اور ہفتہ کی شام کو میں ان سے اپنا معاینہ کروا رہا تھا۔ عزیزی عبدالغفار نے بے حد سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ برادرم عارف صاحب اپنی محبت اور پیار نچھاور کر رہے تھے۔ اگلے ایک دو روز فائل مکمل کرنے اور انشورنس کمپنی کے ساتھ دلہ ہسپتال والوں کی مفاہمت میں گزر گئے۔ 10 اپریل منگل کی صبح 9 بجے عزیزی عبدالغفار مجاہد کا فون آ گیا: ابو! اب آپ تشریف لے آئیں۔ ہسپتال والے بار بار پوچھ رہے ہیں کہ مریض کدھر ہے؟ ظہر تک سارے چیک اپ ہوئے۔ نجانے کتنے ٹیسٹ، ہر دس منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی سسٹر سر پر کھڑی رہتی۔ نماز ظہر کی اذان ہوئی اور نرسوں کا غول مجھے آپریشن تھیٹر میں منتقل کرنے کے لیے اُمڈ آیا۔ میں نے کہا: میں تو پہلے نماز ادا کروں گا باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ نماز ظہر کے بعد مجھے سٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ عزیزم عکاشہ مجاہد اور عبدالغفار مجاہد میرے ساتھ چلتے ہوئے آپریشن تھیٹر تک

میں نے کہا: میں تو پہلے نماز ادا کروں گا باقی باتیں بعد میں ہوں گی نماز ظہر کے بعد مجھے سٹریچر پر لٹا دیا گیا۔

گئے۔ صدر دروازے پر نرسوں نے اعلان کیا: بس بھئی لواحقین! اب آپ کی حد ختم ہو گئی۔ اس سے آگے آپ لوگ نہیں جا سکتے۔ بچے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کہہ رہے تھے: ابو جی! اللہ حافظ، کوئی غلطی ہو تو معاف کر دینا۔ ادھر میں ان کو زندگی کے معاملات صاف وشفاف رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

قارئین کرام! آپریشن تھیٹر کوئی سات آٹھ میٹر چوڑا اور پندرہ میٹر لمبا ہو گا۔ اندر دیوہیکل مشینری لگی ہوئی تھی۔ سامنے جہازی سائز کی سکرین نظر آ رہی تھی۔ دو فلپینی نرسیں آئیں اور میرے سٹریچر کو مشین کے قریب لے گئیں۔ ایک ملازم نے پوچھا کہ آپ کا نام؟ میں نے کہا: عبدالمالک مجاہد، کہنے لگا: پورا نام بتائیں؟ عبدالمالک مجاہد محمد یونس۔ میرے جسم پر اب کاغذ کا لباس تھا۔ نرسوں نے کوئی پندرہ منٹ میں تمام مشینوں اور آپریشن تھیٹر کو تیار کر دیا۔ اور اب ڈاکٹر محمد عرفہ کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہنستے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر عرفہ تشریف لائے۔ انھوں نے بھی اپنے ہلکے گرین لباس کے اوپر کاغذ کا گاؤن پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ماسک۔ السلام علیکم! کیسے ہو بھئی مجاہد؟ تم تو بڑے معروف شخص ہو۔ ڈاکٹر اسد اللہ رومی تو بہت مرتبہ آپ کے لیے فون کر چکا ہے، مگر آج صبح میری ہمشیرہ کا فون آیا وہ بھی طب کے شعبے سے منسلک ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں: مجاہد صاحب کا خیال رکھیے گا۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کی ہمشیرہ میری اہلیہ کی دوست محترمہ ڈاکٹر ارجمند صاحبہ کی شاگردہ ہیں۔ انھوں نے اپنی محبتوں اور وفاؤں کا اظہار یوں کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی بہن کو متعدد

ہو سکتا ہے کہ اچانک میں موت کی وادی میں چلا جاؤں۔ کیا میں اس کے لیے تیار ہوں؟

بارفون کر کے میرے بارے میں پورے اہتمام کی تلقین کی۔

قارئین کرام! اب میں مکمل طور پر ڈاکٹر اور نرسوں کے نرغے میں تھا۔ مجھے بتا دیا گیا کہ آپریشن کے دوران ہاتھوں کی جنبش منع ہے۔ سیدھے لیٹے رہنا ہے۔ دونوں رانوں پر کریم سی مل گئی۔ ڈاکٹر عرفہ کی پھرتیاں اب عروج پر تھیں۔ وہ احکامات جاری کر رہے تھے جن پر فوراً عمل ہوتا جا رہا تھا۔ آواز آئی: بسم اللہ۔ ڈاکٹر عرفہ کہنے لگے: ہلکا سا درد ہوگا اور پھر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم میں انجکشن کی سوئی داخل کی ہے۔ درد کا ہلکا ہلکا احساس جاری رہا۔ نہایت تجربہ کار ڈاکٹر اور ان کی ٹیم اپنے کام میں مصروف تھی۔ ادھر میں نے دعاؤں کا مسلسل ورد جاری رکھا۔ کبھی قرآن کریم کی تلاوت، کبھی درود شریف، کبھی مختلف اوراد، مختلف خیالات، بیوی، بیٹے، مرحوم والدین، رشتہ دار، پوتیاں، نواسے، نواسی، بیٹیاں، عزیز دوست اور احباب سب نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ دل ودماغ میں یہ تفکرات کہ کیا یہ میرا آپریشن کامیاب ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ اچانک میں موت کی وادی میں چلا جاؤں۔ کیا میں اس کے لیے تیار ہوں؟ خیالات کا ایک انبار تھا جو مسلسل ذہن میں آتا اور جاتا رہا۔ میں نے ہمت کر کے سر کو اٹھایا سکرین پر میرے دل کی شریانیں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک میرے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ آ گئی:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾

”کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر کرتے ہو۔“[1]

---

[1] الملک 67 : 23.

میں کتنی دیر تک اس آیت کریمہ پر غور کرتا رہا۔ جب میں ان دیوہیکل کمپیوٹرائزڈ مشینوں کو دیکھتا تو سوچنے لگ جاتا: ان کو بنانے والوں نے کتنی محنت کی ہوگی، نجانے کتنے انجینئرز نے ان پر دن رات محنت کی ہوگی۔ ان مشینوں کو بنانے والے تو عظیم ہیں، مگر انسان کو بنانے والا کتنا بڑا اور بلند وبالا ہے۔ میں نے سوچا: اس چھ فٹ کے انسان کی مشینری پر اگر غور کریں تو اللہ تعالیٰ پر ایمان مزید پختہ اور اس کی وحدانیت پر یقین مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور پھر ذہن عقیدہ توحید کی طرف مڑ گیا۔ کیا دنیا بھر کے تمام جھوٹے معبود مل کر انسان کے جسم کا کوئی ایک حصہ بھی بنا سکتے ہیں۔ معمولی سا ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اس کے علاج کے لیے کتنا خرچ اور کتنا اہتمام ہو رہا ہے۔ سبحان اللہ! اس قادر مطلق پر کروڑوں مرتبہ قربان جائیں، اس کا شکر ادا کریں جس نے انسان کو یہ جسم، یہ جان، یہ دل ودماغ اور جسم کا ایک ایک عضو مفت میں عطا فرمایا۔ وہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے در پر دستک دیتے ہیں وہ کتنے جاہل وظالم اور کم عقل ہیں۔ اگر ہم ذرا سا اپنی خلقت پر غور کریں تو کہہ اٹھیں گے: ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾

''بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے عمدہ بنانے والا ہے۔'' (المؤمنون 14:23)

آپریشن شروع ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا تھا، مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میری اسٹنٹنگ (انجیو پلاسٹی) کی جارہی ہے کیونکہ اگر صرف انجیو گرافی ہوتی تو اس کے لیے تو آدھ گھنٹہ ہی کافی تھا۔ میں نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے پوچھ ہی لیا: کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپریشن کس مرحلہ میں ہے؟ Stay with us، ڈاکٹر عرفہ نے جواب دیا۔ آپریشن جاری ہے۔ میرا خیال تھا کہ دل کو حرکت ہوگی آوازیں آئیں گی۔ درد ہوگا مگر یہاں تو احساس تک نہ تھا۔ صرف ٹانگ کے اوپر والے حصہ میں ہلکی ہلکی ٹیسیں ضرور تھیں۔ جو اس

میرا خیال تھا کہ دل کو حرکت ہوگی آوازیں آئیں گی۔ درد ہوگا مگر یہاں تو احساس تک نہ تھا۔

بات کا احساس دلا رہی تھیں کہ میرا آپریشن ہو رہا ہے۔ میں پھر ذکر واذکار اور قرآن کی تلاوت میں مشغول ہوگیا۔ کبھی کبھار ہمت کرکے سر اوپر اٹھاتا۔ الٹی جانب سکرین کی طرف دیکھتا، ہلتے ہوئے دل کی شریانیں میری سمجھ میں نہ آنے والے نقاط نظر آتے اور میں سر نیچے کر لیتا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہے۔ اچانک ڈاکٹر عرفہ کی آواز آئی: «حمدًا للّٰه على سلامتك» آپ کی سلامتی پر اللہ کا شکر ہے۔ شیخ مجاہد آپ کو مبارک ہو۔ آپ کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ الحمد للہ، الحمد للہ! میں نے دوران آپریشن نوٹ کیا: ڈاکٹر عرفہ ہر مرحلہ پر بسم اللہ کہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی دعائیہ جملہ یا دعا بھی ان کی زبان سے نکل جاتی۔

مجھے اشارہ ہوا: اب آپ اپنے ہاتھوں کو سیدھا کر سکتے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا: عبدالمالک کو اس کا نیا دل دکھا دو۔ پھر مجھے آپریشن سے پہلے والا متاثرہ حصہ دکھایا گیا۔ بلاشبہ ایک شریان سکڑی ہوئی تھی۔ اور پھر دوسری تصویر دکھائی گئی۔ اس میں وہی شریان بالکل درست اور صحت مند حالت میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ادا کیا۔ فطری بات ہے میرے چہرے پر طمانینت اور مسکراہٹ تھی۔ ڈاکٹر محمد عرفہ اب جا چکے تھے۔ نرسیں اپنے کاغذی ایپرن اتار رہی تھیں۔ مجھے دوبارہ سٹریچر پر منتقل کیا گیا۔ کوئی پانچ سات منٹ کے بعد ڈاکٹر عرفہ سعودی لباس میں میرے پاس کھڑے مبارک باد اور صحت یابی کی خوشخبری سنا رہے تھے۔ کوئی سوال ہو تو پوچھیے؟ کیا واقعی میرا دل

درست حالت میں ہے؟ بالکل۔ بس تھوڑی سی پرہیز کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر عرفہ کا میں نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے: اللہ کا شکرادا کریں میرے لیے اور امت مسلمہ کے لیے بطور خاص دعائیں کریں۔ امتِ مسلمہ کو دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔

اب کمرے کی طرف میری واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ چند منٹ کے بعد مجھے میرے روم نمبر 207 میں واپس لایا گیا تو بچوں نے نعرہ بلند کیا: ابو مبارک ہو۔ اہلیہ نے بڑھ کر مبارک باد دی، وہ مسلسل اللہ کا شکرادا کر رہی تھی۔ اہلیہ اس پورے عرصہ میں مسلسل دعائیں اور قرآن پڑھتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی سعودی عرب کے مختلف شہروں اور پاکستان سے مبارک باد کے فون آنے شروع ہو گئے۔ ذرا سا اطمینان ہوا تو احباب نے اپنی محبتوں کے دروازے وا کر دیے۔ سب سے پہلے ہمارے سفارت خانے کے ملٹری اتاشی جناب بریگیڈیر حسن جلیل صاحب اپنی اہلیہ کے ہمراہ پھولوں کا گلدستہ اور مٹھائی کے ساتھ تشریف لائے۔ محترم چوہدری بشیر صاحب کامونکی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماشاءاللہ! نہایت لمبے قد کے خوبصورت ساتھی ہیں۔ جتنے وہ قدآور ہیں اتنا ہی قدآور وہ پھولوں کا گلدستہ لے کر آئے۔ احباب آتے رہے، شام تک میرا کمرہ گلدستوں سے بھر چکا تھا۔ مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے ساتھی اپنے اپنے انداز میں محبتوں کا اظہار کر رہے تھے۔ کچھ بنفس نفیس تشریف لائے۔ کچھ نے فون کا سہارا لیا۔ اردو نیوز کے ایڈیٹر طارق مشخص نے فون کیا اور کہنے لگے: شیخ! یہ آپ نے کہاں دل لگا لیا؟ اس مرحلہ سے گزرتے ہوئے احباب کی محبتیں اور چاہتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اگلے دن ہسپتال سے چھٹی مل گئی اور میں گھر پہنچ گیا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْآخِرَةِ.

سعودی عرب کے ولی عہد جناب شہزادہ نائف بن عبدالعزیز حفظہ اللہ سے ایک یادگار ملاقات

یہ رمضان المبارک کے ایام تھے، 24 ستمبر 2008ء کی صبح سحری سے فارغ ہوا ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف پروفیسر ساجد میر صاحب تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی ابھی فون آیا ہے کہ آج رات آپ لوگوں کی وزیر داخلہ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز کے ساتھ مکہ مکرمہ میں ملاقات ہے، اس لیے تیار رہیے گا۔

نماز فجر کے بعد پھر فون آیا، ناظم جمعیت اہلحدیث حافظ عبدالکریم لائن پر تھے۔ انھوں نے کہا: مکتب تنفیذی کی ہدایت ہے کہ آپ لوگ فوراً ریاض ائرپورٹ پہنچ جائیں۔ حافظ عبدالکریم نے کہا: ہم حکومت کے مہمان ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہم وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ وفد میں امیر محترم، ناظم اعلیٰ حافظ عبدالکریم، مولانا علی محمد ابوتراب نائب امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان اور راقم الحروف بحیثیت مدیر علاقات خارجیہ شامل تھے۔

جدہ کے الحمراء سوفٹیل میں ہماری رہائش کا بندوبست تھا۔ اس دوران علامہ ساجد میر نے بتایا کہ آج ہی ہماری میاں نواز شریف سے بھی ملاقات طے ہے۔ ظہر کی نماز کے بعد

مختار عثمانی آ گئے۔ وہ میاں نواز شریف کے ساتھ ملاقات میں ہمارے معاون تھے۔ نماز عصر کے بعد ہم میاں صاحب کے گھر موجود تھے۔ علامہ ساجد میر اور میاں صاحب پاکستان کی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ اس ملاقات میں دونوں جانب سے اس بات پر زور دیا گیا کہ جمعیت اہل حدیث اور مسلم لیگ کے درمیان مستقبل میں مزید ورکنگ ریلیشن شپ کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دونوں ہی رہنما پاکستان کی دگرگوں صورتحال پر مضطرب تھے اور مل کر کچھ کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس موقع پر میں نے میاں صاحب کو اپنی کتابوں کا ہدیہ پیش کیا، آفتاب نبوت کی سنہری شعاعیں، اس ملاقات میں مسلم لیگ کے سینئر رہنما اسحٰق ڈار بھی موجود تھے۔

سعودی عرب کے وزیر داخلہ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز سے ہماری ملاقات رات گیارہ بجے کے بعد طے تھی۔ نماز عشاء کے فوراً بعد وفد کو مکہ مکرمہ لے جایا گیا جہاں ہم وزارت داخلہ پہنچے۔ رات کے ٹھیک بارہ بج کر بیس منٹ پر معالی ڈاکٹر سعد الحارثی نے بتایا کہ سموالامیر نائف بن عبدالعزیز آپ لوگوں کے منتظر ہیں۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو وزیر موصوف نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر وفد کا پر وقار طریقے سے استقبال کیا۔ یہ ایک نہایت خوش گوار لمحہ تھا، علامہ ساجد میر نے اپنی اور ارکان وفد کی جانب سے شہزادہ نائف کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے شرف ملاقات بخشا، جبکہ میزبان کی جانب سے بھی زبردست گرمجوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔ ایک روز قبل ہی سعودی عرب میں قومی دن منایا گیا تھا۔ امیر محترم اور اراکین وفد نے اس مناسبت سے سموالامیر اور پوری سعودی قوم کو اپنی اور پاکستانی قوم کی طرف سے مبارک باد پیش کی۔ سموالامیر نے ہمیں پوری تفصیل اور نہایت دلچسپ انداز میں سعودی عرب کی

تاریخ سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا: ہماری حکومت ایک سلفی حکومت ہے۔ یہاں پر کسی قسم کی بدعات وخرافات نہیں۔ گفتگو میں ہم متعدد دیگر موضوعات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ اچانک شہزادہ نائف نے گفتگو کا رخ پاکستان کی طرف موڑ دیا۔ وہ اسلام آباد میں میریٹ ہوٹل پر ہونے والے بم حملے پر بہت رنجیدہ تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ سعودی عرب نے حکومت پاکستان کو متشددانہ سرگرمیوں کی روک تھام میں تعاون کی پیشکش کی ہے۔ وہ نہایت اپنائیت اور محبت کے جذبات کے ساتھ بتا رہے تھے کہ سعودی عرب ہر دور میں پاکستانی قوم کے ساتھ رہا ہے۔ شہزادہ نائف اپنی گفتگو کے دوران خاص طور پر صدر ضیاء الحق مرحوم کا بھی ذکر لائے اور کہنے لگے: پاکستان کو ابھی کافی جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اس گفتگو میں اندازہ ہوا کہ شہزادہ نائف پاکستان سے کس قدر لگاؤ رکھتے ہیں، وہ پاکستان کے تینوں اطراف میں موجود ممالک کو پاکستان کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ کہنے لگے: ہندوستان تو پاکستان کا دشمن ہے ہی، مگر افغانستان اور ایران میں بھی تشدد پسند عناصر پاکستان کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان ایٹمی قوت کا مالک ہے، یہ یقیناً بڑے اعزاز کی بات ہے۔ پاکستان کے اوپر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا سعودی عرب کی حکومت اور یہاں کے عوام نے پاکستان کی بھرپور مدد کی۔ اس موقع پر وفد کے ارکان نے ڈاکٹر سعد الحارثی کے ادارے کی تعریف کی کہ جب پاکستان میں زلزلہ آیا تو انھوں نے کس طرح وہاں پر ہسپتال بنائے۔ عمارتیں تعمیر کیں۔ پوری کی پوری بستیاں بنا کر لوگوں میں تقسیم کیں۔ نوے منٹ تک جاری رہنے والی اس ملاقات میں عالم اسلام اور اس کو درپیش مسائل پر کھل کر تبادلہ خیال ہوا اور نشست کا اختتام اس عزم کے ساتھ ہوا کہ دونوں مسلم ممالک کے رہنماؤں کو ایسی ملاقاتیں مستقبل میں بھی جاری رکھنی چاہییں۔

بندہ ناچیز کے لیے ایک نامور صحافی کے تأثرات

راقم الحروف کو اپنے بارے میں نہ تو پہلے کوئی بہت زیادہ خوش فہمی تھی نہ آج ہے اور یقیناً آیندہ بھی نہیں ہو گی۔ میں بلاشبہ ایک عام سا آدمی ہوں، میرے ذریعے اب تک جو بھی کام ہوا اور آیندہ بھی جو ہو گا وہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ مجھ سے محبت کرنے والے بعض احباب نے مختلف انداز میں اپنی چاہت کا اظہار کیا، جس کے لیے یقیناً میں ان کا مشکور ہوں، مجھ سے پیار کرنے والوں کی وجہ محبت میری ذات میں کوئی انقلابی کشش نہیں بلکہ یہ دراصل اس مشن سے محبت اور پیار ہے جو دارالسلام کی صورت میں شروع ہوا۔ اور الحمدللہ! آج تقریباً پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ میرے انھی چاہنے والوں میں ایک نام جناب عرفان صدیقی صاحب کا ہے جو پاکستان کے شہرت یافتہ صحافی ہیں۔ پہلے تو تکبیر میں لکھتے تھے، پھر روزنامہ نوائے وقت کے ادارتی صفحے کی زینت بنے اور آج کل وہ روزنامہ جنگ میں اپنے قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ میرے بارے میں انھوں نے جو لکھا میں اس کے لیے ان کا مشکور ہوں، اس تحریر کو قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

دارالسلام سے سوئے مدینہ

عرفان صدیقی...... نقش خیال...... روزنامہ جنگ 19 اپریل 2010ء

میرے لیے ریاض کی ایک خصوصی کشش دارالسلام اور اس کے منتظم عبدالمالک مجاہد ہیں۔ ریاض کا قصد کرتے ہی میرے ذہن میں ایک عظیم الشان طباعتی ادارے کا تصور ابھرتا ہے جس نے 23 برس قبل ایک بہت ہی چھوٹے سے پبلشنگ ہاؤس کے طور پر آنکھ کھولی تھی اور آج وہ جوانی کی بھرپور دہلیز پر قدم رکھ چکا ہے۔ ایک شخص کے عزم راسخ، مستقل مزاجی اور ہمت شعاری کی یہ داستان میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، لیکن ہر بار یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ کہانی پہلی بار کہی جارہی ہے۔ خطاطوں کے معروف گھرانے میں پیدا ہونے والے عبدالمالک مجاہد نے بھی خطاطی کا فن سیکھا اور سعودی عرب کی وزارت دفاع میں خوشنویس کے طور پر نوکری کر لی۔ تب گوجرانوالہ کے چھوٹے سے گاؤں کیلیانوالہ کے باسی عبدالمالک کے حاشیہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آنے والے چند برسوں میں وہ عالم اسلام کے ایک معروف اشاعتی ادارے کا سربراہ ہوگا اور یہ ادارہ اسلامی علوم بالخصوص قرآن وحدیث کے فروغ کا قابل ذکر سرچشمہ بن جائے گا۔

قدرت جب لالے کی حنابندی کرنے پر آتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہونے لگتے ہیں اور سینہ سنگ میں بھی کونپلیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ ملازمت کے دنوں میں

عبدالمالک کو ایک رپورٹ کے ذریعے معلوم ہوا کہ عیسائیت کے فروغ کے لیے قائم لبنان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے کی مالکہ ایک عیسائی خاتون ہے۔ اس خبر یا اطلاع میں بظاہر چونکا دینے والی کوئی بات نہ تھی، لیکن یکا یک عبدالمالک کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی جو بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ دیر تک روتا اور سوچتا رہا: کیا میں اس عیسائی خاتون سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے دین حق کے فروغ کے لیے کچھ نہیں کر رہا۔ یہی وہ دن تھا جب پہلے پہلے عبدالمالک مجاہد کے دل میں اسلامی کتب کی اشاعت کے لیے ایک طباعتی ادارے کے تصور نے انگڑائی لی اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس تصور کو عملی سانچے میں ڈھالنے کی تدابیر کرنے لگا۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بڑے کام کے لیے چن لیا تھا۔ 1988ء میں عبدالمالک نے چند مخلص رفقاء کی مدد سے چھوٹا سا کتاب گھر قائم کیا۔ 1992ء میں اسے دارالسلام کا نام دیا گیا۔ سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں قائم یہ ادارہ ابر بہار سے سیراب ہونے والے پودے کی طرح تیزی سے نمو پانے لگا اور آج وہ بلاشبہ نجی شعبے کا ایک عظیم ادارہ بن چکا ہے جس کی خدمات کا دائرہ مسلسل پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ عبدالمالک مجاہد اپنے آپ کو خوش نصیب خیال کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہے اور ایسے مخلص، محنتی اور باصلاحیت افراد کی ایک ٹیم بھی، جس کے بغیر اس درجہ و مقام کے ادارے قائم ہو سکتے ہیں نہ اتنی مختصر مدت میں اس قدر بیش بہا کام کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے کسی کالم میں عبدالمالک مجاہد کو ایک ادارہ قرار دیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں کہ ہمارے ہاں کے تو ادارے بھی اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ شرکاء کے اہتمام میں قائم ہونے اور تنخواہوں کے آشوب میں مبتلا اہلکاروں کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے ادارے سفید

ہاتھی کی طرح فنڈ ز ہڑپ کرنا تو جانتے ہیں لیکن ان کی فرد عمل خالی ہی رہتی ہے۔

دارالسلام دنیا کی مختلف زبانوں میں ایک ہزار سے زائد انتہائی معیاری کتب شائع کر چکا ہے جن کے لاکھوں نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔ اب تک قرآن کریم کے اٹھارہ زبانوں میں ترجمے شائع ہو چکے ہیں ان میں اردو، انگریزی، ہسپانوی، ہندی، بنگالی، پشتو، فرانسیسی، ملیباری، تامل، ترکی، انڈونیشی، البانوی، فلپائنی، نیپالی، سندھی، فارسی اور سواحلی زبانیں شامل ہیں۔ دس مزید زبانوں کے تراجم اس سال کے اختتام تک مکمل ہو جائیں گے جن میں تلگو، مراٹھی، صومالی، چینی، گجراتی، پنجابی، ہوسا، سنھالی، یوروبا اور امھاری زبانیں شامل ہیں۔

دنیائے اسلام میں کسی ریاستی یا غیر ریاستی ادارے کے بارے میں کم از کم میں نہیں جانتا جس نے قرآن کریم کے اتنے تراجم شائع کیے ہوں۔ ادارے کے مرتب کردہ منصوبہ کار کے مطابق 2012ء کے اختتام تک دنیا کی چالیس زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم شائع ہو جائیں گے۔ کالم کی تنگ دامانی مانع ہے ورنہ میں بتاتا کہ عبدالمالک مجاہد نے درست اور معیاری ترجمے کے لیے کتنا کڑا نظام وضع کر رکھا ہے اور اس ضمن میں وہ خود ذاتی طور پر کتنی محنت و کاوش کرتے ہیں۔

حال ہی میں دارالسلام نے کتب ستہ، یعنی احادیث کی چھ بنیادی کتابوں کے انگریزی تراجم شائع کیے ہیں۔ یہ سارا سرمایہ 38 جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اب ان کے معیاری اردو ترجمے کا سلسلہ تکمیل پذیر ہے، قرآن کریم اور سیرت نبوی کے اٹلس انتہائی خوبصورت انداز میں شائع کیے گئے ہیں۔ اٹلس فتوحات اسلامیہ کا ذکر میں پہلے بھی کہیں کر چکا ہوں۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کی فتوحات کا یہ انسائیکلو پیڈیا اپنی

نوعیت کی انتہائی عظیم کاوش ہے۔ بچوں کے لیے دارالسلام نے ایک خصوصی شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ اسلامی فکر کی تہذیب و تربیت کے لیے اتنا عمدہ اور دلکش لٹریچر شاید ہی کسی دوسرے ادارے نے شائع کیا ہو۔ سب سے اہم بات یہ کہ دارالسلام کی شائع کردہ کتب انتہائی اعلیٰ طباعتی معیار کی حامل ہیں۔ اس معیار کو برقرار رکھنے کے لیے اٹلی، لبنان، سعودی عرب، چین اور پاکستان کے طباعت گھروں کی خدمات سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ دارالسلام کا نیٹ ورک سعودی عرب کے متعدد شہروں کے علاوہ متحدہ عرب امارات، برطانیہ، کوالالمپور، ہیوسٹن، نیویارک اور کینیڈا تک پھیلا ہوا ہے، دنیا کے 28 ممالک میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔

بلاشبہ عبدالمالک مجاہد برسر جہاد ہے، اس کے سر میں ایک سودا سمایا ہوا ہے اور ایسے کام کے لیے سودائیوں ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے کرشمے کسی صاحب جنوں کے ہاتھوں ہی جنم لے سکتے ہیں۔ میں ریاض میں قیام کے دوران دو بار انھیں ملا۔ دونوں بار یہ تأثر لے کر اٹھا کہ معجزۂ فن کی نمود خون جگر ہی سے ممکن ہے۔ عبدالمالک مجاہد ایک مشن کو اپنے جگر کا خون دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے عزم کو جواں رکھے۔

نوٹ: یہ مضمون 2010ء میں شائع ہوا تھا، اس وقت تک دارالسلام سے مختلف زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کی تعداد ایک ہزار تھی، تاہم اب تک، یعنی ستمبر 2014ء تک ماشاءاللہ! دارالسلام سے چودہ سو سے زائد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اسی طرح اب تک دارالسلام قرآن کریم کے اٹھائیس زبانوں میں تراجم شائع کر چکا ہے۔

ایک انوکھی مگر سنہری تقریب

انسان کی زندگی میں نشیب وفراز آتے رہتے ہیں۔ مسلمان ہر حال میں اپنے رب کی طے شدہ تقدیر پر صابر وشاکر رہتا ہے اور قضاوقدر پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ میری زندگی کے مشکل ترین اوقات میں جس طرح ہماری برادری کے افراد نے میرے ساتھ محبت اور الفت کا اظہار کیا اور میرے لیے ڈھیروں دعائیں کیں، اس کا صلہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

میری اہلیہ محترمہ انیسہ فردوس نے اس دوران جس صبر واستقلال کا مظاہرہ کیا اور میرے کیس کی مسلسل پیروی کی، بچوں کی تربیت کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں، مختلف ذمہ داران سے رابطہ رکھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی تجویز، کوئی نیا راستہ اور کوئی نیا طریقہ اپنایا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عزیزوں کی محبتوں اور دعاؤں کا نتیجہ برآمد ہوا۔ مجھے بچوں نے بتایا کہ اس دوران والدہ کے چہرے پر ہم نے کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی۔

میں نے ایک دن اہلیہ سے کہا: مدرسہ ضحیٰ العالیہ سے تم تنخواہ لے لیا کرو۔ تو جواب ملا کہ وہ تو اللہ ہی سے لوں گی۔ میں گویا ہوا: تو پھر تمھیں جیب خرچ دیا کروں گا۔ اس ماہ سے

آپ کی تنخواہ تین ہزار ٹھہری اور ہاں! لوگوں کی تنخواہ سال بعد بڑھتی ہے لیکن آپ کی تنخواہ میں ہر ماہ سوریال کا اضافہ ہوگا۔ بات تو شغل اور مذاق میں شروع ہوئی، مگر میں سنجیدہ تھا۔ چنانچہ فروری 2009ء سے تین ہزار ریال تنخواہ شروع کر دی گئی۔ مارچ میں اس میں سوریال کا اضافہ ہوا اور یہ رقم 3100 بن گئی اور اس طرح یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

ماہ جون میں جب میں سرکاری مہمان بنا تو یہ سلسلہ مجبوراً منقطع ہوگیا۔ جب میں گھر واپس آیا تو پانچ، چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اس اللہ کی بندی کا کہنا تھا: مجھ سے ہر چیز لے لیں مگر مجھے مجاہد صاحب واپس چاہییں۔ پھر انھوں نے اس وقت کے وزیر داخلہ امیر نائف بن عبدالعزیز کو امیر جمعیت اہل حدیث کے ذریعہ ایک پیغام ارسال کیا کہ میرے خاوند نے گزشتہ رمضان المبارک میں آپ کو حدیث کی کتب کا مجموعہ بطور ہدیہ پیش کیا تھا، اس رمضان میں آپ مجھے میرا خاوند ہدیہ کر دیں، اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو۔ پروفیسر ساجد میر صاحب نے جب ان کو پیغام دیا تو انھوں نے خوشی اور تعجب کا اظہار کیا اور کہا: ہم ضرور اسے ہدیہ کریں گے۔

میں نے سوچا کہ اس وفاداری کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور ملنا چاہیے۔ میرے ایک سعودی دوست، جن کا نام یوسف الحزیم ہے، نے اپنی غیر معمولی خوشی کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ جب میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو اپنے سیکرٹری کو بلوا کر کہنے لگے: ریاض کی سب سے اعلیٰ بیکری سے کیک لایا جائے۔ کم وبیش آدھ گھنٹہ بعد شہر ریاض کی سب سے اعلیٰ اور مہنگی بیکری سے چاکلیٹ سے بھری ٹوکری میرے سامنے رکھ دی گئی۔ میں چاکلیٹ بالکل نہیں کھاتا، مگر جب اس دن میں نے چاکلیٹ کو چکھا تو محسوس ہوا کہ واقعی اعلیٰ قسم کے چاکلیٹ بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔ طلحہ کو بڑے پسند ہیں۔ انیسہ نے بہت سے

چاکلیٹ طلحہ کے لیے چھپا دیے کہ وہ اگلے ماہ انگلینڈ سے آرہا تھا۔ ڈاکٹر یوسف جو ایک فائیوسٹار ہوٹل کے مینجنگ ڈائریکٹر بھی ہیں، ایک دن کہنے لگے: آپ کبھی اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہمارے ہوٹل ڈنر کے لیے آئیں، آپ کو یقیناً مزا آئے گا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سارے لوگوں کو اعزازات سے نوازا ہے، انھیں شیلڈیں پیش کیں ہیں، مگر اپنے گھر کے کسی فرد کو یہ اعزاز نہیں بخشا اور پھر میرا ذہن اس طرف مڑ گیا کہ مجھے اپنی غم گسار اہلیہ کو ایک اعزازی شیلڈ پیش کرنی چاہیے۔ میں نے اگلے دن عکاشہ اور عبدالغفار کو اعتماد میں لیا اور کہا: تمھاری ماں کو علم نہیں ہونا چاہیے کہ اسے شیلڈ مل رہی ہے تاکہ اسے سرپرائز دیا جاسکے، وہ شام میری زندگی کی نہایت اہم اور خوبصورت شام تھی جب میں اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ فائیواسٹار ہوٹل میں ڈنر کررہا تھا۔ ہوٹل والوں نے خصوصی طور پر ایک کارنر ہمیں دے دیا تھا، پردہ کا مکمل اہتمام تھا، انیسہ کو معلوم ہوگیا تھا کہ آج کی تقریب اس کے اعزاز میں ہورہی ہے۔

تلاوت قرآن کریم سے اس پروقار اور یادگار تقریب کا آغاز ہوا، میں نے بچوں کو اشارہ کیا، انھوں نے شیلڈ کا پیکٹ کھولا، میں نے خوبصورت شیلڈ نکالی اور انیسہ کو پیش کی اور جو کچھ اس پر لکھا تھا وہ سب کو پڑھ کر سنایا، میں نے لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے مشن کی ساتھی، میری وفا شعار رفیقہ حیات انیسہ فردوس، جس نے میری زندگی کے ''مشکل ترین'' لمحات میں بے مثال صبر وثبات، استقامت واستقلال، احساس ذمہ داری، مخلصانہ دعاؤں اور سچی وفاداری کا شاندار مظاہرہ کیا ہے، یہ اعزازی شیلڈ میں ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور غمگساری کے اعتراف میں پیش کررہا ہوں۔ خوشی کے اس موقع پر

میں اس عظیم خاتون کو ''ام الوفاء'' کے خطاب سے نوازتے ہوئے فخر اور خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

﴿ إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾

پھر میں نے پچیس ہزار نو سو ریال کی خطیر رقم انیسہ کو پیش کی۔ بچوں نے اپنی والدہ کو پھولوں کا گلدستہ پیش کیا اور پھر اچانک انھوں نے ایک بیش قیمت انگوٹھی اپنی امی کے ہاتھ میں پہنا دی۔ ادھر انیسہ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے اپنے اس اعزاز پر شکریہ ادا کیا۔ طلحہ نے خوبصورت کمپیئرنگ کی اور بچوں نے اس تقریب کی مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ ایک شاندار عشائیہ تھا جس میں کم و بیش چالیس کے قریب مختلف ڈشیں تھیں۔ بچے ہمیں ہماری ٹیبل پر سروس مہیا کرتے رہے۔ ہوٹل والوں نے بڑی ٹیبل کے اردگرد پردہ لگا رکھا تھا تاکہ گھر کے افراد پورے اطمینان سے کھانا کھا سکیں۔ انیسہ نے اپنے بڑے داماد فیصل کو اپنے پاس بلوایا اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہنے لگی: تم نے سب سے زیادہ میرا خیال رکھا، گھنٹوں میرے پاس بیٹھے رہتے اور تسلی دیتے۔ اسے دو ہزار ملا، پھر بیٹیوں، بیٹوں، نواسوں اور پوتی سب کو حصہ ملا۔ طلحہ نے گاڑی خریدنی تھی اس کو پندرہ ہزار ملے۔ اس طرح انیسہ نے کھڑے کھڑے ساری رقم وہیں تقسیم کر دی اور اس طرح محبتوں اور خوشیوں سے بھری یہ تقریب رات کے گیارہ بجے دعائیہ کلمات کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ بچوں کا کہنا تھا کہ ابو ہم نے پہلی مرتبہ اس قسم کی تقریب میں شرکت کی ہے جس میں صرف خاندان کے افراد تھے اور بڑے ہی محبت بھرے ماحول میں ہم نے ڈنر کیا ہے۔

مولانا حکیم محمد ادریس فاروقی

......کچھ یادیں کچھ باتیں

محترم مولانا محمد ادریس فاروقی صاحب، جنھیں اب رحمہ اللہ لکھتے ہوئے کلیجہ لرزتا ہے، سے میرے چار رشتے تھے۔ سب سے پہلا رشتہ دین کا، اسلام کا، عقیدہ کا اور ذہنی ہم آہنگی کا تھا۔ دوسرا رشتہ اس وقت قائم ہوا جب 1969ء میں ہماری باجی عصمت کی ان سے شادی ہوئی۔ ان کی اہلیہ رشتہ میں میری سگی خالہ زاد اور چچا زاد ہیں۔ میں نے فاروقی صاحب کو دیکھا، بڑا خوبصورت چہرہ، سفید رنگ، قدرے درمیانہ قد، شیروانی میں ملبوس فاروقی صاحب بڑے اچھے لگے۔ ان کے والد محترم حافظ محمد یوسف کی خوشیاں دیکھنے والی تھیں کہ آج ان کے بیٹے کی شادی تھی۔ فاروقی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

شادی کے فوراً بعد وہ باجی کے ہمراہ ہمارے گھر حافظ آباد تشریف لائے۔ والدہ محترمہ نے ان کو ضیافت پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جب رشتہ طے ہو رہا تھا تو مجھے والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ فاروقی صاحب جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے فارغ التحصیل ہیں اور ان کا خاندان بڑا معزز و محترم ہے، وہ کوئٹہ میں خطیب ہیں۔

فاروقی صاحب کوئٹہ میں تھے، وہ وہاں کی اہل حدیث مسجد کے امام اور خطیب تھے۔

کوئٹہ میں اس وقت اہل حدیث بھائیوں کے لیے ایک ہی مسجد تھی۔ میں ان کی موجودگی میں ایک مرتبہ کوئٹہ گیا۔ یہ 1976ء کی بات ہے، اس سے پہلے میں نے کبھی کوئٹہ نہیں دیکھا تھا۔ کوئٹہ میں فاروقی صاحب نے خوب سیر کروائی۔ ان دنوں حافظ عبدالوحید صاحب (آف امریکہ) بھی وہیں مقیم تھے۔ ان کے پاس نئی نویلی موٹر سائیکل تھی۔ انھوں نے بھی حق ضیافت ادا کیا اور کئی مقامات پر اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے گئے۔ حافظ عبدالوحید صاحب کا بیٹا بابر ماشاءاللہ بڑا خوبصورت اور پیارا بچہ تھا۔ اس سے نام پوچھتے تو کہتا: میرا نام بابو ہے۔ آج کل وہ دارالسلام ہیوسٹن کا منیجر ہے۔

فاروقی صاحب سے میرا تیسرا رشتہ اس طرح قائم ہوا کہ 1982ء کے آخر میں مولانا محمد سلیم صاحب کی دختر سے میری شادی ہوگئی اور ہم دیگر رشتوں کے علاوہ ہم زلف بھی بن گئے۔

وزیر آباد سے سیالکوٹ جانے والی سڑک سے قدرے فاصلے پر سوہدرہ کا قصبہ واقع ہے۔ کم وبیش ایک یا ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کریں تو سڑک پر ایک چھوٹی سی ''نئی بستی'' آتی ہے۔ اس میں اہلحدیثوں کی کوئی مسجد نہ تھی۔ یہ 1986ء کی بات ہے۔ ابھی دارالسلام کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ میرے والد صاحب وفات پا چکے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں ان کی طرف سے مسجد تعمیر کرواؤں۔ چنانچہ میں نے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرنا شروع کی۔ میرے پاس 80 ہزار روپے جمع ہوگئے جو کہ میرے لیے ایک خطیر رقم تھی۔ میں نے یہ مبلغ ان کے حوالے کر دی اور انھوں نے اس رقم سے مسجد کے لیے زمین خرید لی۔

ان کو ''نئی بستی'' والی مسجد کی تعمیر کا مسلسل خیال رہتا تھا اور مجھے بڑے تواتر سے اس

طرف توجہ دلاتے رہتے، چنانچہ میرے توسط اور ایک فاعل الخیر کے تعاون سے مسجد بدریہ اہلحدیث کی تعمیر شروع ہوگئی۔ وہ شاید اس مسجد کو علاقے کی سب سے بڑی مسجد بنوانا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ علاقے کے اعتبار سے ایک بڑی مسجد ہے۔ مجھے اب بھی اس مسجد کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے کہ اس کی زمین میں نے اپنے والد محترم کی طرف سے خریدی تھی۔

فاروقی صاحب سے میرا چوتھا رشتہ یہ بنا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے سمدھی بن گئے۔ میری سب سے بڑی بیٹی کی شادی محترم فاروقی صاحب کے بیٹے عزیزی فیصل سلمہ اللہ سے ہوئی۔ اس طرح ہمارے تعلقات اور قربت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

میں یہ الفاظ بار بار کہنے پر مجبور ہوں کہ واقعی وہ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ اس طرح کے نئے رشتے کے بندھن کے بعد عموماً گھرانوں میں شکر رنجیاں پیدا ہو جاتی ہیں، مگر ہمارا گھرانہ الحمد للہ! اس لیے منفرد ہے کہ ہمارے ہاں پیار اور محبتوں میں اضافہ ہوا۔ اپنی تمام تر مصروفیت کے باوجود فاروقی صاحب سے ملاقاتیں اور خط و کتابت جاری رہی۔

فیصل کو میں نے اکثر اوقات ایک ہی نصیحت کی کہ اپنے والدین کے فرماں بردار رہنا۔ میرے نزدیک کسی بھی شخص کی کامیابی کی چابی والدین کی رضا ہے۔ اپنی بیٹی سے جب بھی ملاقات ہوتی، میں اس سے فاروقی صاحب اور باجی کے بارے میں پوچھتا اور اس کو اپنی ساس اور سسر کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتا۔

میرا فیصل سے اکثر سوال ہوتا کہ ابو کو پیسے بھیجے ہیں؟ وہ الحمد للہ اثبات میں سر ہلا دیتا۔ میں فیصل سے یہی کہتا: دیکھو بیٹا! اگر تمھارے پاس پیسے کم پڑ جائیں تو مجھ سے لے لینا، مگر

والدین کی ہر خواہش پوری کرنا۔ اگر میں یہ الفاظ لکھوں تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ سوہدرہ کے لوگوں نے فاروقی صاحب کی وہ عزت نہ کی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس بات کا مجھے قلق تھا، تاہم ہماری برادری میں ان کی حیثیت ایک داماد کی تھی، برادری میں ان کی ایک عزت اور وقار تھا۔ جب وہ میرے سمدھی بن گئے تو اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

یہ ان کا ذاتی شوق تھا اور ان کی خاندانی روایات کہ انھوں نے ضیائے حدیث نامی ایک ماہانہ پرچہ کا اجرا کیا۔ انھوں نے ایک مدت تک اس پرچہ کی آبیاری کی۔ عموماً دینی پرچے نکالنا، مادی اعتبار سے خسارہ کا سودا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اخروی اعتبار سے یقیناً منافع بخش سودا ہے۔ وہ خود ہی اس کے چیف ایڈیٹر، اس کے ناشر، اس کے ڈسٹری بیوٹر اور اس کے سرمایہ کار تھے۔ ضیائے حدیث ان کا شوق تھا۔ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ خود ہی اس کے مضامین لکھتے تھے۔ مضمون نگاروں سے رابطہ کرتے غرضیکہ ہر کام وہ خود کرتے تھے۔ یہ پرچہ بڑا عمدہ اور خوبصورت ہے جس میں مذہبی، سیاسی، تاریخی، علمی، ادبی، اخلاقی، اصلاحی اور طبی مضامین ہوتے ہیں۔ یعنی ہر ذوق کا قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ پرچہ انھوں نے کوئٹہ سے آنے کے بعد 1991ء میں شروع کیا۔ عزیزی فیصل اور نجم گھر کے اخراجات کے لیے جو بھی رقم اپنے ابو کو بھجواتے اس کا اکثر حصہ اس پرچے کی نظر ہو جاتا۔ انھوں نے اس کو زندہ رکھنے کے لیے قرض کا سہارا بھی لیا جس کا علم مجھے کافی عرصہ بعد ہوا۔

فروری 2010ء میں ایک دن میں نے فاروقی صاحب سے کہا: دیکھیے جناب! آپ کا پرچہ ہم خرید لیتے ہیں، اگر منافع ہوگا تو آپ کا اور اگر خسارا ہوا تو میں پورا کر دوں گا...... بس اگلے چند لمحات میں برادرم حافظ عبدالعظیم کے توسط سے ہر چیز طے ہوگئی۔ پرچہ کے

جتنے قرضے ہیں وہ دارالسلام ادا کرے گا اور وہ اب اس کا مالک ہوگا، مگر اس کی انتظامیہ وہی رہے گی۔ فاروقی صاحب اس کے چیف ایڈیٹر ہوں گے۔ میں کئی مرتبہ سوچتا ہوں کہ ضیائے حدیث واقعی فاروقی صاحب کی جان تھی۔ نامساعد حالات کے باوجود وہ اس کو چلا رہے تھے، نہ صلہ کی تمنا، نہ مال و دولت کی خواہش، محض اللہ کی رضا ان کے پیش نظر تھی۔

فاروقی صاحب شریف آدمی تھے، میرے اللہ کو بھی ان کا کام پسند تھا۔ نہ انھوں نے کبھی ہم سے کہا: پرچہ خرید لیں نہ ہم نے کبھی سوچا۔ اب ضیائے حدیث دارالسلام کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ فاروقی صاحب کے لیے ایک دفتر خالی کروا لیا گیا۔ ان کو ایک دو معاون اور ایک کمپیوٹر مع آپریٹر مہیا کر دیے گئے اور عزیزی نعمان تو ایک مدت سے ان کے ساتھ معاون ایڈیٹر تھے۔

فاروقی صاحب دفتر کے اوقات کی اہتمام سے پابندی کرتے تھے۔ اپنی کتاب ''مقامِ رسالت'' کو دوبارہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کی نظر ثانی کا کام مولانا ارشد کمال صاحب کو دے رکھا تھا۔ وہ 5 جون 2010ء تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دارالسلام آئے اور فاروقی صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ ایک کے بعد دوسرا صفحہ نکالا، تیسرے کی باری تھی کہ ایسے محسوس ہوا جیسے تیز ہچکی لگی ہو، وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ بیٹا حافظ نعمان فاروقی فوری پہنچا۔ ابو جی!...... ابو جی!...... پکارتا رہا، مگر جواب نہ ملا۔ حافظ عبدالعظیم کو اطلاع دی۔ واپس پہنچے تو فاروقی صاحب اپنی کرسی ہی پر دارِفنا کو الوداع کہہ چکے تھے۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون.

اللہ کے رسول ﷺ کی عظمت، شان اور ان کے مقام رسالت پر کام کرتے ہوئے علوی خاندان کے اس نامور سپوت کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ ان شاء اللہ

مسجد نبوی کی لائبریری میں دار السلام کی کتب

مسجد نبوی میں اگر آپ باب ملک فہد کے سامنے کھڑے ہیں تو آپ کا منہ جنوب کی طرف ہوگا۔ مکہ مکرمہ جنوب کی طرف ہے۔ آپ کی دائیں طرف مغرب ہوگا اور مغربی جانب گیٹ نمبر دس کے اوپر یہ عظیم الشان لائبریری مسجد کی چھت پر قائم کی گئی ہے۔ چھت پر پہنچنے کے لیے برقی سیڑھیاں ہیں جو دو تین منٹ میں آپ کو لائبریری تک پہنچاتی ہیں۔

راقم الحروف کی بڑی دیر سے تمنا تھی کہ دار السلام کی شائع کردہ کتب کو مسجد نبوی کی لائبریری میں رکھا جا سکے، اس کے لیے کچھ عرصہ سے کوششیں جاری تھیں۔ پھر رمضان 1432ھ کے شروع میں دار السلام مدینہ برانچ کے مینیجر عزیزی منیب کبریا کا فون آ گیا: الحمدللہ! ہماری کتب کو لائبریری میں رکھنے کی منظوری مل چکی ہے اور ہم نے فوراً کتب مہیا کر دی ہیں۔ میں اس سے پہلے عزیزم کو کہہ چکا تھا کہ اگر ہماری کتب کو مسجد نبوی میں جگہ ملتی ہے تو ہمارے لیے اس سے زیادہ خوشی اور اعزاز کی کوئی بات نہ ہوگی۔ ادارہ کی شائع شدہ ہر کتاب کے دو یا تین نسخے ہم عطیہ کریں گے۔ واقعی جس وقت مجھے یہ اطلاع ملی میں نہایت شاداں و فرحاں تھا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو اور زبان پر اللہ رب العزت کا شکر اور تعریف تھی کہ میری دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ ہمیں وہ دن بھی نصیب ہوا جس میں دار السلام کی کتب کو مسجد نبوی میں رکھا گیا۔ مکتبہ مسجد نبوی کے ذمہ داران نے اس خواہش

کا اظہار کیا کہ اگر دارالسلام کے مسئولین خود آئیں تو ہمیں ان سے ملاقات کر کے خوشی ہوگی۔ عزیزم منیب کبریا نے مجھے انتظامیہ کا پیغام پہنچا دیا۔

میں نے شروع رمضان ہی میں 22 رمضان المبارک 1432ھ بمطابق 22 اگست 2011ء پیر کی صبح کی فلائٹ سے ٹکٹ بک کروا رکھا تھا۔ مسجد کی انتظامیہ سے اسی شام ساڑھے پانچ بجے ملاقات کا وقت طے تھا۔ یہ لائبریری مسجد کی چھت پر قائم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب یہ باب مجیدی کے قریب ہوتی تھی۔

مسجد نبوی شروع دن ہی سے مدینہ منورہ میں علم کا مرکز رہی ہے۔ اسلامی دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی اصحاب صفہ کی تھی۔ مسجد نبوی میں موجودہ لائبریری کا آغاز شاہ سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور 1352 ہجری سے ہوتا ہے۔ اس وقت مدینہ منورہ کے مدیر اوقاف سید عبید مدنی نے تجویز پیش کی کہ مسجد نبوی میں ایک عمدہ لائبریری قائم کی جائے، چنانچہ ان کی تجویز پر لائبریری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جس کے پہلے مدیر سید احمد یاسین خیاری تھے۔ اس مکتبہ کے لیے بہت سارے لوگوں نے اپنی کتب وقف کیں۔ اس دور کے وزیر الشیخ محمد العزیز کی کتب بھی ان میں شامل ہوئیں، جنھوں نے اپنا بیش قیمت مکتبہ مسجد نبوی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ روضہ شریفہ کے قریب بھی بہت سی قدیم اور نادر کتب تھیں جن کو اس لائبریری میں شامل کر لیا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگ اس مکتبہ میں کتب ہدیہ کرتے رہے۔ حکومت نے خود بھی بہت ساری کتابیں خرید کر اس میں رکھی ہیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ذمہ داران ہمارے منتظر تھے۔ برادر عزیز فارس بن محمد الجرباع نے ہمیں گلے لگایا۔ جناب محمد حسن العبیدی نے معانقہ کیا اور وفد کو خوش آمدید کہا۔ ان کا کہنا تھا: اس لائبریری کے مدیر مسئول جناب شیخ عبید صالح العبید آپ لوگوں کا نیچے اپنے دفتر میں انتظار کر رہے

ہیں۔سیڑھیوں سے نیچے اتر کر شیخ عبید کے دفتر میں پہنچے تو انھوں نے بڑی محبت واخلاص سے روایتی انداز میں وفد کا خیر مقدم کیا اور 900 سے زائد کتب کا عطیہ مسجد نبوی کی لائبریری کے لیے پیش کرنے پر دارالسلام کا شکریہ ادا کیا۔وہ میرے آنے سے پہلے ہمیں شکریہ کا لیٹر بھی روانہ کر چکے تھے۔

قارئین کرام! یقیناً یہ میری زندگی کے سنہرے لمحات تھے۔اس سے زیادہ شرف اور اعزاز کیا ہوسکتا ہے کہ کسی ادارے کا تعلق مسجد نبوی سے قائم ہو جائے۔اب انھوں نے ہمیں اس مکتبہ کا مکمل تعارف کروانا شروع کیا کہ اس وقت اس لائبریری میں ایک لاکھ سے زائد کتابیں ہیں۔358 سے زائد الماریوں میں سجائی گئی یہ کتابیں انتہائی جدید انداز میں لگائی گئی ہیں۔تمام کتابوں کا ڈیٹا کمپیوٹر میں محفوظ ہے۔لائبریری میں 320 کرسیاں ہیں۔جہاں علم کے رسیا بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔لائبریری میں داخلہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے۔تقریباً ہر روز اس لائبریری کی کتابوں سے ہزار سے بارہ سو لوگ استفادہ کرتے ہیں۔موصوف نے بتایا: ہمارے مکتبہ میں انگلش اور اردو کتب کی کمی تھی جو دارالسلام کی کتابوں سے بہت حد تک پوری ہوگئی ہے۔راقم الحروف نے دارالسلام کا مکمل تعارف کرواتے ہوئے کہا: ہمارے ادارے نے الحمدللہ اب تک دنیا کی 25 زبانوں میں اسلامی لٹریچر شائع کیا ہے۔ہمارے میزبان دارالسلام سے بخوبی واقف تھے،مگر پھر بھی انھوں نے مختلف سوالات کے ذریعہ مزید معلومات حاصل کیں۔

یہاں قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے عرض کروں گا کہ آج سے بارہ تیرہ سال قبل جب دارالسلام نے فتح الباری کا نسخہ شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو میری خواہش تھی کہ اس کا مقارنہ نواب صاحب کی شائع کردہ فتح الباری سے کیا جائے۔میرے علم کی حد تک اس کا

ایک نسخہ پاکستان میں دارالحدیث جلال پور پیروالا میں اور ایک نسخہ ماموں کانجن کے مدرسہ میں موجود تھا۔ میں نے دارالحدیث محمدیہ جلال پور کے ناظم شیخ محمد رفیق اثری حفظہ اللہ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ ہمیں یہ نسخہ مقارنہ کے لیے درکار ہے۔ اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے فوراً کہا کہ آپ بڑے شوق سے اسے سعودی عرب لے جائیں۔ چونکہ یہ نسخہ بڑا نادر تھا اور سعودی عرب میں لانے سے اس کے ضائع ہونے کا خدشہ تھا، اس لیے میں نے عرض کیا کہ آپ کی نگرانی میں اس نسخہ کا مقارنہ دارالحدیث محمدیہ جلال پور ہی میں ہوگا، چنانچہ ان کی نگرانی میں حدیث کے اساتذہ اور طلبا نے بڑی محنت سے اس کا مقارنہ کیا۔ آج میں یہ لکھتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت دارالسلام کا فتح الباری کا شائع شدہ نسخہ سب سے زیادہ معتمد اور اغلاط سے پاک ہے۔ مدینہ یونیورسٹی کے اساتذہ اس نسخہ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس طرح فتح الباری کا پندرہ جلدوں پر مشتمل یہ طبع ہزاروں کی تعداد میں ہر سال دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ جاتا ہے۔

قرآن کریم کے بعد اس لائبریری میں سب سے زیادہ اہمیت کتب حدیث کو دی گئی ہے۔ فتح الباری کے جس نسخے کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی یہاں موجود تھا۔ مجھے انتظامیہ نے بتا دیا تھا کہ آج افطاری یہیں ہوگی۔ اب میں دارالسلام کی کتب پر مشتمل شیلفوں کے سامنے کھڑا اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ محض اس کا فضل وکرم ہے۔ مغرب کی اذان کا وقت سات بجے تھا، ہم لوگ چند منٹ پہلے دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ لائبریری میں جتنے افراد تھے سب کے سب مدعو تھے۔ خصوصی ڈشوں کا انتظام بھی تھا۔

قارئین کرام! جن حضرات کو اس مسجد میں افطاری کا موقع ملا ہے ان کو خوب معلوم ہوگا کہ دنیا بھر کی افطاریاں اور ان کا مزہ ایک طرف، مگر مسجد نبوی کی افطاری بڑی انوکھی اور منفرد ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ایک جیسی افطاری کرتے ہیں جن میں شاہ و گدا سبھی شامل

ہوتے ہیں۔ مدینہ کی انواع واقسام کی کھجوریں، زم زم کا ٹھنڈا پانی، دہی اور گول شکل کی روٹی جو مدینہ ہی میں ملتی ہے۔ دہی کے اوپر ڈالنے کے لیے مدینہ کی خصوصی ''دقی'' جو کہ چورن یا پھکی سے مشابہ ہوتی ہے۔ یقین جانیے اس افطاری کا مزا بڑا ہی منفرد ہے۔ ہمارے لیے خصوصی بندوبست تھا، اسی لیے دستر خوان انواع واقسام کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔

مسجد نبوی میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور لاکھوں لوگ اکٹھے افطاری کر رہے تھے۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد ہم پھر اکٹھے ہوئے۔ مکتبہ کے بارے میں مزید تفصیلات بتائی گئیں کہ عورتوں کے سیکشن میں مسجد کی مشرقی اور مغربی جانب دو لائبریریاں ہیں، جہاں پر دارالسلام کی کتب کو خصوصی جگہ دی گئی ہے۔ عورتوں کے مطالعہ کے لیے پانچ ہال ہیں۔ ان میں سے تین ہال باب نمبر 24 عثمان بن عفان پر بنائے گئے ہیں۔ مغربی جانب باب نمبر 16 عمر بن خطاب پر دو ہال ہیں۔ ان تمام چھوٹے مکتبات کا افتتاح 1416ھ میں ہوا تھا۔ مسجد نبوی کی اس لائبریری کو دنیا کی جدید ترین لائبریریوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بیشتر ٹیبلوں پر کمپیوٹر موجود تھے۔ میں نے دوران گفتگو اس طرف اشارہ کیا کہ یہ دور ماڈرن سلفیوں کا دور ہے۔ یہاں اب جدید ایجادات سے بھرپور استفادہ ہوتا ہے۔

دورہ کے دوران برادرم ابوتراب نورپوری آف گوجرانوالہ ہمارے ساتھ ساتھ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری کتب کو وہاں رکھوانے میں ان کا تعاون بہت کارگر ثابت ہوا۔

میں نے الحمدللہ زندگی میں بہت سے مقامات پر عزت پائی ہے۔ لوگوں نے اپنی بے پناہ محبتوں کا ثبوت دیا ہے، مگر امر واقعہ یہ ہے کہ 22 اگست 2011ء کی شام کو مسجد نبوی شریف میں مکتبہ مسجد نبوی کے ذمہ داران نے جس محبت، پیار اور عزت سے نوازا یہ میری زندگی کی ایک روشن اور سنہری شام تھی۔

امام کعبہ..... فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن السدیس سے ملاقات

انسان کی زندگی میں بعض لمحات بڑے خوش قسمتی کے ہوتے ہیں، ایسے ہی خوبصورت لمحات میں ایک دن امام کعبہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس کے سیکرٹری خاص استاذ عبدالعزیز انصاری کا فون آیا کہ فضیلۃ الشیخ آپ کو سلام کہہ رہے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کر رہے ہیں کہ دارالسلام ان کی کتاب خطبات حرم کا اردو میں ترجمہ شائع کرے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس کا نام سنتے ہی دل میں خوشی اور سرور آ جاتا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا واقعی یہ ان کی خواہش ہے کہ دارالسلام ان کی کتاب کا ترجمہ شائع کرے۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہر چند کہ ان سے متعدد بار ملاقاتوں کا شرف حاصل کر چکا ہوں، مگر مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ دارالسلام کو اپنی کتاب کی اشاعت کا اعزاز بخشیں گے۔

اس دنیا میں بہت ساری نامور اور مقبول شخصیات موجود ہیں اور اپنے حلقوں میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، مگر میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عصر حاضر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس کا شمار مسلمانوں کی مقبول ترین اور عظیم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ یہ ہر خطے، طبقے اور مسلک کے لوگوں میں یکساں مقبول

ہیں۔یہی شخصیت ہے جو لوگوں کے سروں پر نہیں بلکہ دلوں پر حکومت کرتی ہے۔

عصر حاضر میں بلاشبہ دو شخصیات ایسی ہیں جو اپنی مسحور کن آواز کے ذریعے سننے والوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہیں۔ان میں ایک تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس ہیں اور دوسری عظیم شخصیت ڈاکٹر سعود الشریم ہیں، بلاشبہ ان دونوں کی جوڑی کو اللہ تعالیٰ نے بلند مقام اور مرتبہ عطا کیا ہے۔جس خوبصورت انداز میں وہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں اس سے سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔سعودی عرب میں قیام کے دوران الحمدللہ! ان عظیم شخصیات کی امامت میں نماز ادا کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے ہیں۔تراویح ادا کرنے، قیام اللیل اور دعائے ختم قرآن میں شرکت کا اللہ تعالیٰ نے بارہا موقع عطا فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس کو فن خطابت سے وافر حصہ عطا فرمایا ہے، وہ کمال حافظہ کے مالک ہیں۔قرآن کریم تو ان کو اتنا ازبر ہے کہ سالہا سال سے پڑھتے ہوئے کبھی نہیں اٹکے، مگر اس کے ساتھ ہی عربی ادب، اشعار کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جب وہ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں تو الفاظ ان کے سامنے باندیوں کی طرح ہاتھ باندھے کھڑے نظر آتے ہیں، ان کا منہج بڑا قوی ہے،عقیدہ توحید پر ان کی تقاریر سننے سے تعلق رکھتی ہیں۔

''خطبات حرم'' میں صرف 19 خطبات کا ترجمہ ہے جن میں قرآن مجید، علم، عقیدہ، اتباع سنت، نماز، زکاۃ، حجاج کرام کی خدمت میں رہنما باتیں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، مسلمانوں کی حالت زار اور مسجد اقصیٰ کی پکار اور موجودہ عالمی حالات میں امت مسلمہ کی ذمہ داریاں جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن السدیس جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں ان کا اس قدر استقبال ہوتا ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ لوگوں کو ان کے ساتھ کس قدر محبت ہے۔ کئی سال قبل جب وہ پاکستان تشریف لے گئے تو ان کا جس طرح استقبال کیا گیا وہ تاریخی واقعہ ہے۔ ان کا استقبال کرنے والے صرف مرد حضرات ہی نہیں تھے بلکہ بچوں اور حکومتی عہدیداروں کی ایک بڑی تعداد استقبال کے لیے موجود تھی۔ لاکھوں خواتین وحضرات نے امام کعبہ کی امامت میں نماز کی ادائیگی کی۔

شیخ عبدالرحمٰن السدیس کی کتاب کا ترجمہ برمنگھم میں ہمارے دوست مولانا عبدالهادی العمری نے شیخ صاحب کی فرمائش پر کیا تھا۔ مولانا عبدالہادی العمری کا اصل وطن بھارت ہے، مگر گزشتہ تین دہائیوں سے وہ برطانیہ میں مقیم ہیں۔ مرکزی جمعیت اہلِ حدیث برطانیہ کے امیر بھی رہے ہے، متعدد دینی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ وہ نامور خطیب ہیں، شریعہ کونسل کے رکن ہیں، ماہنامہ صراط مستقیم کی مجلس ادارت میں شامل ہیں اور ریڈیو وٹی وی پر ان کے متعدد پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہمیں موصول ہوا تو میں نے اسے مراجعت کے لیے دارالسلام کی پاکستان برانچ کو بھجوادیا۔ وہاں کے ریسرچ سیکشن نے خوب محنت سے اصل مسودے کے ساتھ مراجعہ کیا اوراحادیث اور آیات کی تخریج بھی کردی۔ وقت گزرتا چلا گیا، ہماری خواہش تھی کہ جتنی بڑی شخصیت شیخ سدیس کی ہے اتنی ہی شان وشوکت کے ساتھ ان کی کتاب بھی شائع ہونی چاہیے، پھر وہ دن بھی آہی گیا کہ یہ خوبصورت کتاب چھپ کر میرے ہاتھوں میں تھی۔ ناشر کے لیے کتاب کی اشاعت ''نومولود'' کی خوشی سے کم نہیں ہوتی۔

یکم اکتوبر 2011ء کی صبح سویرے میں اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ مکہ مکرمہ پہنچ گیا تھا، عمرے

کی سعادت حاصل کی۔ شیخ صاحب کے سیکرٹری نے مجھے ایک دن پہلے فون پر مطلع کر دیا تھا کہ شیخ صاحب کے گھر پر شام پانچ بجے آپ کی ان سے ملاقات ہوگی۔ ہم نے عصر کی نماز حرم شریف میں ادا کی، دارالسلام کی جدہ برانچ کے منیجر محمد اشرف کے ہمراہ ہم جلدی سے گاڑی میں بیٹھے اور شیخ سدیس کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس کا گھر عوالی کے علاقے میں ہے جو مکہ سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر ام القریٰ یونیورسٹی روڈ پر ایک پوش علاقہ ہے۔ راستے میں تیز بارش شروع ہوگئی۔ خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں بارش کی وجہ سے شیخ کے ساتھ ملاقات ملتوی ہی نہ ہو جائے۔ جب ہم ان کے گھر پہنچے تو زوردار بارش ہو رہی تھی۔ برادر عزیز شیخ عبدالعزیز انصاری نے ہمارا استقبال کیا۔

میں نے اہلیہ اور بیٹی کو گاڑی میں چھوڑا اور میں شیخ انصاری کے ساتھ امام صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ماشاء اللہ! ان کا گھر بہت بڑا پیلس ہے۔ جس میں مہمانوں کا دروازہ مجمع امام الدعوۃ کی طرف کھلتا ہے۔ دراصل یہ بہت بڑا علمی مرکز ہے، یہاں شیخ سدیس صاحب کی اپنی بہت بڑی لائبریری بھی ہے جو ایک بڑے ہال میں ہے، یہ نہایت خوبصورت لائبریری ہے۔ لائبریری میں مطالعہ کرنے والوں کے لیے کم و بیش سو کے قریب نشستیں ہیں۔ ہال کے چاروں طرف خوبصورت الماریاں ہیں جن میں ہزاروں کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ ہال کی دوسری طرف ملحق ہال میں شیخ کا مکتب خاص اور ان کے سیکرٹری کا دفتر ہے۔ شیخ سدیس میرے انتظار میں تھے۔

روایتی معانقہ ہوا، پھر ملاقات کا آغاز ہوا۔ میں نے ان کو ان کی کتاب ''خطبات حرم'' کا اردو میں ترجمے کا نسخہ پیش کیا جو دارالسلام نے نہایت خوبصورت (فور کلرز) میں شائع کیا ہے۔ شیخ صاحب کے ساتھ اس میٹنگ میں بہت سے امور زیر بحث آئے جن میں ان

کی کتاب کے انگلش اور فرنچ زبانوں میں تراجم کا کام بھی شامل تھا۔ شیخ سدیس نے فرمایا: مکہ مکرمہ مہبط الوحی اور اللہ کے رسول کا مولد ہے۔ یہ اسلام کا مرکز ہے۔ یہاں پوری دنیا سے لوگ علم کی تلاش میں آتے ہیں۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کو اسلام کا صحیح پیغام پہنچائیں اور اس کے لیے جدوجہد کی جائے۔ انھوں نے خطبات حرم کی طباعت، خوبصورت ڈیزائننگ اور جلد بندی کی بے حد تعریف کی۔ انھوں نے متعدد منصوبوں اور کاموں کی تحسین کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دارالسلام سے کافی دیر سے واقف ہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن السدیس نے نشر و اشاعت کے میدان میں دارالسلام کے کاموں کو سراہا اور فرمایا: اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ہماری اس ملاقات کے دوران میں دارالسلام جدہ برانچ کے مینیجر بھی شریک تھے۔ انھوں نے تجویز دی کہ دارالسلام اور مجمع امام الدعوۃ کو مل کر بعض علمی منصوبوں پر کام کرنا چاہیے۔ راقم نے شیخ عبدالرحمٰن السدیس کو دارالسلام کے بارے میں مکمل بریفنگ دی اور بتایا کہ دارالسلام نے 22 زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم کے علاوہ کم وبیش 1300 کتابیں شائع کی ہیں۔ دارالسلام سے اس وقت 270 سے زائد افراد منسلک ہیں۔ ہمارا نیٹ ورک 30 سے زیادہ ممالک میں مصروف عمل ہے۔ شیخ سدیس نے کہا کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ جدید وسائل اعلام سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ راقم الحروف نے ان کو دارالسلام کی طرف سے شائع شدہ الکتب الستہ کا نسخہ پیش کیا جسے انھوں نے بے حد سراہا۔ شیخ سدیس نے اس نسخے میں خاصی دلچسپی لی۔ اس کے مقدمے کے بعض حصوں کو پڑھا اور اس خوبصورت اور اہم کام کی تحسین فرمائی۔ پاکستان میں دعوتی کاموں کے حوالے سے بات چیت ہوئی تو راقم نے ان کو کتاب وسنت سے وابستہ علماء کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے اس موقع

پر مسلک اہلِ حدیث کے حوالے سے اشعار پڑھ کر سنائے، جس میں منہج اہل حدیث کی تعریف کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا: اگر اصل اہلِ سنت والجماعت اہل حدیث نہیں ہیں تو پھر اور کون ہے؟

ملاقات میں شیخ سدیس کی کتاب ''خطبات حرم'' کا انگلش اور فرنچ زبان میں ترجمہ کرنے اور دارالسلام کی طرف سے شائع کرنے کا معاہدہ طے پایا۔ ان شاء اللہ اگلے چند ماہ کے دوران ان دونوں زبانوں میں خطبات حرم کے تراجم شاندار طریقے سے شائع ہوں گے۔ انھوں نے ترجمے کی خوبصورتی اور اہمیت کے حوالے سے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی ریاض میں قائم دارالسلام کے ہیڈ آفس کا دورہ کریں گے۔ شیخ سدیس نہایت خوش اخلاق اور مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک ہیں۔ گفتگو سے ادب اور فصاحت و بلاغت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دوران میں ہماری تواضع اعلیٰ قسم کی کھجوروں، قہوہ اور چائے سے کی گئی۔

باہر گاڑی میں میری اہلیہ اور بیٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جب اندر آنے لگا تو کہنے لگیں: شیخ صاحب سے ہمارے لیے دعا کروایئے گا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ بھی شیخ صاحب کو سلام عرض کر سکیں۔ میں نے موقع کی مناسبت سے عرض کیا کہ میری اہلیہ اور بیٹی بھی آپ کو سلام عرض کرنے کی خواہشمند ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً بلوالیں۔ فرمانے لگے: ان کو اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہیے تھا۔ بہر حال وہ دونوں بھی اندر آئیں، شیخ صاحب نے ان کو مرحبا فرمایا، ان کے لیے دعا کی اور حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔

سبحان اللہ! ان کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ ہمارے گھر میں مدتوں سے کم وبیش ہر روز ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔

قارئین کرام! شیخ سدیس دنیا بھر میں نہ صرف بڑوں بلکہ بچوں میں بھی بہت مقبول ہیں۔ آیئے اس حوالے سے ایک خوبصورت واقعہ پڑھتے ہیں:

الجزائر کی رہنے والی آٹھ سالہ بچی صفا چھوٹی عمر سے شیخ سدیس کی آواز کو پسند کرتی، اور انھی کی طرح قرآن پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے پورے الجزائر میں بچوں میں تلاوت کے مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یہ بچی اکثر اوقات شیخ سدیس کا ذکر خیر کرتی اور ان سے ملاقات کی خواہش رکھتی تھی۔ شیخ سے اس کی محبت کا یہ عالم تھا کہ جب اس سے نام پوچھا جاتا تو کہتی: میرا نام صفیہ السدیسیہ ہے۔ اپنی والدہ سے اکثر پوچھتی کہ میں شیخ سے کب ملوں گی؟ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ ان سے ملاقات کروں۔ اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تمھیں شیخ سے ملاقات کے لیے مکہ لے جاؤں، اگر ہمارا اپنا گھر ہوتا تو میں اسے بیچ کر بھی تمھیں مکہ لے جاتی۔ بچی کا اصرار جاری رہا، ایک دن وہ پھٹ پڑی اور کہنے لگی: اماں تم لوگ جھوٹ بولتے ہو، تم مجھے شیخ کے پاس لے کر کیوں نہیں جاتے؟ آہستہ آہستہ وہ قرآن کریم پڑھنے سے بھی انکار کرنے لگی۔ اس کی والدہ نے اسے ڈانٹا اور مارا بھی کہ تم دین اور قرآن سے کیوں دور ہو رہی ہو؟ پھر وہ نفسیاتی مریضہ بننے لگی۔ ایک دن کویت کے ایک چینل سے سوال و جواب کی نشست چل رہی تھی۔ وہاں کے ایک معروف ڈاکٹر صاحب سوالات کے جوابات دے رہے تھے کہ صفا کی والدہ نے اپنی مشکل ان کے سامنے رکھتے ہوئے اس کا حل پوچھا۔ اسے جواب دیا گیا: تم بچی کے ساتھ جھوٹ نہ بولو اور اسے مارنا پیٹنا بند کر دو۔ پھر اچانک ہی انھوں نے شیخ سدیس سے مخاطب ہو کر کہا: شیخ صاحب! اگر آپ میری آواز سن رہے ہیں تو مہربانی فرما کر اس بچی کو فون کریں اور اسے اطمینان دلائیں اور اس سے

بات کریں وہ آپ سے شدید محبت کرتی ہے۔

قارئین کرام! اور پھر واقعی ایسا ہو گیا۔ جیسے ہی شیخ صاحب کو اس بچی اور اس کی خواہش کا علم ہوا تو انھوں نے اس کے والدین سے رابطہ کیا اور اپنے خرچ پر اس بچی کو والدین کے ساتھ عمرے پر بلوالیا۔ وہ مکہ مکرمہ گئے، عمرہ کیا اور پھر شیخ نے ان کو اپنے گھر میں دعوت پر بلوایا۔ صفا اور اس کے والدین کا بھرپور استقبال کیا، بچی کو حوصلہ دیا اور قرآن کریم حفظ کرنے کی تلقین کی۔ بچی سے اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھا اور پھر فرمایا کہ تم میری بیٹی ہو اور تمھارے تمام تعلیمی اخراجات میں خود ادا کروں گا۔ بچی نے شیخ صاحب کو ان کی طرز پر جب قرآن کریم کی تلاوت اور ختم قرآن کی دعائیں سنائیں تو شیخ صاحب سمیت تمام حاضرین کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شیخ نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھپایا ہوا تھا اور وہ زاروقطار رو رہے تھے۔ یہ قرآن کے ساتھ ایک بچی کی محبت تھی کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں شیخ سدیس سے ملاقات کی خواہاں تھی، اس کی تمنا اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی تھی۔ شیخ نے اسے انعامات اور تحائف سے نوازا۔

ہماری ملاقات شیخ صاحب کے ساتھ بڑی یادگار تھی۔ میری بیٹی عفراء سے انھوں نے کہا: تم میری بہن ہو۔ وہ بڑے فخر سے سب کو بتاتی پھرتی ہے کہ میں شیخ سدیس کی بہن ہوں۔ انھوں نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ مہمانوں کو تحفے دینا نہ بھولیے گا اور پھر مجھے، اہلیہ، بیٹی اور اشرف صاحب کو انھوں نے خصوصی تحائف عطا کیے۔

انھوں نے استاذ عبدالعزیز سے کہا کہ عبدالمالک کو مجمع امام الدعوۃ کی لائبریری کا وزٹ کراؤ۔ شیخ صاحب کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ یہ ملاقات اختتام کو پہنچی اور میں نے لائبریری کا وزٹ بھی کیا۔

حافظ اسماعیل اسد رحمہ اللہ کی یاد میں

میرا حافظ آباد سے اس وقت سے تعلق ہے جب میری عمر نو سال تھی۔ والد محترم نے ہمارے چھوٹے سے گاؤں کیلیانوالہ سے 1964ء میں حافظ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تو میں تیسری جماعت ختم کر چکا تھا۔ انھوں نے محلّہ بہاولپورہ میں دس مرلہ کا مکان بنالیا اور میں گورنمنٹ پرائمری سکول برانچ نمبر 5 میں چوتھی جماعت کے طالب علم کے طور پر داخل ہوا۔ اس وقت حافظ آباد میں اہلحدیثوں کے دو بڑے مراکز تھے۔ ایک شہر کے شرقی حصہ میں سرکاری پڑاؤ میں واقع جامع مسجد اہلحدیث میں، جہاں مولانا ابوالحسن محمد یحییٰ حافظ آبادی خطیب تھے۔ دوسرا بڑا مرکز شہر کے غربی حصہ میں جلالپور روڈ پر واقع جامع مسجد مبارک تھی جس میں دارالحدیث محمدیہ نامی مدرسہ بھی تھا۔ ہمارا گھر مولانا یحییٰ صاحب والی مسجد سے قدرے قریب تھا اس لیے ہم جمعہ کی نماز اکثر و بیشتر مولانا محمد یحییٰ رحمہ اللہ کی اقتدا میں ادا کیا کرتے۔ کبھی کبھار خطبہ جمعہ یا کسی جلسہ میں شرکت کرنے کے لیے ہم لوگ مسجد مبارک بھی چلے جاتے تھے۔ اس مسجد کے خطیب حضرت مولانا حکیم ابراہیم صاحب تھے۔ یوں تو شہر میں اہلحدیثوں کی متعدد مساجد تھیں، مگر ان دونوں مساجد کو ان کے خطباء کی وجہ سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔ میرے گھر کے سامنے سڑک کے پار دور اینٹوں کا

بھٹہ تھا جو میاں فضل حق صاحب کی ملکیت تھا اور وہ ان دنوں مولوی بھٹے والے کے نام سے مشہور تھے۔

حکیم ابراہیم صاحب کی حافظ آباد کے مین بازار میں حکمت کی دوکان تھی۔ یہ نہایت خوبصورت، اونچے، لمبے قد کے تنومند جوان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ کی نعمت سے نواز رکھا تھا۔ مسجد مبارک میں کئی مرتبہ ان کے خطبات جمعہ اور دروس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ بڑے پائے کے خطیب تھے۔ شہر میں ہونے والے کسی بھی سیاسی یا دینی جلسہ میں ان کی شرکت جلسہ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ مسجد مبارک شہر کی بڑی خوبصورت اور وسیع مسجد تھی۔ یہ پنڈی بھٹیاں جانے والی سڑک پر واقع تھی۔ راقم الحروف نے دینی تعلیم مبارک مسجد میں قائم مدرسہ دارالحدیث میں حاصل کی۔ ہمارے ایک استاذ مکرم کا نام حافظ اسماعیل اسد تھا جو مولانا حکیم ابراہیم کے اکلوتے فرزند تھے۔ حافظ اسماعیل صاحب جن کو اب مرحوم لکھتے ہوئے واقعی کلیجہ کانپ رہا ہے، اس وقت ان کی بھرپور جوانی کا دور تھا۔ حافظ صاحب بہت خوبصورت دراز قد نوجوان تھے۔ ایک مالدار باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کے ناتے واقعی ان کی زندگی شہزادوں والی تھی۔ اس زمانے میں یہ نہایت خوبصورت اور مہنگا لباس زیب تن کرتے تھے۔ سر پر خوبصورت اور نہایت قیمتی قراقلی ٹوپی پہنتے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ قدرتی طور پر سوکھا ہوا تھا، اس لیے کندھے پر خوبصورت زرد رنگ کا رومال رکھتے تھے، جس سے بازو کو اس خوبصورتی سے ڈھانپتے کہ عام آدمی کو قطعاً احساس نہ ہوتا کہ ان کے بازو میں نقص ہے۔ مسجد مبارک میں داخل ہوں تو اس کی بائیں جانب بڑی خوبصورت اور وسیع لائبریری تھی۔ جس کے وسط میں ان کا خصوصی فرش اور گاؤ تکیہ رکھا ہوتا تھا۔ حافظ اسماعیل

صاحب اس جگہ میں پڑھاتے تھے۔

قارئین کرام! میں آپ کو 1972ء کے دور میں لیے چلتا ہوں۔ ہمارے مدرسہ کے مہتمم مولانا ابوالحسن یحییٰ صاحب ہوتے تھے۔ مدرسہ کے طلبا کی تعداد کوئی زیادہ نہ تھی۔ حافظ اسماعیل اسد صاحب صدر مدرس تو نہ تھے، مگر ان کی اپنی ایک آن بان تھی جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ ان کے والد گرامی شہر کے نمایاں افراد میں سے تھے۔ ان کی عزت اور شہرت ایک دیانت دار تاجر اور حکیم کے طور پر تھی۔ سارے شہر میں مشہور تھا کہ جس شخص کو خالص عرق لینا ہو وہ حکیم ابراہیم کی دکان پر چلا جائے۔ حافظ آباد آج سے چالیس سال پہلے کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ مین بازار کوئی زیادہ چوڑا نہ تھا۔ اس کے آخر پر حکیم ابراہیم صاحب کی دکان آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ عصر کی نماز کے بعد ان کے گھر سے چائے کی بڑی سی چینک آجاتی۔ جیسے جیسے شام کا وقت قریب ہوتا جاتا، حکیم صاحب کے چاہنے والے بوڑھے بوڑھے حضرات ان کی دکان پر جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ تمام حاضرین کو چائے ملتی تھی۔ حکیم صاحب کسی ایک کو اشارہ کرتے کہ چلو حاضرین کو چائے پلاؤ۔ ایک کونے میں پینے والے پانی کا ڈھکا ہوا برتن، اس کے پہلو میں چینی کے پیالے پڑے ہوتے تھے، جن میں چائے بھر بھر کر وہ حاضرین کو پلاتا تھا۔ حکیم ابراہیم صاحب مجھے عموماً امام مالک کے نام سے پکارتے تھے۔ ہم ان سے ڈرتے بھی خوب تھے اور جتنا ڈرتے تھے اتنی ہی محبت بھی کرتے تھے۔ آج چالیس سال گزر چکے ہیں ان کے بتائے ہوئے بعض علمی نکات اور باتیں ابھی تک یاد ہیں۔ ان میں خلوص، تقویٰ، امانت داری اور کھرا پن تھا، اس لیے ان کے سامنے بات کرنے سے بھی ڈرتے اور کتراتے تھے۔ محترم میاں فضل حق صاحب ان کے شاگردوں میں سے تھے اور ان کا بے حد احترام بھی کرتے

تھے۔

مجھے بچپن سے تقاریر کا شوق تھا۔ مدرسہ میں ہر ہفتہ ہم بزم ادب کا پروگرام رکھتے۔ شہر میں جلسہ ہوتا تو اس کے اعلانات میں نمایاں حصہ لیتے۔ میری زندگی کے دو پروگرام ناقابل فراموش رہے۔ ایک مرتبہ میں نے کسی پروگرام میں تقریر کی تو حافظ اسماعیل صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی: اگر تم اسی طرح تقاریر کرتے رہے تو کوئی عجب نہیں کہ حافظ آباد میں دوسرا ابوالکلام پیدا ہو جائے۔ خیر ہم نے ابوالکلام تو کیا بننا تھا وہ تو امام الہند تھے۔ برصغیر میں ان کے پائے کا عالم کم ہی ہوگا، مگر حافظ صاحب کے یہ الفاظ میرے عزم و حوصلے کو مہمیز دیتے رہے۔

ایک مرتبہ مسجد مبارک میں جلسہ ہو رہا تھا۔ محترم مولانا محمد حسین شیخوپوری تشریف لا رہے تھے۔ حافظ صاحب کو نجانے کیا سوجھی کہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ جلسہ میں ایک تقریر عربی میں بھی ہونی چاہیے۔ اب یہ تقریر کون کرے، کون لکھے اور اسے یاد کر کے مجمع کے سامنے سنائے۔ خیر قرعہ فال میرے نام نکلا۔ مولانا محمد رفیق شیخ الحدیث تھے۔ ان کے تعاون سے عربی میں تقریر لکھی گئی اور میں نے اسے یاد کرنا شروع کر دیا۔ مدرسہ کی جو چیزیں مجھے ناپسند تھیں ان میں سر کے بالوں کا صاف کرنا بھی شامل تھا۔ جبکہ مدرسہ کے قوانین وضوابط میں یہ شامل تھا کہ سر پر بال نہیں ہونے چاہییں۔ خصوصاً اگر وہ اس قابل ہو جائیں کہ کنگھی کا استعمال ہو سکے تو وہ اساتذہ کی نظر میں ناقابل برداشت تھے۔ میرے پاس سر پر باندھنے کے لیے جو ریشمی رومال تھا وہ سر پر ٹکتا ہی نہیں تھا۔ مگر مدرسہ کے طالب علم کے لیے اسے سر پر رکھنا ضروری تھا۔ میرے جیسا لاابالی طبیعت کا مالک کہاں اس کی اتنی پروا کرتا، سر اکثر ننگا ہی رہتا تھا۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ محترم حافظ اسماعیل صاحب

اس کے سٹیج سیکرٹری تھے۔ شروع میں تلاوت اور پھر ایک صاحب جن کا نام غالباً صوفی شریف تھا، ان کی خوبصورت نظم یا نعت جس کے الفاظ اور پہلے مصرعہ کو وہ بار بار پڑھتے اور ہر مرتبہ انداز مختلف اور خوبصورت ہوتا جس کی وجہ سے لوگ جھوم جاتے تھے۔ ادھر صوفی صاحب نے نعت ختم کی ادھر حافظ صاحب نے میرے نام کا اعلان کر دیا۔ میں جلسہ گاہ کے دوسری جانب لاؤڈ سپیکر چیک کر رہا تھا کہ آواز صحیح آ رہی ہے یا نہیں۔ اس کام کی ذمہ داری بھی حافظ صاحب نے مجھے دے رکھی تھی۔ اب ادھر میرا نام لیا جا رہا ہے۔ حافظ صاحب کا ڈر اور خوف بھی ہے کہ جلدی جلدی سٹیج پر پہنچوں۔ ہم مکتب طلبا میری طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ میں سامعین کے درمیان سے بھاگتا ہوا سٹیج پر جا پہنچا۔ کچھ اساتذہ کا رعب، کچھ عربی زبان میں تقریر کی ہیبت تھی اور ساتھ ہی رومال کو بھی سنبھالنا پڑا جو بار بار سر سے پھسلتا، سرکتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ تقریر شروع کی، اساتذہ اور علماء کے علاوہ کس کو عربی زبان کی سمجھ آنی تھی۔ میں نے ایک دو بار رومال کو قابو کرنے کی کوشش کی کہ سر پر ٹک جائے مگر وہ پورے طور پر میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں تقریر بھی کر رہا ہوں اور اسے قابو میں رکھنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ جب اسے قابو کرنے میں مکمل ناکام ہو گیا تو اسے زمین پر دے مارا۔ سامعین کھلکھلا کر ہنس دیے، مگر مجھے ان کی کیا پروا تھی۔ مجھے تو عربی میں تقریر کرنا تھی۔ اس بات کا خوف اور خدشہ بھی تھا کہ کل حافظ صاحب سے ڈانٹ پڑے گی۔ محترم مولانا محمد حسین شیخوپوری سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ انھوں نے رومال پکڑا اور سائڈ میں رکھی ہوئی میز پر رکھ دیا، اس طرح میری جان میں جان آئی۔ میں یہ تو دعوی نہیں کروں گا کہ ان مشاہیر کی موجودگی میں میری تقریر بہت اچھی رہی، مگر اتنی بری بھی نہ تھی۔ لوگوں نے یہ ضرور کہا: آج مدرسہ کے ایک طالب علم نے عربی میں تقریر کی ہے۔ اگلے دن

حافظ صاحب کے درس میں حاضر ہوا تو ان کا تاثر بھی زیادہ برا نہیں تھا۔

میں یہ لکھتے ہوئے بڑی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ اس قسم کی تربیت اس دور میں ملی اور آج اللہ کا شکر ہے کہ اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں میں گفتگو یا تقریر کرنی پڑ جائے تو رومال سر سے نیچے نہیں سرکتا۔ دراصل اس قسم کے واقعات مجھ جیسے طلبا کے لیے بڑے حوصلہ افزا ہوتے ہیں اور ان کے لیے ترقی کے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ بیان کر کے آگے بڑھوں گا۔ جو ممکن ہے قارئین کے لیے اتنا اہم نہ ہو مگر میرے لیے عزت وشرف والی بات تھی۔

ریاض میں «النَّدْوَةُ الْعَالَمِيَّةُ لِلشَّبَابِ الإِسْلَامِي» کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر مانع الجہنی کے ساتھ میٹنگ تھی۔ فیصل آباد سے محترم مولانا محمد اسحاق چیمہ اور جناب مولانا قاضی اسلم سیف صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو سوریا کے ایک ساتھی نے جمعیت اہل حدیث کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا۔ ہم اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ اس زمانے میں مجھے زیادہ عربی بھی نہیں آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور میری زبان کے بندھن کھلتے چلے گئے۔ میں نے انگلش زبان میں جماعت کا موقف پوری شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا۔ ڈاکٹر مانع الجہنی خاصے مطمئن ہو گئے۔ ہم جس کام کے لیے گئے وہ بھی ہو گیا۔ جو اہم بات بتانے والی ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم میٹنگ سے باہر نکلے تو محترم اسحاق چیمہ صاحب نے راقم کو گلے لگایا، ماتھا چوما اور فرمانے لگے: آج تم نے اہل حدیث کی لاج رکھ لی ہے۔

میرے خالو، میرے چچا، میرے سسر، میرے محسن، میرے مربی، مولانا محمد سلیم کیلانی رحمہ اللہ

جمعہ 4 فروری 2005ء کا دن بلاشبہ میرے لیے نہایت غم و افسوس کا دن تھا کہ اس روز میرے مربی، میرے محسن، میرے چچا، میرے خالو، میرے سسر جناب محترم محمد سلیم کیلانی اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے۔ ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ گزشتہ ہفتہ عشرہ سے جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ شدید بیمار ہیں تو میں ہر روز انھیں فون کرتا تھا۔ جمعہ کے دن بھی معمول کے مطابق فون کیا تو خالہ جان نے بتایا کہ آج رات طبیعت خاصی بے چین رہی ہے، دعا کریں۔ اہلیہ نے اپنی امی کو امکانی حد تک تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔ اس روز نجانے کیوں ہم نے ماموں جان سے بات نہ کی۔ فون بند کرنے کے بعد میں نے اہلیہ سے پوچھا: ابا جان سے بات کیوں نہ کی؟ کہنے لگی: ہمت ہی نہ پڑی کہ آج ان کی رات بڑی پریشانی میں گزری ہے۔ ہم دونوں نے ایک ہی دعا کی: یا الٰہی! یہ بندہ ہمارے علم کی حد تک تیرا اطاعت گزار، نہایت متقی اور پرہیز گار ہے تو ان کو سکون مہیا فرما۔ پھر واقعی اس روز انھیں سکون مل گیا۔

میں نے واربرٹن اپنے برادر نسبتی حبیب کبریا کو فون کیا کہ تفصیل بیان کرو۔ کہنے لگا:

ادھر مسجد میں جمعہ کا خطبہ شروع ہوا، ادھر ابا جان نے میری گود میں بار بار «اَللّٰھُمَّ بِالرَّفِیْقِ الْأَعْلٰی» کہا اور جان اللہ کے سپرد کر دی۔

مولانا محمد سلیم کیلانی رحمہ اللہ سے میرا تہرا رشتہ تھا۔ وہ میرے خالو جان، برادری میں چچا اور میرے سسر بھی تھے۔ بچپن ہی سے خالو ہونے کے ناتے کثرت سے گھر آنا جانا تھا اور پھر جب رشتہ مصاہرت قائم ہوا تو اور بھی قرب حاصل ہو گیا۔ جب میرے والدین کا انتقال ہو گیا تو جہاں ایک رشتہ کمزور ہوا وہاں وار برٹن سے رشتہ گہرا ہو گیا کہ پاکستان میں میرے لیے یہی دوسرا گھر تھا۔ ان کی پوری زندگی میرے لیے کھلی کتاب کی طرح تھی، وہ میرے والد محترم محمد یونس کیلانی رحمہ اللہ کے گہرے دوست بھی تھے۔ اس لحاظ سے بھی میں ان کی زندگی کے بے شمار گوشوں کا شاہد ہوں۔

مولانا محمد سلیم رحمہ اللہ نے بہت زیادہ دینی تعلیم تو حاصل نہ کی، مگر کثرت مطالعہ کی بنا پر اور اپنے خداداد حافظے اور علمی ذوق کی بنا پر بعض ایسے کام کر گئے جو اللہ سے ہمیں امید ہے کہ قیامت تک قائم و دائم رہیں گے۔ پیشہ کے اعتبار سے کیلانی خاندان کے دیگر بزرگوں کی طرح وہ بھی اعلیٰ درجے کے خطاط تھے اور ایک مدت تک اس پیشے کو اپنائے رہے۔ ان کا ذہنی میلان نقشہ نویسی، ڈیزائننگ اور تعمیرات کی طرف تھا، چنانچہ زندگی کا خاصا حصہ مختلف مدارس، مساجد اور بعض عزیزوں کے مکانات کی تعمیر کی نگرانی میں گزرا۔ وہ جہاں جاتے خود بھی اول وقت کی نماز کا اہتمام کرتے اور لوگوں کو بھی ترغیب دیتے۔ کھرے، سچے اور صاف ستھرے مسلمان کی صفات اگر کسی شخص میں دیکھنی ہوں تو وہ محترم چچا جان میں پائی جاتی تھیں۔ میں نے انھیں عین جوانی کے زمانے میں قرآن پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، وہ تلاوت کرتے، اس کا ترجمہ پڑھتے اور زار و قطار روتے۔ نہایت چھوٹی عمر میں انھوں نے

تہجد کی نماز شروع کی اور زندگی بھر ان کے معمول میں فرق نہ آیا۔ انھوں نے غربت کا دور بھی دیکھا اور پھر اللہ نے خوشحالی بھی دی، مگر ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ خیر کے کاموں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بیٹیوں کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ بیٹوں سے نوازا۔ الحمدللہ ان پانچوں کی بہترین تربیت کی۔ چاندی کوٹ سے وہ واربرٹن آ گئے، جب اپنا گھر بنانا شروع کیا تو اس کے ساتھ ہی ایک پلاٹ پر مسجد کی بنیاد رکھ دی۔ چھوٹی سی مسجد، جس کے وہ مؤسس بھی تھے، معمار بھی، مزدور بھی اور امام مسجد بھی وہ خود ہی تھے۔ دو تین نمازی ہوتے تھے۔ مسجد کے ساتھ ان کی محبت اور اخلاص نے رنگ دکھایا۔ پہلے محراب کی طرف ایک پلاٹ خرید کر مسجد میں شامل کیا، پھر دائیں طرف والا مکان خریدا، پھر ایک اور مکان، اور پھر کچھ عرصہ پہلے تیسرا مکان خرید کر مسجد میں شامل کیا اور اپنی نگرانی میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کروانا شروع کی۔ مسجد کے سامنے ایک چھوٹے سے پلاٹ پر لڑکیوں کے لیے مدرسہ مرأۃ القرآن والحدیث شروع کروایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ملحقہ پلاٹ بھی خرید کر مسجد میں شامل کر دیے۔ انھوں نے اپنے چچا زاد بھائی مولانا عبدالغفور کیلانی صاحب کے تعاون سے ایک ننھا منا پودا لگایا تھا جو تناور درخت بن چکا ہے۔ الحمدللہ! اب مسجد اور مدرسہ کی رونقیں دیکھنے والی ہیں۔ کہاں دو تین نمازی اور اب الحمدللہ! جمعہ کے روز مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے۔ جمعہ کی خطابت کے لیے اپنے بھانجے کے داماد مولانا عبدالجبار کو منتخب کیا، جنھوں نے قرآن وسنت کی ترویج میں ان کے ساتھ مل کر مسلسل کام کیا۔ اپنے سگے بھتیجے مولانا عبدالصمد رفیقی فاضل مدینہ یونیورسٹی کو بخاری شریف پڑھانے کے لیے منتخب کیا۔ مسجد میں حفظ قرآن کے حلقے قائم کروائے۔ مدرسہ اور مسجد تو ان کی جان تھی۔ ان کی سوچ، فکر اور گفتگو مدرسہ اور مسجد سے

شروع ہوتی اور وہیں جا کر ختم ہو جاتی۔

وہ صبح سویرے سب سے پہلے مسجد میں داخل ہونے والے لوگوں میں ہوتے اور سب سے آخر میں اشراق پڑھ کر نکلتے۔ اس سال باوجود پیرانہ سالی اور بیماری کے مسجد میں اعتکاف کیا اور اکیلے نہیں کیا، بلکہ ان کی مسجد معتکف مردوں اور عورتوں سے بھری ہوتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کا خاتمہ بالخیر ہوتا ہے اور اس کی علامتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ ''میں اچھا ہوں یا برا مجھے فوری طور پر دفنا دیا جائے، کسی کا قطعاً انتظار نہ کیا جائے، نہ ہی میرے جنازے کا مسجد میں اعلان کیا جائے، بے نماز میری نماز جنازہ نہ پڑھے۔

ایک دوست، جو جنازے میں شریک تھے، مجھ سے کہنے لگے: میں نے ان کے جنازے کے شرکاء کو خوب غور سے دیکھا۔ کوئی شخص بھی مجھے بدعتی یا بے نماز نظر نہیں آیا بلکہ سب لوگ ہی نیک، پرہیزگار، علمائے کرام، مدارس کے اساتذہ اور دین کے طالب علم نظر آئے۔

آخر میں رفیق ادارہ دارالسلام محسن فارانی کی فکری کاوش بصورت قطعہ پیش کر کے اپنے بزرگ کا ذکر جمیل ختم کرتا ہوں:

ہوئے ہیں رخصت محمد سلیم کیلانی
مدام ان کی زباں پر تھا نطق قرآنی
وہ متقی تھے، موحد، سلیم فطرت تھے
ہو رب کا فضل و کرم ان پہ ہر دم ارزانی

میری تألیفات

راقم الحروف عبدالمالک مجاہد کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ میں اپنے بارے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میں عام انسان ہوں۔ میں نے کبھی اپنی علمیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ دارالسلام کے بارے میں بھی عموماً میں مجالس میں کہا کرتا ہوں کہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل وکرم سے چلا رہا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے چابی میرے ہاتھ میں پکڑا دی اور مجھ سے کہا: عبدالمالک! یہ تالا تم کھولو۔ میرے اوپر اللہ تعالیٰ نے جہاں دیگر بے شمار کرم کیے وہاں مجھے تحریر کی قوت اور طاقت بھی عطا فرمائی۔ میں یہ قطعاً نہیں لکھوں گا کہ میں تو بچپن سے بڑا لکھاری چلا آرہا ہوں اور جناب میں نے فلاں فلاں مضامین اپنے بچپن میں لکھے تھے۔ بھلا ایک ایسا انسان جو ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا جو بڑی حد تک اللہ کے فضل وکرم کے بعد سیلف میڈ ہے، وہ اپنی علمیت اور لکھاری ہونے کا دعویٰ کیسے کرے گا۔ ہاں یہ ضرور اعتراف کروں گا کہ مجھے بچپن میں صحافی بننے کا بڑا شوق تھا، مگر میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میں کسی وقت صحافی یا مؤلف بن جاؤں گا۔ میں نے کتب کی تالیف کیسے شروع کی اور میں کیسے لکھاری بنا؟ اس کا مختصر سا تذکرہ میں نے اپنی سب سے پہلی کتاب ''سنہرے اوراق'' میں کیا تھا...... چلیے مختصر سا تذکرہ یہاں بھی کیے دیتا ہوں۔

سنهری یادیں

غالباً 1998ء کی بات ہے، میں ریاض میں وزارت مذہبی امور کے شعبہ اوقاف کے ڈپٹی منسٹر جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن مطرودی رحمہ اللہ کے پاس بیٹھا تھا، موصوف نہایت ذہین و فطین آدمی تھے۔ انگلینڈ میں پڑھتے رہے، وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہمارا موضوع سخن اسلامی کتابوں کی اشاعت تھا، انھوں نے گفتگو کا رخ بدلا اور کہنے لگے: دارالسلام نے اب تک نوجوانوں کے لیے کتنی کتابیں شائع کی ہیں؟ میرے پاس اس کا کوئی خاص جواب نہ تھا۔ میں نے بس گول مول سا جواب دیا کہ شائع کی ہیں...... میں کہتے کہتے رک گیا، پھر کہا: کوئی خاص نہیں۔

میرے ذہن میں یہ ضرور تھا کہ دارالسلام کو نوجوان طبقہ کے لیے کتب ضرور شائع کرنی چاہییں، تاہم اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں خود بہت ساری کتب کا مؤلف بن جاؤں گا اور وہ نوجوان نسل کے لیے لکھی جائیں گی۔

مجھے کتب کی نشر واشاعت کے سلسلے میں بے شمار سفر کرنا پڑے، دوران سفر ہوائی جہاز پر یا ہوٹل میں قیام کے دوران مطالعہ کا وقت مل جاتا ہے، دوپہر کے قیلولہ کے وقت یا رات سونے سے پہلے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ تو پرانی عادت ہے، مگر سفر میں کچھ زیادہ ہی وقت مل جاتا ہے۔ میں اپنے ہمراہ ہر سفر میں دو تین عربی کتابیں ضرور رکھتا ہوں، دوران مطالعہ یہ بات میرے علم میں آئی کہ ہماری اسلامی تاریخ ایسے ایسے شاندار واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جنھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ میں کتنے عظیم لوگ پیدا ہوئے جن کے کارہائے نمایاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں، بلاشبہ یہ ہماری روشن تاریخ کے سنہرے اوراق ہیں، اسلامی تاریخ کے چمکتے دمکتے واقعات، سلف صالحین کی زندگی کے علمی و عملی نمونے، تاریخی احوال، دلچسپ مشاہدے ...... میں نے ایسی درجنوں کتابیں پڑھ

ڈالیں۔ جب میں سفر سے واپس آتا تو عموماً اپنے بچوں کو یہ واقعات سناتا۔ بعض اوقات دوستوں کی محفل میں بیٹھتا تو مزے لے لے کر ان کو بیان کرتا، کسی جگہ تقریر کا موقع ملتا تو اس سنہری تاریخ سے اقتباسات سناتا جس سے سامعین کے ساتھ میں خود بھی محظوظ ہوتا۔

بعض احباب نے ان تاریخی واقعات کو جمع کرنے کی جانب توجہ دلائی تو جن کتابوں کو پڑھا تھا ان میں جو واقعات دلچسپ اور حقائق پر مبنی نظر آئے ان کو نشان زد کرنا شروع کر دیا، ایک مرتبہ کتابوں کی نمائش میں ایک عربی ناشر سے گفتگو ہوئی، اس نے پوچھا: آپ عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی کتابیں شائع کرتے ہیں؟ اسلامی تاریخ میں سلف کے واقعات اپنی نوجوان نسل تک پہنچائیں تاکہ نوجوانوں کو معلوم ہو کہ ہمارا ماضی کتنا روشن تھا اور تاریخ میں کیسے کیسے دل نشین واقعات پیش آئے۔

مجھے اس کا مشورہ بروقت لگا، میں نے اور زیادہ توجہ سے تاریخی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا، مجھے اپنی کم علمی کا مکمل احساس ہے، مجھے عربی زبان پر کامل دسترس کا دعویٰ نہیں، تاہم کثرت مطالعہ کی بنا پر مفہوم سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں، عموماً فجر کی نماز کے بعد لکھنے بیٹھ جاتا یا پھر سفر کے دوران اس کام میں جت جاتا۔

یہ تاریخی واقعات وحکایات سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ ادھر مجھ پر دارالسلام کی ذمہ داریاں مسلسل بڑھتی جارہی تھیں اور مصروفیات میں روز افزوں اضافہ جاری تھا۔

ایک دن میرے پاس ایک ہندوستانی نوجوان رضوان اللہ ریاضی صاحب تشریف لائے، وہ ملازمت کی تلاش میں تھے، میں نے ان کا سی وی دیکھا، باصلاحیت نظر آئے، مجھے ایک معاون کی شدید ضرورت تھی جو میرے بکھرے مسودوں کو دیکھ سکے، چنانچہ انھی کا

انتخاب کرلیا گیا۔

جناب ریاضی صاحب نے میرے منتخب واقعات کو مرتب کرنا اوران میں سے بعض کا ترجمہ کرنا شروع کردیا۔ میں زبان و بیان کی مناسب تبدیلیاں کردیتا اور یوں سیکڑوں صفحات مرتب ہوگئے۔

عربی بڑی جاندار زبان ہے، مزا تو اسی وقت آتا ہے جب واقعات عربی لغت ہی میں پڑھے جائیں، ترجمے میں وہ چاشنی اور فصاحت و بلاغت نہیں ہوتی۔ میں نے ایک ایک واقعہ کئی کئی بار پڑھا، اس کی نوک پلک سنواری، پھر بھی تشنگی باقی رہی، چنانچہ اس کی مزید اصلاح وترتیب کے لیے پاکستان میں دارالسلام کے بعض معاونین کو بھجواتا رہا، وہ اس میں مزید نکھار پیدا کردیتے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ ترجمہ اصل واقعہ سے دور نہ چلا جائے۔ واقعات میں جا بجا عربی عبارات بھی من وعن لکھ دی گئی ہیں، خاص طور پر قرآن کریم، حدیث شریف یا کسی شاعر، ادیب، سردار قبیلہ یا سپہ سالار کے الفاظ تا کہ عربی ادب کی چاشنی باقی رہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میری مرتب کردہ یا تالیف کردہ کتب میں بیان کردہ واقعات کو علمائے کرام، اساتذہ، طلبہ، سیاسی رہنما اور مقررین اپنی تقاریر میں بیان کریں یا بطور حوالہ کتابوں میں درج کریں تا کہ ان سے ہماری نوجوان نسل بطور خاص استفادہ کرے۔

جہاں تک ان کتب میں شائع شدہ واقعات کے درست ہونے کا تعلق ہے تو میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ صرف ایسے واقعات ذکر کیے جائیں جو درست ہوں اور جن کے حوالہ جات موجود ہوں۔ پھر بھی کوئی ایسا واقعہ سامنے آجائے جو تاریخی اعتبار سے درست نہ ہو تو قارئین سے اس کی نشاندہی کی درخواست ہے، تا کہ اگلے ایڈیشن میں اسے تبدیل کردیا جائے۔

تألیف کتب کا جو سلسلہ میں نے اللہ کی توفیق سے شروع کیا تھا، عامۃ الناس میں خصوصاً نئی نسل میں اس کو میری توقع سے بڑھ کر پذیرائی حاصل ہوئی۔ کتب کا یہ سلسلہ بیس کا عدد پار کر چکا ہے اور تسلسل سے جاری ہے۔ اس کام میں آج کل میری خصوصی معاونت ہمارے ادارے کے سینئر ریسرچ سکالر قاری محمد اقبال عبدالعزیز اور پروفیسر محمد ذوالفقار صاحبان اور دیگر بہت سے احباب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہے وہ مجھ سے دین کی خدمت کا کام لیتا رہے گا اور تألیف کتب کا یہ کام بلا کسی انقطاع کے جاری رہے گا۔

یہاں مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ تمام تر واقعات کا انتخاب الحمدللہ میرا ذاتی ہوتا ہے۔ میرا لکھنے کا ایک مخصوص انداز ہے اور وہ انداز بالکل سادہ ہے۔ میں لکھتے وقت واقعات میں ڈوب جاتا ہوں۔ میں عبارت کو نہایت آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود مجھے مشکل الفاظ کے معانی آتے ہیں نہ ہی ہمارے قارئین کی اکثریت ایسے الفاظ کو جانتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ قارئین کی اکثریت مشکل الفاظ کو پڑھنا ناپسند کرتی ہے۔ ان کے نزدیک عبارت جس قدر عام فہم اور آسان زبان میں لکھی گئی ہو، اسے سمجھنا اسی قدر آسان ہوگا۔ میں قارئین کی نبض کو خوب پہچانتا ہوں۔ میں انھی کی زبان میں گفتگو کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ بطور خاص نوجوان نسل میری کتابوں کو پسند کرتی ہے۔ اپریل 2014ء میں جب میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو اس وقت میری کتب کم از کم تین لاکھ کی تعداد میں الحمدللہ شائع ہو چکی ہیں۔ بلاشبہ میرے جیسے گم نام مؤلف کے لیے یہ اعزاز سے کم نہیں۔

یہ کتب میں نے دارالسلام کو بغیر کسی رائلٹی کے بطور تحفہ دی ہیں۔ اللہ کا یہ بھی میرے اوپر کرم ہے کہ میں نے آج تک ان کتب کے عوض دارالسلام سے کوئی ایک پیسہ بھی وصول

نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی مبلغ مانگنے کا ارادہ ہے۔ محض تحدیث نعمت کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ میرا اور اہلیہ انیسہ فردوس کی زندگی کا بیشتر حصہ دعوت میں گزرا ہے۔ الحمدللہ! آج تک ہم نے کبھی کسی سے صلہ کی امید نہیں رکھی، نہ مطالبہ کیا، سوائے ایک مرتبہ کے اور وہ بھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ کسی دوست نے ایک معمولی سا گفٹ دیا جو میں نے قبول کرلیا۔ مجھے اور میری اہلیہ کو اللہ تعالیٰ نے کامل استغناء دے رکھا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے سوچا: عبدالمالک! اگر تمھیں کوئی شخص دعوتی کام کا معاوضہ پیش کرے تو تم کیسا محسوس کرو گے؟ تو میرا جواب تھا کہ میں اس معاوضہ کی خواہش کو آگ کے انگارے سے تشبیہ دوں گا۔ مجھے میرے رب نے اتنا کچھ دے رکھا ہے کہ میں اس کام کے بدلے میں کسی دنیاوی صلہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ سعودی عرب میں محاضرات دینے کے لیے حکومت سے تصریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں متعلقہ آفیسر کے سامنے پیش ہوا، وہ کڑا امتحان لیتے تھے اور سعودی جامعات سے فارغ التحصیل ہونا شرط قرار دیتے تھے۔ میں نے ان کو اپنی کتب کا سیٹ پیش کیا اور کہا: یہ رہیں میری ڈگریاں۔ الحمدللہ ہر ہفتہ اخبار میں میرا کالم آتا ہے جو A4 سائز کے چار صفحات کے برابر ہوتا ہے۔ رہا معاوضہ کا سوال تو اللہ کی قسم! اگر آپ مجھ سے میرے ہر جمعہ اور محاضرہ کے بدلہ میں مجھ سے کوئی رقم طلب کرو تو میں اپنی جیب سے دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور میں رو پڑا۔ اس نے مسکرا کر میرے جذبے کی قدر کی اور کہنے لگا: عبدالمالک! ہم آپ کو تصریح جاری کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے حافظ نور عالم صاحب کی خدمات کو میں کبھی نہیں بھولا، ہمیشہ ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔

قصہ مسجد نبوی اور غزوات نبوی کے ماڈلز کا......

مجھے سعودی عرب میں رہتے ہوئے 32 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔الحمدللہ! سیکڑوں بار مسجد نبوی شریف میں نماز ادا کرنے کا موقع ملا ہے۔اللہ کے رسول ﷺ اور مدینۃ الرسول کی محبت مجھ سمیت تمام مسلمانوں کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی تھی:

> اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کی دعا کے نتیجہ میں مدینہ منورہ کی معیشت اور رونق روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

"اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت سے بھی بڑھا دے۔ اے اللہ! ہمارے غلہ و پیداوار میں برکت فرما اور اس کی آب وہوا کو ہمارے موافق بنا دے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کی اس دعا کو قبول فرما لیا، جس کے نتیجہ میں مدینہ منورہ کی معیشت اور رونق روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔اس شہر کی محبت ہر مسلمان کے دل میں ہمہ وقت موجزن رہتی ہے۔ مدینہ منورہ نے گزشتہ 32 سالوں میں بے حد ترقی کی ہے۔شہر چاروں طرف سے خاصا بڑھ گیا ہے۔جب میں 32 سال قبل والے مدینہ طیبہ کا

آج کے عظیم الشان شہر سے مقابلہ کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ گزشتہ سالوں کے مقابلے میں یہ مقدس شہر کئی گنا بڑا ہو چکا ہے۔ جہاں دیکھیں ہر طرف ترقیاتی کام ہو رہے ہیں۔

راقم سمیت بے شمار لوگوں کو یہ جاننے کی تمنا اور خواہش ہوگی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں مدینہ طیبہ کیسا شہر تھا؟ مسجد نبوی کتنی بڑی تھی اور اس کی شکل وصورت کیسی تھی؟ مدینہ یونیورسٹی میں شام سے تعلق رکھنے والے ایک پروفیسر تھے، ان کو بھی مدینہ کی تاریخ اور ثقافت پر تحقیق کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کے اندر ایک ورکشاپ قائم کر لی، جس میں انھوں نے اپنے علم اور مطالعہ کی بنا پر مسجد نبوی، مدینہ شہر اور غزوات پر مبنی لکڑی کے ماڈل بنانے شروع کر دیے۔ یہ خاصا مہنگا اور مشکل شوق تھا، مگر ان کے دل ودماغ پر یہ کام کرنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔ کسی دانا نے کہا ہے: اگر کسی جگہ خوشبو موجود ہو تو اس کی مہک سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔ انھیں بھی اس کا وافر حصہ ملتا ہے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو اس عظیم منصوبے کی اطلاع ہونا شروع ہوئی تو انھوں نے ان کے گھر آکر ان ماڈلز کو دیکھنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے اس منصوبے کی تحسین کی اور ان کی خوب حوصلہ افزائی کی، مگر اس عظیم کام کے لیے خاصی رقم درکار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا بندوبست یوں کیا کہ اس منصوبے کی اطلاع گورنر مدینہ کو ہوئی تو انھوں نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی ان ماڈلز کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک دن ان کے گھر پہنچ گئے اور اس ورکشاپ کو دیکھا جس میں یہ عظیم کام ہو رہا تھا۔ انھوں نے شام کے اس پروفیسر کو مبارک باد دی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا اور پھر ایک اطلاع کے مطابق اسلامک ڈویلپمنٹ بنک نے بھی اس کام میں تعاون کیا۔

کسی دانا نے کہا ہے: اگر کسی جگہ خوشبو موجود ہو تو اس کی مہک سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ مدینہ شریف میں سیرت پر ایک نمائش لگی تھی، جس میں مختلف ماڈلز رکھے گئے تھے۔ میں بطور خاص ریاض سے یہ نمائش دیکھنے کے لیے گیا تھا جو مجھے بہت زیادہ پسند آئی۔ اس میں شرکاء کو بتایا گیا کہ غزوہ بدر کیسے ہوا؟ مسلمانوں کا پڑاؤ کہاں تھا؟ قریش کا ٹھکانہ کس جگہ تھا؟ معرکہ کہاں ہوا؟ ان ماڈلوں کی بدولت سیرت کے ان اہم واقعات کو سمجھنے اور انھیں ذہن نشین کرنے میں بڑی مدد ملی۔ میں نے کافی وقت اس نمائش میں گزارا۔ مدینہ منورہ کے دوستوں اور ساتھیوں نے مسئولین سے ملوایا۔ میں نے مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات لکھتے ہوئے یہ تمنا ظاہر کی کہ اس قسم کی نمائش کو عام ہونا چاہیے۔ یہ بڑا مبارک کام ہے۔ خصوصاً ہماری نوجوان نسل، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ وطالبات میں سیرت کے پیغام کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس قسم کے ماڈل سیرت کے مختلف پہلوؤں کو عام کرنے میں بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں خود ان ماڈلز کو پاکستان بھجوانے کا بندوبست کرسکوں گا۔ مگر ایک بات طے ہے کہ سوچوں پر پہرے تو نہیں بٹھائے جاسکتے۔

قارئین کرام! سیرت کے حوالے سے نمائش کا سلسلہ کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کے لیے حکومت نے ایک بڑا ادارہ قائم کر دیا ہے، جس نے تحقیق کے میدان میں مزید نکھار پیدا کیا ہے۔

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں خود ان ماڈلز کو پاکستان بھجوانے کا بندوبست کرسکوں گا۔

میں نے نیت کرلی کہ جب بھی موقع ملا ہم ان ماڈلز کو پاکستان منتقل کریں گے۔ وقت گزرتا گیا، میرے ارادے میں مزید پختگی آتی گئی، مجھے معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ میں ایک سعودی اسکول ٹیچر فہد المبارک نے اس منصوبے کو ''موبائل'' صورت میں منتقل کردیا ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے ماڈلز کو ٹرکوں پر رکھ کر مختلف اسکولوں میں دکھانا شروع کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری خواہش بڑھتی چلی گئی۔ آخرکار ایک دن میں نے برادر عزیز ابوتراب نور پوری سے اپنی اس خواہش کا تذکرہ کیا کہ میں یہ ماڈلز پاکستان لے جانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے جناب فہد المبارک سے ذکر کیا۔ ان کا جواب بڑا حوصلہ افزا تھا۔ انھوں نے کہا: میں آپ لوگوں کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہوں۔

پھر ایک دن ہم لوگ ان کے گھر گئے اور ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ سعودی عرب میں لیبر کے اخراجات کافی زیادہ ہیں، اس لیے ان کی قیمت یہاں کافی زیادہ ہے۔ میری خواہش یہی تھی کہ ماڈلز مدینہ منورہ ہی میں تیار ہونے چاہییں۔ میں شکرگزار ہوں برادرم فہد المبارک کا کہ انھوں نے ازراہ محبت ان ماڈلز کو آدھی سے بھی کم قیمت پر مہیا کردیا۔

برادرم ابوتراب اور عزیزم منیب کبریا کا اس سلسلے میں تعاون مثالی رہا اور الحمدللہ! آج میری کئی برس پرانی خواہش پوری ہوچکی ہے۔ یہ ماڈلز لاہور پہنچ چکے ہیں اور دارالسلام کی عمارت میں سیرت کی کتابوں کے ساتھ ان کی بھی نمائش کی جارہی ہے۔

پیغام ٹی وی کی سالانہ میٹنگ......مکہ مکرمہ میں

پیغام ٹی وی کی مجلس امناء (ٹرسٹیز) کی سالانہ میٹنگ 28 شعبان 1434ھ مطابق 7 جولائی 2013ء اتوار کے روز طے تھی۔ مجلس امناء کے رئیس، عالم اسلام کی نمایاں شخصیت، امام وخطیب حرم مکی شریف ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس ہیں۔ اس سال یہ اجلاس ان کے دفتر میں ہوا جو بیت اللہ شریف سے چند منٹ کی پیدل مسافت پر ہے۔ پیغام ٹی وی الحمدللہ! بتدریج ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

اس پروگرام میں شرکت کے لیے امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث جناب پروفیسر ساجد میر صاحب 29 جون ہفتہ کی صبح اسلام آباد سے ریاض پہنچے تو ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ انھوں نے ریاض میں چار دن کا نہایت مصروف وقت گزارا۔ کارکنان اور سعودی حکومت کے متعدد ذمہ داران سے ملاقاتیں کیں۔ نوجوانوں کی تنظیم پاک پروفیشنل فورم کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور کارکنان سے خطاب فرمایا۔ یہ تنظیم بھی سلفی نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زیادہ تر انجینئر ہیں۔ کم وبیش سبھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں۔ یہ نوجوان سوشل ورک بھی کرتے ہیں اور دینی امور میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

ریاض میں پیغام ٹی وی کا باقاعدہ دفتر قریباً دو ماہ پہلے کھل چکا ہے۔اس کا رسمی افتتاح ہو چکا تھا، مگر حضرۃ الامیر کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خاص کارکنان کا پروگرام اس دفتر میں منعقد کیا گیا۔توقع سے کہیں زیادہ حاضری تھی۔ پروفیسر ساجد میر صاحب جب ریاض میں ہوتے ہیں تو ہم لوگ بڑے مزے میں ہوتے ہیں۔دارالسلام کا دفتر ان دنوں امیر محترم کے دفتر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں ان کو ہر طرح کی سہولت میسر ہوتی ہے۔یہاں جماعتی مسائل، مشورے، سیاسی اور علمی گفتگو سبھی کچھ چلتا ہے۔ پروفیسر صاحب ایک جرنیل کی طرح ہیں۔ وہ ہماری تربیت کے ساتھ ساتھ ہماری علمی استعداد میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ بطور خاص میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جیسے ہی میں نے کوئی غلط تلفظ بولا، وہ بڑی محبت سے تصحیح کر دیتے ہیں۔ ہم اکثر کہتے ہیں: یہ بہاریں محترم پروفیسر ساجد میر صاحب کی وجہ سے ہیں۔

پروفیسر صاحب چار دن کے قیام کے بعد مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ میرے ذاتی علم کی حد تک آج تک ایسا نہیں ہوا کہ وہ سعودی عرب آئے ہوں اور مدینہ طیبہ نہ گئے ہوں۔

راقم الحروف کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ بھی پیغام ٹی وی کی مجلس ٹرسٹیز میں شامل ہے۔کل چودہ ٹرسٹیز ہیں جن کے رئیس جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن السدیس ہیں۔ ان کے نائب پروفیسر ساجد میر صاحب ہیں۔ پیغام کے مدیر عام جناب ڈاکٹر حافظ عبدالکریم صاحب ہیں اور راقم الحروف کو ان کا نائب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جناب علی محمد ابوتراب سعودی عرب میں پیغام ٹی وی کے مدیر تنفیذی ہیں۔اس طرح پاکستان سے چار ٹرسٹیز ہیں۔سعودی عرب سے تین، قطر سے دو، بحرین، کویت، برطانیہ، بنگلہ دیش اور

بھارت سے ایک ایک نمائندہ ہے۔اس طرح کل تعداد 14 ہے۔اوپر میں ذکر کر چکا ہوں کہ ہر سال ان ٹرسٹیز کا اجتماع ہوتا ہے جس میں گزشتہ سال کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا ہے اور آئندہ سال کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے، نیز بجٹ کی منظوری کے ساتھ ساتھ ٹرسٹیز کے مشورے اور ان کی توجیہات سنی جاتی ہیں۔مدیر عام اپنی رپورٹ میں بتاتے ہیں: ہمارا گزشتہ سال کیسے گزرا اور ہم نے کن حالات میں کام کیا۔اس اجلاس میں اگر اچھی کارکردگی کی تحسین ہوتی ہے تو نقائص پر تنقید بھی ہوتی ہے۔ذمہ داران اپنا دفاع بھی کرتے ہیں۔کھلے دل سے تنقید اور مشورے سنتے اور قبول کرتے ہیں۔

7 جولائی 2013ء کو نماز ظہر کے فوراً بعد یہ اجلاس شروع ہونا تھا۔برطانیہ سے برادرم شعیب احمد میرپوری بطور خاص تشریف لائے ہوئے تھے۔ان سے ملاقات میں وہاں کے جماعتی، دعوتی، سیاسی اور اقتصادی حالات سے آگاہی ہوئی۔الحمدللہ! وہاں کی مرکزی جمعیت اہل حدیث خاصی فعال ہے۔عصر کی نماز کے وقت امیر محترم سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: آج رات کا کھانا سعودی عرب کی معروف علمی شخصیت اور امام کعبہ شیخ صالح بن عبداللہ بن حمید کے گھر ہے۔عشاء کے بعد پاکستانی سفارت خانے کے کمرشل منسٹر جناب حجاب گل تشریف لے آئے۔کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔محبت بھرے انداز میں گلے شکوے ہوئے۔آئندہ جدہ میں ملاقات کے وعدے پر مسکراہٹوں سے فضا خوشگوار ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک زندگی میں جو ''حلہ'' پہنا تھا، اس کی شکل کیسی تھی؟ کیا آج یہ ''حلہ'' بازار میں مل سکتا ہے؟

شیخ صالح بن حمید کا گھر بیت اللہ سے زیادہ دور نہیں۔ شیخ کے آدمی بازار میں انتظار کر رہے تھے۔ دروازے پر شیخ صاحب کے ایک خوبصورت مگر متواضع بیٹے نے اور پھر اندر مجلس میں شیخ صاحب نے وفد کے ارکان کو گلے لگایا۔ محترم ساجد میر صاحب سے ان کے برسوں پرانے تعلقات ہیں۔ حافظ عبدالکریم صاحب تو جامعہ ام القریٰ میں ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اس مجلس میں بہت عمدہ اور مفید گفتگو رہی۔ گفتگو کا مرکز پیغام ٹی وی ہی رہا۔ پشتو زبان میں جلد ہی چینل شروع کرنے کا عزم، اس میں رکاوٹیں، چیلنجز، دعوتی سرگرمیاں اور سیاسی میدان میں جماعت کی جھود پر بات چیت ہوتی رہی۔

راقم الحروف خاصی دیر سے ایک سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی مبارک زندگی میں جو "حلہ" پہنا تھا، اس کی شکل کیسی تھی؟ کیا آج یہ "حلہ" بازار میں مل سکتا ہے؟ جب میں نے شیخ صاحب سے یہی سوال کیا تو اس پر بحث شروع ہو گئی۔ انھوں نے مجھے کئی کتابوں کے حوالے دیے۔ جن میں امام ابن القیم کی مشہور کتاب "زاد المعاد" کا نام لیا۔

حسب روایت کھانا نہایت لذیذ اور یادگار تھا۔ شیخ صالح بن حمید بار بار فرما رہے تھے: وقت کی قلت کے باعث ہم زیادہ اہتمام نہیں کر سکے۔ مگر اس کے باوجود کوئی سات آٹھ ڈشیں تو ضرور ہوں گی۔ رات کے کم وبیش ساڑھے گیارہ بجے ہم ان کے گھر سے رخصت ہوئے تو انھوں نے ہر مہمان کو گلے لگا کر دروازے پر آ کر رخصت کیا۔

قارئین کرام! اگر آپ امام کعبہ کے ساتھ آدھی رات تک ہوں اور پھر حرم مکی کی نماز فجر میں انھی کی آواز سنیں تو آپ کو کیسا لگے گا؟ 7 جولائی کو میں فجر کی نماز کے لیے کھڑا ہوا تو نماز شیخ صالح بن حمید ہی پڑھا رہے تھے۔ میں ان کا بڑا مشتاق ہوں اور جب ان کی آواز

سنی تو نہال ہو گیا۔ اللہ اکبر! اس عظیم شخصیت کے ساتھ تو رات ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر میں نے کھانا کھایا تھا۔ بلاشبہ یہ زندگی کا بہترین اور یادگار عشائیہ تھا۔

پیغام ٹی وی کی مجلس امناء کی میٹنگ اور پروگرام شیخ عبدالرحمٰن السدیس کے دفتر میں ظہر کے فوراً بعد شروع ہونا تھا۔ شیخ صاحب کا دفتر پانچویں منزل پر ہے۔ ہم نے ظہر کی نماز انھی کے دفتر سے ملحق بڑی مسجد میں ادا کی۔ پھر جہاں تقریب ہونا تھی، اس ہال میں پہنچے۔ یہ ایک بڑا ہال ہے جہاں سٹاف کی میٹنگیں چلتی رہتی ہیں۔ سامنے اسٹیج پر پیغام کا بڑا سا ''لوگو'' لگا ہوا تھا۔ ہال کا فرنیچر نہایت خوبصورت اور قیمتی ہے۔ ٹی وی اور پریس کے نمائندے پہنچ چکے تھے۔ دیواروں پر حرمین شریفین کی مستقبل میں توسیع کے حوالے سے بڑی بڑی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ جب حرم کی حالیہ توسیع کا منصوبہ مکمل ہوگا تو حرم پاک مزید خوبصورت اور وسیع ہو جائے گا۔ لاکھوں حاجیوں کی گنجائش بڑھ جائے گی اور انھیں بہت ساری دیگر سہولتیں ملیں گی۔

شیخ صاحب کے دفتر سے بلاوا آ گیا کہ اراکین مجلس اُمناء اندر آ جائیں۔ میرے لیے ان کے دفتر میں جانے کا پہلا موقع تھا۔ شیخ صاحب کی تواضع دیکھیں کہ وہ اپنے دفتر کے دروازے پر کھڑے تمام ارکان کو گلے لگا رہے تھے۔ ان کے نام لے لے کر انھیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

شیخ سدیس نے صدارت کی کرسی سنبھالی اور کارروائی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے اصرار سے کہا: صدارت اور امارت تو شیخ ساجد میر صاحب کی ہے۔ وہی اس کے اہل ہیں اور انھی سے ہمیں سیکھنا ہے۔ محترم ساجد میر نے ان سے کہا: یہ ہمارے لیے سعادت ہے کہ ہم آپ کی قیادت اور رہنمائی میں کام کریں۔ اس اجلاس میں بجٹ پیش ہونا تھا۔ اس کی

توثیق اور آئندہ کی منصوبہ بندی ہونا تھی۔ جناب حافظ عبدالکریم صاحب نے گزشتہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی، جس کی شرکاء نے توثیق کی۔ اجلاس میں ایجنڈے کی بعض شقوں پر خوب بحث ہوئی۔ طوالت کے ڈر سے اس کی تفصیل ذکر نہیں کی جارہی۔

اجلاس کے دوران چائے، قہوہ اور کھجوروں کا دور چلتا رہا۔ بلاشبہ میں نے اور تمام شرکائے اجلاس نے شیخ سدیس صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ ایک خاص بات کی طرف انھوں نے توجہ دلائی کہ ہمیں اپنے معاملات اور حسابات اس قدر شفاف رکھنا ہوں گے کہ کسی وقت بھی اگر کوئی ادارہ ان حسابات کو چیک کرنا چاہے تو وہ نہایت آسانی اور سہولت سے چیک کر سکے۔ اب وہ دور گیا جب شخصی اعتماد کی بنیاد پر کام ہوتے تھے اور ایک فرد ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ ہمیں جو کام بھی کرنا ہے اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی ہونی چاہیے۔ اسے اجتماعی بنیادوں پر کرنا ہوگا۔ معاملات کا تمام شرکاء کو علم ہونا چاہیے۔ اپنی تقریر میں کتنی بار انھوں نے سلام علیٰ اہل الحدیث کہا۔ متعدد بار انھوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ میں نے ان میں ایک خوبی دیکھی کہ انھوں نے تمام شرکائے اجلاس سے ذاتی آراء دریافت کیں اور ہر ایک کو اہمیت دی۔

ادھر مجلس امناء کا یہ اجلاس ہو رہا تھا، دوسری طرف بڑے ہال میں بہت سے نمایاں افراد جن میں تاجر حضرات، علمائے کرام اور دیگر معززین شامل تھے، امام صاحب اور ان کے ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ اجلاس ختم ہوا تو اگلے پروگرام کے لیے ہم بڑے ہال میں منتقل ہو گئے۔

جناب ابوتراب صاحب کے ترحیبی اور توضیحی کلمات کے بعد مائیک حافظ عبدالکریم صاحب نے سنبھالا۔ انھوں نے لکھی ہوئی تفصیلی رپورٹ پیش کی جس میں پیغام ٹی وی کی

آئندہ منصوبہ بندی، آنے والے مسائل اور دیگر امور پر مکمل بحث تھی۔ انھوں نے شیخ عبدالرحمٰن السدیس کو زبردست خراج تحسین پیش کیا کہ انھوں نے پیغام ٹی وی کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی چیئرمین شپ کی ذمہ داری قبول کر کے ہم سب کو بہت بڑا اعزاز بخشا ہے۔

شیخ حافظ عبدالکریم صاحب کے بعد مائیک جناب پروفیسر ساجد میر صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے جہاں سعودی حکومت اور خادم الحرمین الشریفین کا شکریہ ادا کیا، وہیں شیخ سدیس کی خدمات کو بھی سراہا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ ان شاء اللہ عنقریب پیغام ٹی وی یورپ میں بھی دیکھا جا سکے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم 30 ملین سے زائد لوگوں کے لیے پشتو زبان میں بھی چینلز لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ امیر محترم نے اس موقع پر پیغام ٹی وی کی افادیت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

اب باری تھی شیخ عبدالرحمٰن السدیس حفظہ اللہ کی۔ انھوں نے شرکاء سے تفصیلی خطاب فرمایا۔ شیخ صاحب نے موجودہ دور میں میڈیا کی اہمیت سے حاضرین کو آگاہ کیا کہ اسلام کے پیغام اور اس کی سچی تعبیر کو عام کرنے کی اس دور میں شدید ضرورت ہے۔ اسلام پر مختلف حلقوں کی طرف سے بہت زیادہ الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ ہمارے دین کو تشدد اور دہشت گردی سے جوڑا جا رہا ہے، حالانکہ اسلام امن کا دین ہے۔ انھوں نے سیرت پاک اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے حوالے دے کر فرمایا کہ اسلام کا موجودہ دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں۔ ان غلط فہمیوں کو پیغام ٹی وی بڑے عمدہ انداز میں زائل کر رہا ہے۔

اس موقع پر موجود "پیغام" کے خیر خواہوں نے دل کھول کر فنڈ زدیے۔ جن لوگوں نے پیغام کے لیے کام کیا تھا ان کو اعزازی شیلڈز سے نوازا گیا۔ سب سے پہلے پروفیسر ساجد میر صاحب نے شیخ سدیس کو شیلڈ پیش کی۔ پھر انھوں نے پروفیسر ساجد میر صاحب کو شیلڈ

پیش کی۔ مجلس امناء کے تمام شرکاء کو شیلڈ پیش کی گئی۔ راقم کی زندگی کا بڑا خوبصورت لمحہ تھا جب مجھے بھی پروفیسر ساجد میر صاحب اور شیخ عبدالرحمٰن السدیس صاحب کے ہاتھوں اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔ میں نے بھی شیخ سدیس کو اپنی نئی کتاب ''میرے سنہرے سفرنامے'' پیش کی۔ اسی دوران ایک ٹیم نے جلدی جلدی کھانا لگانا شروع کر دیا۔ وہی عربوں کا روایتی انداز، بڑے بڑے تھال جن میں چاول تھے اور ان پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے تھے۔ مہمان بیٹھتے چلے گئے۔ بلاشبہ یہ بھی میری زندگی کا ایک سنہرا دن تھا کہ اس مرتبہ مجھے بھی اسی تھال پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا اعزاز ملا جس پر شیخ سدیس، امیر محترم اور دیگر اکابرین بیٹھے تھے۔ عربوں کی عادت ہے کہ میزبان گوشت کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے مہمانوں کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے تاکہ وہ زیادہ کھائیں۔ اس عمل کو میزبان اور مہمان دونوں اپنے لیے باعث عزت و اکرام سمجھتے ہیں۔ آج کے مہمانِ خصوصی تو امیر محترم تھے، لہٰذا پہلے ان کو اعزاز ملا کہ شیخ سدیس نے گوشت کے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے ان کے سامنے رکھے۔ ان کے بعد یہ اعزاز مجھے بھی حاصل ہوا کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے گوشت کا ٹکڑا میرے سامنے رکھا۔ میں نے کھانے کے بعد شیخ سدیس سے عرض کیا:

یہ میری زندگی کا بہت اہم واقعہ ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے اور آپ نے مجھے اپنے ہاتھوں سے گوشت پیش کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری اولاد، میرے پوتے اور ان کے بعد کی نسلیں اس پر فخر کریں گی۔ پھر میں نے دیکھا کہ عصر حاضر کی سب سے عظیم شخصیت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ فرمانے لگے: عبدالمالک! ایسا نہ کہو، تم تو بھائی ہو، ہم سب آپس میں بھائی ہیں۔

آہ! میاں نعیم بھی اپنے رب رحیم کے پاس چلے گئے

24 اپریل 2011ء کو میں فجر کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو پاکستان سے برادرم عبدالعظیم اسد کا فون تھا کہ محترم میاں نعیم الرحمٰن اس دار فانی سے کوچ فرما گئے ہیں۔

﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

وہ تقریباً میرے ہم عمر تھے۔ میری پیدائش 1955ء کی ہے اور غالباً وہ بھی 1955ء ہی میں اس دنیا میں آئے۔ وہ بھی حافظ آباد کے رہنے والے تھے۔ میں نے بھی چوتھی جماعت سے وہیں تعلیم حاصل کی اور سعودی عرب آنے تک وہیں مقیم رہا۔ اس لحاظ سے وہ میرے گرائیں تھے۔ انھوں نے بچپن میں مسجد مبارک اہلحدیث میں قائم طارق ماڈل سکول میں تعلیم حاصل کی اور راقم الحروف نے بھی اسی مسجد کی چٹائیوں پر حدیث پاک کی تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ پاکستان میں ان سے ملاقات تو نہ ہوئی، مگر جب ان کے والد گرامی میاں فضل حق رحمہ اللہ کے ساتھ ہمارے تعلقات بنے اور ریاض میں متعدد بار ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا، ان کے ساتھ کئی کانفرنسوں میں شرکت کا موقع ملا تو میاں نعیم الرحمٰن صاحب سے بھی تعارف ہوا۔ ہم نے درجنوں بار ملاقاتیں کیں۔ وہ ریاض میں بہت مرتبہ میرے گھر اور دارالسلام تشریف لائے۔ مجھے یہ

کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ میرے بہت قریبی اور مخلص دوست تھے۔ میرا اوران کا درد مشترک تھا۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے مرکزی ذمہ داران میں سے تھے۔ اپنے والدمحترم کی وفات کے بعدان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ وہ رئیس جامعہ سلفیہ بن گئے۔ ہماری میٹنگ عموماً جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے شروع ہوتی اور جامعہ سلفیہ کے حالات اورواقعات ہی پرختم ہوجاتی۔

میں کبھی کبھارسوچتا کہ ایک ایسا شخص جو بلاشبہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا ہے، جس کے پاس بے حد جائیداد ہے، کئی فیکٹریوں اور بڑے بڑے گھروں کا مالک ہے، اس کی فکراورسوچ کا محور ہی جامعہ سلفیہ فیصل آباد ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ دینی اداروں کو چلانا، ان کا انتظام کرنا اورعلمائے کرام کے ساتھ چلنا اتنا آسان نہیں، مگر پھر بھی اس نے اسی پرخار راستے کا انتخاب کیا۔ ان کے دست راست اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے مدیر منتظم جناب پروفیسر یٰسین ظفر صاحب سے بارہا جامعہ کے معاملات کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ وہ ہمیشہ مجھے یہی بتاتے کہ میاں نعیم الرحمٰن نہایت دل کھول کر جامعہ پر خرچ کرتے ہیں۔

میاں نعیم الرحمٰن طویل مدت سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ الحمدللہ! میرا ان سے رابطہ شروع دن سے رہا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مشکل وقت کے دوران آدمی کے کام آنا اور اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا اظہار کرنا ہی سچی دوستی کی علامت ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس دوستی کا حق ادا کیا، مگر مجھے یہ افسوس نہیں کہ میں نے کبھی انھیں فون نہیں کیا یا میرا ان سے رابطہ منقطع رہا۔

الصعید الطیب

کوئی بارہ چودہ سال پرانی بات ہے، ہمارے ایک دوست ڈاکٹر ابراہیم ابوعباۃ مجھ سے کہنے لگے کہ ہم ہسپتالوں میں مریضوں کے لیے کچھ گفٹ تیار کرنا چاہتے ہیں، تم اس سلسلہ میں ہماری مدد کرو اور ہمیں مشورہ دو کہ ہم انھیں کیا پیش کریں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو وضو کا مسئلہ درپیش رہتا ہے، شریعت نے مریضوں کے لیے تیمّم کا حل بتایا ہے۔ مٹی پر ہاتھ مار کر اپنے چہرے پر پھیر لیں تو تیمّم ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا: اچھا غور کرتے ہیں۔ دو دن کے بعد فون آ گیا کہ ریاض شمیسی ہسپتال میں اس مسئلہ پر غور وفکر کے لیے میٹنگ ہے جس میں آپ کو بھی شرکت کرنی ہے، آپ اپنی تجویز ہمراہ لائیں۔ یہ وہ دن تھے جب اللہ کے فضل وکرم سے مجھے ہر وقت نت نئے آئیڈیاز سوجھتے تھے۔ میں نے اپنی نوکرانی سے کہا: اس مٹی کو گرائنڈ کرو اور پھر اسے ململ کے کپڑے سے گزارو۔ میں خود اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے بتاتا گیا۔ مٹی نہایت باریک ہوگئی۔ ادھر ہمارا آرٹسٹ بازار سے اسفنج کی ایک شیٹ خرید لایا تھا۔ میں نے اس سے کہا: گتے کا ایک ڈبہ بناؤ اور اس میں اسفنج کے ٹکڑے رکھ دو۔ جب ڈبہ بن گیا اور اس میں اسفنج کاٹ کر رکھ دیا گیا تو میں نے دو چمچ مٹی اسفنج میں بکھیر دی۔ مٹی ذرات کی شکل میں تھی وہ اسفنج میں دھنس گئی۔ اب میں نے اپنا ہاتھ اس پر مارا تو کچھ مٹی اٹھ کر میرے ہاتھوں سے لگ گئی۔ لیجیے جناب! تیمّم کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ہسپتال میں میٹنگ کرنے بڑے سمجھ دار لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اپنے

اپنے آئیڈیاز تھے۔ سب بیان کرتے گئے، مگر رئیس مجلس ان پر اعتراض کر کے ان کو خاموش کراتے چلے گئے۔ میں جان بوجھ کر خاموش بیٹھا رہا۔ میں اکیلا غیر ملکی تھا، باقی سب سعودی تھے۔ آخر میں میری باری آئی تو میں نے اس ڈبہ کو بیگ سے نکالا، جب عملی تجربہ کر کے دکھایا تو سب نے اسے پسند کیا۔ یہ آئیڈیا اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ ہر مریض کو ایک ایک ڈبہ دیں، جب وہ ہسپتال سے فارغ ہو تو یا تو اسے ضائع کر دے یا گھر لے جائے، کیونکہ یہ صرف ایک شخص کے ذاتی استعمال کے لیے بنایا گیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ آئیڈیا اتنا زیادہ پسند کیا گیا کہ اس کے جواز پر علماء کے بورڈ نے فتویٰ دے دیا۔

دارالسلام کو لاکھوں کی تعداد میں اس کے آرڈر ملے۔ پہلے یہ موٹے کاغذ کا ڈبہ تھا جو ہفتہ دس دن بعد ٹوٹ جاتا ہے، مجھے وہ تیونسی نہیں بھولتا جس نے مجھ سے کہا تھا: عبدالمالک! یہ صرف تجارت نہیں بلکہ عبادت ہے، اسے مزید بہتر بناؤ۔ میں نے دفتر آ کر اپنی نگرانی میں گتے کا ڈبہ بنوایا اور اسے چین بھجوا دیا۔ پھر خود چین گیا تو اپنی نگرانی میں اس کی خوبصورت پیکنگ بنوائی۔ ہم نے موٹا گتہ استعمال کیا۔ آرڈر تیس ہزار، چالیس ہزار، کبھی لاکھ کی صورت میں مل جاتا تھا۔ الحمدللہ! یہ آئیڈیا بڑا مقبول ہوا۔ لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس آئیڈیا کو اپنے نام رجسٹرڈ کرواؤں۔ میرا جواب تھا کہ یہ عبادت ہے جو کوئی بھی کاپی کرنا چاہے مجھے پروا نہیں۔ بعض لوگوں نے سوریا (شام) اور مصر سے اس جیسا ڈبہ بنوایا، مگر ہم چین سے کام کرواتے ہیں، اس کا ریٹ اور کوالٹی سب سے بہتر ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں کسی بھی ہسپتال میں جاؤں الصعید الطیب کا یہ ڈبہ نظر آتا ہے۔ اسے دبئی اور کویت کی حکومت نے خریدا، یہ قطر کے ہسپتالوں میں گیا، اسے اللہ تعالیٰ نے دارالسلام کی آمدنی کا ذریعہ بھی بنا دیا۔ (والحمد للّٰہ علی ذٰلك)

مفکر، ادیب، صحافی، بینکر، اکانومسٹ

ڈاکٹر یوسف عثمان الحزیم

یہ 1996ء کی بات ہے کہ میں سعودی عرب کے نائب وزیر مذہبی امور فضیلۃ الشیخ صالح بن عبدالعزیز بن محمد آل الشیخ کے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے گیا۔اس زمانے میں ہم کتب ستہ جنھیں پاکستان میں صحاح ستہ کہا جاتا ہے، کو ایک جلد میں شائع کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔اس کا اشراف جناب وزیر موصوف کر رہے تھے۔ان دنوں وہ نائب وزیر تھے۔میں ان کے دفتر میں داخل ہوا تو ان کے کمرے میں ایک باوقار شخصیت تشریف فرما تھی۔وزیر موصوف نے میرا ان سے تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ ڈاکٹر یوسف بن عثمان الحزیم ہیں جو ایک بینکار ہیں اور فیصل اسلامی بینک سے وابستہ ہیں۔پہلے یہ الراجحی بینک میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔کچھ گپ شپ اور ہنسی مذاق ہوا، ہم مسکراتے رہے۔میں نے ان سے کہا: آپ تو اسلامی بینک میں کام کرتے ہیں، آگے بڑھیں اور دارالسلام کو کچھ عطیات پیش کریں۔ہمیں ریسرچ ورک کے لیے تو بینکروں کی ضرورت ہے۔میں نے یہ بات مذاق اور شغل کے انداز میں کہی تھی۔محفل میں ایک قہقہہ لگا، اور بات آئی گئی ہوگئی۔کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے۔میں اپنا

کام مکمل کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔

چند ماہ گزرے وزیر موصوف نائب وزیر سے مکمل وزیر بن گئے اور نئے دفتر میں منتقل ہو گئے۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو موصوف کسی بیرونی وفد کے ساتھ مصروف ملاقات تھے۔ مجھے اشارہ کیا گیا کہ میں ان کے سیکرٹری خاص محمد العمری کے دفتر میں بیٹھ کر ان سے ملاقات کا انتظار کروں۔ دفتر میں گیا تو سامنے کرسی پر جناب یوسف الحزیم بھی تشریف فرما تھے۔ تعارف تو ان سے پہلے ہی ہو چکا تھا، وہ بھی وزیر موصوف سے ملنے کے لیے آئے تھے اور میری طرح انھیں بھی انتظار کے لیے کہا گیا تھا۔ ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ استاذ محمد العمری تو اپنا دفتر چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ ہم دونوں اکیلے تھے، اس لیے خوب کھل کھلا کر تعارف ہوا۔ ہمیں کافی وقت مل گیا، اس دوران ہم نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستان سنائی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پاکستان میں مؤسسہ خیریہ سے کیا تھا۔ یہ سعودی حکومت کے زیر انتظام عالمی تنظیم ہے جو دنیا بھر میں مسلمانوں سے تعاون کرتی ہے۔ وہ کچھ عرصہ ''مانسہرہ'' میں بھی رہے۔ وہ اس کا بہت ذکر کرتے تھے۔ انھیں اس علاقے سے بڑی محبت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ انھیں اہل پاکستان کے ساتھ خاص تعلق اور محبت ہے۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر یوسف الحزیم کا تعلق ''درعیہ'' سے ہے۔ بڑے نفیس، خوبصورت گفتگو کرنے والے، علمی، ادبی شخصیت ہیں۔ دل میں اسلام کا بہت زیادہ درد رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ اور منہج بہت پختہ ہے۔ وہ اہل حدیث سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو پکے دوست بن چکے تھے۔

کچھ عرصہ بعد انھوں نے ''مؤسسة العنود الخيرية'' کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت

ایک امیر کبیر باپ اور علاقے کے سردار کی بیٹی ایک دور میں ملکہ بن جاتی ہے۔

سے عہدہ سنبھال لیا۔ شاہ فہد بن عبدالعزیز کی اہلیہ محترمہ امیرہ العنود ؒ کی عمر جب صرف تیس سال تھی، تب اس صالح خاتون نے وصیت کی تھی کہ میری وفات کے بعد میری دولت کا تیسرا حصہ خیر و بھلائی کے کاموں، تعمیر مساجد و مدارس، تربیت ایتام و بیوگان، اشاعت قرآن کریم اور دینی کتب کی نشر و اشاعت میں لگایا جائے۔ اس وصیت نامہ کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس پر گواہی علامہ الشیخ ابن باز کی ہے۔ یہ مبارک خاتون شاہ فہد بن عبدالعزیز کے بچوں کی والدہ تھیں۔ ان کے اپنے والد بھی ''امیر'' منطقہ تھے۔ ایک امیر کبیر باپ اور علاقے کے سردار کی بیٹی ایک دور میں ملکہ بن جاتی ہے۔ شاہ فہد اپنے دور کے بہت ہی امیر ترین بادشاہ گزرے ہیں۔ یہ متقی خاتون اپنی زندگی میں اپنے خاندان کے لیے ابر رحمت تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بے شمار خیر کے کام کیے اور ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کی دولت سے العنود فاؤنڈیشن بنائی گئی۔ ان کی چھوڑی ہوئی جائداد کو کاروبار میں لگا دیا گیا۔ ہمارے دوست ڈاکٹر یوسف الحزیم اس منصوبے کے انچارج بنا دیے گئے۔ ان کے حسن تدبر سے ہر سال خاصی بڑی رقم مؤسسہ کو بطور منافع مل جاتی ہے، جسے یہ ادارہ وصیت کے مطابق خیر کے کاموں میں لگا دیتا ہے۔ انھیں شاہ فہد کے بیٹوں کا بے پناہ اعتماد حاصل ہے۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ ان کا دفتر میرے گھر اور دارالسلام سے کوئی پانچ سات منٹ کی ڈرائیونگ کے فاصلے پر ہے۔ مختلف مواقع پر ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں نے ان کو مرکزی جمعیت اہل حدیث اور اس کے امیر جناب پروفیسر ساجد میر صاحب کا مکمل

تعارف کروا دیا تھا۔ وہ جماعت کے بارے میں کچھ معلومات پہلے بھی رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد محترم جناب پروفیسر ساجد میر صاحب ریاض تشریف لائے تو میں نے ان کو بھی ڈاکٹر یوسف صاحب سے ملوا دیا۔ پروفیسر ساجد میر صاحب کی اپنی ایک شخصیت اور اہمیت ہے۔ وہ عصر حاضر میں اسلام کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کا امیر ہونا کوئی معمولی عہدہ تو نہیں۔ ڈاکٹر یوسف الحزیم پہلے ہی اہل حدیث سے خوب محبت کرتے تھے۔ اس سے ان کے تعلقات غیر معمولی حد تک آگے بڑھ گئے۔ اب بھی ان کے آپس میں مثالی تعلقات ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الحزیم بے شمار خوبیوں کا مرقع ہیں۔ انھوں نے دولت کو نہایت عمدہ انداز میں مختلف منافع بخش منصوبوں میں لگایا۔ ریاض کے نہایت پوش علاقے میں فائیو سٹار ہوٹل بنایا جس کی آمدن چیرٹی کے کاموں میں خرچ ہوتی ہے۔ وہ نت نئے منصوبے بناتے ہیں اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ ان پر عمل کرتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے حوالے سے اس مؤسسہ کی کتب کی طباعت کا کام دارالسلام کے سپرد ہے۔ ہم نے کتنی ہی کتابیں نہایت خوبصورت انداز میں بیروت سے طبع کروائی ہیں۔ میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ ڈاکٹر یوسف متعدد بار میرے گھر تشریف لائے ہیں۔ ہم کتنی ہی بار گھنٹوں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ وہ نہایت مدبر اور خلیق شخصیت ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے: اپنے سے بہت بڑے انسان کو کبھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کے بارے میں نہ بتانا کہ ان سے علاج کروائیں۔ اسی طرح بہت بڑے آدمی کے ساتھ ایک ساتھ دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے بچنا۔

ان کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کا اگر تذکرہ کروں تو یہ مضمون بہت بڑا ہو جائے

اپنے سے بہت بڑے انسان کو کبھی کسی ڈاکٹر یا حکیم کے بارے میں نہ بتانا کہ ان سے علاج کروائیں۔ اسی طرح بہت بڑے آدمی کے ساتھ ایک ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھانے سے بچنا۔

گا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے ہیں۔ مجھ پر ایک مشکل وقت آیا تو میرا بیٹا عکاشہ ان سے ملنے کے لیے گیا۔ انھوں نے اپنا بٹوہ نکال کر عکاشہ کی طرف اچھال دیا اور کہنے لگے: اپنی والدہ کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہو: جتنی رقم کی آپ کو ضرورت ہے اس میں سے لے لیں۔ الحمدللہ! ہم نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا نہ ہی لینا تھا مگر اس سے ان کے نیک جذبات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ معروف تر ہوتے چلے گئے۔ ان کے روابط بلاشبہ بہت بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ملنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے، مگر وہ دارالسلام کو اور مجھے ہمیشہ خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں ان سے ملاقات کے لیے گیا ہوا تھا، ہم گفتگو کر رہے تھے کہ ایک وفد آ گیا۔ اس کے ارکان کو میرا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے:

تم لوگ اس شخص کو نہیں جانتے۔ یہ دارالسلام کا مدیر ہے جو اس وقت دنیائے اسلام کا عربی زبان کو چھوڑ کر دیگر زبانوں کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ شیخ عبدالمالک میرا نہایت ہی عزیز اور صدیق ہے۔ یہ اہل حدیث ہے اور ان کا نمائندہ ہے۔ یہ ادیب، صحافی، ناشر اور مؤلف ہے، کتنی ہی کتب اس نے لکھی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ نہایت

مدبر اور مفکر انسان ہے۔

اتنے بڑے آدمی کے منہ سے اپنے بارے میں یہ کلمات سن کر میں پانی پانی ہو گیا۔ وہ میٹنگ اس قسم کی تھی کہ میں کوئی جواب نہ دے سکا، اٹھ کر چلا آیا، پھر میں نے ان کو شکریہ کا پیغام بھجوایا اور کہا: کاش! آپ ان الفاظ کو کاغذ پر لکھ دیتے۔

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے ایک مرتبہ بلوایا اور کہنے لگے: ہمارے پاس دس چھوٹی چھوٹی کتابوں کا سیٹ ہے۔ ہم ان کتابوں کو ایک لاکھ کی تعداد میں چھپوانا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایسی تجویز پیش کرو کہ یہ سیٹ ہر عام و خاص کو ملے، یہ خوبصورت بھی ہو اور زیادہ مہنگا بھی نہ ہو۔

میرے اوپر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات میں ایک یہ بھی ہے کہ میں پلاننگ فوراً کر لیتا ہوں۔ جب تک کسی منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا لوں، مجھے چین نہیں آتا۔ میں نے ان کو تجویز دی کہ ہم ان کتابوں کو پاکٹ سائز میں آرٹ پیپر پر چین سے چھپواتے ہیں، پھر ان کی تجلید کریں گے اور ان پر ڈسٹ کور چڑھائیں گے، پھر ان کتب کو خوبصورت پیکنگ میں بند کریں گے۔ اس مجموعہ کا نام ہم المجموعة الذهبية رکھیں گے۔ آئیڈیا اچھا تھا، کہنے لگے: میں اس کی پریکٹیکل شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔ فائنل منظوری شاہ فہد کے بیٹے اور بیٹی دیں گے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں ہر وقت چین جاتا رہتا تھا۔ کہنے لگے: نمونہ تمھارے اپنے اخراجات پر بنے گا اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمھیں آرڈر مل جائے گا، ورنہ نہیں۔ میں نے ایک کتاب کو اپنی مرضی کے مطابق ڈیزائن کیا، اپنی نگرانی میں اس کی پیکنگ تیار کروائی اور چین چلا گیا۔ وہاں ننکبو میں چار پانچ دن ٹھہرا۔ کتاب کو اپنی نگرانی

میں چھپوایا۔اس کی تجلید کروائی۔اس کی خوبصورت پیکنگ بنوائی۔ پریس والوں کو میں نے بتادیا کہ یہ نمونہ ہے، میرے ساتھ تعاون کریں۔ میری ہدایات پر عمل کریں۔اگر نمونہ پسند آ گیا تو پھر ہمیں ایسے ایک لاکھ ڈبے بنانا ہوں گے۔ یہ دس کتابیں ہیں اور ہر کتاب ایک لاکھ کی تعداد میں چھپے گی۔ گویا ایک ملین کتاب ہو گی۔انھوں نے بھی میرے ساتھ صبر کیا۔ میں جیسے جیسے کہتا گیا وہ بناتے چلے گئے۔ہم نے بعض اوقات رات گئے تک کام کیا۔اصلی نمونہ بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ خیر جب میں ننگبو سے روانہ ہوا تو میرے بیگ میں اس منصوبے کے دو نمونے تھے جو سو فیصد اصل تھے،تاہم ڈبے کے اندر ایک ہی کتاب دس مرتبہ ڈالی گئی تھی۔ یہ ڈبہ واقعی بڑا خوبصورت تھا۔

ریاض آ کر میں نے یہ ڈبہ ڈاکٹر یوسف صاحب کو دکھایا تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے: اب اسے فائنل منظوری کے لیے شہزادہ سعود بن فہد اور ان کی ہمشیرہ شہزادی کو بھیجنا ہے۔انھیں ایک ایک نمونہ بھجوا دیا گیا۔ میرا منصوبہ الحمدللہ کامیاب رہا۔ہمیں ایک لاکھ مجموعہ کا آرڈر مل گیا۔میرا اپنا اندازہ ہے کہ اب تک مختلف اوقات میں ساڑھے تین لاکھ مجموعات شائع ہو چکے ہیں۔اب مجھے چین جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔الحمدللہ! فون پر ہی کام ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف الحزیم نے اپنی نگرانی میں ریاض کے پوش علاقے میں مؤسسۃ العنود الخیریہ کا بڑا خوبصورت دفتر بنوایا ہے۔ اس کے ساتھ بڑی خوبصورت مسجد ہے۔ ڈاکٹر یوسف صاحب کی بعض کتب کو دارالسلام نے بڑی محبت اور چاہت سے شائع کیا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ دوستی اور تعلقات پر فخر ہے۔

ڈاکٹر ذاکرعبدالکریم نائیک اور دارالسلام

ڈاکٹر ذاکر نائیک سے میری ملاقات اتنی ہی پرانی ہے جتنا پرانا دارالسلام ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کروں گا کہ جیسے ہی دارالسلام کا آغاز ہوا، ڈاکٹر ذاکر نائیک سے میرے تعلقات شروع ہو گئے، تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ جیسے ہی دارالسلام کی کتب کو اللہ تعالیٰ نے پذیرائی بخشی ہمارا ڈاکٹر ذاکر نائیک سے رابطہ ہو گیا، تعلق قائم ہوا اور پھر ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ تعلق مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک بلاشبہ اس دور کی مشہور ترین شخصیات میں سے ہیں۔ وہ 1965ء میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ ان کا تعلق بمبئی کی معروف کاروباری فیملی اور اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ انھوں نے ممبئی میں (Islamic Research Foundation) کے نام سے ایک ادارہ بنایا ہے۔ اسے عرف عام میں (IRF) کہا جاتا ہے۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد نوجوانوں کی تربیت کرنا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک مناظر ہیں، خطیب ہیں اور ادیان عالم پر عبور رکھتے ہیں۔ قدرت نے انھیں بلا کا حافظہ دیا ہے۔ اسلام پر اعتراضات کرنے والوں کو بڑے مسکت جواب دیتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والے کتنے ہی مناظروں میں مخالفین کو شکست دے چکے

ہیں۔

جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے احمد دیدات سے متاثر ہو کر انھوں نے ہندوؤں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے مناظرے شروع کیے۔ بلاشبہ احمد دیدات نے جنوبی افریقہ میں اسلام کو پھیلانے کے لیے بہت کام کیا۔ ڈربن میں ان کا بہت بڑا دفتر ہے، مجھے ان کے دفتر کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ احمد دیدات ڈاکٹر ذاکر کے استاذ ہیں، مگر یہ اپنے استاذ سے کہیں آگے نکل گئے ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ شیخ احمد دیدات زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اور یہ میڈیکل کی ڈگری کے ساتھ کثرت مطالعہ کی بنا پر اب بہت بڑے سکالر بن چکے ہیں۔

شروع میں جن اداروں نے دارالسلام کی کتب کو فروخت کرنا شروع کیا ان میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کا ادارہ بھی شامل ہے۔ شروع شروع میں ہندوستان میں ہماری کتابوں کے یہی سول ڈسٹری بیوٹر تھے، مگر جب انھوں نے (Peace TV) شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب نہایت مصروف ہو گئے۔ اس لیے ان کے ادارہ (IRF) کی توجہ دوسری طرف مبذول ہوگئی۔ اس لیے اب وہ دارالسلام کی کتب لیتے تو ہیں، مگر بہت کم لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک کی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، انھیں ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھے اور ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے، ان کا عقیدہ اور منہج بڑا مضبوط ہے۔ بعض مسائل میں ان سے یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ چہرے کا پردہ یا چند دیگر فروعی مسائل میں ان کی رائے منفرد ہو سکتی ہے، مگر اکثر مسائل میں ان کا منہج وہی ہے جو اس امت میں کتاب وسنت پر عمل کرنے والے سلف صالحین کا تھا۔ الحمد للہ! میری ان کے ساتھ درجنوں ملاقاتیں اور نشستیں رہی ہیں۔ ان کا عقیدہ اور ذہن بڑا صاف ہے، وہ اہل

سنت والجماعت کے صاف ستھرے عقیدے پر کار بند ہیں۔ میں ان کو رواتی اہل حدیث تو نہیں کہوں گا مگر یہ منہج اہل حدیث سے دور بھی نہیں ہیں۔ میرے لیے باعث شرف ہے کہ وہ میرے گھر اور دارالسلام میں کم وبیش ہر سال تشریف لاتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر پر کئی مرتبہ ان کی دعوتیں بھی کی ہیں۔ یہ بلاشبہ نہایت ذہین وفطین، متحرک، فعال اور ہر دل عزیز شخصیت ہیں۔ ہم نے گھنٹوں بیٹھ کر آپس میں گفتگو کی ہے۔ میں نے ان کے بہت سے لیکچر بھی سنے ہیں۔ ان کی انگلش اور اردو کتب کو شائع بھی کیا ہے۔ ان کے اعزاز میں پروگرام بھی کیے ہیں۔ انھوں نے بھی دارالسلام کے بارے میں ہمیشہ بہت عمدہ اور قابل قدر ریمارکس دیے ہیں۔

9 مارچ 2012ء کو جمعۃ المبارک کے دن لؤلؤ مارکیٹ ریاض میں دارالسلام کی نئی برانچ کا افتتاح تھا۔ اس مارکیٹ میں چند ماہ قبل ایک ہندو فلمی ایکٹر نے سونے کی ایک دوکان کا افتتاح کیا تھا۔ اخبارات کے مطابق اس افتتاح کے موقع پر کثیر تعداد میں لوگ آئے۔ میں نے خبر پڑھی تو مجھے خیال آیا کہ ہم اسلامک بک سٹور کھولنے جا رہے ہیں، کیوں نہ ہم ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کو اس کے افتتاح کے لیے بلوائیں۔ اگر ہم اس ہندو ایکٹر جتنے لوگ اکٹھے نہ کر سکے تو ان سے کچھ کم بھی نہیں ہوں گے۔ دفتر میں ایک نئی بحث چھڑ گئی کہ ڈاکٹر صاحب تو نہایت مشغول شخصیت ہیں وہ آئیں گے کیسے؟ میں نے برادرم عارف بھٹی صاحب سے کہا کہ وہ میری طرف سے ڈاکٹر صاحب کو ای میل بھجوا دیں کہ ہم فلاں تاریخ کو افتتاح کر رہے ہیں۔ آپ اگر تشریف لائیں اور بنفس نفیس اس کا افتتاح کر دیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اگلے دن پھر بحث تھی کہ وہ آئیں گے یا نہیں آئیں گے؟ میرا ایک ہی جواب تھا: اگر ان کو ای میل مل گئی تو ان شاء اللہ ضرور آئیں

گے۔ چند دن بعد ان کا جواب آ گیا کہ وہ مقررہ تاریخ سے ایک دو دن پہلے ریاض پہنچ جائیں گے۔ ہم نے دن رات ایک کر کے شوروم تیار کیا۔ برادرم شمشاد علی صدیقی صاحب کا تعاون بڑا مثالی رہا اور مقررہ وقت پر شوروم افتتاح کے لیے تیار ہو گیا۔ اب نیا جھگڑا لولو مارکیٹ انتظامیہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ اگر ہجوم زیادہ ہو جاتا ہے تو اسے کنٹرول کیسے کیا جائے گا؟ اگر ایک شیشہ بھی ٹوٹ گیا تو کیا ہو گا؟ میں خود مذاکرات کے لیے چلا گیا۔ خاصی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ ڈاکٹر صاحب حاضرین سے خطاب نہیں کریں گے بلکہ بعد میں پریس کانفرنس کر لیں گے۔ خود لولو کی انتظامیہ کا تعلق بھی انڈیا ہی سے ہے اور وہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کے بڑے مداح تھے، مگر انتظامی مجبوریاں اپنی جگہ تھیں۔

افتتاح کا دن بڑا ہی اہم تھا۔ لولو کی انتظامیہ نے 18 سعودی سکیورٹی گارڈز خصوصی طور پر طلب کیے۔ پروگرام سے قریباً ایک گھنٹہ قبل انھوں نے سارے راستے بند کر دیے۔ لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ اسے کنٹرول کرنا نہایت مشکل تھا۔ میں جب ڈاکٹر ذاکر صاحب کو لے کر مارکیٹ کے صدر دروازے پر پہنچا تو سعودی سکیورٹی کے افراد نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ اندازہ ہے کہ کم و بیش 1500 سے 2000 افراد افتتاح کے موقع پر موجود تھے۔ سکیورٹی والوں نے لوگوں کو شوروم سے کافی دور کھڑا کیا ہوا تھا۔ ہم نے مہمانوں کو خصوصی پاس جاری کیے ہوئے تھے، مگر سکیورٹی والوں نے بہت سارے کارڈ مسترد کر دیے۔ خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی۔ خود میں بہت جذباتی ہو رہا تھا، میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے، میرا مشن کامیاب ہو چکا تھا۔ اس چھوٹی سی جگہ میں اتنے زیادہ لوگوں کا جمع ہونا بڑی اہم بات تھی۔ صحافی بھائیوں کو بھی

روک دیا گیا۔ ہم جیسے ہی شوروم تک پہنچے، ڈاکٹر صاحب اور میں نے علیحدہ علیحدہ قینچی سے فیتہ کاٹا۔ میں نے بآواز بلند کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ» لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلند کیا۔ کوئی پانچ منٹ تک وہ شوروم کے اندر رہے۔ واپسی کے لیے سکیورٹی والوں نے علیحدہ روڈ میپ بنایا ہوا تھا۔ ہمیں نہایت تیزی سے دوڑاتے ہوئے مارکیٹ کے اندر ہی کانفرنس روم میں پہنچا دیا گیا۔ متعدد VIP احباب بعد میں پہنچ سکے۔ کانفرنس روم میں کوئی چالیس افراد کی جگہ ہوگی۔ ہم دونوں نے مل کر پریس کانفرنس کی۔

لؤلؤ کی انتظامیہ نے نہایت عمدہ ریفریشمنٹ کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اگلے دن میں نے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک بڑے ہوٹل میں استقبالیہ کا بندوبست کر رکھا تھا جس میں پاکستان ایمبیسی کے تمام سفارت کار، ملائشیا، مالدیپ، بنگلہ دیش اور دیگر ملکوں کے سفیروں اور سفارتی عملے کے علاوہ ریاض شہر کی چیدہ چیدہ شخصیات نے شرکت کی۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اسلام اور ذرائع ابلاغ کے موضوع پر سیر حاصل خطاب فرمایا۔ راقم الحروف نے بھی انگلش زبان میں حاضرین کو دارالسلام کے آئندہ منصوبوں کے بارے میں مطلع کیا۔ عزیزی عکاشہ مجاہد اور عبدالغفار مجاہد نے بڑی خوبصورت اور یادگار کمپئرنگ کی۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار پروگرام تھا۔ اخبارات نے نمایاں سرخیوں سے افتتاح اور استقبالیہ کی خبروں کو شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صحافیوں سے علیحدہ بھی خطاب کیا۔ اگر میں اس قسم کے پروگراموں کی تفصیل لکھنا شروع کروں تو اس کتاب کے صفحات کم پڑ جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ اور بچوں سمیت بھی ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ انیسہ نے ان کی اہلیہ کے اعزاز میں گھر پر ہی بڑا خوبصورت پروگرام کیا تھا۔ ان کی اہلیہ نے

خواتین سے خطاب بھی کیا تھا۔

دارالسلام نے بڑی خوبصورت ڈیزائننگ کے ساتھ ان کی چھوٹی چھوٹی متعدد کتب انگلش اور اردو میں بھی شائع کی ہیں۔گزشتہ آٹھ دس سالوں میں ان کے متعدد پروگرام کنگ فہد کلچرل سنٹر ریاض میں ہوئے۔دارالسلام اس موقع پر کتابوں کا سٹال لگاتا ہے۔دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کے پروگرام کے آخر پر منتظمین نے مجھے سٹیج پر بلوایا اور میں نے انھیں ان کی نئی شائع شدہ کتاب پیش کی۔اس موقع پر انھوں نے دارالسلام کے بارے میں عمدہ کلمات کہے۔انھوں نے مہمانوں کی کتاب میں جو کچھ لکھا اس کا ترجمہ نذر قارئین ہے:

الحمدللہ! میری معلومات کے مطابق دارالسلام انگلش زبان میں اسلامی لٹریچر شائع کرنے والا دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔دارالسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا لٹریچر انتہائی مستند اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ہوتا ہے۔

کتب ستہ کا انگلش ترجمہ بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصا سنن اربعہ میں صحیح اور ضعیف احادیث کی نشاندہی مسلم دنیا کے لیے کسی انمول تحفے سے کم نہیں۔

اللہ تعالی محترم بھائی عبدالمالک مجاہد کو ان کی خدمات پر اجر عظیم عطا فرمائے اور انھیں اسلامی لٹریچر کی خدمت کرنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

ذاکر نائیک

36 لوئر مال کی بلڈنگ

لاہور میں دارالسلام کے دفتر کا قیام 1995ء کے آغاز میں ہوا۔ حافظ عبدالعظیم اسد صاحب ان دنوں جامعہ سلفیہ اور دیگر اداروں سے دینی علوم کی اعلیٰ اسناد لے کر نئے نئے فارغ ہوئے تھے۔ ہم نے ان کو دارالسلام لاہور کا منیجر مقرر کیا۔ اُردو بازار غزنی سٹریٹ میں میری ایک دکان ہے، جو میں نے ذاتی طور پر خریدی تھی، وہاں دفتر بنایا گیا۔ میرا مزاج ایسا ہے کہ تنگ گلیوں اور چھوٹے دفاتر میں میرا جی نہیں لگتا۔ جلد ہی ہم اُردو بازار سے 50 لوئر مال پر منتقل ہو گئے۔ یہ جگہ محترم علامہ احسان الٰہی ظہیر کی تھی۔ کسی زمانے میں ان کا دفتر بھی یہیں تھا۔ میں نے اس جگہ محترم پروفیسر ساجد میر صاحب ﷿ کو دفتر سجائے دیکھا ہے۔ ایک وقت آیا کہ ہم نے علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے صاحبزادے جناب ابتسام الٰہی ظہیر سے 50 لوئر مال لاہور والی یہ بلڈنگ کرایہ پر لے لی۔ ابتسام الٰہی ظہیر کی بڑی ہمشیرہ ریاض میں ہوتی ہیں۔ شروع دن سے ان کے ساتھ ہمارے تعلقات بڑے اچھے ہیں۔ خصوصاً میری اہلیہ اور علامہ صاحب کی صاحبزادی آپس میں بہنوں کی طرح ملتی ہیں۔ یہ بلڈنگ انھی کی معرفت، انھی کے ایما اور گارنٹی کے ساتھ کرایہ پر لی گئی تھی۔ یہ دفتر 1995ء کے آخر میں کرایہ پر لیا گیا تھا۔

میرے ذہن میں ابتسام صاحب کی بات گردش کر رہی تھی، مگر نہ تو میرے پاس پیسے تھے نہ ہی میں نے اپنا دفتر لینے کا کبھی سوچا تھا

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ 2001ء کی بات ہے۔ میں ریاض سے لاہور آیا ہوا تھا کہ محترم ابتسام الٰہی ظہیر کا فون آیا: مجاہد صاحب! ہمیں بلڈنگ کی ضرورت ہے اس لیے اسے خالی کر دیں۔ عام حالت میں یہ معمول کی بات ہے کہ کوئی بھی مالک مکان اپنے کرایہ دار سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی بلڈنگ خالی کر دے، مگر میں اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ ہم نے خاصی رقم لگا کر اس دفتر کی آرائش کی تھی۔ خیر میں نے سوال کیا کہ کب تک آپ کو بلڈنگ درکار ہے؟ کہنے لگے: جس قدر جلد ممکن ہو آپ خالی کر دیں۔

وہ دن ایسا تھا کہ دفتر میں بہت سارے لوگ ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کوئی کرسی پر بیٹھا تھا، کوئی کھڑا، کوئی باہر انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے ایک جاننے والے جناب محمد مسلم صاحب گویا ہوئے۔ مجاہد صاحب اب تو آپ کو بڑے دفتر کی ضرورت ہے؟ دیکھیں کتنے لوگوں کو بیٹھنے کے لیے جگہ بھی میسر نہیں۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: دعا کریں اللہ ہمیں اپنا اور بڑا دفتر دے دے۔ میرے ذہن میں ابتسام صاحب والی بات گردش کر رہی تھی، مگر نہ تو میرے پاس پیسے تھے نہ ہی میں نے اپنا دفتر لینے کا کبھی سوچا تھا، البتہ ان کے فون سے میں پریشان ضرور تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب رش کم ہوا تو کہنے لگے: مجاہد صاحب! اگر آپ واقعی دفتر خریدنے کے خواہش مند ہیں تو بالکل آپ کے قریب ایک بلڈنگ برائے فروخت ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا: مسلم صاحب! میرے پاس پیسے کہاں؟ کہنے لگے: آپ جگہ دیکھ تو لیں۔ اس میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ ایسے ہی

میں نے ڈرائیور سے کہا کہ چلو ذرا گاڑی نکالو۔ صبح سے کام کر کے تھک گئے ہیں۔ ذرا آؤٹنگ ہی سہی۔

محمود خالد مسلم صاحب ہمیں 36 لوئر مال پر لے آئے۔ یہ جگہ ان کے سگے بھائی عبدالحفیظ ناگی صاحب کی تھی۔ یہاں پر واپڈا والوں کا دفتر تھا۔انھوں نے ایک لمبی مدت ان کے ساتھ مقدمہ لڑ کر یہ جگہ خالی کروائی تھی۔ یہ واقعی اجڑی ہوئی بلڈنگ تھی۔ واپڈا کے بے شمار ردی کاغذات کمروں میں پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے اس کو اوپر نیچے سے دیکھا، میں نے جناب مسلم صاحب سے پوچھا: اس کی قیمت کتنی ہوگی؟ کہنے لگے: اگر آپ سنجیدہ ہوں تو میں اسے آپ کو ایک کروڑ روپے میں دلوا سکتا ہوں۔ میرے بھائی کراچی میں رہتے ہیں، وہ جھگڑوں میں پڑنے والے نہیں ہیں۔ آپس میں مشورہ کیا۔ استخارہ کیا، اللہ تعالیٰ سے خوب دعا کی۔ ایک کروڑ اس جگہ کی قیمت مناسب تھی، مگر مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میں نے ان سے ایک سال کی مہلت مانگی جو انھوں نے دے دی۔ کہنے لگے: جتنے پیسے آپ کے پاس ہیں وہ ادا کر دیں۔ باقی قسطوں میں ادا کر دیں۔ جب آپ مکمل رقم ادا کریں گے تب ہم آپ کو رجسٹری کر کے دیں گے۔ میں نے دیکھا کہ پارٹی الحمدللہ! ایماندار ہے۔ ہم نے بیعانہ دے کر بات پکی کر لی، اور اس کی مرمت شروع کر دی۔ ہم نے اس کی مرمت پر خطیر رقم خرچ کی۔ 2002ء میں اس بلڈنگ کی مکمل رقم ادا کر کے رجسٹری ہوگئی اور ہم اس نئے دفتر میں منتقل ہو گئے۔ اتنی دیر تک ہم 50 لوئر مال کے دفتر ہی میں کام کرتے رہے۔ برادرم عزیز حافظ عبدالعظیم صاحب نے انتھک محنت کر کے اس دفتر کو بڑا خوبصورت بنوایا۔ ریسرچ سنٹر بنا۔ اس کے لیے بہترین ٹیم اکٹھی کی گئی۔ اس سلسلہ میں حافظ عبدالعظیم صاحب نے اپنی ذہانت، فطانت، زبردست محنت اور

ایمانداری سے اپنے آپ کو منوایا۔ کام بتدریج آگے بڑھتا چلا گیا۔ جناب محمد ندیم صاحب ہمارے پہلے اکاؤنٹنٹ مقرر ہوئے۔ بڑے شریف النفس محنتی اور ایماندار انسان ہیں۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ دارالسلام کا یہ دفتر نشر واشاعت کے حوالے سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ گزرا کہ ہم نے اس پر دوسری منزل ڈالنے کی کوشش کی تو پچھلی بلڈنگ میں مقیم عبدالوحید ناگی صاحب نے اس پر اعتراض کر دیا۔ معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ وہ عدالت سے Stay Order لے آئے، اور کام رک گیا۔ میں ریاض سے پاکستان آیا۔ ان کے عزیز جناب سہیل درانی صاحب اس وقت کراچی میں ڈی آئی جی تھے۔ اس وقت رؤف صدیقی صاحب سندھ کے وزیر داخلہ تھے۔ میں ان سے ملا۔ انھوں نے ان کو فون کیا، خیر ان سے ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے، میں نے ان سے اتنی بات کہی کہ ہم ہمسائے ہیں لڑائی کا کیا فائدہ۔ انھوں نے بھی موافقت کی اور ہماری آپس میں صلح ہوگئی۔ مقدمہ واپس ہو گیا۔ ہم نے فوراً بعد دو کروڑ پینسٹھ لاکھ روپے کے عوض ان سے 37 مرلہ کا پچھلا پلاٹ بھی خرید لیا۔ جگہ الحمدللہ میری ذاتی ہے۔ میں نے تمام رقم الحمدللہ اپنی جیب سے ادا کی ہے۔ دارالسلام کا اس بلڈنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم میں نے اس بلڈنگ کو نہایت مناسب بلکہ کم کرایہ پر دارالسلام کو دے رکھا ہے۔ 2012ء میں میٹرو کا اسٹیشن بنا تو حکومت نے ہم سے کچھ جگہ لے لی۔ اس کے لیے بلڈنگ کو توڑا گیا۔ حکومت نے اس کا کچھ معاوضہ بھی دیا جو نقصان کے مقابلہ میں بہت کم تھا۔ مگر حکومتوں سے کون لڑ سکتا ہے۔

دارالسلام ریسرچ سنٹر

میری بڑی دیرینہ تمنا تھی کہ میں ایک ایسی بلڈنگ بناؤں جس میں مسجد بھی ہو اور اسلام کی نشر واشاعت کے لیے دفاتر بھی ہوں۔ جہاں تحقیق ہو۔ علماء بیٹھیں۔ ریڈیو اسٹیشن ہو۔ دارالسلام کی بلڈنگ میں ہم شفٹ ہو چکے تھے۔ میں جب بھی بیٹھتا مسجد کے بارے میں سوچتا رہتا۔ یہی فکر رہتی کہ موت کسی وقت بھی آ سکتی ہے، کہیں تاخیر کا شکار نہ ہو جاؤں۔ یہ 2004ء کی ایک دوپہر تھی۔ میں دفتر سے آیا۔ دوپہر کا کھانا ہم کچن میں کھاتے تھے۔ ہماری نوکرانی نے ٹیبل پر کھانا لگا دیا تھا۔ میں انیسہ کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ سکول سے آئے اور ہم کھانا شروع کریں۔ اسی دوران دھیان مسجد کے منصوبے کی طرف چلا گیا۔ میں سر پکڑے مسجد کا تصور بنا رہا تھا کہ اس دوران انیسہ کچن میں داخل ہوئی۔ حسب دستور اس نے سلام کہا، مگر میں تو مسجد کے تصور میں گم تھا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے قطعاً اندازہ نہ ہوا کہ وہ کب داخل ہوئی ہے۔ اس نے پیار سے ٹھوکر دیتے ہوئے کہا: مجاہد صاحب! کہاں گم ہیں، کیا سوچ رہے ہیں؟

میں نے کہا بہت عمدہ چیز سوچ رہا ہوں۔ میں دراصل مسجد کے لیے جگہ لینا چاہتا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کہاں اور کیسے جگہ خریدوں۔ اللہ اس کو جزائے خیر دے، اس عورت نے

ہمیشہ خیر کے کام میں میرا ساتھ دیا ہے۔ کہنے لگی: اس میں سوچ و بچار کی کیا بات ہے، ہم نے ابھی تک اپنا گھر نہیں بنایا، وہ بعد میں بنالیں گے۔ پہلے اللہ کا گھر بناتے ہیں۔ میرے پاس سات ہزار ریال ہیں، سب سے پہلے وہ میں آپ کو پیش کرتی ہوں۔ میں خوش ہو گیا۔ اگر گھر سے آپ کو تعاون مل جائے تو مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ میری نظر دارالسلام کے ساتھ والی جگہ پر تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ مالکان اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ چند دن کے بعد میں نے شیخ محمد یوسف صاحب کا نمبر حاصل کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ شیخ صاحب آپ تو مجھے نہیں جانتے، مگر میں آپ کا ہمسایہ ہوں۔ مجھے یہ جگہ مسجد اور اسلامک سنٹر کے لیے درکار ہے، مگر میرے پاس پیسے نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کی قبر کو روشن کرے، وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ کہنے لگے: مجاہد صاحب! آپ تو مجھے نہیں جانتے، مگر میں آپ کو خوب جانتا ہوں۔ مجھے آپ پر مکمل اعتبار ہے۔ میں نے مہلت طلب کی، کہنے لگے: جتنے پیسے آپ کے پاس موجود ہیں وہ ادا کر دیں، باقی بعد میں سہی۔ اس طرح ہم نے بیس لاکھ روپے کا بیعانہ دے کر سودا کر لیا۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی خطیر رقم کا اللہ تعالیٰ نے جلد ہی بندوبست کر دیا۔ اس میں بیس لاکھ روپے دارالسلام نے ادا کیے۔ باقی ساری رقم الحمد للہ! میں نے ذاتی طور پر ادا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خاص مدد فرمائی۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ برکتیں کہاں سے اور کیسے آئیں۔ اتنی بات جانتا ہوں کہ نیت اگر درست ہو، اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں اور التجائیں ہوں تو وہ کبھی اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ کل 31 مرلے جگہ تھی۔

جیسے ہی ہمیں اس جگہ کا قبضہ ملا، ہم نے فوراً اس پر عارضی مسجد بنا دی جس میں کوئی ڈیڑھ سو سے زائد افراد نماز پڑھ سکتے تھے۔ الحمد للہ! جمعۃ المبارک کا خطبہ بھی کئی سال تک

ہوتا رہا۔ اسی دوران میری خواہش رہی کہ ہم یہاں پر عمارت بنائیں۔ اس کے لیے نقشہ منظور کروانے کا مسئلہ تھا۔ ایک لمبے چوڑے پراسس اور طویل غلام گردشوں سے گزرنے کے بعد کم وبیش 26 لاکھ روپے کی ادائیگی کے بعد حکومت نے ساڑھے چھ منزلہ بلڈنگ بنانے کی اجازت دے دی۔ گورنمنٹ قوانین کے مطابق ایک سال میں ہم نے اسے شروع کرنا تھا۔ ادھر میرے اپنے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ہم نے پہلے ہی کئی منصوبے شروع کر رکھے تھے۔

ریاض شہر میں ڈاکٹر ریاض جاوید خواجہ نہایت معروف شخصیت ہیں۔ یہ گزشتہ چالیس سال سے زائد مدت سے ریاض میں مقیم ہیں۔ ہمارے ان کے ساتھ گزشتہ بیس سال سے فیملی تعلقات ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ باجی نصرت خواجہ میری اہلیہ سے بڑی محبت کرتی ہیں۔ اس کے دروس میں شریک ہوتی ہیں، مختلف مناسبات میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں اپنے قارئین کو اس قربت کی ایک مثال سنا کر آگے بڑھوں گا۔ رمضان شریف کا مبارک مہینہ تھا۔ میں نے ایک دن ڈاکٹر صاحب کو فون کیا اور دوران گفتگو کہہ دیا: ڈاکٹر صاحب! آپ ہماری افطاری کب کروا رہے ہیں؟ ان کا جواب تو اثبات ہی میں ہونا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے گھر والوں کو بتایا کہ مجاہد صاحب اپنی فیملی سمیت ہمارے گھر افطاری کے لیے آرہے ہیں تو ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ خوشی سے رونے لگیں کہ ہمارے گھر انیسہ افطاری کے لیے آرہی ہے!!! یہ بات مجھے ڈاکٹر صاحب نے اگلے دن بتائی تھی۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے آپس میں کس قسم کے تعلقات ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ صاحب رفاہی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ میں نے کسی موقع پر ان سے ذکر کیا کہ میں نے لاہور میں جگہ خریدی ہوئی ہے۔ وہاں پر میں ریسرچ سنٹر بنانا چاہتا ہوں، مگر

فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے اس منصوبے کو شروع نہیں کر سکا۔ اللہ تعالیٰ اس خاندان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے باہمی مشورے سے اس منصوبے میں میرے ساتھ شرکت کا فیصلہ کیا۔ الحمد للہ! اس منصوبے کا باقاعدہ سنگ بنیاد 6 اپریل 2013ء بروز ہفتہ کو رکھا گیا، ایک خوبصورت تقریب ہوئی جس میں شرکت کے لیے پروفیسر ساجد میر صاحب، ڈاکٹر ریاض خواجہ، راقم الحروف، ڈاکٹر صاحب کے بھانجے ایوب شیخ صاحب اور دیگر معززین کی دعاؤں سے اس عظیم منصوبے کا آغاز ہوا۔ جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اس وقت تک الحمد للہ! تین فلور تک کام مکمل ہو چکا ہے۔ اندازہ ہے کہ ایک سال تک یعنی 2015ء کے وسط تک یہ بلڈنگ مکمل ہو جائے گی۔ ایک فلور مسجد کے لیے ہوگا، جہاں عورتوں کے لیے نماز پڑھنے کی سہولت بھی میسر ہوگی۔ ایک فلور علوم سیرت نبوی کے لیے مختص ہوگا جس میں سرور عالم ﷺ کی سیرت پر ماڈل رکھے جائیں گے۔ یہاں پر نوجوان نسل کو سیرت پر لیکچر دیے جائیں گے۔ ایک فلور پر ریسرچ سنٹر، خواتین اور نوجوانوں کے لیے دفاتر، اور ایک فلور پر دارالسلام ریڈیو اسٹیشن ان شاء اللہ قائم کیا جائے گا۔ یہ بلڈنگ اللہ کے لیے وقف ہوگی۔ اس کا کوئی حصہ کرایہ پر نہ دیا جائے گا اور اگر کوئی حصہ کرایہ پر دیا گیا تو اس کا کرایہ بلڈنگ پر ہی خرچ ہوگا۔ اس کو چلانے کے لیے عبدالمالک مجاہد اور محترم ڈاکٹر ریاض جاوید خواجہ صاحب کے درمیان ایک علیحدہ معاہدہ طے پا گیا ہے۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کا مقصد نہایت مثبت انداز میں دین کی خدمت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے روشنی کا مینار بنائے، اس سے توحید و سنت کی شمع روشن ہو اور خلق کائنات کو اس سے فائدہ حاصل ہو۔ آمین ثم آمین!

دارالسلام پرنٹنگ کمپلیکس لاہور

2009ء میں مجھ پر کچھ مشکل وقت آیا۔ اس دوران میں الحمدللہ! قرآن کریم سے خاصا تعلق پیدا ہوا۔ میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔ میں سارا دن قرآن کریم کی تلاوت کرتا رہتا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہر روز اوسطاً دس پارے تلاوت کرتا۔ قرآن کریم کی تلاوت سے دل کو جو سرور اور تسلی ملی اس کا اندازہ قرآن کریم پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا، قرآن کریم سے محبت بڑھتی چلی گئی۔ اس دوران میں خیال پیدا ہوا کہ مجھے قرآن کریم کو مفت تقسیم کرنا چاہیے۔ ہمارے سامنے ایک خوبصورت اور قابل تقلید مثال ''مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف'' کی ہے۔ یوں تو دنیا میں بڑے بڑے حکمران آئے جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں دین کی خدمت کی، مگر جو خدمت شاہ فہد بن عبدالعزیز نے کر کے دکھائی، وہ شاید ہی ان سے پہلے کسی حکمران کے حصے میں آئی ہو۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں بہت بڑا پرنٹنگ پریس لگایا جس کو قرآن کریم کی طباعت کے لیے وقف کر دیا۔ اس کی تاسیس سے لے کر اب تک نجانے کتنے سو ملین قرآن کریم اور اس کے تراجم کے نسخے شائع ہو کر دنیا کے ہر حصے میں پہنچ چکے ہیں۔ ہر سال قرآن کریم کے کئی ملین نسخے شائع ہوتے ہیں اور حجاج کرام میں مفت تقسیم ہوتے

ہیں۔ میں نے سوچا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے بے شمار نعمتوں اور مال و دولت سے نوازا ہے۔ میں بادشاہ تو نہیں، ہاں البتہ اس قسم کی سوچ اور فکر تو رکھ سکتا ہوں کہ میں ایک ایسا پرنٹنگ پریس لگاؤں جس کی آمدنی قرآن کریم کی طباعت کے لیے وقف ہو جائے۔ بس میں سوچتا رہا، پلاننگ کرتا رہا۔ ان ایام ابتلاء میں اہلیہ ایک دن ملاقات کے لیے آئی تو میں نے اس سے کہا: انیسہ! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کیوں نہ ہم زندگی میں قرآن کریم کی خدمت کر جائیں؟ لاہور میں ایک بڑی جگہ تلاش کریں جس پر پرنٹنگ پریس لگایا جائے۔

میرا اللہ ہم پر ہر حال میں بڑا مہربان اور شفیق ہے۔ بہت جلد وقت آیا کہ مجھ پر وارد ہونے والے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے مشن کو تیز کر دیا۔ حکومت پنجاب نے دارالسلام سے سکولوں کے لیے خاصی بڑی تعداد میں کتب خریدی تھیں۔ میں نے ان کو چائنا سے چھپوایا تھا۔ ان کا بل ملنے والا تھا، الحمدللہ! اس میں ہمارا خاصا منافع بھی تھا۔ عزیزم حبیب کبریا کی معرفت لاہور اسلام آباد موٹر وے پر کوٹ عبدالمالک انٹر چینج سے متصل ہی پانچ ایکڑ زمین مل گئی۔ یہ بڑی اہم جگہ تھی جو ہمیں ڈھائی کروڑ روپے میں مل گئی۔ میں نے شرکائے دارالسلام سے بات کی کہ میرا اس قسم کا منصوبہ ہے۔ پہلے خیال تھا کہ ہم 30 فیصد منافع قرآن کریم کے لیے وقف کریں گے۔

قرآن کریم کے اس منصوبے کے لیے میں اپنے مربی اور محسن شیخ عبداللہ المعتاز حفظہ اللہ کے پاس گیا۔ میں نے ان سے ایک سوال کیا کہ اس وقت دنیا میں کتنے فائیو سٹار ہوٹل ہیں؟ جواب ملا: ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہوں گے۔ میرا اگلا سوال تھا: یہ بتائیں کہ دنیا میں قرآن کریم کی پرنٹنگ کرنے والے پریس کتنی تعداد میں ہیں؟ فرمانے لگے:

ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ میں نے بڑی لجاجت سے عرض کیا: شیخ صاحب! یہ بتائیں کہ ہم وراثت میں فائیو سٹار ہوٹل چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوں یہ بہتر ہے یا قرآن کریم کی پرنٹنگ کا پریس چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوں تو بہتر ہے۔

الحمدللہ! میرے دلائل کام کر گئے۔ اس روز شیخ محمد بن عبداللہ المعتاز نے بھی اس معاملے میں خوب مدد کی۔ ہم پہلے سے تیاری کر کے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ شیخ محمد کو جزائے خیر دے، خیر کے ہر کام میں وہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ ہمارے تعلقات بالکل بھائیوں جیسے ہیں۔ انھوں نے بھی والد کے سامنے میرے منصوبے کی بھرپور تائید کی اور ہماری تھوڑی سی کوشش اور گفتگو کے نتیجے میں شیخ عبداللہ المعتاز نے میری پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا: تم توکل علی اللہ کرو، بڑا عمدہ منصوبہ ہے۔ مجھے ان سے مال و دولت نہیں، بلکہ ان کی دعائیں اور ان کی تائید درکار تھی جو اس روز حاصل ہوگئی اور ہم نے اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔

زمین خریدنے کے بعد اس کی چار دیواری اور بھرتی کا مسئلہ تھا۔ نقشے کو پاس کروانا تھا۔ یہ ایسے کام تھے جن پر خاموشی سے کام شروع کر دیا گیا۔ میں نومبر 2011ء کے آخر میں لاہور میں تھا۔ چند دن گزرے تھے، خیال آیا کہ کیوں نہ پریس کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے، چنانچہ ایک دو دن کے نوٹس پر ہم نے 20 نومبر بروز اتوار ایک خوبصورت تقریب کا بندوبست کر لیا۔ برادری کے لوگ آ گئے۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد سے برادر عزیز چودھری یٰسین ظفر صاحب شیوخ الحدیث کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ بڑی زوردار تقریب ہوئی۔ حافظ مسعود عالم صاحب کی خوبصورت دعا، ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی صاحب اور برادر عزیز نجیب الرحمٰن کیلانی صاحب کی شاندار گفتگو اور کلمات، سب نے سماں باندھ دیا۔

میں نے اس موقع پر جو کچھ کہا وہ میرے دل کی آواز تھی جو آنسوؤں کی صورت میں بہہ نکلی۔ احباب نے پھولوں سے لاد دیا۔ پیار، محبت، دعاؤں کے ساتھ اس شاندار تقریب کا اختتام پُرخلوص ریفریشمنٹ سے ہوا۔

جناب خالد مخدوم صاحب نے تعمیراتی کام کا آغاز کر دیا۔ دن رات درجنوں مستری اور مزدور کام کرتے رہے۔ اس کے لیے وسائل نجانے کیسے اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے عطا فرماتا چلا گیا۔ میں نے جو پس انداز کیا ہوا تھا، وہ لگا دیا۔ کچھ دارالسلام ٹرسٹ کی رقومات تھیں، وہ بھی بلڈنگ کے حوالے کر دی گئیں۔

اگلے سال جب میں آیا، بلڈنگ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اتنی بڑی بلڈنگ الحمدللہ تیار کھڑی تھی۔ میں بار بار اپنے آپ سے کہتا: عبدالمالک! اللہ کا شکر کرو، یہ کام اللہ نے تم سے لے لیا ہے۔ یہ قرآن کریم کی پرنٹنگ کا کمپلیکس ہے۔ بلاشبہ یہ کروڑوں کا منصوبہ تھا، جسے اللہ نے ہمارے لیے آسان کر دیا۔

دارالسلام پرنٹنگ کمپلیکس بن تو رہا تھا، مگر میں ایک کنفیوژن کا شکار تھا کہ کیا سارے پریس کی آمدنی وقف ہوگی یا اس کا تیسرا حصہ۔ خیال یہ تھا کہ پریس کے لیے مختلف احباب سے انویسٹمنٹ لی جائے۔ بہت بڑا پریس لگایا جائے اور آمدنی کا تیسرا حصہ وقف ہو جائے۔ بعض ساتھی ان شرائط پر پیسہ دینے کے لیے تیار بھی تھے۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ نجانے کتنی آمدنی ہو۔ دعائیں جاری تھیں کہ ایک دن اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کر دیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب شیطان کو ان شاء اللہ مکمل شکست دیتے ہیں۔ یہ پریس مکمل طور پر وقف ہوگا، اس کی تمام آمدنی اشاعت قرآن کریم پر صرف ہوگی۔ انسان کی ''دنیا''، اس کے ذاتی اخراجات اور خواہشات مرتے دم تک کبھی پوری نہیں ہوتیں۔

میں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ نیت کی نئے سرے سے اصلاح کی اور دارالسلام کے شرکاء سے گزارش کی کہ میں نے اللہ کی رضا کے لیے لاہور کے پریس میں اپنا حصہ وقف کر دیا ہے۔ اللہ دونوں کو جزائے خیر دے، دونوں نے کہا: ہم تمھارے پیچھے ہیں۔ تم نے جو بھی فیصلہ کیا ہے اچھا ہی کیا ہے۔ ہم بھی اپنا حصہ وقف کرتے ہیں۔ یہ جون 2013ء کی بات ہے، میں نے پرنٹنگ پریس کے اکاؤنٹنٹ جناب محمد ندیم صاحب سے کہا: آج سے حساب پر لکیر لگا دیں۔ آج کے بعد پریس کا جو بھی منافع ہوگا وہ صرف قرآن کریم اور اس کی تعلیمات کے لیے وقف ہوگا، چنانچہ اس تاریخ سے آج تک اور جب تک اللہ چاہے گا، یہ پریس قائم رہے گا۔ میری تمنا تو ہے کہ قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے۔ جو بھی اس پریس سے منافع آئے اس سے 30 فیصد قرآن کریم سادہ، قرآنی قاعدے، سپارے، 30 فیصد قرآن کریم ترجمہ والے، اُردو، سندھی، پشتو، فارسی اور انگریزی زبان میں، 30 فیصد عقیدہ، حدیث شریف، سیرت رسول ﷺ، اذکار، دعائیں اور نماز کے موضوع پر کتب، میری ذاتی تمام کتابیں، کیونکہ یہ کتابیں نوجوان نسل کی تربیت کے لیے نہایت مفید ہیں، اصلاحی مجلّہ ماہنامہ ضیائے حدیث، اس کے علاوہ بچوں کے لیے مفید کتابیں، بچوں کی دینی تربیت کے لیے دارالسلام کے قائم کردہ سکولوں کے لیے سلیبس، ان کے لیے کتب، عورتوں، بچوں کا میگزین، دعوتی اسٹیکرز اور پمفلٹ وغیرہ یا جو چیز ہمارے بورڈ آف ڈائریکٹرز مناسب سمجھیں، وہ اس پریس سے شائع کی جا سکتی ہیں۔ عقیدہ اہل سنت والجماعت کے خلاف کوئی کتاب یا پمفلٹ اور نظریۂ پاکستان کے خلاف کوئی مواد اس پریس سے کبھی شائع نہیں ہوگا۔ باقی دس فیصد کو اس پریس کے لیے نئی مشینری کی تنصیب، ضروری تبدیلی یا چیرٹی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

یہ جو ترتیب اور نسبت میں نے اوپر لکھی ہے، کوئی حتمی نہیں۔ قرآن پاک کے نسخے اہم جگہوں پر ہم پہنچا چکے ہیں، مگر ترجمہ قرآن کی زیادہ ضرورت ہے یا اسلامی کتب کی ایک وقت میں زیادہ ضرورت ہے، جیسے کہ ہم نے بچیوں کے لیے سلیبس بنایا ہے۔ اب اسے پڑھنے سے بچیوں کے عقائد کی اصلاح ہو رہی ہے تو اس نصاب کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ خواہ ہمیں اس کا بجٹ قرآن کریم یا تراجم کے بجٹ سے لینا پڑے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس پریس کی بنیاد اللہ کے کلام اور اس سے متعلقہ کتب کی اشاعت کے لیے ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں ہمیں برکت دے گا اور ان شاء اللہ آنے والے وقتوں میں یہ پریس ایک بڑا پریس ہوگا، جس میں قرآن و سنت کے علوم کی ترویج کا کام ہوتا رہے گا۔ میں بلاشبہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے اپنی زندگی میں ایک خواب دیکھا، اسے سوچا، اس منصوبے پر عمل درآمد کیا اور الحمدللہ! اس منصوبے کے برگ و بار اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ میں جتنی بار بھی پریس میں گیا، الحمدللہ! اس میں کام جاری تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس منصوبے کی حفاظت فرمائے اور ہمیں اس کام میں مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

انیسہ کافی عرصہ سے خواہش مند تھی کہ ریاض میں اپنا نیا اور خوبصورت گھر خریدا جائے۔ اس نے اس مقصد کے لیے تین لاکھ ریال جمع کیے ہوئے تھے۔ ادھر بلڈنگ کا کام جاری تھا۔ رقومات کی شدید ضرورت تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آخرت کا ذکر کیا کہ چلو وہاں جنت میں اپنا گھر بناتے ہیں۔ دنیا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے وافر دی ہوئی ہے۔ جس گھر میں ہم رہ رہے ہیں، وہ بھی مثالی ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں تو عش عش کر اٹھتے ہیں۔ سوال کرتے ہیں کہ اس کا ڈیزائن کس نے بنایا ہے؟ یہ اعلیٰ ذوق کس کا

ہے؟ میرا جواب ہوتا ہے کہ یہ سارا کریڈٹ ام عکاشہ انیسہ فردوس کو جاتا ہے۔ انیسہ میری رگ رگ کو پہچانتی ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ دعوت کے لیے کتنی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس اللہ کی بندی نے فوراً تین لاکھ ریال پریس کے حوالے کر دیے۔ کہنے لگی: ہمیں آخرت میں شدید ضرورت ہے۔

پروفیسر ساجد میر صاحب مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر ہیں۔ وہ سینیٹر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی جیب سے ایک خطیر رقم پریس کے لیے پیش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے کیا دیا ہے۔ میرے نہایت مخلص اور پیارے دوست کاشف باجوہ صاحب ہیں۔ وہ مجھ سے اور میں ان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ ان کے والد گرامی اور والدہ محترمہ نے اپنی گریجویٹی کی رقم پریس کے لیے بھجوادی۔

ڈاکٹر ریاض خواجہ کے گھر کے افراد نے، ان کی اہلیہ نے، ان کی بیٹیوں نے، ان کے بیٹوں نے، ہر ایک نے اپنی توفیق کے مطابق حصہ لیا۔ ان کے فرزند ارجمند کاشف ریاض خواجہ تو سب سے آگے بڑھ گئے۔

شرکاء نے ایک خطیر رقم برائے مشینری پیش کی۔ ڈاکٹر محمد یوسف الحزیم، جناب رضی فقیہ اور دیگر افراد نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ ہم نے متعدد نئی مشینیں خریدیں۔ الحمد للہ فروری 2014ء میں پرانا پریس بھی نئی جگہ پر منتقل ہو گیا اور یہاں کام شروع ہو چکا ہے۔

کچھ اپنی فیملی کے بارے میں

انیسہ فردوس بنت محمد سلیم بن حافظ عبدالحي کے ساتھ میری شادی 19 دسمبر 1981 کو ہوئی۔ یہ میری سگی خالہ زاد اور رشتہ میں چچازاد بھی ہے۔ ہم دونوں کا خاندان (سپراجٹ) ایک ہی ہے۔ اس کے والد اور میرے والد آپس میں چچازاد بھائی ہیں۔ اوپر جا کر رشتہ آپس میں مل جاتا ہے۔ انیسہ کی والدہ اور میری والدہ سگی بہنیں ہیں۔ ان کا تعلق راجپوت خاندان سے ہے۔ ہمارا نکاح 26 فروری 1976ء کو ہوا تھا۔ یہ نکاح انیسہ کے دادا جان ولی کامل حافظ عبدالحي رحمہ اللہ نے چاندی کوٹ میں پڑھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح میں بڑی برکت عطا فرمائی۔

انیسہ نے بنیادی تعلیم کھیالی گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ پھر چاندی کوٹ میں اپنے دادا حافظ عبدالحي رحمہ اللہ کی تربیت میں آگئیں۔ انھوں نے اسے قرآن کریم حفظ کرایا۔ اس کا ترجمہ اور صرف ونحو پڑھائی۔ بعدازاں یہ میاں محمد باقر رحمہ اللہ کے مدرسہ للبنات جھوک دادو میں کم وبیش 5 سال تک پڑھتی رہی۔ یہ مدرسہ فیصل آباد کے علاقہ تحصیل تاندلیانوالہ میں واقع ہے۔ اسے لاہور شورکوٹ ریلوے لائن پر چک طوراں ریلوے اسٹیشن لگتا ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کے لیے اہلحدیث کا یہ اکیلا ہی مدرسہ تھا۔ میاں محمد باقر دارالحدیث

دہلی سے فارغ التحصیل تھے۔ طور فیملی سے تعلق رکھنے والے میاں باقر زمیندار بھی تھے اور اپنے علاقے کی بڑی مؤثر شخصیت بھی۔ یہ ایک عالم ربانی اور مستجاب الدعوات شخصیت تھے۔ انیسہ نے ان سے بھی پڑھا۔ مدرسہ میں پڑھانے والی بہت سی معلمات بھی اسے پڑھاتی تھیں۔ چونکہ انیسہ حافظ قرآن تھی، اور اس کے پاس سکول کی تعلیم بھی تھی، نیز اس کا تعلق بھی ایک علمی گھرانے سے تھا، اس لیے اسے مدرسہ میں خوب پذیرائی ملی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بچپن سے تقریری صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہوا تھا۔ بڑی دبنگ آواز میں بڑی عمدہ تقریر کر لیتی ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس مدرسہ سے اب تک جتنی بھی طالبات فارغ ہوئی ہیں ان میں انیسہ اب تک سب سے نمایاں شاگرد رہی ہے۔ مدرسہ سے فارغ التحصیل ہوئی تو اس نے واربرٹن اور اس کے قرب وجوار میں خواتین کے مختلف حلقوں میں دعوت وتبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا۔

شادی کے فوراً بعد ہی میں نے انیسہ کو ریاض بلوا لیا۔ ہمارے گھرانوں میں صدیوں سے دستور چلا آ رہا ہے کہ اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو مفت قرآن پاک کی تعلیم دیتے ہیں۔ جب انیسہ ریاض پہنچی تو میں نے حی الوزارات میں بڑا خوبصورت فلیٹ کرایہ پر لے لیا۔ اس میں تین کمرے، دو باتھ اور کچن تھا۔ ہمارے گھر میں محلّہ کے بچے اور بچیاں قرآن پڑھنے کے لیے آنے لگے۔ پھر اس نے اپنے ہی گھر میں قرآن کریم کا ہفتہ وار درس دینا شروع کر دیا۔ الحمد للہ! خواتین میں اس کے درس بڑے پسند کیے جانے لگے۔ یوں قال اللہ وقال الرسول کی آواز گونجنے لگی۔ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں میں اس کا تعارف ہوا تو مختلف گھروں میں دروس کے لیے جانا شروع کیا۔ الحمد للہ! اس اللہ کی بندی کو جس کسی نے کہا اس نے کبھی درس دینے سے انکار نہیں کیا۔ گھر چھوٹا ہے یا

بڑا، اگر اسے درس کی دعوت ملتی تو یہ فوراً پہنچ جاتی۔ میری طرف سے اسے مکمل تعاون حاصل تھا۔ میں اسے خود بھی چھوڑ آتا۔ بعد میں اس کے بھائی عبدالمتین بھی یہ ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

اس وقت ہمارے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ پریگننسی کے دوران بھی جب درس کا وقت آتا طبیعت نہ بھی ٹھیک ہوتی، یہ بستر پر لیٹی ہوتی تو اس نیک سیرت خاتون کے جسم میں بجلیاں دوڑ جاتیں۔ فوراً درس دینے کے لیے تیار ہو جاتی۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہماری مالی حالت شروع دن سے اچھی رہی۔ یہ اچھے سے اچھا لباس پہن کر، زیور پہن کر درس دیتی۔ اس کا کہنا تھا: ہم اسلام کو فقیر اور محتاج نہیں دیکھنا چاہتے۔ عموماً مالی حالت درست نہ ہونے کی وجہ سے گھروں میں لڑائیاں اور ناچاقیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جس زمانے میں ریاض بہت زیادہ سستا تھا اس وقت میری اوسط آمدن الحمدللہ دس ہزار ریال سے زیادہ تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر میں لڑائیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انیسہ خود بھی اپنے بچوں کو اور اپنے گھر کو نہایت صاف ستھرا رکھتی تھی۔ میں دفتر سے آتا تو گھر چمک رہا ہوتا۔ آج تک اس نے بچوں کا پیمپر میرے سامنے نہیں بدلا۔ کھانا بڑا مزیدار پکاتی۔ اس زمانے میں اخراجات بہت تھوڑے تھے۔ مارکیٹ میں جاتے تو سو دو سو ریال میں ٹرالی سامان سے بھر جاتی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آج تک دروس کا معاوضہ لیا اور نہ ہی اس کی خواہش ظاہر کی۔ اگر کسی نے ہدیہ دیا تو اس سے بہتر ہدیہ اسے واپس کیا۔ جب گھر میں درس و تدریس کا سلسلہ بڑھ گیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم کرایہ پر ایک فلیٹ لے کر تدریس کا کام اس میں منتقل کر دیں۔ ہمارے گھر کے قریب ہی یہ مدرسہ قائم ہو گیا۔ یہاں قرآن و سنت کی تعلیم بالکل مفت دی جاتی۔ والدہ صاحبہ بھی ریاض آ گئی تھیں۔ وہ بھی

مدرسہ میں پڑھانے لگیں۔ اس طرح ان کا بھی دل لگ گیا۔

میں جب وزارۃ الدفاع والطیران میں ملازمت کرتا تھا تو میرا تعارف ایک سعودی آفیسر جمعان الزہرانی سے ہوا، غالباً وہ اس وقت میجر تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ ہم لڑکیوں کا مدرسہ کھولنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ یہ خیر کا کام ہے۔ مدرسہ میں بچیوں اور عورتوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اسے مدرسہ فاطمۃ الزہرا کا نام دیا گیا۔ اس زمانے میں ہم نے حکومت سے اجازت لینے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ ہم نے سوچا کہ ہم تو قرآن پڑھا رہے ہیں، اس کے لیے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ جمعہ کے علاوہ ہفتے کے چھ دن صبح سویرے سے لے کر رات تک مدرسہ میں قرآن کریم پڑھایا جاتا رہا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ حکومت سے اس کی اجازت لینا ضروری ہے۔ بعض مدارس بند بھی کر دیے گئے ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد شیخ جمعان الزہرانی نے ہمارا تعارف سمو الامیرہ منیرہ بنت سعود الکبیر سے کروایا۔ ان کی شادی شاہ سعود کے صاحبزادے شہزادہ مساعد بن سعود آل سعود سے ہوئی تھی۔ ان کو ہم نے اس مدرسہ میں آنے کی دعوت دی۔ وہ ہمارے مدرسہ میں تشریف لائیں۔ یہ خاتون نہایت مدبر، علم دوست اور قرآن سے محبت کرنے والی ہیں۔ مکمل حجاب میں تشریف لائی تھیں۔ مدرسہ سے نکلیں تو مجھے کہنے لگیں: شیخ عبدالمالک! اللہ تم لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہ بڑا مبارک عمل ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے انیسہ نے ان کو سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں مدرسہ کے لیے مالی امداد کی ضرورت نہیں بلکہ اخلاقی مدد درکار ہے۔ انھوں نے ہمیں جمعیۃ تحفیظ القرآن کے نام ایک خط دیا۔ اس وقت شیخ عبدالرحمٰن آل فریان زندہ تھے۔ میں نے اس خط کے ہمراہ

درخواست لکھی اوران کے پاس گیا۔ میرے ساتھ جمعیۃ تحفیظ القرآن قسم النسائیہ کے مدیر شیخ سعود العمار بھی تھے۔ شیخ آل فریان رحمہ اللہ نے امیرہ کے خط کی قدر کی اور ہمیں بلا تاخیر عورتوں کے لیے حلقہ تحفیظ القرآن کھولنے کی اجازت مل گئی۔ میں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ ہمیں آپ سے کسی مالی مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم سارے اخراجات ان شاء اللہ خود برداشت کریں گے۔ ہمیں صرف اجازت نامہ درکار ہے۔

اس زمانے میں ہمارے اس مدرسے کے اخراجات بھی تو تھوڑے سے تھے۔ انیسہ اور دیگر ٹیچرز مفت پڑھاتی تھیں۔ کرایہ اور بجلی کا بل وغیرہ الحمدللہ! میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھے۔ ممکن ہے کہ کسی نے کوئی تھوڑا بہت تعاون دیا بھی ہو، جو مجھے یاد نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے کسی کے سامنے اس مقصد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

امیرہ منیرہ بنت سعود الکبیر سے کافی دیر تک تعلقات رہے۔ وہ عورتوں کے سالانہ پروگرام میں بھی تشریف لائیں۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا: ہم ان دنوں ریاض سے باہر صحراء میں خیمے لگائے ہوئے ہیں۔ سردی کا موسم تھا اور دھوپ کا اپنا مزہ تھا۔ کہنے لگیں: اپنی فیملی کے ساتھ آؤ اور دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ تناول کرو۔ ان کا ڈرائیور ہمارے گھر آ گیا۔ ہم اس کی رہنمائی میں اپنی کار پر ریاض سے باہر گئے۔ ریاض سے کوئی چالیس کلومیٹر باہر انھوں نے خیمے لگا رکھے تھے۔ یہاں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ یہ ایک شہزادے کے خیمے تھے جو بہت بڑے بڑے تھے۔ صحراء میں خاصی جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ وہاں شاہی انتظام تھا۔ جنریٹر چل رہے تھے۔ میں چونکہ سموالامیرہ کا مہمان تھا، اس لیے میرے ساتھ خصوصی سلوک کیا گیا۔ شہزادی منیرہ کی عظمت کو سلام کہ وہ برقعہ میں ملبوس مردوں کے خیموں کی طرف آئیں۔

اپنے شوہر شہزادہ مساعد کے ساتھ تعارف کروایا۔ میرے اور انیسہ کے بارے میں بڑے اچھے جملے ادا کیے کہ یہ لوگ پاکستانی کمیونٹی کو قرآن کریم پڑھاتے ہیں۔ شہزادہ نے مجھے گلے لگا لیا۔ ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے خاص خیمہ میں لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ کھانے میں روایتی ڈش مندی تھی۔ بڑی بڑی پراتوں میں چاول اور ان پر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے تھے۔ کھانا بلاشبہ بڑا لذیذ تھا۔ وہاں بہت سارے لوگ تھے، مگر جن لوگوں کو شہزادے کے قریب جگہ دی گئی، ان میں ہم بھی شامل تھے۔

امیرہ منیرہ بڑی صالح خاتون ہیں۔ ہم نے ان سے کبھی کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اللہ تعالی نے مجھے اس بارے میں کمال استغنا دیا ہوا ہے۔ بس یہ ضرور تھا کہ جب میں ان کو فون کرتا تو اگر اسی وقت جواب نہ دیتیں تو بعد میں ان کا فون ضرور آتا۔ اس عظیم خاتون کو قرآن کریم کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ جب کبھی ملاقات کے لیے جاتے تو ایک ایک بچے کے بارے میں پوچھتیں۔ ان کا پیلس ریاض کے جنوب میں شہر سے خاصا باہر واقع تھا۔ یہ وہاں اپنے نوکروں کی فوج ظفر موج کے ساتھ مقیم تھیں۔ اصرار سے پیلس کے اندر بلاتیں بلکہ مجلس خاص میں بلواتیں۔ خاصی دیر تک پاس بیٹھی رہتیں اور باتیں کرتی رہتیں۔ پردہ کی سخت پابند تھیں۔ جب بھی میرے سامنے آتیں مکمل نقاب کے ساتھ آتیں۔ یہ نہایت جہاں دیدہ خاتون تھیں۔ ان کی رگوں میں شاہی خون ہے۔ معاملہ فہم اور اسلام کی داعیہ ہیں۔ بیرون ملک جاتیں تو اپنے ساتھ دارالسلام کی کتب لے کر جاتیں اور لوگوں میں تقسیم کرتیں۔

ایک مرتبہ ہم ان سے ملنے کے لیے گئے تو بچوں کو گاڑی میں چھوڑ گئے کہ بچے ابھی

چھوٹے تھے، سوچا شور مچائیں گے۔ ان کی نوکرانیاں میرے سامنے آتیں تو وہ بھی نقاب کیے ہوئے ہوتیں۔ وہ ہمیں قہوہ اور اعلیٰ قسم کی کھجوریں پیش کرتیں۔ امیرہ مجھ سے پوچھنے لگیں: بچے کدھر ہیں؟ انیسہ اور میں نے ٹالنا چاہا، مگر انھوں نے اصرار سے پوچھا: بچوں کو کیوں نہیں لائے وہ کدھر ہیں؟ مجھے ان کے اصرار پر بتانا ہی پڑا کہ وہ باہر گاڑی میں ہیں۔

کہنے لگیں: فوراً ان کو لے کر آؤ۔ بچے آئے تو ہر ایک کو پیار کیا۔ ٹیبل پر اعلیٰ درجے کی چاکلیٹ رکھی ہوئی تھیں۔ بچوں سے کہنے لگیں: خوب جی بھر کر کھاؤ۔ اعلیٰ درجے کی چاکلیٹ ان کو کھلائیں، بلکہ اصرار سے ان کی جیبوں میں ڈالیں۔

ان کی دو بیٹیاں شہزادی منال بنت مساعد بن سعود آل سعود اور شہزادی مشاعل ہمارے مدرسہ کے سالانہ پروگرام میں تشریف لائیں۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ ہماری مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہمارا ان سے رابطہ تقریباً ختم ہو گیا، کہ ایک دن اچانک شہزادی منال کا فون آ گیا۔ کہنے لگیں: کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم آپ لوگوں کو بھول چکے ہیں۔ ہم تو آپ لوگوں کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا پن اور تواضع تھی، ورنہ ذرا سا آدمی بڑا ہو جائے تو وہ عام لوگوں کو کہاں یاد کرتا ہے۔ امیرہ نے بڑے اصرار سے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

پھر ایک دن ان سے وقت مقرر کر کے میں، انیسہ، ہماری بیٹی عفراء اور ہمارے مدرسہ کی مدیرہ ان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ ریاض کے پوش علاقے میں واقع ان کا گھر کوئی بڑا نہ تھا، مگر نہایت خوبصورت اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا تھا کہ ہم کسی پرنس کے گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ ہم ان کے ہاں کوئی دو

سے ڈھائی گھنٹے تک رہے۔ امیرہ منال نہایت پڑھی لکھی، باشعور، عاقلہ خاتون ہیں۔ ان کی پانچ بیٹیاں ہیں۔ خود حافظہ قرآن ہیں۔ غالباً ان کی بیٹیوں نے بھی قرآن کریم حفظ کر رکھا ہے۔ اس خاتون نے قرآن وسنت کو پھیلانے کے لیے خاصی جدوجہد کی ہے۔ ریاض میں تحفیظ القرآن کے مراکز کھولے ہیں۔ خیر کے کاموں میں پیش پیش رہتی ہیں۔ انھوں نے توحید کے موضوع پر بڑی خوبصورت کتاب بھی لکھی ہے۔ ہر چند کہ کتاب مختصر ہے، مگر بڑی جامع ہے۔ اس روز ہماری گفتگو کا مرکز اور محور زیادہ تر دعوتی سرگرمیاں تھیں۔ جب تک میرے سامنے رہیں، مکمل حجاب میں تھیں، بلکہ ہاتھوں پر دستانے تھے۔ ان کے اپنے تجربات تھے جو بیان کرتی رہیں۔ ہم عصر کے بعد ان کے ہاں گئے تھے اور عشاء کے وقت واپس آئے۔ یہ کھانے کا وقت نہ تھا، مگر اس کے باوجود انھوں نے ریفریشمنٹ کا بڑا زبردست انتظام کیا ہوا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ واقعی ہم ایک شہزادی کے گھر ہیں۔ بڑے اہتمام اور اصرار سے ہمیں مختلف اشیاء کھانے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک وقت میں مجھے، اہلیہ اور بیٹی کو اکیلے چھوڑ کر اندر چلی گئیں، تاکہ ہم آرام سے کھا پی سکیں۔

جب واپس آئیں تو کہنے لگیں: شیخ عبدالمالک! میں نے آپ کو ایک چیز دکھانی ہے۔ نوکرانی کو اشارہ کیا تو وہ اندر سے ایک سنہرا صندوقچہ اٹھا کر لائی۔ اسے کھولا تو اس کے اندر قرآن کریم تھا۔ جب پاکستان بنا تو بننے کے کچھ سالوں بعد غالباً خواجہ ناظم الدین کے دور میں شاہ سعود بن عبدالعزیز پاکستان کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ یہ ان کے دادا تھے۔ کہنے لگیں: میں نے اپنے والد کے خزانے میں اس سنہرے صندوقچہ کو دیکھا تو والد کی اجازت سے اسے اپنے گھر لے آئی۔

میں نے دیکھا کہ صندوقچہ پر بڑے ہی خوبصورت نقش و نگار تھے۔ اس پر حکومت پاکستان کی مہر لگی ہوئی تھی جو پیتل میں کھدی ہوئی تھی۔ یہ پیتل کا صندوق تھا، مگر بادی النظر میں سونے کا لگتا تھا۔ مرورِ زمانہ کے باعث اب اس کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ صندوق کے اندر تاج کمپنی کا چھپا ہوا قرآن کریم رکھا ہوا تھا۔ غالباً 1950ء کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ یہ نسخہ اہلِ لاہور کی طرف سے شاہ سعود آل سعود رحمہ اللہ کو تحفتاً پیش کیا گیا تھا۔ تجلید کثرت استعمال سے اکھڑ چکی تھی۔ میں ان کی اجازت سے اسے دارالسلام کے دفتر میں لے آیا۔ دفتر کے ایک موظف کی ڈیوٹی لگائی۔ اس نے دوبارہ اس کی تجلید درست کی، ایک ادارے نے اس صندوق پر اس قدر خوبصورتی سے سنہری قلعی کی کہ یہ دوبارہ سونے کا لگنے لگا۔ امیرہ منال نے مجھے شکریہ کا فون کیا۔ کہنے لگیں: والدہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ معاوضہ بتائیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا: یہ میری طرف سے تحفہ قبول فرمائیں۔ یہ دونوں ماں بیٹیاں پاکستان جا چکی ہیں۔ جب افغانستان کا جہاد ہو رہا تھا تو انھوں نے اس دوران افغان مہاجرین کی خوب مدد کی تھی۔

ریاض میں سیکڑوں لڑکیاں انیسہ فردوس کی شاگرد ہیں، جن کو اس نے ترجمہ قرآن یا حدیث پڑھائی ہے۔ غالباً 1990ء کے بعد اس نے ریاض میں خواتین کا سالانہ پروگرام شروع کیا۔ جس میں ہزار سے زیادہ عورتیں آتی تھیں۔ کئی سال تک یہ پروگرام بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ بعد میں انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا۔

ایک زمانے میں ہم نے مدرسہ عفراء بنت عبید الانصاریہ کو خوب وسعت دی۔ طالبات کی تعداد 1200 سے متجاوز ہو گئی۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کی کتب بھی پڑھائی جاتی رہیں۔ قرآن پاک کو حفظ کروانے کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تربیت کے لیے دیگر کتب بھی

پڑھائی جاتی رہیں۔ اس مدرسہ پر کئی مدو جزر آئے، مگر دعوت کا کام ہر حالت میں چلتا ہی رہا۔

انیسہ کی زیر قیادت عورتوں نے ''مطلع الفجر'' کے نام سے ایک پرچہ بھی نکالا۔ جو کچھ عرصہ چلنے کے بعد بند ہو گیا۔ مدرسہ عفراء بنت عبید اپنے عروج کو پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ بند رہا۔ انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے اس کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ اب اس کا نام ''ضحیٰ انٹرنیشنل سکول'' ہے اور اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے۔

دارالسلام کے قیام سے لے کر اب تک انیسہ کا تعاون میرا خوب مددگار رہا ہے۔ مجھے الحمدللہ! کبھی گھریلو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ گھر کے تمام افراد میری خواہشات کا احترام کرتے ہیں۔ ہمارے گھرانوں میں اللہ کا شکر ہے کہ صبح وشام دین کی باتیں ہوتی ہیں۔ انیسہ چونکہ خود کتاب اللہ کی حافظہ ہے۔ جب تک دو پارے منزل نہ پڑھ لے اسے چین نہیں آتا۔ ہمارے گھر میں گزشتہ پندرہ سال سے نوکرانی ہے جس کی وجہ سے اسے دعوت کا کام کرنے میں خوب آسانیاں رہیں۔ نوکرانی ہمیں کیسے ملی؟ کیونکہ سعودی عرب میں کسی غیر ملکی کو نوکرانی اس کی کفالت میں نہیں مل سکتی، یا بہت کم ملتی ہے۔ تو اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہمارے ہاں ان دنوں پروفیسر ساجد میر صاحب ریاض میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گورنر ریاض شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز حفظہ اللہ سے ہماری ملاقات تھی۔ ایسے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ ہم ملاقات کے لیے جا رہے ہیں، کیوں نہ ان سے خادمہ کا ویزا طلب کر لیا جائے۔ میں نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ فوراً درخواست لکھو۔ ہم ملاقات کے لیے گئے تو نکلتے وقت ان کو میں نے درخواست پیش کی، انھوں نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سیکرٹری کو دیکھا۔ جس نے لپک کر ان کے ہاتھ سے درخواست پکڑ لی۔ چند دن

کے بعد ویزا ہمارے پاس آ گیا۔ ہمیں انڈیا سے ایک خاتون تتلی بیگم مل گئی۔ اس کا نام ہم نے عائشہ رکھ دیا۔ حیدر آباد سے تعلق رکھنے والی عائشہ پندرہ سال ہمارے گھر میں مقیم رہی۔ یہ خاتون ہمارے حق میں اور ہم اس کے حق میں بڑے عمدہ رہے۔ یہ اچھے اخلاق اور کردار کی مالکہ تھی۔ بڑا اچھا، مزیدار اور جلدی سے کھانا پکاتی۔ اس نے انیسہ کو گھر کے کاموں سے بڑی حد تک فارغ کر دیا۔ الحمد للہ! ہمارے تعاون سے اس نے انڈیا میں اپنا گھر بھی بنالیا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا، جس کو اس عورت نے ویزا بھجوا کر اپنے پاس بلوالیا۔ انیسہ کے ایماء اور خواہش پر اس نوکرانی کی شادی بھی ایک پاکستانی سے کر دی گئی۔ یہ اب مستقل انڈیا واپس جا چکی ہے۔ ہمارے گھر میں اس کے جانے کے بعد بھی اس کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

میں نے دارالسلام کے قیام کے لیے بے شمار سفر کیے ہیں۔ چند ایک مواقع چھوڑ کر انیسہ نے ہمیشہ مجھے ائرپورٹ پر الوداع کہا اور واپسی پر استقبال کیا۔ ہم نے کتنے ہی حج اکٹھے کیے۔ بے شمار عمرے ادا کیے۔ ہمیں یہ بھی اعزاز ملا کہ ہم نے خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے مہمان بن کر حج کیا۔ اس حج کے دوران میں ہمارے بچے بھی شامل ہو گئے۔ یہ حج رابطہ عالم اسلامی کے زیر انتظام ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی کے تعاون سے ہوا۔ یہ بلاشبہ یادگار اور مثالی حج تھا۔

قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے لکھے دیتا ہوں کہ خیر و برکت کیسے آتی ہے۔ اس کی ایک خوبصورت مثال میرے سامنے اس وقت آئی جب میں نے پہلی مرتبہ مدرسہ کے لیے 8 ہزار ریال کا چیک دیا۔ مجھے وہ منظر کبھی نہیں بھولتا جب مدرسہ کی بلڈنگ کا مالک میرے پاس دارالسلام میں آیا۔ میں نے چیک لکھ کر اس کے حوالے کیا تو مجھے بڑی خوشی ہو رہی

تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے برکت نازل ہو رہی ہے۔ پھر واقعی اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی خیر و برکت عطا فرمائی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ درست ہے کہ دارالسلام میں ہم نے انتھک محنت کی، مگر اصل برکت اور خیر تو صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ اللہ کے فضل سے دارالسلام کے حالات بتدریج بہتر ہوتے چلے گئے۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب ہمارے پاس ابھی مدرسہ کا اجازت نامہ نہیں تھا۔ دراصل اس وقت اتنا شعور ہی نہیں تھا کہ قرآن پڑھانے کے لیے پہلے قانونی تقاضے پورے کیے جائیں، پھر کام شروع کیا جائے۔ ہم نے مدرسہ کھول لیا تھا، مگر ہمارے پاس اجازت نامہ نہ تھا۔ اسی دوران ہمیں معلوم ہوا کہ بعض مدارس کو بند کیا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بڑے آدمی سے رابطہ کیا۔ ان سے ملاقات کی۔ ان سے مشورہ کیا تو وہ کہنے لگے: مدرسہ فوراً بند کر دو۔ میں سخت مضطرب ہوا۔ میں تو ان کے پاس اس لیے گیا تھا کہ وہ میری حوصلہ افزائی کریں گے، مگر یہ کیا! انھوں نے تو مایوس کر دیا۔ میں نے ایک دن فجر کی نماز ادا کی۔ مدرسہ کی چابی میری جیب میں تھی۔ میں نے مدرسہ کھولا۔ اللہ کی قسم! مجھے قرآن کی خوشبو آئی۔ مجھے اتنا سکون اور چین ملا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ میں نے روتے ہوئے کہا: اللہ! میں نے یہ مدرسہ کسی مالی منفعت کے لیے نہیں کھولا تھا، یہ تو تیری رضا کے لیے اور لوگوں کو تیرا قرآن سکھانے کے لیے تھا اور اب یہ بند ہونے جا رہا ہے۔ کیا میں اس کو بند کر دوں؟ نہیں نہیں! میں اسے کبھی بند نہیں کروں گا۔ میں نے ہاتھ نیچے کیے تو دل میں ایک عزم اور ارادہ تھا کہ میں اس مدرسہ کو کبھی بند نہیں کروں گا۔

مدرسہ سارا دن کھلا رہتا تھا۔ والدہ صاحبہ ان دنوں میرے پاس مقیم تھیں۔ وہ ناشتہ کر

کے مدرسہ آ جاتیں۔ کبھی کبھار چائے بھی بناتیں۔ ملنے والی آتیں تو ان کو بھی پلاتیں۔ کتنی ہی عورتوں کو انھوں نے قرآن پڑھایا۔ سارا دن مدرسہ میں رونق لگی رہتی۔ والدہ صاحبہ کے الفاظ: عبدالمالک! بڑی بڑی بودیاں والی (یعنی بے پردہ) عورتیں یہاں آتی ہیں، مگر چند دنوں میں ان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ وہ حجاب کی نعمت ساتھ لے کر جاتی ہیں۔

اللہ تعالی نے میری دعا کو شرف قبولیت بخشا اور چند ہفتوں کے بعد ہی ہمیں شہزادی منیرہ بنت سعود الکبیر کی معرفت اور سفارش سے جمعیۃ تحفیظ القرآن کی طرف سے مدرسہ کا اجازت نامہ مل گیا۔ اس زمانے میں شعبہ خواتین کے سربراہ شیخ سعود العمار تھے۔ میں ان کا تعاون کبھی نہیں بھولوں گا۔ ہمارے دوست حافظ محمد الیاس کا تعلق انڈیا سے ہے۔ یہ شیخ ابن باز کی مسجد کے امام ہیں۔ انھوں نے بھی مدرسہ کے معاملات میں ہماری خوب مدد کی۔ یہ شام کے وقت جمعیۃ النسائیہ میں کام کرتے تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا: حافظ صاحب! آپ جمعیت کے دفتر میں بغیر تنخواہ کے ہمارے مندوب ہیں۔

دعوت کا کام کرنے والے خوب جانتے ہیں کہ اس راہ میں رکاوٹیں آتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے مال کی قربانی بھی چاہیے۔ ہمت اور جرأت بھی درکار ہوتی ہے۔ بروقت فیصلے بھی خیر کے کاموں کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک خوبصورت واقعہ یاد آ رہا ہے کہ میں ایک مرتبہ وزارت مذہبی امور میں مدرسہ کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کے لیے گیا۔ متعلقہ کلرک کے سامنے پیش ہوا تو اس کا رویہ کچھ اچھا نہ تھا۔ میں اس کی ٹیبل کے سامنے کھڑا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔ خیر کچھ انتظار کے بعد اس نے بڑے کرخت لہجے میں پوچھا: بتاؤ! یہاں کیا لینے آئے ہو؟ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگا: تم کون ہوتے ہو؟ اس مدرسہ پر خرچ

کون کرے گا؟ مدرسین کی تنخواہیں کون دے گا؟ بلڈنگ کا کرایہ اور بجلی کا بل کون ادا کرے گا؟ اور ہاں یہ بتاؤ تم یہ کام کیوں کرنا چاہتے ہو؟

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا، پورے جوش وخروش اور قدرے بلند آواز سے کہا: میرا نام عبدالمالک مجاہد ہے۔ میں پاکستانی ہوں اور وزارۃ الدفاع میں ملازم ہوں۔ اس مدرسہ کے جملہ اخراجات میں ان شاء اللہ خود برداشت کروں گا۔ مجھے اس کے بدلہ میں جنت مقصود ہے۔ میں تمھارے پاس کسی مالی منفعت کے لیے یا چندہ لینے کے لیے نہیں آیا، بلکہ صرف اجازت نامہ کے لیے آیا ہوں۔ پھر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد سے کہا: کیا تمھیں جنت درکار ہے؟ میری پرعزم گفتگو سن کر اس کا رویہ یکسر بدل چکا تھا۔ اس کی آواز پست ہو چکی تھی۔ بڑے احترام سے سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: شیخ! آپ کرسی پر بیٹھ جائیں۔ پھر پوچھنے لگا: یا شیخ! کیا آپ چائے پییں گے؟ پھر اس نے چائے منگوا کر مجھے پلائی۔ بڑے اطمینان سے میرے سوالات کا جواب دیا۔ میری حوصلہ افزائی کی اور بڑی دعائیں دیں۔

قارئین کرام! اگر آپ اپنے مشن میں مخلص ہیں تو پھر لوگ آپ کے ساتھ تعاون کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اوپر میں نے شیخ سعود العمار اور حافظ محمد الیاس صاحبان کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں میں مزید اضافہ فرمائے، یہ میری بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ مدرسہ کے معاملات میں رکاوٹیں ہوتیں تو خود بخود انھیں دور کر دیتے۔

جب ہم نے مدرسہ کا آغاز کیا تو ہمیں اس کی بلڈنگ خریدنے کے لیے خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ ایک دن میں نے شیخ محمد المعتاز صاحب سے کہا: ریاض کے ایک معروف تاجر کے ہاں مدرسے کے لیے جانا ہے۔ محمد المعتاز صاحب کو اس قسم کے کاموں

کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہم نے ان کے والد شیخ عبداللہ المعتاز سے اس معروف تاجر کے نام ایک لیٹر لیا۔ جس میں میرا تعارف اور مدرسے کے قیام کا ذکر تھا۔ ہم نے فجر کی نماز ان کے گھر کے قریب کی مسجد میں جا کر ادا کی ۔ نماز کے بعد اور بھی کئی لوگ ان کے ہاں تعاون کے لیے آ گئے ۔ اس معروف تاجر نے جب اتنے لوگوں کو دیکھا تو اپنے دروازے کو بند کر لیا اور گھر کے اندر چلے گئے ۔ ہمیں اس قسم کے سلوک کی توقع نہ تھی، ہمیں بڑی مایوسی ہوئی ۔ میں بڑی مشکل سے محمد المعتاز کو راضی کر کے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ہم اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ قرآن پاک کے مدرسے کے لیے آئے تھے۔ ان شاء اللہ ہمیں اجر وثواب ضرور ملے گا۔ خیر بوجھل قدموں کے ساتھ واپس ہونے لگا تو خیال آیا کہ کیوں نہ امام مسجد کی معرفت یہ لیٹر تو ان کو پہنچا دیا جائے ۔

اس تاجر کو جب معلوم ہوا کہ میرے گھر میں شیخ عبداللہ کا بیٹا خود آیا تھا تو افسوس کا اظہار کیا اور اس کی تلافی اس طرح کی کہ ایک لاکھ ریال کا چیک ہمیں بھجوا دیا۔

مدرسے کے قیام کے لیے انیسہ نے بھی بڑی مالی قربانیاں دی ہیں۔ اس اللہ کی بندی نے کم از کم دو مرتبہ اپنا پورا زیور مدارس کے لیے صدقہ کیا۔ کچھ حصہ ریاض کے مدرسہ کے لیے اور کچھ وار برٹن کے مدرسہ اور دیگر مدارس کے لیے عطیہ کیا۔ عورتوں کو اپنا زیور بڑا عزیز ہوتا ہے ۔ یہ مجھ سے مختلف وقتوں پر زیور کی صورت میں گفٹ لیتی رہتی تھی ۔ اللہ نے مجھے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں دیں ۔ میری والدہ صاحبہ فرماتیں: عبدالمالک! انیسہ جھولی بھر کر گھر آئی ہے، اب تم اس کی جھولی بھرو۔ ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ اسے سونے کی چوڑیاں یا سیٹ بطور گفٹ پیش کرو۔ اس زمانے میں سونا خاصا سستا تھا۔ خیر ایک مرتبہ اس نے ایک بیش قیمت انگوٹھی مجھ سے بڑا مطالبہ کر کے خریدی ۔ چند دنوں کے بعد مجھے کہنے لگی: میں

نے نیت کی ہے کہ میں اپنا سارا زیور اللہ کی راہ میں دے دوں۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟ میں نے کہا: بڑے شوق سے دو یہ تمھاری ملکیت ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ الحمد للہ! اس زیور کا وزن کم وبیش ایک کلوگرام تھا۔ میں نے کہا: مجھے کوئی اعتراض نہیں، بلکہ تمھارا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں اسے عموماً صدقہ وخیرات کے لیے ابھارتا رہتا تھا کہ جتنا صدقہ کروگی اتنی ہی برکت آئے گی۔ لیکن میرا ایک سوال ہے: یہ بتاؤ یہ جو تم نے مجھ سے مطالبہ کر کے بلکہ دوسرے الفاظ میں لڑلڑ کے انگوٹھی بڑے شوق سے خریدی تھی، اسے بھی صدقہ کروگی۔ اس اللہ کی بندی نے بڑا خوبصورت جواب دیا: ہاں، ہاں! ضرور اسے بھی صدقہ کروں گی۔ بلکہ اسے سب سے پہلے اللہ کی راہ میں دوں گی۔

سبحان اللہ! میں نے دیکھا کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کے پاس اتنا ہی زیور پھر آ گیا۔ کہاں سے آیا؟ اس کا جواب مجھ سے نہ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیا۔ کیسے دیا؟ یہ وہی جانتا ہے۔ ہم نے آج تک اللہ کا شکر ہے اپنی ذات کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ نہ ہی ہمیں کسی نے دیا ہے۔ میرے تمام جاننے والے ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ عبدالمالک بہت مالدار ہے، یہ الگ بات ہے کہ میرے پاس بہت ہی کم بینک بیلنس رہا ہے۔

مدرسہ کے سلسلہ میں ایک مرتبہ میں شیخ عبداللہ المعتاز کے پاس گیا۔ ان سے مدعا بیان کیا تو انھوں نے کہا: تم پاکستانی لوگ ہر وقت مدارس بنانے کا سوچتے رہتے ہو، پھر ان سے اپنی ذاتی اغراض پوری کرتے ہو! میں نے ان کی بات سنی تو میں غصہ میں آ گیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں نے کہا: شیخ! آپ کیا سمجھتے ہیں کہ پیسہ صرف آپ لوگوں کے پاس ہے؟ ان شاء اللہ میں اب آپ سے ایک ریال بھی طلب نہیں کروں گا۔ میں بھی کوئی فقیر آدمی

نہیں۔ میں اپنی جیب سے خرچ کروں گا۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ اسے ہو کر رہنا ہے۔ میں خود بڑا غیور ہوں۔ میں بولتا چلا گیا۔ میری آواز بھی بلند ہوگئی۔ میں ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے میری پیٹھ سہلائی۔ اس پر شفقت اور محبت کا ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہنے لگے: میں تو تمھیں آزما رہا تھا۔ جاؤ! یہ خیر کا کام کرو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

ہم جس مدرسہ میں تھے، وہ ایک چھوٹی سی گلی اور تین چار کمروں کا فلیٹ تھا۔ بچیوں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم اس کو چھوڑ کر بڑی جگہ چلے جائیں گے۔ اسی دوران ہمارے اس مالک مدرسہ نے اپنا گھر شہر کے پوش ایریا میں بنا لیا اور وہاں پر شفٹ ہو گیا۔ اوپر کی منزل پر اسی کا گھر خالی ہو گیا، جس کے کمرے قدرے بڑے تھے اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ میں بروقت کرایہ ادا کرنے والا کرایہ دار تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم اس کے فلیٹ کو خالی کرنے جا رہے ہیں تو اس نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ اس گھر کی اوپر والی پوری منزل خالی کر رہے ہیں آپ اسے مدرسہ کے لیے لے لیں۔ انیسہ چاہتی تھی کہ ہم بڑا سا مدرسہ لیں۔ خیر وہ میرے اصرار پر میرے ساتھ اوپر کی منزل دیکھنے کے لیے گئی۔ اس کے الفاظ مجھے نہیں بھولتے۔ کہنے لگی: ''بڑے مشورے دینے آئے ہیں۔ خود اس محلے سے باہر پوش ایریا میں مکان بناتے ہیں اور ہمیں کہتے ہیں کہ ان کے چھوڑے ہوئے پرانے گھروں میں آ جائیں۔ میں تو کبھی یہ سودا نہیں کروں گی۔ ہمیں تو خوبصورت اور کھلا مدرسہ درکار ہے۔'' اللہ نے اس کی لاج رکھی اور الحمد للہ! ہم نے واقعی بڑا خوبصورت مدرسہ حاصل کر لیا۔ مدرسہ خریدنے کی داستان بھی بڑی دلچسپ اور یادگار ہے۔

شیخ عبداللہ المعتاز اور دارالسلام کے دیگر مالکان کے ساتھ تعلقات میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ ان کی اپنے گھر پر دعوت کی۔ دارالسلام کے دوسرے شریک

شیخ سلیمان الفیز بھی تشریف لائے۔کھانے سے فارغ ہوئے تو انھیں بتایا کہ ہمارے پاس کچھ رقوم جمع ہیں۔ ہم مدرسہ کے لیے عمارت خریدنا چاہتے ہیں۔آپ کا تعاون درکار ہے۔دونوں نے ہاں کردی اور کہا: کچھ مبلغ ہم ادا کر دیتے ہیں، کچھ تم جمع کرو۔خیرانیسہ نے اپنا زیور فروخت کر دیا۔کچھ میں نے اور دیگر لوگوں نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔اس دوران ہم نے متعدد عمارتیں دیکھیں۔میں شام کے وقت عقاریوں کے دفاتر کے چکر لگاتا۔ان کے پاس بیٹھتا۔کوئی عمارت ہمیں پسند نہ آتی۔کسی کی قیمت ہماری پہنچ سے زیادہ ہوتی۔دو تین مرتبہ ایسا ہوا کہ ہمیں بنگلہ پسند آ گیا،مگر ہمارے پاس پیسے نہ ہوتے اور وِلاّ فروخت ہو جاتا۔میں نے ایک دن شیخ عبداللہ المعتاز حفظہ اللہ سے کہا: جناب! دو تین بلڈنگیں ہمیں پسند آئیں،مگر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بک گئیں۔اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، کہنے لگے:تم عمارت پسند کرو، ان شاء اللہ! اب پیسوں کی وجہ سے یہ عمارت کہیں نہیں جائے گی۔

ریاض میں پرانے ائرپورٹ روڈ پر وزارت داخلہ کے سامنے ایک بڑا ہوٹل یمامہ ہے۔اس کی پشت پر ایک وِلاّ ہمیں پسند آ گیا۔قیمت 440000 ریال تھی۔مکان کو دو گلیاں لگتی تھیں۔ہر چیز بہترین تھی،مگر اس علاقے میں کوئی مسجد نہ تھی۔اس وِلاّ کے وسط میں کھجور کا بڑا درخت تھا۔مالک مکان سے میں نے خود سودا طے کیا۔یہ شخص سعودی ائرلائن میں برقی انجینئر تھا۔یہ اس کے مرحوم والد کا وِلاّ تھا۔اس کا بچپن اسی جگہ گزرا تھا۔اب اپنی والدہ کے ہمراہ جدہ میں مقیم تھا۔بڑا نفیس اور وسیم شخص تھا۔میں نے اس سے کہا: کیا آپ کو اچھا نہیں لگے گا کہ آپ کے والد کے گھر میں اب قرآن پڑھا اور پڑھایا جائے۔اس نے اپنی والدہ کے ساتھ مشورے کے بعد غالبًا بیس ہزار ریال کم کر دیے۔

سودا ہو گیا اور میں نے ٹوکن دے دیا۔ جو رقم میرے پاس تھی وہ میں نے شیخ عبداللہ المعتاز کی جھولی میں ڈال دی۔ اب مجھے صحیح یاد نہیں کہ وہ رقم کتنی تھی۔ باقی مبلغ انھوں نے خود ڈال دیا اور الحمدللہ! یہ وِلاّ شیخ عبداللہ البکری اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن کے نام لگ گیا۔

چند ماہ گزرے تو جن سے یہ گھر خریدا تھا وہ میرے دفتر میں آئے اور کہنے لگے: میں تمھیں اپنی والدہ کی طرف سے امانت کی ادائیگی کرنے آیا ہوں۔ بٹوہ نکالا اور پانچ ہزار ریال میرے حوالے کر دیے۔ ہمیں اس وقت پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ہم نے مدرسہ کی مرمت پر اس مبلغ کو لگا دیا۔ میں نے گلی کی طرف ایک کمرے کا دروازہ کھولا، اسے مسجد کی شکل دی، چھوٹا سا مینار بنوایا، اوپر مصلی لکھا، صفیں بچھائیں اور اپنے بچوں کے ہمراہ وہاں نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ ہمارا تجربہ زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ ایک تو یہ جگہ میرے گھر سے دور تھی۔ گاڑی پر آنا ہوتا تھا۔ دوسرا میں تو وزارت میں ملازم تھا۔ خیر ہمارا مدرسہ توقع سے کہیں جلدی کامیاب ہو گیا۔ ہم پہلے بالکل مفت تعلیم دیتے تھے۔ انیسہ کے علاوہ جو استانیاں تھیں وہ سب کی سب اس کی شاگرد تھیں۔ اس نے ان کی ذہن سازی اس طرح کی تھی کہ ہمیں اپنے اللہ کو راضی کرنا ہے، لہٰذا مفت کام کرو۔ مگر ان میں کئی ایک بلاشبہ نہایت ضرورت مند تھیں۔ ان کے گھر کا کچن بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ کئی ایک نے دبے لفظوں میں کہنا شروع کیا: باجی! آپ کے مالی حالات تو اچھے ہیں لیکن ہمارے تو نہیں، ہم تو اپنے خاوندوں کی مدد کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی بات معقول تھی، میں نے بھی اس بات کی تائید کی کہ جس شخص کا پیٹ خالی ہو اسے جتنے مرضی لیکچر دے لیں، اسے تو روٹی چاہیے۔

بالکل مفت تعلیم کا تجربہ بھی بہت زیادہ کامیاب نہ ہوا۔ ہمارے پاس زیادہ تر بچیاں

صوبہ خیبر پختون خوا سے تعلق رکھنے والی تھیں، جس کا نام اس وقت صوبہ سرحد تھا۔ ان کے والدین مدرسہ کے نام پر تو بچیوں کو تعلیم کے لیے بھجوانے پر تیار تھے، مگر سکول کے نام پر نہیں۔ اب ہم نے محسوس کیا کہ ایک بچی آج آئی ہے کل نہیں آئی، جب دل چاہا چھٹی کر لی۔ ہم نے اس کا کھوج لگایا تو معلوم ہوا کہ چونکہ والدین کو کوئی فیس تو ادا نہیں کرنی پڑتی، اس لیے جب جی چاہا بچی کو سکول چھوڑ گئے جب جی چاہا اسے گھر بٹھا لیا۔ خیر کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیس تیس ریال ماہوار رکھ دی۔ اس سے سکول کو بھی کچھ تعاون ملا اور بچیاں بھی پہلے کی نسبت منظّم ہوگئیں۔ مگر اب ٹیچرز کی طرف سے مطالبہ آیا: ہم پڑھاتی تو کسی بھی انٹرنیشنل سکول کی طرح ہیں اور ہمیں تنخواہ برائے نام ملتی ہے۔ ہمارے ہاں صرف غریبوں کی بچیاں پڑھتی تھیں۔ امیر لوگ یہ کہہ کر اپنی بچیوں کو داخل نہیں کرواتے تھے کہ یہ تو غریبوں کا سکول ہے۔ اس طرح ہم مجبور ہوتے چلے گئے اور فیس میں اضافہ کرنا پڑا۔ ٹیچرز کو بھی فائدہ ہوا، سکول کی بھی حالت بدلی اور کچھ مالداروں کی بچیاں بھی سکول میں داخل ہونے لگیں۔ بہت جلد تعداد 500 سے اوپر چلی گئی اور کمرے کم پڑ گئے۔

میں ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرا پرانا سعودی مالک مکان ایک دوسرے سعودی کے ساتھ دفتر میں داخل ہوا۔ سلام دعا اور معانقہ کے بعد میں نے ان کو بٹھایا۔ چائے کا پوچھا تو کہنے لگے: ہم ایک ضروری کام سے آئے ہیں، ہمیں امید ہے کہ تم ہمیں مایوس نہیں کرو گے۔ میں نے پوچھا: بتائیں! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ کہنے لگے: جس علاقے میں تم نے مدرسہ عفراء بنت عبید بنایا ہے، اس علاقے میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ ہم نے خوب سروے کیا ہے۔ جس وِلاّ میں مدرسہ ہے وہ مسجد کے لیے نہایت مناسب جگہ ہے۔ مدرسہ اور کسی بھی جگہ بن سکتا ہے۔ تم یہ وِلاّ ہمیں فروخت کر دو ہم یہاں مسجد بنانا

چاہتے ہیں۔ہم تمھیں معقول معاوضہ دے دیں گے۔ہمیں ''شرکۃ الجمیع'' نے اس جگہ مسجد بنانے کے لیے موافقت دے دی ہے۔ وہ اپنے خرچ پر اس مسجد کو تعمیر کریں گے۔ ہمیں کوئی بہت زیادہ جلدی نہیں۔ آپ لوگ جب متبادل جگہ دیکھ لیں گے تب ہم وِلاّ گرائیں گے۔واضح رہے کہ ''الجمیع'' سعودی عرب کا بہت بڑا تجارتی گروپ ہے۔ان لوگوں نے خیر کے بے شمار کام کیے ہیں۔

میں نے چند لمحے سوچا،فوراً جواب ملا: عبدالمالک! خیر و برکت تمھارے گھر چل کر آئی ہے۔تمھاری جگہ پر مسجد بنے گی۔ اللہ اکبر!اس سے بڑا اجر وثواب کیا ہوگا؟!میں نے فوراً موافقت ظاہر کردی۔ ہمارا پرانا مالک مکان اپنی جگہ سے اٹھا۔اس کا نام احمد العمری تھا۔ اس نے مجھے گلے لگالیا۔ میں نے اپنے فیصلے سے انیسہ اور شیخ محمد المعتاز کو مطلع کیا۔سب کا یہی کہنا تھا کہ اللہ ہمیں بڑا وِلاّ دینا چاہتا ہے۔تو جناب اب ہم ایک مرتبہ پھر عقاریوں کے دفاتر کے چکر لگانے لگے۔علاقے کے جتنے عقاری تھے میں ان کے پاس گیا،ان کو اپنی خواہش سے مطلع کیا اور مناسب وِلاّ کی تلاش شروع ہوگئی۔ میں عصر کی نماز کے فوراً بعد اپنے گوہر مقصود کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔اس وقت میں مزاحاً کہا کرتا تھا: میں نے سعودی عرب میں رئیل اسٹیٹ کا بزنس سیکھ لیا ہے۔ مجھے قیمتوں کا علم ہوگیا ہے۔بات کیسے کرتے ہیں، ریٹ کیسے معلوم کرتے ہیں،سودا کیسے کرتے ہیں، یہ سب کچھ میں چند مہینوں میں سیکھ گیا۔اس دوران ایک معروف خیراتی ادارے کی جانب سے مجھے اشارہ مل گیا تھا کہ میں ایک وِلاّ جس کی قیمت پندرہ سولہ لاکھ ریال کے قریب قریب ہو تلاش کر لوں۔جو رقم ہمارے پاس ہے وہ ہم ادا کریں گے، باقی ان کی طرف سے تعاون ہوجائے گا۔خاصی تلاش کے بعد ہمیں ایک جگہ مل گئی جو ایک قطری کی ملکیت تھی۔ بڑی سڑک سے

بالکل قریب تھی مگر اندر گلی میں تھی۔ یہ جگہ کوئی چار کنال کے لگ بھگ تھی۔ گلی کوئی بڑی نہ تھی۔ بڑے دروازے سے داخل ہوں تو اندر بڑا سا صحن، اس کے دائیں طرف پرانی عمارت جس کے نیچے اور اوپر خاصے کمرے تھے۔ صحن میں وہ اپنی گاڑیوں کا تیل بدلتے تھے۔ فرش پر باریک کنکر، دائیں طرف صحن ہی میں لکڑی کا بنا ہوا قدرے اچھا کمرہ تھا۔ قطری کالے رنگ کا بدو تھا۔ اس نے باز پال رکھے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ شاہ خالد رحمہ اللہ کے حاشیہ برداروں میں سے تھا۔ ایک باز ہر وقت اس کے سامنے لکڑی کے سٹینڈ پر جھولتا رہتا تھا۔ باقی چند ایک گھونسلوں میں تھے۔ سامنے حقہ، اس کی لمبی نالی اور ایک گندھا سا قالین تھا جس پر وہ بیٹھا تھا، حقے اور سگریٹ کی بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے ریٹ کی بات کی تو اس نے اپنے سفید دانت نکالتے ہوئے کہا: میری طرف سے ریٹ سولہ لاکھ ریال ہے۔ اگر زیادہ دینا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہم مسکرائے، اندازہ ہوگیا کہ ریٹ فکس ہے، اس میں کمی کی گنجائش نہیں۔ اس طریقے سے ہم نے چند ماہ بعد ہی وِلّا خرید لیا۔ پرانے وِلّا کو خالی کیا تو انھوں نے اسے گرا دیا۔ جلد ہی وہاں مسجد کی تعمیر شروع ہوگئی۔ الحمدللہ! اب اس جگہ بہت خوبصورت مسجد بن چکی ہے۔ مسجد بننے کے بعد میں پہلی مرتبہ وہاں نماز پڑھنے کے لیے گیا تو بڑا مزا آیا۔ اللہ اس مسجد کی تعمیر میں کسی بھی طرح حصہ لینے والوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ میں اسے اپنی مسجد سمجھتا ہوں۔ کبھی کبھار اس طرف سے گزرنے کا اتفاق ہو تو کوشش کرتا ہوں کہ اس مسجد میں نماز ضرور ادا کروں۔

میری اولاد

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے چھ بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا ہے۔ سب سے بڑی بیٹی امامہ ہے جو 1982ء میں پاکستان میں پیدا ہوئی۔ اس کی عمر کوئی ایک ڈیڑھ ماہ ہوگی جب یہ سعودی عرب آ گئی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے قرآن کریم حفظ کیا ہے۔ بڑی بیٹی ہونے کے ناتے یہ ابو کی خاصی لاڈلی ہے۔ اس نے اپنی ساری تعلیم ریاض ہی میں حاصل کی۔ جب اس نے حفظ کیا تو میں نے اس سے کہا: بیٹی! اگر تم دنیا بھر کی ڈگریاں بھی لے آؤ تو ان کے مقابلے میں یہ حفظ کی ڈگری میری نظر میں سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ اس کی شادی 2003ء میں اس کے خالہ زاد عزیزم قمر الحمید فیصل کے ساتھ ہوئی۔ فیصل مشہور عالم دین مولانا محمد ادریس فاروقی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے پردادا مولانا عبدالمجید سوہدروی تھے۔ فیصل میں خاندانی شرافت اور وقار پایا جاتا ہے۔ اپنے خاندان کی روایات کا امین ہے۔ شادی کو دس سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ آج تک الحمدللہ! مجھے اس سے کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد مجھے ہی والد سمجھتا ہے۔ دارالسلام میں ملازمت کے ساتھ ساتھ اب وہ جمعیت اہل حدیث ریاض کا ناظم بھی ہے۔ امامہ بیٹی الحمدللہ! تین بیٹوں قیم، ارقم، ادریس اور ایک بیٹی ضحیٰ کی ماں ہے۔ ریاض

ہی میں مقیم ہے۔ اپنی والدہ انیسہ کے قائم کردہ سکول ضحیٰ انٹرنیشنل کو چلا رہی ہے۔

میرے سارے بچوں کے استاذ ان کے ماموں حافظ عبدالمتین صاحب ہیں جن سے انھوں نے قرآن کریم سیکھا اور پڑھا ہے۔ امامہ کے بعد میرا سب سے بڑا بیٹا عکاشہ ہے۔ میں اس کے نام پر ابو عکاشہ کنیت کرتا ہوں۔ عکاشہ جب پیدا ہوا تو ہمیں غیر معمولی خوشی ہوئی۔ اس وقت ریاض میں ہمارے ہمسائے میں معروف خطاط یوسف السدیدی رہتے تھے۔ میں ان کا شاگرد خاص تھا۔ عموماً کھانا میرے گھر سے جاتا تھا، میں کتابت سیکھتا تھا، خوش نویسوں کی اصطلاح میں ان سے ''مشق'' لیتا تھا۔ انھوں نے پاکستان میں مشہور خطاط صوفی خورشید عالم کو لکھا کہ میرے دوست عبدالمالک مجاہد کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش لکھنی ہے۔ تو انھوں نے اشعار میں اس کی تاریخ پیدائش لکھ بھیجی:

مبارک ہو تجھے اے عبدالمالک ہری کی ہے خدا نے تیری کھیتی
ہوا ہے آج فضلِ ایزدی سے عکاشہ نیک طینت زیب گیتی

(1404ہجری)

آخری الفاظ ''عکاشہ نیک طینت زیب گیتی'' کے حروف کو اگر حروف ابجد کے حساب سے جمع کیا جائے تو 1404 بنتا ہے۔ اور یہی سال عکاشہ کی ولادت کا سال ہے۔

اس زمانے میں مدینہ شریف میں مقیم محدث کبیر شیخ عبدالقادر سندھی رحمہ اللہ کی بڑی شہرت تھی۔ یہ بہت بڑے عالم دین تھے۔ انھیں سعودی نیشنلٹی ملی ہوئی تھی۔ شیخ ابن باز کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔

میری اہلیہ کی طرح ان کی دوسری اہلیہ بھی مدرسہ خادم القرآن جھوک دادو سے فارغ التحصیل تھیں، اس لیے وہ انیسہ کی دوست تھیں۔ شیخ عبدالقادر سندھی سے فون پر میرا رابطہ

رہتا تھا۔عکاشہ کی پیدائش کے چند ہی دن بعد شیخ مدینہ شریف سے ریاض تشریف لائے تو میں بڑے اصرار سے انھیں اپنے گھر لے آیا۔انھوں نے عکاشہ کو اپنی گود میں لے کر اسے گھٹی دی۔ ایک کھجور اپنے منہ میں چبائی اور عکاشہ کے منہ میں ڈال دی۔اس نے کھجور چاٹنا شروع کر دی۔فرمانے لگے: مبارک ہو، گھٹی ہو گئی۔ ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر سابق امام کعبہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن آل الشیخ کا گھر تھا۔میرا ان سے تعارف جناب عطاء اللہ ثاقب رحمہ اللہ کی معرفت ہوا تھا۔ مجھے تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ کبھی کبھار میں ان کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ یہ عصر کی نماز کے بعد اپنی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے۔عموماً اکیلے ہوتے تھے۔ میں ان سے ملنے جاتا تو بہت خوش ہوتے۔ان کا نوکر ہمیں چائے پیش کرتا رہتا۔ میرے لیے دودھ والی چائے بھی بنواتے۔ہم مغرب کی اذان سے ذرا پہلے تک باتیں کرتے رہتے۔ یہ شاہ فیصل رحمہ اللہ کے زمانے میں وزیر بھی رہے تھے۔ یہ بہت بڑے عالم تھے۔نہایت مدبر شخصیت تھے۔ میں نے ان کی زبانی ان کے جد امجد مجدد الدعوۃ امام محمد بن عبدالوہاب کی کہانی سنی ہے۔آل الشیخ اور آل سعود کے تعلقات، ان کے درمیان تاریخی معاہدہ، عموماً یہ میری دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ شیخ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ایک دن گھر کے اندر لے گئے اور شاہ فیصل کے نام لکھے ہوئے خطوط دکھائے۔ اس وقت ان کے بڑے بیٹے وزیر زراعت تھے۔ یہ مدتوں عرفات کے میدان میں خطبہ حج بھی دیتے رہے۔ جب عکاشہ پیدا ہوا تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ عکاشہ کو گھٹی دیں۔ وہ خاصے ضعیف تھے۔مسجد ان کے گھر کے سامنے تھی۔ مجھے کہنے لگے: اگر تم گھٹی دلانا چاہتے ہو تو کسی نماز میں بچے کو لے کر آجاؤ، میں نماز کے بعد گھٹی دے دوں گا۔ وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے

کہ میں نے انیسہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ اس کی گود میں عکاشہ تھا۔ میں نے مسجد کے دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی۔ نماز کے بعد میں نے عکاشہ کو گود میں اٹھایا ہوا تھا۔ شیخ عبدالعزیز دروازے سے نکلے تو میں نے عکاشہ کو ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ انھوں نے گھٹی دی اور بے شمار دعائیں دیں۔ اس طرح عکاشہ کو شیخ علامہ عبدالقادر سندھی رحمہ اللہ اور شیخ عبدالعزیز آل الشیخ سابق امام کعبہ کے ہاتھوں گھٹی ملی۔

شیخ عبدالعزیز آل الشیخ کا داماد پائلٹ تھا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ اچانک ان کے اس پائلٹ عزیز کا حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔ شیخ کی اہلیہ پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔ اب جواں سال بیٹی بیوہ ہو گئی۔ میں بھی تعزیت کے لیے گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کے صدمے کو برداشت نہ کر سکے۔ میں ایک دن عمرے کے لیے مکہ گیا ہوا تھا۔ نماز ادا کی تو بیت اللہ میں اعلان ہوا: اب ہم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن حسن آل الشیخ کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کریں گے۔ میرے دل کو دھچکا لگا۔ غائبانہ نماز جنازہ کے بعد میں نے ان کے لیے خوب دعائیں کیں۔ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزرتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ گھر بڑی قیمتی جگہ پر تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ اسے گرایا جا رہا ہے۔ اس پر غالباً کئی منزلہ بلڈنگ بنے گی۔ رہے نام اللہ کا۔

حافظ عبدالمتین صاحب چونکہ بچوں کے ماموں ہیں اس لیے پردے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہی ان کو صبح سویرے اٹھاتے، نماز اور قرآن پڑھاتے اور سکول چھوڑ آتے۔ عکاشہ بیٹے نے ریاض کے انٹرنیشنل ہائی سکول سے ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کی۔ پھر کچھ عرصہ شارجہ میں پڑھتا رہا۔ بعد ازاں لاہور کی یونیورسٹی آف سینٹرل پنجاب میں تعلیم حاصل کی۔ آخر میں ایک سال کے لیے آئر لینڈ چلا گیا۔ وہاں سے اس نے BBA کیا۔ تعلیم سے

فارغ ہو کر دارالسلام جوائن کر لیا۔ تین چار سال ریاض میں گزارے۔ میں نے اسے اور عبدالغفار (میرا دوسرا بیٹا) کو اپنے ہی کمرے میں بٹھالیا۔ وہیں ان کے ٹیبل لگوا لیے۔ میرا ان سے کہنا تھا: اگر آپ سال بھر میرے ٹیلی فون سنتے رہے تو آپ کو کاروبار کی بہت سی باریکیوں کا علم ہو جائے گا۔ عکاشہ اب پاکستان میں ہے اور دارالسلام کی سیل مانیٹر کر رہا ہے۔ الحمدللہ! اس نے بہت جلد تجربہ حاصل کر لیا ہے۔ پاکستان میں جو دارالسلام پرنٹنگ کمپلیکس بنایا گیا ہے، میرے بعد اس کو ذمہ دار بنایا گیا ہے۔

اس کی شادی ہم نے ریاض میں مقیم ایک نہایت شریف اور پڑھی لکھی فیملی میں کی ہے۔ اس کے سسر جناب جاوید صاحب کا تعلق سیالکوٹ اور پھر اسلام آباد سے ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے انجینئر ہیں۔ کافی عرصہ سے ریاض میں مقیم ہیں۔ ان کے صاحبزادے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انجینئر ہیں۔ میری بہو سارہ نے بھی انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رکھا ہے۔ کچھ عرصہ ہمارے سکول میں انگلش سیکشن کی انچارج بھی رہی ہے۔ نہایت سمجھدار، عقل مند اور ذہین ہے۔ غیر فیملی سے ہونے کے باوجود بہت جلد ہماری فیملی میں گھل مل گئی ہے۔ اس بڑی بہو سے میری ایک پوتی مسفرہ اور پوتا یونس ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اولاد فرماں بردار ہے۔ بہو بھی عزت کرتی ہے۔ ابو جی ابو جی کہتی پھرتی ہے۔ میں نے اور انیسہ نے کبھی گھر کے امور میں غیر ضروری ٹانگ نہیں اڑائی۔

عکاشہ کے بعد میرا دوسرا بیٹا عبدالغفار مجاہد ہے۔ اس نے بھی ریاض میں تعلیم حاصل کی، پھر پاکستان میں اپنے بھائی عکاشہ کے ساتھ یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب سے بی بی اے کی ڈگری حاصل کی اور دارالسلام جوائن کر لیا۔ میرا یہ بیٹا نہایت خوبصورت، مؤدب اور والدین کا بے حد فرمانبردار ہے۔ ہر ایک کا خیر خواہ ہے۔ ابو کا اسے بے پناہ اعتماد

حاصل ہے۔ سبحان اللہ! میں نے اپنی اولاد سے کبھی کوئی چیز نہیں چھپائی۔ میرے ATM کارڈ کا کوڈ میرے سارے بچوں کو معلوم ہے۔ عبدالغفار ہی میرا اکاؤنٹ چلاتا ہے۔ میں بینک بیلنس کا قائل ہوں نہ ہی میرے اکاؤنٹ میں بھاری بھرکم رقوم جمع ہوتی ہیں۔ بس نہایت ضروری ضروری رقم ہوتی ہے جس سے گھر کے اخراجات اور مہمان داری آسانی سے چلتی رہے۔ میں کئی مرتبہ اس سے پوچھتا ہوں: عبدالغفار! ذرا بتانا میرے اکاؤنٹ میں کوئی چیز ہے؟ اللہ کا شکر ہے کہ سارے بچوں کی تربیت ہم نے اس طرح کی ہے کہ گھر میں چوری چکاری کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی کوئی میری یا اپنی ماں کی اجازت کے بغیر کوئی پیسہ لیتا ہے۔ بچوں نے اگر کوئی پیسہ لینا ہوتا ہے تو اجازت لے کر، مجھے یا ماں کو بتا کر لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر میں ان سے کہوں کہ یار میری جیب سے لے لو تو وہ بٹوا نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کہ ابو اپنے ہاتھ سے دیں، ہمیں اسی طرح مزہ آتا ہے۔ عبدالغفار کی شادی میں نے اپنے گہرے دوست حافظ عابد الٰہی صاحب کی صاحبزادی ''اُلاء'' سے کی ہے۔

حافظ عابد الٰہی صاحب علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں اس گھرانے سے بڑا متاثر ہوں۔ ہماری دوستی بڑی مثالی چلی آرہی تھی۔ میں نے اہلیہ کے مشورے سے ایک دن ان کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں سیر کے لیے چلے گئے۔ راستے میں میں نے کہا: عابد! میں تم سے ایک بات کرنے لگا ہوں۔ اگر پسند آئے تو ٹھیک ورنہ اپنے اعصاب پر قابو رکھنا اور غصے میں نہ آنا۔ دراصل ہماری دوستی بڑی گہری ہے۔ ہم کھل کر ایک دوسرے کو اپنی پسند ناپسند سے آگاہ کر لیتے ہیں۔ کہنے لگا: بتایئے بات کیا ہے؟ میں نے کہا: عابد! کیوں نہ ہم اپنی دوستی کو رشتہ داری میں تبدیل کر لیں؟ میں نے

ان سے عبدالغفار کے لیے رشتہ مانگا۔ انھوں نے سوچنے، مشورہ کرنے اور استخارہ کے لیے وقت طلب کیا۔ مشورے کے بعد بات ان کو پسند آئی، مگر کہنے لگے: ہماری روایات کے مطابق آپ کو رشتہ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب سے طلب کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے رشتہ طلب کیا تو انھوں نے الحمدللہ! ہاں کر دی۔ دونوں خاندانوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ایک دوسرے کو مبارک بادیں دی گئیں۔ نکاح حرم شریف میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے ہی پڑھایا۔ ریاض ہی میں رخصتی ہوئی۔ میری اس بہو سے تین بیٹیاں، لبابہ، قانتہ اور ایمان ہیں۔ تینوں ہی اپنے دادا ابو کے ساتھ بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ ذرا سی بات ہو تو بہو دبانے بیٹھ جاتی ہے۔ عبدالغفار تو خدمت کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ میری پوتیاں تو دادا ابو کے سینے پر چڑھتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، نظمیں سناتی ہیں، دفتر سے گھر آتا ہوں تو ان کی ماں ان کو بنا سنوار کر اچھے اچھے کپڑے پہنا کر سیڑھیوں کے قریب کھڑا رکھتی ہے۔ ادھر میری آواز آئی، ادھر نعرہ لگا: دادا ابو آگئے، دادا ابو آگئے۔ میری ٹانگوں سے چمٹ جاتی ہیں۔ جرابیں اتارنے کے لیے آپس میں لڑتی ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی باری باری، ایک ایک کر کے اتارو۔ جس کی باری نہیں آتی وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ میں دوبارہ جرابیں پہن لیتا ہوں کہ لو بھئی! اب تم اتارلو۔ اس خدمت کا بدلہ انھیں ٹافی کی صورت میں ملتا ہے جو ہم نے الماری میں رکھی ہوتی ہیں۔ میری اس بہو "الاء" نے اسلامیات میں ایم اے کیا ہوا ہے۔

میرا تیسرا بیٹا حافظ طلحہ مجاہد ہے۔ طلحہ نے ریاض کے سب سے اچھے سکول "منارات الریاض" سے تعلیم حاصل کی۔ یہ سکول شاہ فیصل کے بیٹوں نے بنایا تھا۔ اس کا معیار بہت اچھا ہے۔ کبھی اس میں امراء کے بچے پڑھتے تھے۔ طلحہ نے اپنے ماموں حافظ عبدالمتین

صاحب سے قرآن حفظ کیا۔ ایف ایس سی کے بعد اس نے انگلینڈ کی چھ یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواست دی۔ الحمدللہ! اس کا تعلیمی کیریئر بڑا اچھا تھا۔ سب یونیورسٹیوں نے داخلہ قبول کر لیا، مگر میرے مشورے سے اس نے برمنگھم کو ترجیح دی۔ وہاں جمعیت اہل حدیث کا نیٹ ورک ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہ برمنگھم کی آسٹن یونیورسٹی میں چار سال تک پڑھا اور کمپیوٹر سائنس میں بیچلر کیا۔ اس کا شوق اور رٹ تھی کہ اسے U.C.L (یونیورسٹی کالج لندن) سے ماسٹر ڈگری حاصل کرنی ہے۔ یہ یونیورسٹی دنیا میں پانچویں یا چھٹے نمبر پر ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ اس سے فارغ التحصیل ہیں، الحمدللہ! اس نے وہاں سے M.S.C کی ڈگری امتیاز سے حاصل کی۔

اس کی والدہ کا ایک ہی قول ہے: میں نے اپنے بچوں کو یورپی ممالک میں کبھی بھی مستقل نہیں رہنے دینا۔ تعلیم کے فوراً بعد وہ واپس آیا۔ خود اس کا وہاں قطعاً دل نہیں لگا۔ دوران تعلیم وہ سال بھر میں ریاض کے تین سے چار چکر لگا لیتا۔ اس نے لاہور میں ڈی ٹیک D-Tech کے نام سے کمپیوٹر کی کمپنی بنائی ہے، جس میں آٹھ کے قریب کمپیوٹر انجینئر ہیں، باقی عملہ ان کے علاوہ ہے۔ یہ دارالسلام کا ذیلی ادارہ ہے۔ اس کا کام دارالسلام کی کتب کو E.Books میں تبدیل کرنا ہے۔

انیسہ کہا کرتی تھی: میں طلحہ کی شادی لکھوی خاندان میں کروں گی۔ اگر انھوں نے رشتہ نہ دیا تو پھر غزنوی خاندان میں۔ اگر انھوں نے بھی انکار کیا تو پھر روپڑی خاندان سے رشتہ لوں گی، اگر وہاں سے بھی نہ ملا تو پھر اپنا سپرا خاندان تو ہے ہی۔

الحمدللہ! اس کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ لکھوی خاندان کی نہایت مشہور شخصیت مولانا معین الدین لکھوی کی پوتی اور ڈاکٹر زعیم الدین کی صاحبزادی مریم سے اس کا نکاح دسمبر

2013ء میں ہو چکا ہے۔ ہم ان کے لیے اور وہ ہمارے لیے بالکل نئے تھے۔ ہم نے ان کو وزٹ ویزے پر ریاض بلوا لیا تھا۔ ادھر طلحہ کو بھی میں نے انگلینڈ سے بلوا لیا۔ دونوں خاندان چند دن اکٹھے رہے۔ الحمد للہ! رشتہ طے ہو گیا۔ ہم نے کہا: منگنی کر دیں، جواب ملا: منگنی کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں، بس نکاح کریں گے۔ مریم ان دنوں میڈیکل کی آخری سال کی طالبہ ہے۔

اوپر تلے تین بیٹوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹی سے نوازا جس کا نام مشہور صحابیہ عفراء بنت عبید کے نام پر رکھا گیا۔ عفراء ہمارے گھر میں بڑی خیر اور برکتیں لے کر آئی۔ اللہ نے اس کے بعد مجھے چار بیٹوں سے نوازا۔ ایک بیٹا عبید اللہ چند دن زندہ رہنے کے بعد اپنے اللہ کے پاس چلا گیا۔ تین بھائیوں سے چھوٹی اور تین بھائیوں سے بڑی عفراء نے ہم سب سے بہت زیادہ پیار لیا۔ پورے گھرانے میں بڑی مقبول اور لاڈلی ہے۔ بڑے بھائی اس سے بے حد پیار کرتے ہیں، جبکہ تینوں چھوٹے اس کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ان پر خوب رعب جھاڑتی ہے۔ اس نے اپنے باپ کے سینے پر چڑھ کر کتنی ہی باتیں منوائی ہیں۔ میں بیرون ملک جاتا تو اس کے لیے لازماً فراک لے کر آتا۔ خصوصاً دمشق سے تو درجنوں بار اس کے لیے کپڑے خرید کر لایا۔ ماشاء اللہ حافظہ قرآن ہے۔ نہایت ٹیلنٹڈ ہے۔ سعودی عرب کے بہترین سکول منارات الریاض سے A اور O لیول کیا اور اس وقت بی بی آئی ٹی کے آخری مرحلے میں ہے۔

گھر میں اپنی پیاری پیاری باتوں سے ہر وقت رونق لگائے رکھتی ہے۔ ابو سے ہر وقت نت نئی فرمائشیں کرنا اور ان کو پورا کروانا اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے۔ قرآن اتنا خوبصورت پڑھتی ہے کہ میں کہتا ہوں: تمھاری ساری ''بدتمیزیاں'' قرآن سننے کے

بعد معاف ہو جاتی ہیں۔اس کی ماں مجھے کہتی ہے: آپ نے اس کی عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ نہایت خوبصورت آواز ہے، حمد یا نعت پڑھتی ہے تو سماں باندھ دیتی ہے۔ایک دن کہنے لگی: ہم لڑکیوں کو اذان دینے کی اجازت نہیں، مگر آپ تو گھر والے ہیں آپ کے سامنے تو جائز ہے، آپ تو محرم ہیں۔ پھر اس نے اتنی خوبصورت اذان دی کہ ہم سب خوش ہو گئے۔ اس کی ماں کا کہنا ہے کہ عفراء کی باتیں اپنے ابو سے شروع ہوتی ہیں اور ابو پر ختم ہو جاتی ہیں۔ دروس میں اپنی ماں کے ساتھ جاتی ہے تو وہاں چند منٹوں میں کئی ایک سہیلیاں بنا لیتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اس کا نکاح ایک معزز فیملی کے لڑکے ظہور الٰہی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ظہور الٰہی نے C.S.S اور ایل ایل ایم کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ اپنے گاؤں کے نمبر دار بھی ہیں۔ زمیندار ہیں اور جٹ برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود شریف لوگ ہیں۔ ظہور الٰہی آج کل گورنمنٹ کے محکمہ منسٹری آف کامرس میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ چند مہینوں تک ان شاء اللہ رخصتی ہونے والی ہے۔عفراء بیٹی نے اپنے نام سے کیلیانوالہ میں مسجد بنوائی ہے۔ الحمدللہ میرے سارے بچے غریبوں کے خیر خواہ، اور ان سے محبت کرنے والے ہیں۔

انیسہ الحمدللہ! داعیہ ہے۔ ہفتہ میں اس کے پانچ دروس ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر میں عموماً دین کو غالب کرنے کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔انیسہ مختلف مقامات پر جا کر درس دیتی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے گھر کا ہر فرد موحد ہے۔ یہاں شرک ہے نہ بدعات کا کوئی تصور۔تمام خواتین حجاب کا اہتمام کرتی ہیں، مگر اتنا بھی نہیں کہ اگر کوئی عزیز آ جائے تو اسے سلام بھی نہ کریں۔ میں تمام امور میں ''وسطیت'' کا قائل ہوں۔کسی بھی معاملے میں ہمارے ہاں افراط وتفریط نہیں ہے۔ ہمارے گھر میں سختی صرف نماز کے سلسلہ میں ہوتی

ہے۔

میرے تین چھوٹے بچے عبداللہ، عبدالرحمٰن اور محمد ہیں جو بتدریج یونیورسٹی اور سکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ گھر میں خیر و برکت ہے۔ مہمان کثرت سے آتے ہیں۔ میں لوگوں کو کھلا کر خوش ہوتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے ہاتھ کھلا ہے، میں کنجوس نہیں۔ انیسہ بھی دونوں ہاتھوں سے مال لٹاتی ہے، دین کے لیے خرچ کرتی ہے۔ اس کی بدولت گھر میں خیر و برکت ہے۔ لڑائی جھگڑے کا کوئی تصور نہیں۔ اللہ ہمیں حاسدوں اور شریروں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

بعض پیاری شخصیات

کاشف باجوہ

کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے دارالسلام اور عبدالمالک مجاہد سے بے لوث محبت اور پیار کیا ہے۔ انھی لوگوں میں میرے دوست برادرم انجینئر کاشف باجوہ صاحب ہیں۔ شروع شروع میں ہمارے پروگراموں میں شریک ہوتے تھے۔ پھر قربت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ہم گہرے دوست بن گئے اور الحمدللہ! آج بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بے شمار انعامات کیے۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ دولت آئی تو انھوں نے پہلے جو کام کیے ان میں مکہ مکرمہ میں دو کمروں کا فلیٹ 25 سال کے لیے مالکانہ حقوق پر حاصل کیا۔ اس سے انھیں عمرہ یا حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں بیت اللہ سے قریب ترین رہائش میسر ہو گئی۔ مجھے بھی دو تین مرتبہ اس فلیٹ میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ باب الملک عبدالعزیز کے بالکل سامنے روٹانا ہوٹل میں یہ فلیٹ محض پانچ منٹ کی مسافت پر ہے۔ ان کے والدین ان کے پاس ہی رہتے ہیں۔ جب بھی میں پوچھتا ہوں کہ ابو امی کہاں ہیں تو وہ بتاتے ہیں کہ مکہ میں ہیں۔ رہائش کا انھیں کوئی مسئلہ نہیں۔

ایک زمانے میں وہ بابا سلام کے منصوبے میں ہمارے ساتھ شریک کار بھی رہے۔ بڑے اچھے شریک کار تھے۔ لاہور میں دارالسلام نے قرآن پرنٹنگ پریس لگانے کا فیصلہ کیا تو ہم نے موٹروے کے پاس جو زمین خریدی اس کے ساتھ کاشف صاحب نے بھی پانچ ایکڑ زمین خریدی۔ ان کے عزائم بڑے بلند ہیں۔ ان کے والدین نے قرآن پرنٹنگ پریس میں اپنا اپنا حصہ پیش کیا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ انھوں نے متعدد بار مجھ سے کہا ہے کہ مجاہد صاحب میں پاکستان میں قرآن پرنٹنگ پریس کو اعلیٰ کوالٹی کا پریس دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک دن آئے گا جب ہم سب سے خوبصورت قرآن کریم شائع کریں گے۔ ان شاءاللہ

چوہدری بشیر احمد

اونچے لمبے قد کے چوہدری بشیر احمد ریاض کی نمایاں شخصیات میں شامل ہیں۔ان کا ریاض میں چاولوں اور مصالحوں کا کاروبار ہے۔مختلف پروگراموں میں ملاقات ہوتی رہتی تھی،مگر وہ محض ہاتھ ملانے تک ہوتی تھی۔ایک دن ہم ایک تقریب میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے کہ کہنے لگے: آپ کی والدہ محترمہ نے ایک مرتبہ میرے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا تھا۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم نے حی الوزارات میں قرآن کریم کا مدرسہ قائم کیا تھا تو ان کی اہلیہ بھی قرآن پڑھنے کے لیے آتی تھیں۔میری والدہ محترمہ ان دنوں وہاں عورتوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں۔وہیں کسی دن انھوں نے والدہ صاحبہ کو سلام کیا۔یہ ان کے بیٹے جیسے تھے۔انھوں نے دعا کے لیے کہا تو جیسا کہ ہمارے ہاں بزرگ دعا کے ساتھ ساتھ سر پر ہاتھ بھی پھیرتے ہیں،جب انھوں نے مجھے وہ ایام یاد کروائے تو شدت جذبات سے میری آنکھیں بھر آئیں۔کہنے لگے: میری اہلیہ کو انھوں نے بیٹی بنایا ہوا تھا۔میرے دل میں ان کے لیے محبت اور قربت میں اضافہ ہوگیا۔میں نے ان سے کہا: اب میں کسی دن آپ کے گھر آؤں گا۔چوہدری بشیر صاحب نے ریاض کے پوش علاقے میں بڑا خوبصورت وِلاّ بنایا ہوا ہے۔مجھے متعدد بار ان کے ہاں دعوتوں میں شریک ہونے کا

موقع ملا ہے۔ ہر مرتبہ انھوں نے مجھے بڑی عزت اور احترام دیا جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ میں اگر کبھی پروگرام میں تاخیر سے پہنچا تو بھی انھوں نے خصوصی جگہ مہیا کی۔ میں بیمار ہوا تو ہسپتال ملنے کے لیے آئے۔ جتنا بڑا ان کا قد ہے، اتنا ہی بڑا پھولوں کا گلدستہ لے کر آئے۔ ان سے میری قربت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب 2013 میں ہم دونوں نے مسجد الراجحی ریاض میں ایک ساتھ دس روزہ اعتکاف کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بظاہر دنیادار لگنے والے چوہدری محمد بشیر کا اللہ تعالیٰ سے گہرا تعلق ہے۔ اللہ اسے مزید مضبوط بنائے۔ پاکستان میں 'مریدکے' میں ان کی رائس مل بھی ہے۔ مجھے وہاں جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید برکتیں عطا فرمائے۔ یہ بھی بہت سے رفاہی کام کرتے رہتے ہیں۔

ریاض میں احباب کی کمی نہیں، لوگ دل و جان سے محبت کرتے ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے چوہدری فریاد صاحب پاکستان کمیونٹی کی اہم شخصیت بن چکے ہیں۔ وہ ریاض میں مشہور ریسٹورنٹ ''النافورہ'' کے مؤسسین میں سے ہیں۔ مدت دراز سے سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اللہ کے فضل و کرم کے بعد اپنی محنت اور جدوجہد سے بہت بڑا نام اور مقام پیدا کیا ہے۔ یہ بھی میری بے حد عزت کرتے ہیں۔ ان کا منہج اور عقیدہ بھی اس ملک میں رہنے کی وجہ سے بڑا عمدہ ہو گیا ہے۔ پروگراموں میں ان کے تبصرے بڑے شاندار ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد لقمان السلفی

ریاض میں قیام کے دوران جن شخصیات سے میرا تعارف ہوا اور طویل عرصہ سے رابطہ قائم ہے، ان میں ایک شخصیت علامہ محمد لقمان سلفی ہیں۔ ان کا وطن مالوف بھارت کی ریاست بہار میں ہے۔ یہ مدینہ یونیورسٹی میں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے کلاس فیلو تھے۔ ان کے دادا جان ان مجاہدین میں شامل تھے جنھوں نے ہندوستان کی سرزمین کو چھوڑا اور پاکستان کے شمالی سرحدی صوبہ میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ ڈاکٹر محمد لقمان سلفی صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمہ اللہ کے ساتھ ایک مدت دراز تک کام کرتے رہے۔ وہ ان کے قسم الترجمہ کے ذمہ دار تھے۔ دنیا بھر سے جو خطوط آتے ان کا ترجمہ عربی میں کر کے شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کرتے، بیرونی ممالک سے وفود آتے تو ان کے ہمراہ ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتے۔ ان کی تربیت میں رہے اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے نمایاں کارناموں میں بھارت میں جامعہ ابن تیمیہ کا قیام ہے جسے اس وقت بھارت میں اہلحدیث کا سب سے بڑا ادارہ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تعلقات کو کم و بیش پچیس سال بیت چکے ہوں گے۔ ان کے ساتھ سب سے پہلا تعارف محترم قاری محمد

صدیق صاحب کی وساطت سے ہوا۔ ہم لوگ متعدد بار شیخ ابن باز کے دفتر میں جاتے تو ان کو بھی سلام کرتے، ان کے دفتر میں بیٹھتے اور چائے پیتے، مناسب قد و قامت کے شیخ لقمان سلفی اکثر مسکراتے رہتے اور ہمارے ساتھ تبادلہ خیالات کرتے۔ چونکہ یہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے معتمد خاص تھے، اس لیے ان کی وجہ سے برصغیر کی جماعت اہل حدیث کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کی عربی زبان بہت ہی اعلیٰ قسم کی ہے۔ ان کے پاس بیٹھتے تو وہ ہمیں علامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ کے حوالے سے واقعات سناتے۔ ان کے ساتھ کبھی کبھار شغل مذاق بھی چلتا رہتا۔ بلاشبہ جامعہ ابن تیمیہ بنانا اور اس کے لیے وسائل اکٹھے کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں کتنی ہی مرتبہ سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر لقمان سلفی صاحب کتنے خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں قرآن و سنت کا ایک ایسا پودا لگایا جو بڑھ کر اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ یہ ان کے لیے اللہ نے چاہا تو صدقہ جاریہ ہے۔ انھوں نے تصنیف و تالیف کا بھی کام کیا، متعدد کتابیں لکھیں، ان میں قرآن کریم کی تفسیر تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن جو 1800 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے بڑی نمایاں ہے۔ میں اور میری اہلیہ اس سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے سیرت پر بھی بڑی خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت و سلامتی والی لمبی زندگی عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین!

تراشے

کچھ اعزازات میرے لیے ایسے ہیں کہ جنھیں سنہری یادوں میں ذکر کرنا میرے لیے باعث شرف وسعادت ہے۔ راقم الحروف کا گھر مدتوں سے اہل حدیث علمائے کرام کا مرکز رہا ہے۔ 1985ء سے لے کر کافی عرصہ بعد تک ہر بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب میرے گھر پر درس قرآن ہوتا رہا۔ ایک زمانے میں فضیلۃ الشیخ عبداللہ ناصر رحمانی ﷾ ریاض میں کئی ہفتے مقیم رہے۔ وہ میرے گھر پر درس دیتے رہے۔ جو بھی عالم دین آتا ہم انھیں دعوت دیتے کہ وہ ہمارے ہاں درس ارشاد فرمائیں۔ اس زمانے میں ریاض میں بہت زیادہ اہل حدیث تو نہ تھے، مگر پھر بھی تیس چالیس احباب جمع ہو جاتے۔ ہمارے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ انیسہ فردوس ہر ہفتہ کے دن ایک بڑے برتن میں چاول پکاتی، دوسرے برتن میں عموماً آلو گوشت اور اس میں چنے ڈال کر بڑی ہانڈی پکالی جاتی۔ تنور سے روٹیاں آ جاتیں۔ ریاض اس زمانے میں بہت سستا تھا۔ احباب کو کھلی دعوت ہوتی کہ وہ کھانا کھا کر جائیں۔ الحمدللہ! یہ سلسلہ سال ہا سال تک چلتا رہا۔ کبھی سالن کم پڑا نہ چاول ناکافی ہوئے۔ اللہ نے اتنی برکت دی ہوئی تھی کہ کھانا وافر مقدار میں موجود ہوتا۔ اگر کبھی احباب زیادہ ہو جاتے، تو میں مسکراتے ہوئے کہہ دیتا: بھئی! اگر سالن کم ہو جائے

تو مہمان کا قصور ہے اور اگر روٹی کم ہو جائے تو میزبان کا قصور ہے۔ روٹی کا کوئی مسئلہ نہ تھا، نیچے تنور تھا وہاں سے گرم گرم روٹی آ جاتی، احباب جماعت محبتیں بانٹتے رہتے۔ اس گھر میں علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ بھی تشریف لائے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے خاص سیکرٹری (ان شاء اللہ شہید) عطاء الرحمٰن ثاقب بھی تشریف لائے تھے۔ بلاشبہ یہ نوجوان بلا کا ذہین تھا۔

جناب پروفیسر ساجد میر صاحب کے ہمارے گھر میں کتنے ہی پروگرام ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ انیسہ جب بھی کھانا پکاتی وافر مقدار میں پکاتی، اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتا۔ سبحان اللہ! ہمارے ان پروگراموں میں کبھی کھانا کم نہیں پڑا۔ میں مہمانوں کو کھلے عام دعوتیں دیتا جاتا اور ان سے کہتا: فکر نہ کریں، ان شاء اللہ! عبدالمالک کے ہاں کھانے کی کمی نہیں ہوگی۔

دارالسلام کے آغاز میں جب ہمارے پانچ چھ ملازمین تھے تو رمضان کے مہینے میں انیسہ ہر روز سحری کے وقت ان سب کے لیے پراٹھے پکاتی، میں خود انھیں دے کر آتا یا کوئی آ کر لے جاتا۔ میں نے اشارتاً انیسہ کو کئی مرتبہ کہا بھی کہ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمیں ان کے لیے بھی وقت درکار ہے، مگر اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ یہ لوگ میرے تیار کردہ کھانے سے روزے رکھیں گے تو مجھے اجر و ثواب ہوگا اور گھر میں مزید خیر و برکت آئے گی۔

قارئین کرام! میں نے کھلے ہاتھ کی بڑی برکات دیکھی ہیں۔ آدمی کو اجر و ثواب بھی ملتا ہے اور عزت بھی حاصل ہوتی ہے۔ میں نے یہ مہمان نوازی شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے سیکھی تھی، جنہیں عصر حاضر کا حاتم طائی کہا جاتا ہے۔ میں نے زندگی میں ان جیسا سخی اور مہمان نواز

شخص نہیں دیکھا۔ ہمارے گھر میں اکثر و بیشتر مہمان آتے رہتے، کھانا عموماً زیادہ ہی پکتا۔ ہم کوشش کرتے کہ کھانا کبھی ضائع نہ ہو جو کھانا بچ جاتا، دفتر کے ملازمین کو میں خود جا کر دے آتا۔ میری اپنی خامیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں عموماً باسی کھانا نہیں کھاتا۔ انیسہ نے مجھے ہمیشہ تازہ کھانا بنا کر دیا۔

مدت دراز سے میری خواہش تھی کہ امام کعبہ میرے گھر تشریف لائیں۔ اللہ تعالی نے یہ خواہش پوری کی اور اپریل 2014ء میں امام کعبہ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر صالح بن حمید میرے گھر عشائیہ پر تشریف لے آئے۔ اس موقع پر جناب پروفیسر ساجد میر صاحب، مولانا علی محمد ابوتراب صاحب، ڈاکٹر امیر بخش چنا صاحب، حافظ عابد الٰہی صاحب اور ریاض شہر کی چیدہ چیدہ شخصیات موجود تھیں۔ یہ دن بلاشبہ میری زندگی کا بڑا یادگار دن تھا۔ شیخ صاحب نے اپنی محبتوں سے نوازا، انھوں نے میرے داماد فیصل علوی کے بیٹے ادریس کو گھٹی بھی دی۔ انھوں نے حاضرین سے خطاب بھی فرمایا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج میں دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہوں کہ میرے گھر امام کعبہ تشریف لائے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کے حوالے سے مکمل مضمون ضیائے حدیث میں لکھا۔ یہ مضمون سعودی عرب سے شائع ہونے والے اخبار اردو نیوز میں بھی شائع ہوا۔

سعودی عرب میں مختلف ممالک کے جو بھی سفرائے کرام تشریف لاتے رہے' عموماً ہم ان کو دارالسلام کے بارے میں بریف کرتے اور ان کو کتابیں پیش کرتے۔ ہمارے ایک سفیر جناب شاہد امین صاحب نے اہالیان ریاض کی جانب سے دی گئی ایک تقریب میں میری دستار بندی کی۔ یہ تقریب محترم محمود باجوہ صاحب اور دیگر احباب کی کاوشوں سے شالیمار ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ اردو نیوز میں بہت اچھے طریقے سے اس کی خبر بھی لگی۔

میرے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ پیغام ٹی وی کے حوالے سے میرے گھر میں متعدد میٹنگیں ہوئیں۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنھوں نے مرکزی قیادت کو اس چینل کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔

الحمدللہ! قیادت نے بھی مجھے یہ صلہ دیا کہ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں میرا نام بھی شامل ہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ہمیشہ پرامید رہتے ہیں، مایوسی کبھی میرے قریب نہیں پھٹکی، اگر سیل کبھی کم ہوئی تو بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کے فضل ہی کا سوال کیا۔ اگر سیل زیادہ ہوئی تو بھی الحمدللہ! آپے سے باہر نہیں ہوا۔ میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ فخر وتکبر کو اپنے قریب نہ آنے دوں، تاہم اگر اسلام کی سربلندی کے لیے یا مسلک اہل حدیث کے حوالے سے کسی جگہ بات کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو پھر میں نے کبھی مداہنت سے کام نہیں لیا۔ مجھے اللہ تعالی نے گفتگو کرنے کا اچھا سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ بولنے لگتا ہوں تو بات چیت اچھے طریقے سے کر لیتا ہوں۔ میرے لیے عربی زبان میں گفتگو کرنا یا انگلش زبان میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا کبھی مشکل نہیں رہا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تواضع اختیار کروں، البتہ میں خوش خوراک ضرور ہوں۔ ہمارے ایک سفارت کار نے میرے بارے میں کہا تھا: میں نے اپنی زندگی میں کسی عالم دین کو اس قدر خوش گفتار، خوش لباس اور خوش خوراک نہیں دیکھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں ان تینوں چیزوں کا خیال رکھتا ہوں۔ سردی کا موسم آتا ہے تو میں چار پانچ گرم سوٹ مع جیکٹ سلوا لیتا ہوں۔ اسی طرح گرمیوں کے موسم میں تو دس پندرہ سفید سوٹ سلوا کر رکھ لیتا ہوں۔ اگر کوئی خاص میٹنگ ہو تو عموماً نیا لباس پہن کر جاتا ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ شاہ خرچی کے

زمرے میں آتا ہے مگر میری مجبوری یہ ہے کہ دفتر میں عموماً بڑے VIP لوگ آتے رہتے ہیں۔ عمدہ لباس کسی بھی انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اللہ جزائے خیر دے اہلیہ انیسہ فردوس کو کہ وہ میرے کپڑے ضائع نہیں ہونے دیتی، ہر وقت انھیں تقسیم کرتی رہتی ہے اور پاکستان بھجواتی رہتی ہے۔

میرے لیے شرف کی بات ہے کہ عزت مآب سفیر پاکستان محمد نعیم خان دارالسلام کے دورے پر 10 جون 2014ء کو تشریف لائے۔ انھوں نے خاصا وقت دارالسلام میں گزارا۔ اس موقع پر ریاض کی مختلف سیاسی وسماجی تنظیموں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ انھوں نے مہمانوں کی کتاب میں جن تأثرات کا اظہار کیا وہ کچھ اس طرح تھے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ مجھے ''دارالسلام'' کا وزٹ کرنے کا موقع ملا۔ میں مولانا عبدالمالک مجاہد اور ان کی ٹیم کی اپنے کام سے لگن دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے محترم عبدالمالک مجاہد کو اسلام کی خدمت کے لیے چن لیا ہے۔ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں، وسائل اور وقت اسلام کی اشاعت میں صرف کر رہے ہیں۔

میں ''دارالسلام'' کے تحقیقی معیار سے بھی بہت متاثر ہوا۔ خصوصاً اس کی پبلشنگ انتہائی دلفریب اور دیدہ زیب ہے۔ ''مکتبہ دارالسلام'' اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر کئی زبانوں میں لٹریچر شائع کر رہا

ہے۔اس کاوش کے نتیجے میں بے شمار لوگ اسلام کی صحیح تعلیمات سے متعارف ہوئے ہیں اور یقیناً بہت سے اسلام کی آغوش میں بھی آئے ہیں۔دارالسلام کی کتابوں کے ذریعہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی اسلام کو اس کے صحیح تناظر میں سمجھنے اور مکمل آزادی سے اسلام قبول کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

میری نیک تمنائیں محترم عبدالمالک مجاہد اور ان کی ٹیم کے ساتھ ہیں۔اللہ تعالی محترم عبدالمالک مجاہد کو مزید ہمت، وسائل، صحت اور لمبی زندگی عطا کرے تاکہ وہ انسانیت کی خدمت اسی طرح جاری رکھیں۔

محمد نعیم خان

سفیر اسلامی جمہوریہ پاکستان، ریاض، 10 جون 2014

دارالسلام کے بعد وہ میرے گھر پر تشریف لائے اور اپنے اعزاز میں دیے ہوئے عشائیہ میں شرکت کی، ان کی اہلیہ محترمہ انیلہ نعیم خان صاحبہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ریاض کی چیدہ چیدہ شخصیات بھی موجود تھیں۔

راقم الحروف کا مکمل انٹرویو 2012ء کے اردو ڈائجسٹ کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔یہ انٹرویو جناب اختر عباس نے لیا تھا جس میں دارالسلام کے قیام اور اس کے مشن کے حوالے سے خاصی معلومات تھیں۔

جناب محترم مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے قومی ڈائجسٹ میں بھی راقم کا 26 صفحات پر مشتمل انٹرویو فروری 2014ء میں شائع ہوا۔یہ انٹرویو برادرم عزیز راشد حجازی صاحب نے دارالسلام لاہور میں کیا تھا۔

پاکستان کے نامور صحافی جناب عرفان صدیقی نے نوائے وقت میں دو اور روزنامہ جنگ میں دارالسلام پر تین کالم لکھے۔ جن میں دارالسلام اور راقم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ میرے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ دراصل یہ دنیا میں گواہیاں ہیں، اللہ تعالی انھیں قیامت والے دن بھی قبول فرمائے۔

سیرت کا ایک ورق اور پھر سیرت کے اوراق نامی کالم جدہ سے شائع ہونے والے اردو میگزین میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب 2006ء میں ڈنمارک کے ایک چھوٹے سے اخبار نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کی اور ناپاک خاکے شائع کیے تو میں نے جدہ سے شائع ہونے والے اردو نیوز کے ایڈیٹر جناب طارق مشخص کو خط لکھا کہ ہر روز اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت پر کالم شائع کیا کریں تاکہ لوگوں کو آپ ﷺ کی سیرت سے آگاہی ہو۔ اردو میگزین کے ایڈیٹر جناب رؤف طاہر نے مجھے فون پر بتایا کہ ہر روز تو نہیں البتہ ہفتے میں ایک بار ہم سیرت کا ایک ورق شائع کر سکتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ یہ کالم آپ لکھیں۔

میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کی پیاری زندگی کے حوالے سے لکھوں گا۔ پھر سوچا: عبدالمالک! گھر بیٹھے تمھیں یہ سعادت مل رہی ہے، انکار نہ کرو۔ چنانچہ 2006ء میں یہ کالم لکھنا شروع کیا۔ پہلے ایک صفحہ تھا، پھر قارئین اور ایڈیٹر رؤف طاہر کے اصرار پر دو صفحات کر دیے گئے۔ اس کے لیے مجھے A4 سائز کے چار صفحات لکھنا ہوتے تھے۔ الحمدللہ میں نے 159 کالم لکھے اور پھر یہ پرچہ بوجوہ بند ہو گیا۔ مجھے صحافت میں لانے اور کالم نگار بنانے میں جناب رؤف طاہر کا بڑا ہاتھ ہے، میں ہمیشہ ان کے لیے

دعائیں کرتا ہوں۔ان کی حوصلہ افزائی سے مجھے لکھنے کا طریقہ آ گیا۔الحمدللہ! میں نے آج تک جو لکھا اس کا کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا اور نہ ہی ان شاء اللہ آئندہ کوئی ارادہ ہے۔ مجھے اس کا معاوضہ قیامت کے دن اللہ تعالی سے چاہیے، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت کا حصول ہے۔ان کے جھنڈے تلے جمع ہونے اوران کے ہاتھوں حوض کوثر کا پانی پینا مقصدِ حیات ہے۔

گزشتہ چھ سالوں سے اردو نیوز ہر جمعہ کو''روشنی'' کے نام سے آٹھ صفحات پر ضمیمہ شائع کرتا ہے۔ جب اس کا آغاز ہو رہا تھا تو میں جدہ میں تھا۔ جناب طارق مشخص نے مجھ سے مشورہ بھی کیا اور فرمانے لگے: اگر آپ تعاون کریں تو ہم آٹھ صفحات پر مشتمل ہفت روزہ ''روشنی'' نکالنا چاہتے ہیں، اس میں ایک صفحہ آپ کا ہو گا۔الحمدللہ! میں اس وقت سے ہر ہفتہ اس میں لکھتا ہوں۔ یہ ایک صفحہ بھی A4 کے کم از کم چار سے پانچ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ میں زیادہ تر تاریخ، سیرت رسول ﷺ، اپنے سفر، مشاہدات، مسلمانوں کے احوال اور شخصیات پر لکھتا ہوں۔ مجھے تاریخ سے بے حد دلچسپی ہے۔ میں تاریخ سے واقعات نکال نکال کر انہیں اپنے تبصرے کے ساتھ لکھتا ہوں۔ یہ کالم میں بالکل آسان زبان اور سہل اسلوب میں عامۃ الناس کے لیے لکھتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ اسے عام لوگوں میں ہی نہیں، بلکہ اہل علم کے طبقات میں بھی پذیرائی حاصل ہے۔ ہمارے سفارت کار بلکہ خود سفیر پاکستان بھی اسے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ یہ محض میرے اللہ کا فضل و کرم ہے۔

میرے دو سچے خواب

زندگی میں ہر شخص کو بہت سے خواب آتے ہیں ان میں سے بعض خواب انسان بھول جاتا ہے مگر بعض یاد بھی رہ جاتے ہیں۔ میں نے بھی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے ہیں، مگر ان میں سے دو خوابوں کا تذکرہ اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان خوابوں نے میری زندگی میں بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔ یہ دونوں آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ان خوابوں کو دیکھے ہوئے کم و بیش بیس پچیس سال گزر چکے ہیں۔ گویا یہ دارالسلام کی تاسیس کے بعد ابتدائی دور کے خواب ہیں۔ آیئے پہلا خواب جانتے ہیں:

اسلام کی خدمت کرنے والے لوگوں کا انتخاب ہو رہا ہے۔ یہ الفاظ لکھتے وقت بھی میں چشم تصور سے وہ قطار دیکھ رہا ہوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بھی اس قطار میں دوسرے، تیسرے یا شاید چوتھے نمبر پر کھڑا ہوں۔ ہم لوگ بالکل فوجیوں کی طرح چاق و چوبند کھڑے ہیں۔ اسلام کی خدمت کرنے والے کا انتخاب اس طرح ہو رہا ہے کہ جسے منتخب کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے سینے پر سبز رنگ کا کپڑا رکھ دیا جاتا ہے۔ سبز رنگ کے اس کپڑے کا سائز کوئی ایک میٹر چوڑا اور ڈیڑھ یا دو میٹر لمبا ہوگا۔ ایک بہت ہی عظیم شخصیت لوگوں کا انتخاب کر رہی ہے۔ انتخاب کرنے میں کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا، بس وہ بزرگ

شخصیت آ کر چند سیکنڈ کے لیے منتخب ہونے والے کے سینے پر کپڑا رکھ دیتی ہے۔ جیسے ہی وہ کپڑا رکھتے ہیں اس شخص کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ ہم سب لوگ قطار میں کھڑے بڑی بے چینی سے منتظر ہیں کہ ہمارا بھی اسلام کی خدمت کے لیے انتخاب ہو اور پھر میری باری بھی آ جاتی ہے۔ انہوں نے میرے سینے پر بھی سبز رنگ کا کپڑا رکھا ہے اور میں بھی اسلام کی خدمت کے لیے منتخب ہو گیا ہوں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں کہ انتخاب کرنے والی شخصیت کون ہے؟

مگر جب وہ ہمیں منتخب کر کے چلے جاتے ہیں تو بعد میں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ تھے۔ یقیناً میں اپنے انتخاب پر نہایت خوش تھا۔ (خواب ختم ہو جاتا ہے)

دوسرا خواب

میں اپنی اہلیہ انیسہ فردوس کے ہمراہ یورپ میں گیا ہوا ہوں۔ ہمیں نماز پڑھنی ہے، ہم ایک پرانی سی مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ وضو کے لیے مسجد میں پانی نہیں ہے۔ مسجد کے صحن کے دائیں طرف پرانی طرز کا کنواں ہے، جس پر غالباً چرخی لگی ہوئی ہے۔ جس طرح پرانے زمانے میں ربڑ کی مشک کا ڈول بناتے تھے اسی طرح کا ربڑ سے بنا ہوا ڈول اس کی منڈیر پر موجود ہے جس کے ساتھ لمبی رسی بندھی ہوئی ہے۔ کنویں کے بائیں جانب پانی جمع کرنے کے لیے ایک حوض بنا ہوا ہے۔ میں نے اس کنویں سے پانی نکالنا شروع کیا۔ میں نہایت تیزی سے ڈول کو کنویں میں ڈالتا ہوں۔ پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو بڑی تیزی سے باہر نکال کر حوض میں ڈالتا جاتا ہوں۔ حوض اس سے پہلے بالکل خشک تھا۔ میرے پانی نکالنے سے پہلے اس کنویں میں بہت ساری ٹہنیاں، پتے اور

جھاڑ جھنکار تھا، مگر جو پانی نکل رہا تھا وہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ میں تیزی سے پانی نکال رہا ہوں اور تعجب بھی کر رہا ہوں کہ میں نے پہلے کبھی پانی کنویں سے نہیں نکالا، نہ ہی میں اس کام کا عادی ہوں۔ میرا بدن بھی قدرے بھاری ہے، مگر مجھے قطعاً تھکان محسوس نہیں ہو رہی۔ میں پھر ڈول کنویں میں ڈالتا ہوں۔ چرخی کا استعمال نہیں کر رہا بلکہ ادھر کنویں میں ڈول ڈالا ادھر رسی کو دونوں ہاتھوں سے نہایت تیزی سے کھینچ کر چند سیکنڈوں میں پانی نکال کر حوض میں ڈال رہا ہوں۔ اسی دوران میں نے کنویں میں جھانک کر جو دیکھا تو تمام جھاڑ جھنکار، پتے ٹہنیاں کنویں کے کناروں پر جا لگی ہیں۔ ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور پانی میں چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ نہایت صاف ستھرا پانی نظر آ رہا ہے۔

اب ہم دونوں میاں بیوی مسجد میں داخل ہوتے ہیں۔ پرانی طرز کے تین یا شاید پانچ دروازے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ محراب کے بالکل سامنے والی دیوار جس میں دروازے ہیں اس دیوار کے ساتھ ایک شخص سو رہا ہے۔ اس نے اپنے اوپر ایک چادر اوڑھ رکھی ہے۔ وہ اپنی ٹانگوں کو اکٹھا کیے ہوئے ہے۔ (چونکہ ہم دونوں میاں بیوی ہی ہیں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ میرے ساتھ کوئی ایک آدمی ہو جو میرے ساتھ نماز پڑھے اور ہم نماز کرائیں۔)

میں آگے بڑھتا ہوں اور اسے اپنے گھٹنے سے ہلکا سا مارتے ہوئے کہتا ہوں کہ اٹھو...... اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس وقت تک دارالسلام نے قرآن کریم کے تراجم بہت تھوڑی تعداد میں یا شاید ایک دو زبانوں ہی میں شائع کیے تھے۔

ان دونوں خوابوں کو میں نے پوری تفصیل سے اس لیے لکھا ہے کہ ممکن ہے کوئی ''معبر''

اس کی تعبیر بتا سکیں۔ تاہم میں نے علمائے کرام سے اس کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ اس کی تعبیر بڑی واضح ہے۔ تم دین کی خدمت کرو گے۔

یہ اللہ کا بے پایاں کرم اور اس کا شکر ہے کہ دارالسلام کی کتب یورپ کے ممالک میں بھی ملتی ہیں۔ میں اس دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جب میں 2012ء میں روم گیا۔ وہاں کے اسلامک سنٹر میں بہت بڑی لائبریری تھی۔ مجھے وہاں دارالسلام کا شائع کردہ بنگالی ترجمے والا قرآن کریم، مختصر صحیح بخاری انگلش ترجمہ والی اور ایک اپنی کتاب بھی نظر آئی۔

فرانس میں ہم بوجوہ برانچ نہ کھول سکے۔ وہاں اس وقت کم وبیش پچاس اسلامک بک سٹورز ہیں۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ کم از کم پینتیس سے چالیس ایسے بک سٹورز ہوں گے جہاں پر دارالسلام کی کتب ملتی ہیں۔ اسی طرح یورپ کے تمام معروف ممالک میں ہمارے شائع کردہ قرآن کریم اور دیگر کتابیں ملتی ہیں۔ دنیا بھر سے مسلمان حج اور عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ آتے ہیں۔ حرمین شریفین کے اردگرد جتنے بھی مکتبات ہیں کم و بیش ان تمام مکتبات پر ہماری کتب ملتی ہیں۔ اسی طرح دنیا کے کم وبیش ہر ملک میں دارالسلام کی کوئی نہ کوئی کتاب یقیناً پہنچ چکی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک خواب تھا جسے میرے اللہ نے سچ کر دکھایا۔ میں تو نہایت کمزور ہوں مگر میرا رب بہت طاقتور ہے۔ یہ سارا کرم اور فضل میرے رب کا ہے۔ بس زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ میرا رب ہم سے راضی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ میرے رب نے میرے خوابوں کو سچ کر دکھایا ہے۔ میں ڈاکٹر محسن خان کی اس دعا کی مکمل قبولیت کا بھی منتظر ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور ہم دنیا کے ہر کونے میں دارالسلام کی برانچ کھولیں۔

دارالسلام کا وزٹ کرنے والی بعض معزز شخصیات

دارالسلام میں گزشتہ پچیس برسوں کے دوران بہت سے سرکاری عمائدین اور متعدد سیاسی، سماجی، وعلمی شخصیات تشریف لائیں۔ انہوں نے ہمارے کام کو سراہا، اور ہمیں بہت سے عمدہ مشوروں سے بھی نوازا، جس سے ہماری حوصلہ افزائی بھی ہوئی اور کام کو آگے بڑھانے میں بھی مدد ملی۔ اگر میں ان کے تأثرات کا تفصیل سے ذکر کروں تو یہ بجائے خود ایک کتاب بن جائے گی۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آج تک جتنے بھی مہمانان گرامی تشریف لائے ہیں ان کا ایک یادگار اجمالی تذکرہ اس کتاب میں شامل کر دیا جائے۔

نمبر	تشریف لانے والی شخصیت کا نام ومقام	تاریخ
1-	ڈاکٹر صہیب حسن بن شیخ الحدیث مولانا عبدالغفار حسن، ڈائریکٹر قرآن سوسائٹی، لندن	11-04-1410
2-	جسٹس محمد رفیق تارڑ، سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان	20-06-1996
3-	جسٹس خلیل الرحمٰن خان، چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ، اسلامی جمہوریہ پاکستان	20-04-1996
4-	حافظ عبدالرحمٰن مدنی، رئیس جامعہ لاہور اسلامیہ	20-04-1996

نمبر	تشریف لانے والی شخصیت کا نام ومقام	تاریخ
5-	ظفر علی راجا ایڈووکیٹ' چیف ایڈیٹر اسلامک لاء جرنل لاہور	20-04-1996
6-	پروفیسر عبدالجبار شاکر' ڈائریکٹر پنجاب پبلک لائبریریز' اسلامی جمہوریہ پاکستان	25-04-1996
7-	سفیر نائیجیریا متعین ریاض	27-02-1998
8-	فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن بن ابراہیم الفوزان' رئیس قسم إعداد المعلمین' ملک سعود یونیورسٹی' ریاض	29-01-1419
9-	جناب مصطفیٰ صادق' ایڈیٹر روزنامہ آفاق لاہور' اسلامی جمہوریہ پاکستان	02-06-1996
10-	معالی الشیخ صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ' وزیر مذہبی امور سعودی عرب	21-06-1419
11-	معالی الشیخ عبدالعزیز بن محمد بن عبدالمحسن' سابق ممبر دی مجلس شوری	28-07-1419
12-	فضیلۃ الشیخ فہد بن ابراہیم السویلم' مدیر مکتب الدعوۃ ریاستہائے متحدہ امریکہ	16-05-1420
13-	فضیلۃ الشیخ سلیمان صالح العلیان' مدیر مسجد الشیخ ابراہیم' وینزویلا	06-09-1420

نمبر	تشریف لانے والی شخصیت کا نام ومقام	تاریخ
14-	ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ‘ رئیس قسم الترجمۃ‘ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ	18-12-1420
15-	فضیلۃ الدکتور یوسف بن عثمان الحزیم‘ الامین العام لموسسۃ الامیرۃ العنود الخیریۃ‘ ریاض	04-01-1421
16-	فضیلۃ الشیخ صالح بن محمد المنجد‘ امام وخطیب مسجد عمر بن عبدالعزیز‘ الخبر‘ سعودی عرب	15-03-1421
17-	الدکتور احمد بن سیف الدین‘ الاستاذ المشارک‘ بجامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ‘ ریاض	29-06-2000
18-	ڈاکٹر محمود احمد غازی‘ سابق وزیر مذہبی امور‘ ریکٹر انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی‘ اسلام آباد	31-10-2002
19-	سینٹر راجا ظفر الحق‘ سابق وزیر مذہبی امور‘ اسلامی جمہوریہ پاکستان	31-10-2002
20-	محمد بن عبداللہ الشامی‘ سفیر دولۃ الامارات العربیۃ المتحدۃ‘ بالریاض	10-07-1421
21-	سمو الامیر نائف بن ممدوح بن عبدالعزیز آل سعود	07-09-1421
22-	الشیخ عبدالملک بن ابراہیم‘ مستشار الدیوان الملکی بالریاض	18-11-1421

نمبر تشریف لانے والی شخصیت کا نام ومقام	تاریخ
23- حافظ حسین احمد' ڈپٹی پارلیمانی لیڈر' متحدہ مجلس عمل' اسلامی جمہوریہ پاکستان	28-02-2004
24- نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ' سابق سٹی ناظم کراچی'' اسلامی جمہوریہ پاکستان	-04-08-2007
25- ڈاکٹر ذاکر نائیک' ڈائریکٹر پیس ٹی وی چینل' ممبئی' بھارت	15-09-2007
26- مولانا فتح محمد' سابق امیر جماعت اسلامی' صوبہ پنجاب' اسلامی جمہوریہ پاکستان	21-10-2007
27- صاحب السمو الملکی الامیر خالد بن طلال بن عبدالعزیز آل سعود' مملکت سعودی عرب	14-10-1428
28- سید محمد فضل آغا' سابق گورنر صوبہ بلوچستان' اسلامی جمہوریہ پاکستان	28-10-2007
29- ایڈمرل شاہد کریم اللہ خان' سفیر اسلامی جمہوریہ پاکستان' متعین ریاض	27-1-2007
30- فضیلۃ الشیخ عبدالرحمن بن عبداللہ المخضوب' وکیل وزارۃ الداخلیۃ' مملکت سعودی عرب	19-10-1428
31- انیق احمد' ڈائریکٹر اے آر وائی نیوز' کراچی	26-09-2008

نمبر	تشریف لانے والی شخصیت کا نام ومقام	تاریخ
32-	یوسف ایسٹس، یونائیٹڈ کنگڈم آف برطانیہ	03-10-2008
33-	قاضی حسین احمد، امیر جماعت اسلامی پاکستان	08-06-2008
34-	حافظ محمد ادریس، مدیر معارف اسلامی، لاہور	28-12-2009
35-	سینٹر پروفیسر ساجد میر، امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان	28-12-2009
36-	ڈاکٹر حماد لکھوی، پروفیسر پنجاب یونیورسٹی لاہور	16-05-1430
37-	الشیخ عبدالعزیز بن عبد اللہ التویجری، مدیر مرکز توعیۃ الجالیات، القصیم	16-05-1430
38-	الدکتور احمد بن عبدالرحمٰن القاضی	18-11-1431
39-	ڈاکٹر زعیم الدین لکھوی بن مولانا معین الدین لکھوی	09-02-2011
40-	پروفیسر محمد یسین ظفر، مدیر جامعہ سلفیہ، فیصل آباد، پاکستان	13-12-2011
41-	مولانا احترام الحق تھانوی بن مولانا احتشام الحق تھانوی، کراچی	13-03-1433
42-	عبدالسالک خان، قونصل جنرل پاکستان جدہ	28-02-2012
43-	محمد نعیم خان، سفیر اسلامی جمہوریہ پاکستان، ریاض	10-06-2014
44-	الدکتور عبد العزیز بن عبدالمحسن الترکی، عضو رابطۃ علماء المسلمین، ریاض	19-08-1435

کوائف

مینجنگ ڈائریکٹر

بین الاقوامی اشاعتی ادارہ دارالسلام

نام: چودھری عبدالمالک مجاہد

ولدیت: محمد یونس کیلانی رحمۃ اللہ علیہ

خاندان: سپرا جٹ

پیدائش: نومبر 1955ء بمقام حضرت کیلیانوالہ (علی پور چٹھہ) ضلع گوجرانوالہ

تعلیم وتربیت: حافظ آباد، محلّہ بہاولپورہ (شرقی)، کسوکے روڈ، گلی نمبر 2 (مدرسہ رضیہ یونس)

مستقل رہائش: G-50 سکھ چین گارڈن، ملتان روڈ، لاہور

قیام: الریاض، سعودی عرب میں 1980ء سے تاحال مقیم

تعلیم:

فاضل علوم اسلامیہ، بچپن میں والد گرامی سے قرآن کریم کا ترجمہ پڑھا، چچا محترم مولانا محمد ادریس کیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی، حافظ آباد میں میٹرک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالحدیث محمدیہ حافظ آباد میں علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی۔ سعودی عرب میں پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ سے قرآن کریم کے بعض حصے کا ترجمہ وتفسیر اور بخاری شریف کا بعض حصہ سبقاً پڑھا، ان کے دروس میں کئی سال تک شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب کے دروس کا یہ سلسلہ برسہا برس تک جاری رہا۔

ابلاغ:

عربی، اُردو، انگریزی زبانوں میں تقریری مہارت اور اُردو میں تصنیفی وتالیفی خدمات

ادارتی خدمات:

⊙ بانی ومینجنگ ڈائریکٹر: بین الاقوامی اشاعتی ادارہ دارالسلام

دارالسلام کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ ہے جو 1988ء میں سعودی عرب کے دارالحکومت الریاض میں قائم ہوا۔ دارالسلام نے 28 اہم زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ دارالسلام نے 27 سالوں میں 25 بڑی زبانوں میں 1400 سے زائد کتب شائع کرنے کا منفرد اعزاز حاصل کیا ہے۔ دارالسلام کی برانچیں سعودی عرب اور پاکستان کے علاوہ امریکہ، یورپ اور عرب ممالک میں موجود ہیں۔ دارالسلام کا نیٹ ورک 35 ممالک میں پھیل چکا ہے۔

⊙ بانی ومنیجنگ ڈائریکٹر: دارالسلام قرآن پرنٹنگ کمپلیکس

(لاہور اسلام آباد موٹروے، کوٹ عبدالمالک انٹرچینج سے متصل، قرآن مجید کی اشاعت وتقسیم کا عظیم الشان وقف منصوبہ)

تعلیمی خدمات:

⊙ چیف ایگزیکٹو: دارالسلام حفظ وماڈل سکول سسٹم، پاکستان

⊙ چیف ایگزیکٹو: دارالسلام ایجوکیشنل سسٹم، پاکستان

⊙ چیف ایگزیکٹو: ضحیٰ انٹرنیشنل سکول، الریاض، سعودی عرب

⊙ چیف ایگزیکٹو: دارالسلام آغوشِ مادر بورڈنگ سکول

(یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت کا عظیم الشان اقامتی منصوبہ)

دعوتی خدمات:

⊙ داعی ومبلغ ''مکتب جالیات'' وزارۃ الشؤون الاسلامیہ، مملکت سعودی عرب

صحافتی خدمات:

⊙ چیف ایڈیٹر: ماہنامہ ضیائے حدیث، لاہور (دارالسلام کی تحقیق کا آئینہ دار، مقبول ترین فیملی میگزین)

⊙ چیف ایڈیٹر: سہ ماہی نوائے رابطہ، لاہور (زیر انتظام سپراء رابطہ سوسائٹی)

⊙ چیف ایگزیکٹو: اہل حدیث رائٹرز فورم، لاہور

- مستقل کالم نگار (فرائیڈے ''روشنی'' میگزین' یہ سلسلہ گزشتہ چھ سات سال سے جاری ہے) روز نامہ اردو نیوز جدہ، سعودی عرب

جماعتی خدمات:

- امیر: مرکزی جمعیت اہل حدیث، سعودی عرب
- مدیر: امور خارجہ مرکزی جمعیت اہل حدیث، پاکستان
- سر پرست اعلیٰ: پاک پروفیشنلز فورم، سعودی عرب
- ڈائریکٹر: پیغام ٹی وی، لاہور پاکستان

سماجی خدمات:

- چیئرمین: دارالسلام ٹرسٹ، لاہور پاکستان
- سر پرست اعلیٰ: الرحمہ ٹرسٹ، لاہور پاکستان
- چیئرمین: روشنی ٹرسٹ، واربرٹن (ننکانہ)
- سر پرست اعلیٰ: الہدیٰ ٹرسٹ، بھکھی (شیخوپورہ)
- صدر: سپرا رابطہ سوسائٹی پاکستان۔

(سپرا جٹ برادری کی نمائندہ تنظیم جس میں خاندان کے سبھی لوگ ممبر ہیں۔)

سیرت و تاریخ پر تالیفی و تصنیفی خدمات

1۔سنہرے اوراق، 2۔سنہرے فیصلے، 3۔والدین، اطاعت و نافرمانی واقعات کی زبانی، 4۔سنہرے حروف، 5۔سنہری کرنیں، 6۔سنہرے نقوش، 7۔آفتاب نبوت کی

سنہری شعاعیں، 8۔ سیدہ خدیجہ کی زندگی کے سنہرے واقعات، 9۔ سیدنا عمر ﷛ کی زندگی کے سنہرے واقعات، 10۔ سیدنا ابوبکر ﷛ کی زندگی کے سنہرے واقعات، 11۔ روشنی کے مینار (سیرت صحابہ)، 12۔ قصص الانبیاء (15 حصے) بچوں کے لیے، 13۔ اخلاق نبوی ﷺ پر سنہرے واقعات، 14۔ غزوۂ بدر (بچوں کے لیے)، 15۔ غزوۂ اُحد (بچوں کے لیے)، 16۔ معرکہ قادسیہ کے سنہرے واقعات (بچوں کے لیے)، 17۔ معرکہ جلولا کے سنہرے واقعات (بچوں کے لیے)، 18۔ سنہرے اذکار (بچوں کے لیے)، 19۔ سنہری دعائیں، 20۔ دعاؤں کی قبولیت کے سنہرے واقعات، 21۔ مسلمان بچے کے سنہرے صبح و شام، 22۔ میرے سنہرے سفر نامے، 23۔ رسول اللہ ﷺ کے 200 سنہرے ارشادات، 24۔ سنہری یادیں (خودنوشت)

(مذکورہ کتب کو لکھنے کے لیے سیرت و تاریخ کے موضوع پر 200 کے قریب عربی کتب کا مطالعہ کیا گیا۔ مطبوعہ کتابوں میں سے بعض کتب کا انگلش، فرنچ، جرمن، ہندی، بنگالی، سندھی، انڈونیشی، فارسی اور پشتو زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، کچھ پرنٹ ہو چکی ہیں اور کچھ زیرِ طبع ہیں۔)

سیرت نبوی پر صحافتی خدمات

2006ء میں جب ڈنمارک کے اخبار میں رسول اللہ ﷺ کے گستاخانہ خاکے شائع کیے گئے، تب سے سعودی عرب کے مقبول ترین اخبار روزنامہ اُردو نیوز کے زیرِ اہتمام ہفت روزہ ''اردو میگزین'' میں فل سائز کے دو صفحات پر مشتمل، عبدالمالک مجاہد کے کالم ''سیرت نبوی ﷺ کے اوراق'' کے نام سے، تین سال سے زائد عرصہ تک، مستقل چھپتے رہے جو کہ

مقبول ترین کالموں میں شمار ہوتے تھے۔سیرت کے موضوع پر ان کالموں میں بڑا علمی ذخیرہ جمع ہے۔ان میں بعض مضامین پاکستان کے معروف اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہے جن میں روز نامہ نوائے وقت، روز نامہ جنگ، روز نامہ پاکستان، روزنامہ امت، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ وغیرہ نمایاں ہیں۔

سیرت نبوی پر مستحسن علمی و تاریخی اقدامات

* عبدالمالک مجاہد کی زیرادارت سیرت نبوی کا ایک علمی شاہکار سیرت انسائیکلوپیڈیا اللؤلؤ المکنون کے نام سے 11 جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ یہ سیرت کے موضوع پر علمی، تحقیقی، فنی اور طباعتی خوبصورتی میں ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ سیرت انسائیکلوپیڈیا میں صحیح احادیث اور آثار کو جمع کیا گیا ہے۔ 8 جلدیں نہایت خوبصورت انداز میں آرٹ پیپر پر 4 کلر میں بیروت سے شائع ہو چکی ہیں۔ان شاء اللہ یہ سیرت انسائیکلو پیڈیا 2014 کے آخر تک مکمل دستیاب ہوگا۔مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کا پروگرام ہے۔انگلش میں دو جلدوں کا ترجمہ مکمل ہو چکا ہے۔ وللہ الحمد!
* عبدالمالک مجاہد کی سیرت النبی ﷺ سے والہانہ عقیدت کی بنیاد پر دارالسلام اب تک سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر متعدد زبانوں میں 63 کتابیں شائع کر چکا ہے۔ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر میں کسی بھی ادارے نے سیرت النبی ﷺ پر اتنی کتابیں شائع نہیں کیں جتنی دارالسلام نے شائع کی ہیں۔

ماشاء اللہ لاقوۃ إلا باللہ.

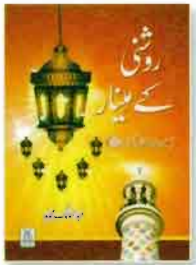
ذكريات ذهبية

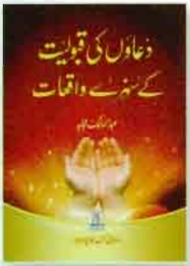
(باللغة الأردية)



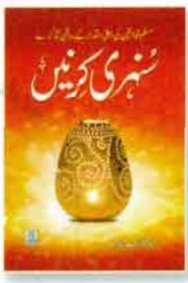




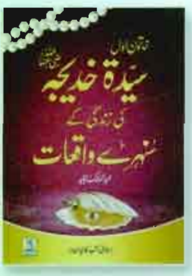












دارالسلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
www.darussalampublishers.com
9786035003391